دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
نومبر 2013
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

جلد43 • شمارہ 11 • نومبر2013 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر229 کراچی74200 • فون (021)35895313 فیکس (021)35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

آنسٹیل پبلک لائبریری
0320-9630911

مدیرِ اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم

نومبر کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ عیدِ قرباں آئی اور شان و شوکت سے گزر گئی۔ مہنگائی کی چکی میں پستی ہوئی اکثریت نے اجتماعی قربانی کا سہارا لے کر اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھا تو کسی نے لاکھوں کا جانور قربان کر کے بارگاہِ خداوندی میں اپنی آسودہ حالی کا کھلا اعلان کیا... یوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور سال اپنے اختتام کو پہنچنے والا ہے... ساتھ ہی موسم کے ساتھ زندگی نے بھی ایک اور کروٹ بدل لی۔ شجر سے ٹوٹے، خنک ہوا کے ساتھ اڑتے زرد پتے... نوید ہے آنے والے سرد ایام... چھوٹے دنوں اور لمبی راتوں کی۔ اب تو برسوں سے یہ حال ہے کہ گرمیاں پسینا بہاتے، لوڈشیڈنگ کے ساتھ جیتے، ہاتھ سے پنکھا کرتے، جنریٹر اپنا ہو یا نہ ہو مگر اس کا شور برداشت کرتے یا پھر خود کو کوستے دیتے گزر جاتا ہے لیکن توانائی کا مارا پیارا پاکستان... جہاں اب سردیوں کی آمد کے ساتھ ہی جی ڈرتا ہے کہ گیس کی لوڈشیڈنگ ہوگی، وہ بھی زوروں پر۔ بچے اسکول کے لیے تیار ہو رہے ہوں گے، مائیں ناشتا بنا رہی ہوں گی اور دل کو دھڑکا لگا رہے گا کہ پیارے اللہ پراٹھا پکنے تک گیس نہ جائے۔ یہی نہیں، سی این جی کی ہفتہ بھر طویل لوڈشیڈنگ بھی مہینوں پر محیط ہو سکتی ہے کہ حالات بدلے نہیں اور امید کا دامن بھی نہیں چھوٹا... لیکن یہ بھی سچ ہے کہ امید جلد بر آتے دکھائی بھی نہیں دیتی۔

کراچی والے قتل و غارت گری کے باوجود اپنی ایک خوش قسمتی پر بڑے نازاں ہیں کہ رُت خواہ کوئی پیرہن بدلے پر موسم ان کا ہمدم ہوتا ہے۔ گرمیاں چاہے کتنی سخت ہوں مگر پھر بھی ائر کنڈیشنر کے بغیر شب و روز کٹ جاتے ہیں، وہ بھی کم تکلیف کے ساتھ... رہی سردیاں تو گھر گرم رکھنے کے لیے کم از کم ہیٹر کی ضرورت قطعی نہیں پڑتی۔ جوں جوں اوپر کی طرف بڑھتے جائیں حیدر آباد سے پشاور، اسلام آباد سے اسکردو اور لاہور سے کوئٹہ... کیا چھوٹا کیا بڑا شہر... موسم خواہ کیسا ہو لیکن اس کی شدت ہوا ہوتی ہے... گرمیوں میں ائر کنڈیشنر تو پھر سردیوں میں ہیٹر... سچ ہے کہ ان پیاروں کا ساتھ نہ ہو تو موسم کی ماری زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ خیر! زندگی نام ہے اسی اتار چڑھاؤ کا...

ہم چلتے ہیں آپ کی محفل ہاؤ ہو میں اور دیکھتے ہیں کہ کیا قیامت ڈھا رہے ہیں نامے آپ کے اس بار...

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی خواہش "جاسوسی اس بار بھی 5 تاریخ ہفتے کی شام ملا اور ویک اینڈ سہانا کر گیا۔ سرورق اس بار کہانیوں سے مطابقت رکھتا تھا اور اچھا تھا۔ خطوط کی محفل کے سردار اس ماہ رحیم یار خان کے مظہر سلیم ٹھہرے، مبارک باد۔ راجا اسلم، قیصر اعوان، اے کیو حسین کا میرے تبصروں پر رائے کا شکریہ۔ چینی نکتہ چینی کی مٹھاس (ماہا ایمان) کی کمی محسوس ہوئی۔ اپنے ہی شہر کے شکیل کاظمی صاحب مدتوں بعد نظر آئے اور خوب آئے۔ اب ذرا کہانیوں کی طرف۔ شمارے کی پہلی کہانی صبا احمد کی خوابوں کا سوداگر ایک دلچسپ تحریر تھی گو کہ کسی مغربی کہانی سے ماخوذ لگتی تھی۔ قسط وار کہانی جواری میں اب نئے کردار شامل ہو رہے ہیں۔ گاؤں کی ایک میٹرک فیل لڑکی ریشم سے ایسے فلسفیانہ ڈائیلاگ کچھ عجیب سے لگے۔ دیکھیں خاور کو اب نورین دوبارہ کب ملتی ہے۔ چودھری کی قید سے ریشم اور خاور اب کیسے نکل پاتے ہیں۔ دوسری قسط وار کہانی گرداب اب اختتام کے قریب ہے۔ شہریار اور سلوا اپنے مشن میں تقریباً کامیاب ہو گئے ہیں اور جلد ہی بارڈر پار کر جائیں گے۔ انسپکٹر پریم ناتھ سے شہریار، سلوا اور ڈاکٹر فرحان کیسے نمٹیں گے۔ اگلی قسط میں واضح ہو جائے گا۔ اسلم، ماہ بانو کو یقیناً وہاں سے نکال لے آئے گا۔ سرورق کی دوسری کہانی کاشف زبیر کی سیاہ فروش پہلی کہانی قتلِ عام سے بدرجہ بہتر تھی۔ شمارے کی واحد دیسی کہانی مریم خان کی مہلک ہتھیار بس گزارے لائق تھی۔ مغربی کہانیوں کی بھرمار میں آصف ملک کی سنگ بردار سب سے بہتر رہی۔ اس کے بعد سکندر ظلیم کی غلامی غنیمت تھی۔ ترجمہ شدہ مغربی کہانیوں کی نسبت دیسی طبع زاد کہانیوں کو جاسوسی میں ضرور شامل کیا کریں۔"

لاہور سے زویا اعجاز کی پسندیدگی "تمام ہم وطنوں اور ادارے کو عید مبارک۔ جاسوسی ڈائجسٹ نے شرفِ دیدار تین اکتوبر کی سہانی شام کو عطا کیا۔ ٹائٹل اپنے اندر گہری معنویت سموئے ہوئے تھا۔ حسینہ جاسوسی سراپا دلکشی اور مسٹر جاسوسی سراپا وحشت و سفاکیت نظر آئے۔ چینی نکتہ چینی میں اس بار بھی چینی خال خال ہی نظر آئی۔ میرا تبصرہ سرے سے ہی غائب تھا۔ بھئی جمہوری حکومت میں اتنی ڈکٹیٹر شپ۔ بہت ناانصافی ہے۔ اس پالیسی کے خلاف ہم لانگ مارچ کریں گے۔ نیازی صاحب! اتنا خوش قسمت ابھی کوئی بھی پیدا نہیں ہوا جسے زویا اعجاز کاپی کرے۔ بھیا قیصر اعوان! میرے بارے میں آپ کا نکا فقتی پرسنٹ درست ہے۔ شکیل کاظمی اور افتخار اعوان کا شکریہ۔ کہانیوں کا آغاز حسبِ معمول گرداب سے کیا جہاں کوئی خاص پیشرفت نہ پا کر کافی مایوسی ہوئی۔ جواری اب رو دھم میں آتی جا رہی ہے تاہم اصل سسپنس یعنی فرید کا ماضی جوں کا توں برقرار ہے۔ خوابوں کا سوداگر بے حد تیکھی اور شاندار تحریر ثابت ہوئی۔ طنز و مزاح پر مبنی اندازِ بیان پر احمد اقبال کے اسلوب کی چھاپ نمایاں تھی۔ سرور اکرام کی قتلِ عام بہت زبردست کاوش تھی۔ مذہب کے نام پر ہر خطے میں ہونے والی سیاست اور وطنِ عزیز کو دیمک کی طرح کھوکھلا کرنے والے عناصر کی بہت خوبصورتی سے نشاندہی ہوئی۔ کاشف زبیر کی تو کیا بات ہے۔ سیاہ فروش کی بنت دلچسپ تھی۔ مختصر کہانیوں میں مہلک ہتھیار ٹاپ پر رہی۔ تادو نے قادر بخش کو جوتا کلب کا ممبر بنا کر یادگار انتقام لیا۔ غلامی بھی بہت خوبصورت تحریر تھی۔ کتر نیں بھی زبردست تھیں۔ اکتوبر کا شمارہ سالِ رواں کے بہترین شماروں میں سے تھا۔"

بنوں سے محمد ہمایوں سعید کی روداد "اکتوبر کے سرورق کے لیے کلاسیکل ٹائپ کی پینٹنگ کر کے ذاکر انکل نے پچھلے سرورق کی گردن پہ بے تحاشا تنقید کرنے والوں کے منہ تسلی بخش انداز میں بند کر دیے۔ مظہر صاحب! جاسوسی سے محبت کے جرم میں کس نے آپ کو قیدِ بامشقت یا جرمانے کی سزا سنائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے جو آپ اتنا واویلا کر رہے ہیں اور میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ محبت اتنی جتائی بھی نہیں چاہیے۔ یہ احساس کا نام ہے۔ اسے احساس ہی رہنے دینا چاہیے۔ قدرت اللہ صاحب! یہ آپ لوگ کیوں بے چاری عروج ناز کے پیچھے پڑ گئے ہو، وہ واقعی ایک دوشیزہ ہی ہیں صرف چوبیس سال کی۔ کبیر صاحب! غلط فرمایا آپ نے، اعجاز کیوں بُرا مانیں گے۔ انہیں تو کئی عظیم لوگوں کا دُم چھلا بننے کا اعزاز حاصل ہو چکا ہے۔ افتخار حسین صاحب! جب آپ وجاہت کے معنی و مطلب کی دھجیاں اڑاتے ہوئے خود کو صنفِ وجاہت کا نمائندہ کہتے ہو جب تو آپ کے ہاتھ نہیں کانپتے اور عروج ناز صاحبہ نے خود کو دوشیزہ لکھ دیا تو... بشیر صاحب! کیا کمال کی اسٹوری سنائی آپ نے۔ وہ صاحب پورا راستہ ڈائجسٹ کے مزے لوٹتے رہے اور جب اترنے لگے تو بہت پیار سے ڈائجسٹ کو سیٹ پر رکھ گئے۔ واہ کیا بات ہے بونس کی۔ شکیل کاظمی صاحب! آپ کی معلومات میں اضافہ کرتا چلوں کہ مزاح کے فن کا بنیادی اصول یہی ہے کہ جو بات آپ کہتے ہیں وہ لوگوں کو خود ہی سمجھ آئے اور وہ لطف اندوز ہوں۔ لیکن اگر کوئی پہلے بات کرتا ہے پھر داد طلب نظروں سے لوگوں کی طرف دیکھتا ہے اور پھر ان سے کہتا ہے کہ میں نے آپ لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کی تھی... ہنسو بھئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کاشف زبیر کی شاندار کہانی سیاہ فروش پڑھی۔ شروع سے آخر تک تمام واقعات اتنے مکمل انداز میں پیش کیے گئے کہ حقیقت کا گمان ہونے لگا۔ ابتدائی صفحات۔ صبا احمد کی کہانی خوابوں کا سوداگر اس لیے بھی زیادہ پسند آئی کہ اس میں شاہ رخ خان تھے۔ اندازِ بیاں اور الفاظ کا چناؤ سو فیصد احمد اقبال جیسا تھا۔ آصف ملک کی سنگ بردار کو حد سے زیادہ انجوائے کیا۔ خوب صورت احساسات اور دردِ دل رکھنے والے دو مغربی جوانوں نے بہت متاثر کیا۔ جمال دستی کی کہانی خیالی گھوڑا، نفسیاتی کیس تھا جسے سمجھنے کے لیے ماہر نفسیات یا نفسیاتی مریض ہونا شرط ہے جو ہم نہیں ہیں۔ (اچھا کیا بتا دیا) ابرار نعیم کی سخت جان کا انجام واقعی چونکا دینے والا تھا۔ سخت جان سے سچ اگلوانے کے شاندار طریقے نے داد دینے پر مجبور کیا۔ چال باز میں بہت گھسی پٹی چال تھی اس لیے پسند نہ آئی۔ قتلِ عام موجودہ دور کی عکاسی کرتی بہترین کہانی تھی۔"

بہاولپور سے بشریٰ افضل کی چہکاریں "5 اکتوبر کو جاسوسی ملا۔ مظہر سلیم کرسیٔ صدارت پر بیٹھے بڑے خوش لگ رہے ہیں۔ ہونا بھی چاہیے مبارک ہو، آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ محمد ہمایوں! منگنی مبارک ہو۔ خوشیوں کے جھولے میں مسکراتے رہیں دونوں۔ وقار احمد سیال! دیکھیں انکل اپنے قاری کا کتنا خیال رکھتے ہیں، ان کا دل نہیں توڑتے کبھی۔ سید شکیل حسین کاظمی اپنے منہ میاں مٹھو بنتے نظر آئے اور معافی تلافی کرتے نظر آئے، سوچ سمجھ کر بولا کریں۔ کاشف زبیر کا آخری رنگ، سیاہ فروش میں نصیحت کا پہلو نمایاں تھا جو کسی کے لیے گڑھا کھودتے ہیں خود ہی اس میں گرتے ہیں۔ رضوان کو اپنی پسند بھی مل گئی۔ مہلک ہتھیار، قادو نے قادر بخش کے خلاف جو ہتھیار استعمال کیا واقعی قابلِ داد تھا۔ دنیا کی نظروں میں اس سے بڑھ کر کیا تذلیل ہوتی۔ چالباز میں بیوی نے شوہر کو قتل کرنے کے لیے جوزف کو استعمال کیا۔ اسے کہتے ہیں دوسروں کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانا اور خود صاف بچ جانا۔ جیسے کو تیسا، خوب صورت تحریر تھی۔ جیت تو شوہر سے زیادہ تیز نکلی.... جو اس نے کرنا تھا خود ہی کر دیا۔ بازی سلویٹر نے ہی سراغ رساں کو اس کام پر مامور کیا اس نے بہ خوبی کام نبھایا مگر آخر میں سلویٹر نے کریڈٹ لے لیا۔ سچی محبت ہو تو انسان کامیاب ہو جاتا ہے۔"

سیدا اکبر شاہ، اوگی مانسہرہ سے لکھتے ہیں "ناول گرل کا دیدار خلافِ معمول جلد یعنی 4 تاریخ کو نصیب ہوا لیکن نصف چہرہ اور اس پر بھی معصومیت کا عنصر۔ بائیں جانب کا منظر ڈراؤنا تھا اس لیے اس حصے کو سرسری نگاہوں سے دیکھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ محفلِ یاراں تک داں میں پہنچے اور اپنا تبصرہ تلاش کرنا شروع کیا۔ پتا نہیں کس وجہ سے وہ تبصرہ در در کی ٹھوکریں کھاتا بلیک لسٹ ہوا۔ اس بار مظہر سلیم کرسیٔ صدارت پر قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ مبارک ہو، جامع تبصرہ تھا ان کا۔ قدرت اللہ نیازی کافی عرصے بعد انٹری کر رہے ہیں، کہاں مصروف ہوتے ہو جی۔ اپنے جگری یار شہزادہ کوہسار کا تبصرہ بھی شاندار تھا۔ کاظمی صاحب! آپ نے بجا فرمایا ہم آپ کی پُرعظمت باتوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہمایوں سعید کی منگنی کا پڑھ کر خوشی ہوئی، بیسٹ آف لک برادر۔ حسبِ معمول جواری سے ابتدا کی، یہ قسط گزشتہ قسطوں پر بھاری رہی۔ وہ کہتے ہیں زندگی کے تلاطم میں ڈوبتے ابھرتے کردار اس بار نورین کے کردار کے ساتھ ساتھ اس کا جسم بھی ڈوب گیا۔ گرداب اس بار کافی سست رہی۔ ابتدائی صفحات پر صبا احمد کی تحریر خوابوں کا سوداگر ہمیں متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ دوسرا رنگ، سیاہ فروش بہترین تحریر تھی۔ ایمن کا کردار قابلِ دید تھا۔ مختصر فن پاروں میں مہلک ہتھیار، چال باز اور غلامی پسند آئیں۔ اقتباسات بھی خوب رہے۔"

صفدر آباد سے تابی اور بالو کی قیاس آرائیاں "جاسوسی کا دیدار اس دفعہ 5 اکتوبر کو نصیب ہو گیا۔ سرورق پر نظر پڑی تو آنکھیں حیرت کے مارے پھٹ گئیں۔ ذاکر انکل نے یہ کس قسم کے بندے کو سرورق پر لگا دیا۔ یہ نہ تو شہزادہ کوہسار لگے نہ ہمایوں سعید، پھر آخر کون ہے؟ حسینہ کی خوب صورت آنکھوں سے گھبرا کر اشتہارات کو نظر انداز کرتے شوگر فیکٹری میں داخل ہوئے۔ استقبالیہ میں مظہر سلیم صاحب کرسیٔ صدارت پر بیٹھے جھکتے نظر آئے۔ ہمیں کب یہ موقع دیا جائے گا؟ کبیر عباسی ہتھ ہولا رکھا کریں۔ بشریٰ آنٹی کو آنٹی کہہ دیا، حد ہوتی ہے۔ قیصر اعوان بھیا! دینا ملک کا خیال دل میں مت لائیں، وہ ہاتھ آنے والی چیز نہیں۔ اٹک سے احمد وصال، ماہا ایمان کو صنفِ وجاہت کی اہمیت پر لیکچر دیتے نظر آئے۔ ماہا باجی کچھ سمجھ آئی یا عقل بھی گئی؟ سعدیہ بخاری کیا کہنے آپ کے، اگر آپ جاسوسانہ طبیعت کی مالک ہیں تو کوئی پسٹل وغیرہ بھی لازمی رکھتی ہوں گی۔ ان کی تلاشی لے کر اندر داخل کیا کریں یہ نہ ہو غصے میں دو چار کو پھڑکا ڈالیں۔ بشیر احمد بھٹی! واہ آپ نے تو مفت کے مزے اٹھا لیے، وہ موصوف شاید آپ کے لیے چھوڑ گئے تھے اتنی پیاسی نگاہوں سے جو دیکھا۔ اس دفعہ خطوط کی کافی کانٹ چھانٹ کی ہے اس وجہ سے کچھ نئے چہرے دیکھنے کو ملے۔ ہمایوں سعید رشتہ منگنیات میں بندھنے پر مبارک، اظہارِ افسوس کرنے کا موقع کب دیں گے؟ ہمارا مطلب شادی کب ہوگی؟ اعجاز احمد اور تفسیر عباس کے تبصرے زبردست تھے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے گرداب نے متوجہ کیا، ہم نے ایک نیا شوشہ چھوڑا ہے کہ اسما قادری اسلم کا قصہ تمام کریں گی۔ ماہ بانو کو بچاتے بچاتے اور ماہ بانو کو بحفاظت واپس لے جانے کی ذمے داری مشابرم خان پر۔ کیسا لگا ہمارا شوشہ؟ اس کے بعد جواری کھول لی، واہ احمد اقبال کا ہیرو مشکل سے مشکل میں بھی پھلجھڑیاں چھوڑنے سے باز نہیں آتا اور اپنے خیالی گھوڑے دوڑاتا رہتا ہے، نورین کھو گئی مگر ریشم مل گئی۔ ریشم ایک دلچسپ کردار رہا، مزہ آ گیا۔ کاشف زبیر کی سیاہ فروش بھی عمدہ رہی۔ پہلا رنگ جو کہ سرور اکرام کے قلم سے تھا، دلچسپ تھا۔"

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی بحث بازی "7 اکتوبر کو جاسوسی حافظ نیوز اسٹال سے خریدا۔ سرورق پر حسینہ اور موصوف کے درمیان جیسے تاکنے جھانکنے والی بات تھی، حسینہ کسی کو دیکھ رہی تھی اور موصوف نے گن اٹھا کر غالباً یہ دھمکی دینے کی کوشش کی تھی کہ نہیں پہلے میں۔ مظہر سلیم کرسیٔ صدارت کی مبارک ہو۔ سید شکیل کاظمی! جناب آپ کی پڑوسن کا کیا حال ہے۔ انور اینڈ نعیم و بیگم یار۔ محمد ہمایوں سعید آپ کو منگنی کی مبارک باد ہو لیکن آخر کار آپ بھی جو صنفِ نازک کے خلاف بولتے تھے، اب ان کے حامی... تفسیر بھائی کا یہ خط خشکی بھرا تھا کیوں؟ محی الدین اشفاق کہاں غائب ہیں؟ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ واہ اسما جی! کیا زبردست موڑ آیا ہے۔ شہریار کی ہمت اور حوصلے کی داد دینی چاہیے۔ ماہ بانو اور اسلم پھر جال میں پھنس گئے۔ جواری نے اب زبردست موڑ لیا ہے۔ خاور کا نورین سے ریشم تک کا سفر زبردست رہا لیکن نورین کو مرنا نہیں چاہیے۔ ابتدائی کہانی خوابوں کے سوداگر نہایت سبق آموز تھی۔ خواب ہر کوئی دیکھتا ہے مگر تعبیر کوئی کوئی... سرورق پر سرور اکرام نے اور کاشف زبیر نے حسبِ روایت اچھا لکھا۔ چھوٹی کہانیوں میں سب سے اچھی تنویر ریاض کی بازی گی اور ٹھگ بازی بھی۔"

صبا گل، مالاکنڈ ڈویژن سے لکھتی ہیں "اتنا عرصہ کسی نے یاد کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تو سوچا خود ہی موجودگی کا احساس دلا دوں۔ شمارہ بروقت 5 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق چھوکری کافی سے زیادہ سندر تھی۔ دنگل پر مظہر سلیم تھے، مبارک۔ ہماری غیر حاضری میں کافی لوگ آئے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں۔ قدرت اللہ صاحب! ابھی اگر صنفِ وجاہت کو کرخت میں بدلنے اور مضحکہ خیز بنانے میں صنفِ نازک ملوث ہیں تو کرختوں کو پھر ڈوب مرنا چاہیے۔ چچ... چچ... چچ... کیسے مرد ہیں آج کے بھی۔ شہزادہ کبیر صاحب! آپ کی وائف کو پتا ہے کہ صرف سوچنے سے کچھ بنتا نہیں۔ پاکستانی ایکٹریسز سے منع کیوں کیا؟ تاکہ ان کی سینڈل ہاتھ میں نہ آ جائے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ! آپ کے بتائے ہوئے نسخے سے اللہ نے راحت دی ہے، شکریہ۔ پڑوسن والے بھیا! آپ کی سخن دانی مزہ دے گئی۔ ہمایوں دل تو نہیں چاہتا لیکن پھر بھی مبارک۔ تفسیر عباس کی خاموشی ہضم نہیں ہوئی۔ جواری کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ احمد اقبال بلاشبہ ایک کھاگ رائٹر ہیں۔ کہانی کا ٹیمپو تسلی بخش تیز ہے۔ واقعات کا تسلسل، موضوعات کا تنوع لاجواب ہے۔ ایک سوال بلکہ اعتراض ہے کہ مفرور مجرم صاحب پر یہ لڑکیاں کیوں اتنی مرتی ہیں؟ کیا اسے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ ہر آنے والی لڑکی اس کے دل سے ٹکراتی ہے؟ ایسے میں عورت ذرا ارزاں ہو جاتی ہے۔ گرداب آخری سانسوں پر ہے۔ اسما جی ذرا تیزی لائیں۔ بڑے عرصے بعد صبا احمد کا نام نظر آیا۔ خوابوں کا سوداگر بھی بڑی دلچسپ اور پُرمزاح کہانی تھی۔ پہلا رنگ ایک نام نہاد سیاسی لیڈر کے کرتوتوں پر مبنی تھا۔ موجودہ سیاسی پارٹیوں اور اس کے پس منظر کی عکاسی کی گئی تھی۔ دوسرا رنگ مزاج پر پوری طرح نہیں اترا۔ چھوٹی کہانیوں میں مہلک ہتھیار فرسٹ کہانی تھی۔ ہمارا معاشرہ قادر بخش جیسے جاگیرداروں سے بھرا پڑا ہے۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔"

کوہاٹ سے سمعیہ، شاہدہ، حائقہ اور دیگر کزنز کا اجتماعی تجزیہ "جاسوسی کا ہمیں بہت شدت سے انتظار رہتا ہے اور برسوں سے ہم سب کزنز بہنیں بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ بہت لگن اور دلچسپی اور بے چینی سے لیکن محفل میں حاضر اس لیے نہیں ہوتے کہ ہمارا گھر شہر سے کافی دور ہے اور ہمیں 10 یا 15 تاریخ کو ملتا ہے۔ اب بھی میں ماہ ستمبر کے جاسوسی پر تبصرہ کروں گی۔ (چلیں آپ کو چھوٹ دیتے ہیں) سلسلہ وار کہانیوں میں ہم سب کی پسندیدہ کہانی گرداب ہے۔ خاص اس لیے کہ میڈم اسما قادری صاحبہ نے اسے بہت مہذب ترین انداز میں تحریر کیا ہے اور ہم سوچتے ہیں کہ واقعی پاکستان کسی کے دم سے قائم ہے اور اس پاک ملک میں اب بھی ایسی پاکیزہ ترین اور باحیا ترین عورتیں ہیں جو الفاظ تک بھی باحیا استعمال کرتی ہیں۔ گرداب کا جو اندازِ تحریر میڈم اسما صاحبہ نے چنا ہے، وہ ان کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ رزاق شاہد کوہلر کی نجات اور مقتول قاتل غوثیہ شبیر کی اے ون رہی اور پیادے نے تو ہم سب کو تین دن تک رلائے رکھا۔ زبردست تحریر تھی۔ مس پروین زبیر اور کاشف زبیر صاحب کو ہم دلچسپی سے پڑھتے تھے لیکن جب سے مریم کے خان اور ان کا اندازِ تحریر ایک جیسا ہو گیا ہم نے پڑھنا ہی چھوڑ دیا کیونکہ کسی بھی مصنف کو اس کا اندازِ تحریر ہی منفرد بناتا ہے۔ احمد اقبال صاحب ذرا سوچیے کہ گرداب اور للکار اس لیے کامیاب رہیں کہ مرد، مرد کا ساتھ دیتے تھے۔ یہ مس نورین کو درمیان سے نکال دیں مروا دیں۔ ورنہ آپ کی کہانی میں ہمیں کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی۔ ہر قسط میں وہی نورین کا رونا، بے ہوش ہونا، اس کا ہوش میں لانا، یہی باتیں ہوتی ہیں۔ کوئی نیا پن نہیں ہوتا۔ کوئی ایکشن بے چارہ جواری تو کر نہیں سکتا۔ کوئی توڑ پھوڑ جھگڑا، بہادری کیونکہ ادھر پھر آنسو ہوتے ہیں۔ یہ بھی کوئی ہیروئن ہے جو ہیرو کے قدموں کی زنجیر بن گئی۔ پہلی قسط میں جب جواری گاما پہلوان کے ساتھ فرار ہوئے تھے تو دونوں مردوں کا کیا ساتھ تھا، مزہ آیا تھا۔ غیر ملکی کہانیوں میں مسلمانوں کے لیے سبق ہوتا ہے کہ اگر ہم بھی وہ تہذیب و تمدن اپنا لیں گے مکمل تو ہمارے درمیان بھی پیار و محبت اور عقیدت کچھ نہیں ہوگا۔ ہم بھی صرف دولت کے لیے جئیں گے اور مریں گے۔ ہم تو کہانی کا نچوڑ نکالتے ہیں تب ہی اسے معیاری اور غیر معیاری ٹھہراتے ہیں۔ دوستوں آپ بھی ذرا سوچ کے پڑھیے اور پھر تب ہی کچھ لکھیے۔"

فضل محمود کا پیغام "سلسلہ جواری سابقہ سلسلوں کی طرح کافی زوردار اور دلچسپ ہے لیکن خاور صاحب کو بار بار سابقہ اور مستقبل کے خیالات بہت آتے ہیں جس سے قاری بور ہو جاتا ہے۔ جس طرح آپ سابقہ ناولوں میں کرداروں سے فائٹ کرواتے ہیں، خاور کے ہاتھ پیر نہ باندھیں بلکہ ہیرو کی طرح فائٹ اور مقابلے کا موقع دیں۔"

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کے مزے "اس بار اکتوبر کا شمارہ خلافِ معمول 3 کو ہی مل گیا۔ سرورق پر ماڈل کا آدھا چہرہ ایسے لگا جیسے بادلوں کی اوٹ برآمد ہوتا آدھا چاند۔ ساتھ ایک ڈکیت انکل جو کہ ایسے لگتے نہیں ہیں۔ اوپر چہرے کی آنکھ سے ٹپکا آنسو عجیب سا کنفیوژن ہو گیا۔ بہر حال آگے بڑھے۔ بزمِ یاراں میں انٹری ماری تو جناب عزت مآب قبلہ بھائی مظہر سلیم صاحب کو صدارت کی کرسی پر بیٹھ کر لفظوں کے پھول نچھاور کرتے دیکھا، اچھا تبصرہ ہے جی مبارکاں۔ سرگودھا سے اسلم اینڈ زیبی اچھے تبصرے کے ساتھ موجود، آگے میرے شہر کے نیازی صاحب بھی لفظوں کا خوب صورت جال بنتے نظر آئے۔ کبیر عباسی صاحب مجھے صنفِ نازک کے فوبیا کا شکار نظر آئے۔ قیصر اعوان صاحب کا بھی تبصرہ اچھا ہے۔ اللہ پاک آپ کو اور سب بے گناہ قیدیوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کو جلد سے جلد رہائی عطا فرمائے۔ اعجاز راحیل صاحب کی شاعرانہ سی گفتگو بہت اچھی لگی۔ شاعر صاحب پریشان نہ ہوں اللہ آپ کے خوابوں، خیالوں کو کبھی بے نشان نہیں کرے گا۔ انتظار کرو کہ وقت آنے کو ہے۔ ہمایوں سعید کو منگنی کی بہت سی مبارک باد قبول ہو، جیسا آپ بول رہے ہو اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ باقی سب کے تبصرے بھی جاندار اور زبردست قسم کے ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی، ونڈرفل قسط تھی۔ جواری بھی اچھی جا رہی ہے۔ صبا احمد کی خوابوں کا سوداگر بھی اچھی کہانی تھی۔ مہلک ہتھیار مریم کے خان کی اچھی کاوش جو امیر غریب کا فرق واضح کرتی نظر آئی اور قادو نے اچھا بدلہ لے لیا۔ قتلِ عام مسلمانوں کے حالات اجاگر کرتی تحریر بہت پسند آئی۔ سیاہ فروش میں وہی پیسے کا کھیل جو ہم لوگوں کی بربادی کا سبب بنتا ہے۔ آج ہم اس دور میں جی رہے ہیں جہاں پیسے کی قدر ہے انسان کی نہیں۔ چالباز میں عورت نے صحیح چال چلی، جوزف کے ساتھ سخت جان اور خیالی گھوڑا کوئی مزہ نہیں دے سکیں۔ دونوں کی سمجھ نہیں آئی مجھے تو۔ ٹھگ بازی میں آسکر نے ٹھیک بے وقوف بنایا دشمن کو کہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ بازی بھی اچھی رہی۔"

عروج ناز، شہر ملہ گنگ سے فرماتی ہیں "اس دفعہ جاسوسی خلافِ معمول 4 تاریخ کو ملا، ہم تو خوشی سے نہال ہی ہو گئے۔ ٹائٹل پر ہر دفعہ ہمایوں سعید ہی اول جلول حلیے میں براجمان نظر آتے ہیں۔ (آپ کو ہمایوں سعید ہی کیوں نظر آتے ہیں؟) سب سے پہلے حاضری دی بزمِ یاراں میں جہاں مظہر سلیم صاحب کرسیٔ صدارت سنبھالے بیٹھے تھے۔ مبارک باد قبول کریں۔ قدرت اللہ نیازی صاحب! عروج ناز سے پنگا، از ناٹ چنگا۔ سو پلیز ذرا سوچ سمجھ کے۔ کبیر عباسی! آپ کو اپنے بارے میں زیادہ ہی غلط فہمی ہے۔ قیصر اعوان بھیا! تہ دل سے شکر گزار ہیں، آپ نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات دور فرمائے، آمین۔ انکل افتخار حسین اعوان! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مابدولت نے 26 ستمبر 2013ء کو اپنی اٹھارویں سالگرہ منائی اور ہم آئی سی ایس پارٹ ٹو کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ شکیل کاظمی صاحب انگارے چباتے نظر آئے۔ ہمایوں سعید کو منگنی کی مبارک باد۔ کم از کم آپ کسی کے لیے قابلِ قبول تو ہوئے۔ (ہولے بھی ہولے) تفسیر عباس بابر کا تبصرہ ہمیشہ دل کو بھاتا ہے۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ تو جناب ابتدا کی گرداب سے جو بہت ہی اچھی جا رہی ہے۔ سرورق کے رنگ اس دفعہ کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکے۔ صبا احمد کی خوابوں کا سوداگر پسند آئی۔ جیسے کو تیسا، غلامی، سنگ بردار پسند آئیں مگر بازی لے گئی قادو موچی کی مہلک ہتھیار۔ جواری میں نئے کردار متعارف ہو رہے ہیں مگر اسٹوری واضح نہیں ہو رہی۔ نادر شاہ کی فرید عرف خاور کے ساتھ آخر دشمنی کیا ہے؟ چالباز بھی اچھی رہی۔ مجموعی طور پر اس دفعہ شمارہ بس بہتر تھا۔"

کراچی سے ادریس احمد خان کا تبصرہ "جاسوسی بروقت مل گیا۔ ٹائٹل میں خوف کا انداز بھی ہے، ہتھیار کی دہشت بھی ہے۔ آنکھ سے خون ٹپکاتی پس منظر کی تصویر بھی ہے۔ چینی و نکتہ چینی کے مقابل ہوئے جہاں مظہر سلیم کا نام نظر آ رہا تھا مبارک باد۔ دیگر نئے پرانے دوست بھی بھرپور کیل کانٹوں سے لیس شرکت کا احساس دلا رہے تھے۔ سب سے پہلے جواری کی محفل میں پہنچے جہاں جواری نئے نئے داؤ آزمانے میں مصروفِ عمل ہے مگر دشمن بھی اپنے اپنے داؤ کی بساط بچھائے بیٹھے ہیں جس کی وجہ سے جواری کو بار بار پھنسنا اور نکلنا پڑ رہا ہے۔ مگر یہی دنیا ہے، یہی جینے کا انداز ہے۔ جو اس جال سے نکل گیا، وہ فاتح اور جو پھنس گیا وہ مفتوح۔ گرداب کی اس قسط میں کوئی نمایاں ایکشن نظر نہیں آیا۔ شاید یہ کلائمکس کی طرف اشارہ ہو۔ تیسری کہانی خوابوں کا سوداگر دلچسپ اور بامعنی ثابت ہوئی۔ چالباز میں عورت نے ایک تیر سے دو شکار کر لیے۔ شوہر کو اپنے راستے سے ہٹا دیا اور اپنے لیے دوسری شادی کا جواز بھی پیدا کر لیا۔ دنیا کی نظروں میں مظلوم بن گئی۔ واقعی سچ کہا ہے کسی نے کہ عورت تیرے کتنے روپ۔ خیالی گھوڑا اچھوتا خیال تھا اچھا رہا۔ ٹھگ بازی میں ٹھگ کو منہ کی کھانا پڑی اور انٹرپول ایجنٹ آسکر نے ٹھگ کو مات دے دی۔ بازی میں دل کے نہاں خانوں میں محفوظ محبت رکھنے والے سلویسٹر نے ڈبل لڑ کر اور جیت کر محبت کی لاج رکھ لی اور محبوبہ کو بچا لیا، نتیجتاً دولت کا حصول بھی آسان ہوا۔ جیسے کو تیسا میں رقیب سے بھی جان چھوٹی اور دشمن جاں شوہر سے بھی۔ سنگ بردار بھی اچھی ثابت ہوئی۔ قتلِ عام میں آخری صفحات کی پوری مہارت تھی جو پسند آئی۔ مغرب اور متعصب یہودیوں کا کردار بھی نظر آیا مگر ہر باطل کی طرح وہ باطل مٹ گیا اور رب کو سچا سمجھنے والے سرخرو ہوئے۔ سیاہ فروش میں بھی سبق ملا کہ برا راستہ اختیار کرنے والوں کو خمیازہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ جن کے دلوں میں کھوٹ نہ ہو، وہ بڑے سے بڑے امتحان سے کامیابی سے گزر جاتے ہیں جس میں ان کا بال بیکا نہیں ہوتا جیسے رضوان کو صحیح راستے پر چلنے سے نوید تو ملی۔"

چارسدہ سے عادل خان خٹک کی توجیہات "جاسوسی 18 اکتوبر کو ہر بار کی طرح بہت لیٹ ملا۔ ٹائٹل پر حسینہ کا آدھا چہرہ بہت بھلا لگا اور ساتھ میں ہمایوں سعید کی کرخت شکل۔ انکل جی کی بات بالکل سچ ہے کہ پاکستان کے محسنوں اور اکابرین کو نئی نسل بھولتی جا رہی ہے۔ بزمِ یاراں میں مظہر سلیم کو کرسیٔ صدارت پر مبارک باد۔ قدرت اللہ نیازی صاحب! کیا ہو گیا ہے، ہائی جمپ لگا کر کیوں جان کے دشمن بن گئے ہو۔ کبیر عباسی کا گونا گوں تبصرہ حیران کر گیا۔ شہزادہ کوہسار کا حال تو ٹائٹل ہی پر دگرگوں ہو گیا ہے۔ قیصر اعوان بھیا! آپ کا بہتان نامہ پسند آیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو جلد آزاد فضا میں لے آئے۔ وصال حیات کا تبصرہ جاندار تھا۔ وقار احمد سیال! میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں کہ للکار کی جگہ جواری لے ہی نہیں سکتی۔ اب صرف گرداب ہی بہترین قسط وار کہانی چل رہی ہے۔ سعدیہ بخاری آپ تو واقعی جاسوس ہی ہیں، پتا نہیں کس کس کی کس کس جگہ پر جاسوسی لیتی ہیں۔ انور یوسف زئی! 5 کو جاسوسی مل جائے، اسے تاخیر سے ملنا نہیں کہتے۔ اسلام آباد سے شکیل حسین کاظمی اپنے ہی تبصرے کو دیکھ کر خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے، واہ کیا بات ہے بھئی۔ انور مجذوب، محمد نعیم اور علی ڈنو! ویلکم جاسوسی کی محفل میں۔ بنوں والے بھیا کیا ہو گیا، بڑی فرماں برداری جتا رہے ہو۔ آپ کا کہنا بالکل بجا ہے کہ والدین کا فیصلہ باعثِ رحمت ہے لیکن آپ کے سارے خط میں مجھے لگا جیسے آپ کو قلبی سکون نہیں والدین کا کہا مان کر کزن سے منگنی تو کر لی ہے لیکن بے چین ہو، پتا نہیں کیوں۔ عمیر شہزاد بنگش اور شہزادہ تفسیر عباس بابر کا تبصرہ جاندار تھا۔ طاہرہ گلزار باجی! کیا حال ہیں آپ کے۔ ٹائم کی کمی اور رسالہ لیٹ ملنے پر کہانیوں پر واضح تبصرہ نہیں کر سکا، صرف کاشف زبیر کی سیاہ فروش پڑھی ہے جو بہت پسند آئی۔"

بھوانہ سے جعفر حسین کی گھن گرج "کراچی کے حالات پڑھ کر انکل نے سرورق پر ٹارگٹ کلر بنا ڈالا۔ ساتھ میں موجود محترمہ خاتون اسی حیرت کا اظہار کر رہی ہے جو ہم کر چکے ہیں۔ مظہر سلیم کو لفظوں کا مناسب چناؤ اور چاپلوسی کرسیٔ صدارت کا حق دار بنا گئی۔ سید شکیل حسین صاحب! خود ستائشی اور خود

شناسی کے درمیان معمولی فرق کو عقل کہتے ہیں۔ بشیر احمد صاحب آپ کی تھرلنگ اسٹوری پروموشن پکچرز اور والٹ ڈزنی والے مشترکہ فلم سازی کا سوچ رہے ہیں۔ عمیر شہزاد! ابھی جاسوسی کو بند نہ کروا دینا۔ مدیر صاحب تو بخوبی جانتے ہیں کہ سمندر میں رہ کر شارک اور مگرمچھوں سے بیر دانشمندی نہیں۔ مختصر تحریروں میں سب سے پہلے مہلک ہتھیار پڑھی۔ سو سنار کی ایک لوہار کی ترجمانی کرتی ہر دل عزیز مصنف کی پُراثر تحریر تھی۔ سلیم انور ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی چونکانے میں کامیاب رہے۔ حوصلوں کو مہمیز کرتی اور کچھ کر دینے پر اکساتی سخت جان نے متاثر کیا۔ انسانی نفسیات کی گتھیاں سلجھاتی، الجھاتی خیالی گھوڑا مصنف کی معیاری تحریر تھی۔ ٹھگ بازی نے بور کیا۔ بنجارے کی قربانی کو منفرد انداز میں بیان کرتی بازی، یہ عشق نہیں آساں کی عملی تفسیر تھی۔ جیسے کو تیسا اوسط درجے کی تحریر تھی۔ سنگ بردار بوجھل لمحات کے لیے اکسیر ثابت ہوئی۔ رسیلی گیند اور غلامی نئے رائٹرز کی اچھی کاوشیں تھیں۔ مشتاق احمد یوسفی کے بقول جس مصنف کی تحریریں مزاج کی تعریف پہ پورا اترتی ہوں، ان کو یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کر دینا چاہیے۔ اسی طرح صبا احمد جو تحریر لکھیں اس کو جاسوسی کے نصاب میں ضرور شامل کریں، ہو سکتا ہے محترم یوسفی صاحب کی طرح ہمارے قارئین نہ سوچتے ہوں۔ سلسلے وار تحریروں میں روایتی انداز میں تشکیل دیے گئے جواری کے پلاٹ کو احمد اقبال صاحب کا غیر روایتی انداز اور اسلوب منفرد پہچان دے رہا ہے۔ تحریر جتنی بھی سنجیدگی کی متقاضی کیوں نہ ہو، اقبال صاحب لبوں پہ مسکان سجانا جانتے ہیں۔ سلیم فاروقی صاحب کی طرح سرور اکرام صاحب بھی ایک ہی کہانی کو مختلف انداز، اسلوب اور پلاٹ کو آگے پیچھے کر کے فنی تحریر دینے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ مصنف کی واپسی ہوئی ہے یا پرانی تحریروں کو چھاپا جا رہا ہے۔" (آپ کو کہانی پڑھی ہوئی لگ رہی ہے؟)

رحیم یار خان سے اے کیو حسین کی جسارت "اکتوبر کا شمارہ خوب صورت حسینہ اور خطرناک ڈاکو کے ساتھ ناشتے کی میز پر 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق کی حسینہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ انکل نے اس بار تو کمال با کمال ہی کر دیا، جاسوسی کو دلربا حسینہ کے سنگ۔ میرے ہم شہر مظہر سلیم کو مبارک باد، بھئی کرسیٔ صدارت کی۔ بھئی آپ کی منظر کشی کے کیا کہنے ہیں، ہم تو قائل ہو گئے۔ کبیر عباسی! اف آپ کی پنجابی لیکن یہ بھی بتاتا چلوں کہ بے ہنگم چیزیں دیکھ کر ہماری آنکھ تو کیا دل بھی خراب ہو جاتا ہے بس اب زیادہ منہ نہ کھلوا دیجیے گا، کہیں بھابی یعنی آپ کی اہلیہ برا نہ مان جائیں۔ قیصر صاحب! آپ کا بہتان نامہ بہت خوب لگا۔ اللہ آپ اور آپ جیسے باقی بے گناہوں کی مدد فرمائے، آمین۔ احمد وصال! آپ کی وضاحت کمال کی ہے شاباش۔ سمعیہ آپ نے خوب تشریح کی کاظمی صاحب کے دل کی۔ خیریت تو ہے کہیں آپ بھی ان کی...؟ ہمایوں جی! آپ کو ڈبل ڈبل مبارکاں۔ عمیر صاحب! آپ نے خوب اِدھر اُدھر کی جھاڑیں۔ احمد راحیل! آپ نے اپنے دل کی کنک شکر ہے کہ کچھ تو واضح کر دی۔ وقار احمد، انجم فاروق، انور مجذوب، علی ظفر اور اصغر شیخ کو ویلکم ان دی شوگر، اوہ سوری چینی نکتہ چینی کی محفل میں۔ اب بات ہو جائے کچھ مسالے دار، ہری بھری، کھٹی اور میٹھی تصانیف کی جو جاسوسی کے ٹائٹل اور بڑی عید کے ساتھ اپنا رنگ اور خوشبو بکھیر رہی ہیں۔ سچ بتائیں تو شروعات جواری سے کی لیکن بدمزہ محسوس ہوئی تو گرداب میں ڈبکی لگائی۔ بہت خوب اشہر یار تے سلو مست ماحول تے مٹھے چول۔ سیاہ فروش بہت زیادہ زبردست کہانی تھی۔ مختصر کہانیوں میں غلامی اور سنگ بردار انتہائی زبردست ثابت ہوئیں۔ صبا احمد کی تصنیف نمکو اور املی معلوم ہوئی۔ چلیں خیر، ویسے ڈپلیکیٹ کی تو تو میں میں نے بہت مزہ دیا۔ چال باز میں خاتون کی چالبازی کام کر گئی اور ہمیں بھی حیرت میں ڈال دیا۔ مریم کے خان نے تو بھی تہلکہ مچا دیا۔ اب کچھ بات ہو جائے اپنی، کیا ہم جیسے کمزور لکھاری جاسوسی میں جگہ بنانے کے لیے کوشش کر سکتے ہیں۔ پلیز مشورہ دیں اور بتائیں کہ کیا میں اگر کوئی مختصر کہانی جاسوسی کے لحاظ سے لکھ کر بھیجوں تو کیا رسپانس ہو گا یا آپ صرف سینئر مصنفین کو ہی..... بائز کرتے ہیں۔" (جی نہیں۔ ہر نئے آنے والے کے لیے دروازے کھلے ہیں۔۔۔ معیار کے مطابق لکھیں اور مستفید ہوں)

محسن علی موسم کی بالاکوٹ سے بے تابیاں "4 تاریخ کو جاسوسی بک اسٹال پر اس طرح نمودار ہوا جیسے سید شکیل حسین کاظمی کی پڑوسن چھت پر۔ ٹائٹل گرل انگلی دانتوں میں دبائے یقیناً یہی سوچ رہی تھی کہ اتنا ہینڈسم بندہ پہلے اس کی نظر سے کیوں نہیں گزرا اور اس کے لیے وہ ذاکر صاحب کی مشکور بھی ہو گی۔ اوپر موجود ماہا ایمان کے وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت پر خون کے آنسو رو رہے تھے لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ زیرِ لب مسکرا کیوں رہے ہیں؟ ساتھ موجود انکل بدست آدمی ہمیں یقین دلا رہا تھا کہ...... چلیں چھوڑیں اس بات کو۔ چلتے ہیں اپنی پیاری محفل کی طرف جہاں بہت سے نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ رحیم یار خان سے مظہر سلیم کی حاضری کو قبولیت کی سند بخشتے ہوئے انکل نے کرسیٔ صدارت ہی عطا کر دی، مبارک ہو بھائی۔ احمد وصال آپ کی محبت کا شکریہ کہ آپ نے خاکسار کو اس قابل سمجھا اور ہمیں اپنے خط میں یاد رکھا۔ ماہا ایمان غائب ہی ہیں کیونکہ آخری اطلاعات کے مطابق ان کی سال خوردہ عینک گم ہو چکی ہے جس سے وہ جاسوسی پڑھ کر تبصرہ لکھتی تھیں اور اب وہ گم گشتہ متاع کی طرح اسے ڈھونڈ رہی ہیں کیونکہ اس طرح کی عینک مصر کے عجائب گھر سے بھی ملنا ممکن نہیں۔ (وہاں سے بھی آپ نے غائب کر دی ہے؟) کہانیوں کی ابتدا خلافِ دستور خوابوں کا سوداگر سے کی۔ کہانی ہمیں متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ کہانی کا ٹیمپو بہت ہی سست تھا، کہانی کا پلاٹ کمزور اور مکالمے بے جان تھے اس لیے یہ کہانی مکمل فلاپ رہی۔ مہلک ہتھیار دلچسپ رہی۔ نام ملنے سے کیا ہوتا، وہ کہتے ہیں کہ نام میں کیا رکھا ہے؟ سچ کہتے ہیں اصل بات تو نصیب کی ہوتی ہے۔ قادر نے تمام زیادتیوں کا بدلہ ایک جوتے سے لے لیا۔ چالباز عورت نے ایک گولی سے دو شکار کیے۔ جواری میں چودھری فریدالدین دوسرا رفیق ثابت ہو رہا ہے کہ اسے لڑکیوں پہ لڑکیاں مل رہی ہیں۔ ایک بوجھ سر سے اترا نہیں کہ دوسرا سوار ہو گیا اور آخر میں بیرونی مداخلت سے اس کی جان بچتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ یہ قسط گزشتہ اقساط سے بہتر رہی۔ گرداب میں اسامی بہت کرداروں کو لے آئیں اور کرداروں پر گرفت کمزور رہی اور آخر میں یقیناً خونی کھیل شروع ہونے کو ہے۔ کاشف زبیر، سیاہ فروش کی صورت میں ہمیشہ کی طرح جاندار کہانی لے کر آئے۔ زاہد نے جو گڑھا دوسروں کے لیے کھودا خود اسی میں گر گیا، رضوان کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ نکلا ورنہ ہاتھیوں کی لڑائی میں اس جیسے مسلے جاتے ہیں۔ قتلِ عام، اسلم اور ظہور اپنی اپنی منزل کو پہنچ گئے۔ فرق اتنا سا ہوا کہ اسلم کامیاب رہا اور ظہور ناکام۔ مختصر کہانیوں میں سنگ برادر اور رسیلی گیند دلچسپ رہیں۔"

ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے قیصر اعوان کی مصروفیت اور معذرت "ماہِ اکتوبر کا جاسوسی طویل انتظار کے بعد 7 اکتوبر کو تمام پابندیاں اور بندشیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

توڑتا، ہواؤں کا رخ موڑتا ہمارے ہاتھوں میں آپہنچا۔ سرورق کی چنداک دلربا ادا دکھاتی، دانتوں سے انگلی دباتی اور آنکھوں سے پریشان پریشان نظر آتی تھی۔ ساتھ میں بہرام ڈاکو کی شکل کے ڈاکو بھائی کو گرینڈ رنائپ گن پکڑے خاصے خوفناک موڈ میں پاکر یہی بہتر سمجھا کہ بھاگ نکلیں۔ بھاگتے بھاگتے خیر کرسی صدارت کی ذمے داری ناتواں کندھوں پر ڈال کر مظہر سلیم خاصے مضطرب نظر آئے، خیر بھیا مبارک ہو۔ راجا سلم اینڈ زینی اسسٹر بشریٰ اس محفل کی سینئر ہیں اور سینئر کا احترام کرنا چاہیے۔ آپ بھی کوشش کریں۔ کبیر عباسی واہ کیا قسمت پائی آپ نے جو بھابی نے آپ کو کترینہ کیف کے لیے چھوٹ دی مگر وہ بھی جانتی ہوں گی کہ... باقی آپ سمجھ دار ہیں۔ وقار احمد سیال ویلکم۔ برادر احمد وصال! آپ کے تبصرے کے کیا کہنے۔ بس اتنا کبوں گا چنگا لکھیا اے۔ افتخار حسین اعوان! ویلڈن۔ بہناں سعدیہ! آپ کی یہ جاسوسانہ طبیعت کچھ کچھ بری لگی، باقی تبصرہ اچھا تھا۔"

مری سے کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار کے اعتراضات "ٹائٹل گرل نے ہمیں دیکھتے ہی انگلی دانتوں میں دبالی۔ ساتھ کھڑے ڈاکو انکل نے اپنا چہرہ کرانے کی کوشش کی مگر موصوف آدھا چہرہ ہی کرا پائے کیونکہ ہم سے ہوتے تو سامنے آتے نا۔ لڑکی کا ہم سے اتنا التفات دیکھ کر اوپر موجود ماسک بھی خون کے آنسو رونے لگا۔ مجموعی طور پر کور پیج ہمیں دل وجان سے پسند آیا۔ فہرست کا قدرے منفرد ڈیزائن بھی ہم پر ایک خوش گوار تاثر چھوڑ گیا۔ احمد اقبال، جواری میں اس دفعہ ایک نیا ٹوئسٹ لے کر آئے اور ہمیں یہ ٹوئسٹ بہت اچھا لگا۔ جواری کی یہ پہلی قسط تھی جو ہمیں صحیح طرح متاثر کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اسما قادری کی گرداب کی یہ قسط قدرے ماٹھی رہی۔ صرف چاندنی کے پارٹ میں کچھ ایکشن اور سسنی محسوس ہوئی یا پھر اینڈ میں۔ باقی کوئی قابل ذکر واقعہ رونما نہ ہوا۔ گرداب اور جواری میں یہ بڑا فرق ہے کہ احمد اقبال کا انداز تحریر تو انتہائی دلچسپ ہے۔ تاہم یہ کہانی میں جزئیات کا اتنا خیال نہیں رکھتے جس کی وجہ سے کہانی میں اکثر جھول پیدا ہو جاتے ہیں جبکہ گرداب کی اسما قادری کا انداز تحریر تو اتنا زیادہ دلچسپ نہیں مگر وہ جزئیات کا بہت خیال رکھتی ہیں جس کی وجہ سے کہانی میں جھول پیدا نہیں ہوتے۔ سرورق کے رنگوں کی بات کریں تو سرورا کرام نے قتل عام کا تانا بانا تو بہت اچھا بنا۔ کہانی موجودہ حالات کی بھی بہترین عکاسی کر رہی تھی مگر نہ جانے کیوں اتنا مزہ نہیں آیا۔ کاشف زبیر کی سیاہ فروش نا قابل فراموش تحریر ثابت ہوئی۔ ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی نفسانفسی، دولت کی دوڑ اور خودغرضانہ سوچ کو بہت خوب صورتی سے پیش کیا گیا۔ اب بات ہو جائے چھیتی نکتہ چینی کی۔ اوار یہ سوچ کے نئے در وا کر گیا۔ مظہر سلیم کی جاسوسی میں پہلی انٹری اور کرسی صدارت۔ بھائی بڑے لکی ہو آپ۔ قدرت اللہ نیازی ہماری گریڈنگ کو سمجھنے کے لیے اچھے ہاضمے سے زیادہ سمجھ دانی کی ضرورت ہے جس سے آپ بدقسمتی سے محروم ہیں۔ قیصر اعوان خوش آمدید جی، آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔"

اوکاڑہ سے تفسیر عباس بابر کا محبت نامہ "یاقوت عنابی گلابی لبوں کے دلفریب فریم میں دوشیزۂ سرورق اپنی بھید بھری جھیل جیسی انگلوتی چشم بے تاب میں ان گنت خوابوں اور سپنوں کے تاج محل سجائے کسی کی منتظر ہے۔ آپ کی اثر انگیز گفتگو نے دعوت فکر کا خصوصی اہتمام کیا۔ تخت وطاؤس پر رحیم یار خان کے مظہر سلیم کا منفرد تبصرہ۔ عروج ناز! آپ نے بہت اچھا کیا جو اپنا نام ومقام عوام کے گوش گزار دیا ورنہ ہم تو یہی سوچتے رہ جاتے کہ کس قیامت کے ہیں یہ نام۔ خانیوال سے قدرت اللہ نیازی کی چکنی چپڑی باتیں اور گھاتیں بھی خوب رہیں۔ مری سے کبیر عباسی! یہ دودھ والا نکتہ آپ نے خوب اٹھایا لیکن وہ کیا ہے کہ جن کے تلوں میں تیل نہیں، وہ دودھ کیا دیں گے۔ سرگودھا سے قیصر اعوان کے دلچسپ تبصرے نے متاثر کیا۔ اٹک سے احمد وصال حیات! آپ جس گائے کو کلاسیکل غزلیں سنا رہے ہیں اسے سمجھاتے سمجھاتے ہمارے بالوں میں چاندی آگئی پر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اٹک سے سعدیہ بخاری! بڑھاپے اور موٹاپے نے آپ کی عقل بھی موٹی کر دی ہے۔ آپ کو ڈنگر ڈاکٹروں سے مستقل رابطے میں رہنا چاہیے ہاہاہا... اسلام آباد سے شکیل حسین کاظمی! ہم تہ دل سے بصد خلوص واحترام عظمت سادات کے قائل ہیں۔ بنوں سے حاجی محمد ہمایوں سعید! اللہ اس نئے سفر میں پے بہ پے آپ کو ان گنت خوشیاں عطا فرمائے لیکن کچھ لوگوں کو آپ نے چھت پر چڑھا کر نیچے سے سیڑھیاں ہی کھینچ لیں، ان کا کیا ہوگا جناب عالی۔ پشاور سے عمیر شہزاد! بوڑھے اکثر بچوں جیسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ آپ بابا کی اوٹ پٹانگیوں بونگیوں پر توجہ نہ دیں تو فائدہ ہے کیونکہ یہی قاعدہ ہے۔ ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل! سنا ہے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس رہا ہے۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ اتفاق میں برکت ہے یا پھر... ایک چپ سو سکھ۔ اوکاڑہ سے تصویر الحسن کو بلیک لسٹ میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پشاور سے طاہرہ گلزار ہمیشہ دیر کر دیتی ہیں یا پھر بقول اقبال کہ اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔ ابتدائی صفحات پر صبا احمد کی خوابوں کے سوداگر، انتہائی پراثر و دلچسپ طرز بیان مگر احمد اقبال کی یہ کوئی جانشین شاگرد یا عزیزہ ہیں تو انہوں نے گویا حق ادا کر دیا۔ شرربار شبنم فشاں قلم کے مالک برجستہ و بے ساختہ جملوں کی بروقت ادائیگی کے ماہر مشاق مصنف احمد اقبال کی بہترین ودلچسپ ترین سلسلے وار کہانی جواری نے اس ماہ سارا ہی میلا لوٹ لیا۔ اسما قادری کی گرداب اب انجام اختتام اور خاتمہ بالخیر کی متقاضی ہے۔"

ملک سعید چکوال سے لکھتے ہیں "چودھویں کی ناکامی کے بعد بھی کوشش کرنا جاسوسی کے لیے ہماری محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ قدر نہ کریں تو یہ الگ بات ہے۔ کرسی صدارت صنف وجاہت کے حصے میں آئی جس کے لیے مظہر سلیم کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اپنا محبت نامہ نہ پاکر ہمایوں سعید کو قصوروار ٹھہرانا بے بنیاد لگا کیونکہ اصل قصوروار تو کوئی اور ہے نا۔ خوابوں کا سوداگر میں آخرکار لال حسین کو اس کی محبت اور خواب کی تعبیر مل ہی گئی۔ اس کے علاوہ دوسری تمام کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ اب اس سے زیادہ مختصر تبصرہ تو لکھنے سے رہا۔ سو پلیز ضرور شائع کیجیے گا۔" (ضرور)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

فاطمہ حرا جمال، دین والی۔ امین مراد انصاری، نیو کراچی۔ محمد اسحاق انجم، کنگن پور ضلع قصور۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی، لاہور۔ قیصر اقبال کچھ اینڈ کمپنی، ضلع بھکر۔ مظہر سلیم، رحیم یار خان۔ آغا فرید احمد خان، سکھر۔ احمد وصال حیات، اٹک۔ رانا منشی حماد فرہاد، ساہیوال۔ بلقیس خان، واہ کینٹ۔ اشرف نوید، ایبٹ آباد

WWW.PAKSOCIETY.COM

آتشِ زیرپا

محی الدین نواب

وقت کے اسٹیج پر دوڑتے بھاگتے کردار... جو رشتوں کی ڈور میں بری طرح جکڑے ہوئے تھے

عشق و جنوں کا سودا سر میں سما جائے تو پھر انسان کو ہر خوف... ہر انجام سے ماورا کر دیتا ہے... شجاعت شاید فطرت کی دین ہے لیکن کبھی کبھی حالات بھی اسے جنم دیتے ہیں... اگر ایسا ہو تو پھر پائوں کا چکر پھیلتا ہی چلا جاتا ہے... وہ ایک سادہ مزاج نوجوان تھا... آتش عشق نے لہو کو گرما دیا اور وہ آگ کے اس دریا کو ہر صورت عبور کرنا چاہتا تھا مگر دنیاداری جذبوں کی سچائی کے بجائے خود ساختہ رویوں کی کسوٹی پر جانچنے پر بضد تھی... وہ منزل کی جستجو میں ہر شرط پر سرِ تسلیم خم کیے جا رہا تھا لیکن حالات کچھ اور رخ اختیار کرتے جا رہے تھے... وہ جسے منزلِ عشق تک پہنچنے کی ایک سیڑھی سمجھا... وہ بگولے میں پھنسے... شاخ سے ٹوٹے پتے کا سفر ثابت ہوا... بھنور در بھنور... عذاب کنی کے امتحان سے دوچار... خاردار راستے اس کا مقدر بنتے چلے گئے...

محبت... عقیدے اور جرم کے ٹکراؤ سے جنم لینے والی جوش وولولے سے ہم آہنگ داستانِ خون چکاں

راجستھان کے اس ریگستانی علاقے میں وہی ایک تارکول سے بنی ہوئی پختہ سڑک تھی۔ وہ اس سڑک پر رات کی تاریکی میں موٹر سائیکل دوڑا رہا تھا۔ زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے جب آرام دہ بستر چھوڑ کر کانٹوں پر دوڑنا پڑتا ہے۔ بہت کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کر گزرنے کے راستوں پر چلنا ہی پڑتا ہے۔

ہیڈ لائٹ کی روشنی اندھیرے کو تیزی سے چیرتی ہوئی جا رہی تھی۔ تیز رفتاری سمجھا رہی تھی کہ موٹر سائیکل کو ایک بھی ٹھوکر لگی تو اس کی ہڈیاں پسلیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں گی۔ لیکن موت سے شرط لگا کر خندق پھلانگنے والے نہیں ڈرتے کہ زندگی ہار جائیں گے۔ وہ بھی ایسا ہی تھا۔ بے خوف و خطر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

اس کے شانے سے ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ اس تھیلے میں بیس کلو ہیروئن تھی۔ جیسلمیر پہنچ کر ایک بہت بڑے ڈیلر سے سودا ہو سکتا تھا۔ واپسی میں وہ تھیلا تیس ہزار روپے سے بھرنے والا تھا۔

زندگی انسان کو آخری سانسوں تک نوچ کر کھاتی رہتی ہے۔ زندگی کا پیٹ مسرتوں سے بھرنے کے لیے خطرات سے کھیلتے رہنا پڑتا ہے۔ تب ہی عمر ہنستے کھیلتے آگے بڑھتی رہتی ہے۔

اس کا نام عمر دراز خان تھا۔ یہ نام نہ ہوتا تب بھی آخری دم تک عمر کو دراز رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اس عمر درازی میں جو چاہو وہ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ جو

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہ چاہو وہ جبراً کرنا پڑتا ہے۔

وہ کھری ٹاؤن سے جیسلمیر کی طرف جا رہا تھا۔ کھری ٹاؤن کو پاکستانی سرحد کے قریب اسمگلروں کی جنت کہا جاتا ہے۔ وہاں سے چاندی، شراب، سپاری اور کتھا وغیرہ پاکستانی اسمگلر لے جاتے ہیں اور بھارتی اسمگلران سے سونا اور ہیروئن حاصل کرتے ہیں۔

وہ دادا بھوانی شنکر کا اسٹور کیپر تھا۔ اسٹور میں سرحد سے جتنا مال آتا تھا پھر ممبئی کی بندرگاہ تک جاتا تھا، وہ ان تمام مال کا حساب لکھتا تھا۔ بھوانی شنکر کو ہر شام بتاتا تھا کہ کتنا مال آرہا ہے اور کتنا ڈیلرز آ کر لے جا رہے ہیں۔

مال زیادہ تر جیسلمیر کے خریدار لے جایا کرتے تھے۔ عمر دراز ان میں سے ایک ڈیلر کو اپنی بیس کلو ہیروئن فروخت کرنے جا رہا تھا۔ جیسلمیر کے قریب پہنچتے وقت اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اپنی دلربا، اپنی جان سلمٰی گوتم کے قریب پہنچ رہا ہے۔

سلمٰی اپنے میکے میں تھی۔ ریگستان کی گرم رات میں ٹھنڈی سانس بھر رہی تھی۔ اسے سہاگ کی سیج پر عمر دراز کے ساتھ ہونا چاہیے تھا لیکن دشمنوں کی سازشوں کے باعث وہ میکے میں رہ گئی تھی۔ تنہا بستر پر چاروں شانے چت پڑی آسمان کے تارے گن رہی تھی۔

سازش اس لیے تھی کہ سلمٰی ہندو بھی تھی اور مسلمان بھی۔ اس کی ماں مسلمان تھی اور باپ گوتم بھردواج ہندو تھا۔ ہندوستان میں ایسی شادیاں ہوتی ہیں کہ لڑکی مسلمان، لڑکا ہندو یا لڑکا مسلمان اور لڑکی ہندو۔ اس کی مثال فلمی دنیا سے دی جاسکتی ہے۔

شاہ رُخ خان مسلمان ہے اور اس کی شریک حیات گوری ہندو ہے۔ معروف ہدایت کار اور فلمساز مہیش بھٹ کی ماں مسلمان ہے اور باپ ہندو ہے۔ ایسے مخلوط مذہبی گھرانوں میں ہندو بیوی کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ مسلمان شوہر سے ہونے والے بچوں کا رشتہ ہندو گھرانوں میں ہو جائے۔

اسی طرح سلمٰی گوتم کے ہندو گھرانے والے نہیں چاہتے تھے کہ وہ عمر دراز سے محبت کرے اور اس کی شریک حیات بن جائے۔ برسوں پہلے سیف علی خان کی والدہ شرمیلا ٹیگور نے نواب پٹوڈی سے شادی کی تھی تو ہندوؤں نے مخالفت کی انتہا کر دی تھی۔

یہ تو مشہور و معروف فلمی ہستیاں ہیں جن کے رومانی اور ازدواجی معاملات منظر عام پر آجاتے ہیں۔ ورنہ عام مسلمان، ہندو لڑکیوں سے شادیاں کر کے عمر دراز کی طرح آزمائشوں سے گزرتے رہتے ہیں۔

اس نے سلمٰی کے ساتھ چھپ کر کورٹ میرج کی لیکن رجسٹرار آفس سے باہر آتے ہی پکڑے گئے۔ سلمٰی کے بھائی آصف گوتم نے کہا۔ ”تم نے کیا اچھا کیا ہے اور کیا برا۔۔۔ اس کا فیصلہ ہمارے خاندان کے بزرگ کریں گے۔ ابھی گھر چلو۔“

سلمٰی کے چاچا سنیل بھردواج نے کہا۔ ”تم نے انڈین لاء کے مطابق شادی کی ہے۔ ہم قانون کے خلاف کچھ نہیں بولیں گے۔ لیکن عمر دراز کو ہمارے دھرم کے مطابق تمہارے ساتھ سات پھیرے لینے ہوں گے اور ہماری جو رسمیں ہیں وہ اسے ادا کرنی ہوں گی۔“

عمر دراز نے کہا۔ ”میں جھگڑا کرنا نہیں چاہتا۔ سلمٰی کو اپنے گھر لے جانے کے لیے آپ کی شرائط پوری کروں گا۔“

سنیل بھردواج نے کہا۔ ”ہماری ایک بھی رسم ادا کرنے میں ناکام رہو گے تو ہم اپنی بیٹی کو تمہارے گھر جانے نہیں دیں گے۔ پچاس ہزار روپے جرمانہ ادا کرو گے، تب اسے لے جاسکو گے۔“

وہ بولا۔ ”یہ جرمانے والی بات بکواس ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں ایسی کوئی رسم نہیں ہوتی جسے ادا نہ کرنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے یا دلہن کو سسرال جانے سے روک دیا جاتا ہے۔“

”بے شک ایسی کوئی رسم نہیں ہے مگر تمہارے لیے ہے۔ ہم اپنے گھر کی چیز آسانی سے لے جانے نہیں دیں گے۔ ہماری شرطیں نہیں مانو گے تو بات اتنی بڑھے گی کہ ہندو مسلم فساد برپا ہو جائے گا۔“

اس نے پریشان ہو کر سلمٰی کو دیکھا پھر کہا۔ ”میں تمہاری رسمیں ادا کروں گا لیکن پچاس ہزار بہت ہیں۔“

”چلو پچاس نہ سہی، چالیس تو دینے ہوں گے۔“

”میں غریب آدمی ہوں۔ بیس ہزار سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔“

”کیا ہماری بیٹی کھلونا ہے کہ بیس ہزار میں بیچ دیں؟“

”کیا اس کھلونے کی قیمت وہ ہے جو آپ لگا رہے ہیں۔ یعنی اسے چالیس ہزار میں بیچ رہے ہیں؟“

وہ گڑبڑا گیا پھر غصے سے بولا۔ ”بکواس مت کرو۔ ہماری کوئی رسم ادا نہ کرنے کی صورت میں تمہیں تیس ہزار دینے ہوں گے۔ بس یہ آخری بات ہے۔“

”آپ یہ اعتراف کریں کہ سلمٰی کے ذریعے مال کما رہے ہیں۔ دنیا والوں کو دکھانے کے لیے خواہ مخواہ رسمیں ادا

کی جائیں گی۔“

”تم کچھ بھی سمجھ لو۔ دنیا والوں کو دکھانے کے لیے ہی سہی۔ تم ہماری رسمیں ادا کرو گے۔ ناکام ہو گے تو تیس۔۔۔“

عمر نے بات کاٹ کر کہا۔ ”تیس نہیں پچیس ہزار۔ میں اس سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔“

وہ پچیس میں راضی ہو گئے۔ اس نے ان کے دھرم کے مطابق سلمٰی کے ساتھ اگنی کے اطراف سات پھیرے لیے پھر طرح طرح کی رسمیں ادا کیں۔ لیکن ایک رسم کی ادائیگی میں اٹک گیا۔

رسم یہ تھی کہ دولہا اور دلہن کو روبرو بٹھایا گیا اور کہا گیا کہ وہ اپنی دلہن کے ہاتھ سے چوڑیاں اُتارے پھر وہ چوڑیاں اسے پہنائے۔ شرط یہ تھی کہ اس دوران ایک بھی چوڑی نہ ٹوٹے۔

بظاہر یہ آسان سی شرط تھی۔ لیکن کانچ کی چوڑیاں پہنتے وقت عورتوں سے بھی ایک آدھ ٹوٹ جایا کرتی ہیں پھر بھلا مرد سے کیسے نہ ٹوٹتیں۔ عمر دراز نے بہت سنبھل کر چوڑیاں اُتاریں لیکن پہناتے وقت ایک ٹوٹ گئی۔

وہ شرط ہار گیا۔ انہوں نے دلہن کو روک لیا اور کہا۔ ”پہلے جرمانہ ادا کرو پھر اسے لے جاؤ۔“

وہاں انصاف پسند لوگ بھی تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”یہ مناسب نہیں ہے۔ سلمٰی کو عمر دراز کے ساتھ جانے دو۔ یہ جرمانے کی رقم آسان قسطوں میں ادا کرتا رہے گا۔“

سنیل بھردواج نے کہا۔ ”جو بات طے ہو چکی ہے، اس کے مطابق یہ پہلے رقم ادا کرے گا۔“

سنیل کے بیٹے جے راج بھردواج نے کہا۔ ”سلمٰی ہمارے گھر میں رہے گی۔ اگر یہ ایک ہفتے کے اندر رقم ادا نہیں کرے گا تو میں سلمٰی سے شادی کروں گا۔ پھر کوئی مائی کا لال مجھے شادی کرنے سے روک نہیں سکے گا۔“

عمر دراز نے کہا۔ ”میں ہر حال میں رقم ادا کروں گا۔ تو سلمٰی کو دلہن بنانے کا خیال اپنی کھوپڑی سے نکال دے۔ اسے کبھی بھول سے بھی ہاتھ لگائے گا تو ہاتھ توڑ کر پھینک دوں گا۔“

اس بات پر جے راج نے غصے سے اس پر حملہ کیا لیکن کئی لوگ بیچ میں آگئے۔ عمر نے کہا۔ ”میں جب تک رقم ادا نہ کروں، تب تک سلمٰی ان لوگوں کے ساتھ میکے میں نہیں رہے گی۔ اسے وہاب چاچا کے گھر میں رہنا چاہیے۔“

علاقے کے چیئرمین نے کہا۔ ”انصاف کا تقاضا یہی ہے۔ میں ہندو ہو کر کہتا ہوں کہ سلمٰی کو بیاہ کے بعد ہندو گھرانے میں نہیں رہنا چاہیے۔ اسے وہاب مرزا کے گھر پہنچا دیا جائے۔“

چیئرمین کا فیصلہ تسلیم کیا گیا۔ سلمٰی اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ وہاب مرزا کے گھر آگئی۔ اب یہ عمر دراز کی جواں مردی پر تھا کہ وہ کتنی جلدی رقم ادا کر کے اپنی امانت وہاں سے لے جاسکے گا۔

وہ دادا بھوانی شنکر کا ملازم تھا۔ اسے ماہانہ دس ہزار روپے ملتے تھے۔ اس نے شادی کے لیے بیس ہزار روپے بچائے تھے اور وہ سب سلمٰی کو پانے کی مسرتوں میں لٹا دیے تھے۔ اب خالی ہاتھ رہ گیا تھا۔

اس نے بھوانی شنکر کو اپنا دکھڑا سنایا پھر کہا۔ ”مجھے پچیس ہزار دو۔ میں ہر مہینے پانچ ہزار ادا کروں گا۔“

اس نے کہا۔ ”تو گھر والی کو لائے گا تو اس کے ناز نخرے میں اخراجات اور بڑھیں گے، کم نہیں ہوں گے۔۔۔ پھر بتا کہ میرا قرضہ کیسے ادا کرے گا؟“

پچیس ہزار ایک غریب ملازم کے لیے بہت ہوتے ہیں۔ لیکن کسی عاشق دیوانے کے لیے کچھ نہیں ہوتے۔ بھوانی شنکر نے اسے صرف پانچ ہزار قرض کے طور پر دیے تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔

وہ گھر آ کر اپنی خالی سیج پر گر پڑا۔ اس نے بڑے ارمانوں سے وہ سیج سجائی تھی۔ اس وقت سلمٰی کو پھولوں کے اس بستر پر ہونا تھا اور وہ نہیں تھی۔ اس کی عدم موجودگی اسے تڑپانے لگی۔

تب اس نے فیصلہ کیا کہ اتنی بڑی رقم شرافت سے نہیں ملے گی۔ چوری کرنی ہی ہوگی۔ وہ جانتا تھا کہ دادا کے اسٹور میں مال کی نئی کھیپ آئی ہے۔ لاکھوں روپے کی ہیروئن ہے۔ اگر وہ پچیس تیس ہزار کا مال چرا لے گا تو دادا کو پتا نہیں چلے گا۔

حساب کتاب تو اسی کے پاس رہتا تھا۔ وہ کھاتے میں ہیرا پھیری کرتا رہتا تو مالک کو کبھی پتا نہ چلتا۔ چوری بڑی آسانی سے ہو سکتی تھی۔ پکڑے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔

پھر بھی اس نے بہت عرصے بعد نماز پڑھی اور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ چوری کرتا ہوا پکڑا نہ جائے اور اپنی سلمٰی کو عزت و آبرو سے گھر لے آئے۔

یہ آدمی کیا ہوتا ہے؟ مجرمانہ دھندے میں بھی خدا کی مدد مانگتا ہے۔ وہ دیکھتا آرہا تھا کہ لاکھوں کمانے والے آقاؤں کو پتا نہیں کیسے آسمانی مدد ملتی رہتی ہے؟ اسے بھی مل سکتی ہے۔ اس نے کئی بار دادا کی بیٹھک میں جیسلمیر سے آنے والے ڈیلروں کو دیکھا تھا۔ ان کے نام اور پتے بھی جانتا تھا۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

مال کے مارکیٹ ریٹ سے بھی واقف تھا۔ جیسلمیر پہنچ کر اسے تیس ہزار روپے مل سکتے تھے۔

وہ اندھا دھند گاڑی چلاتا ہوا دوسری صبح جیسلمیر پہنچ گیا۔ تاریخی قلعے کی فصیل کے باہر شہر آباد تھا۔ وہاں جین مندر کے قریب مہاراج وکرم سنگھ ڈیلر کا اڈا تھا۔ صبح کے وقت اس کے کارندے سو رہے تھے۔ دو چار جاگ رہے تھے۔ اس نے ایک کارندے سے کہا۔ ”میں مہاراج سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس سفید پاؤڈر ہے۔“

اس نے اندر آکر مہاراج کے دستِ راست چمپت راؤ سے کہا۔ ”باہر ایک آدمی سفیدا لے کر آیا ہے۔ مہاراج سے ملنے کو بولتا ہے۔“

چمپت راؤ نے کہا۔ ”اسے اندر بھیج دو۔“

وہ کارندہ باہر چلا گیا۔ اس وقت چمپت راؤ کے سامنے میز پر نوٹوں کی موٹی موٹی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں ایک بیگ میں رکھ رہا تھا۔ ابھی بینک جا کر مہاراج کے اکاؤنٹ میں وہ رقم جمع کرنے والا تھا۔

عمر دراز نے وہاں آکر ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا پھر اپنا تھیلا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تیس کلو سفید پاؤڈر ہے اور بالکل خالص ہے۔“

چمپت راؤ نے وہ تھیلا ایک ملازم کو دیتے ہوئے کہا۔ ”نارنگ سے بولو، اسے ٹیسٹ کرے۔ ابھی بتائے مال کیسا ہے؟“

ملازم مال لے کر چلا گیا۔ چمپت راؤ نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”مال کہاں سے لائے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”بھائی! آپ آم کھائیں، پیڑ نہ گنیں۔“

”ہوں۔“ اس نے غرانے کے انداز میں کہا۔ ”مجھے لگتا ہے، میں نے تجھے شنکر دادا کی بیٹھک میں دیکھا ہے۔ تو کھری ٹاؤن سے آیا ہے نا؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں... بس آگے اور کچھ نہ پوچھیں۔“

اُدھر نارنگ نے سفید پاؤڈر کو چکھنے کے بعد فون پر کہا۔ ”راؤ جی! مال خالص ہے اور تیس کلو سے کچھ زیادہ ہے۔“

چمپت راؤ نے فون بند کر کے عمر سے پوچھا۔ ”کیا سوچ کر آئے ہو؟ کتنی رقم ملے گی؟“

وہ بولا۔ ”یہ پورے بتیس ہزار کا مال ہے۔ میں تیس ہزار لوں گا۔“

اس نے فون پر نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ”مہاراج کی جے ہو۔ شما چاہتا ہوں۔ اتنے سویرے کشٹ دے رہا ہوں۔ ایک آدمی تیس کلو خالص سفیدا لایا ہے اور یہ دادا بھوانی شنکر کا مال ہے۔ اس آدمی کی گھبراہٹ بتا رہی ہے کہ اسے چرا کر لایا ہے۔ کیا ہم اسے خرید لیں؟“

عمر دراز نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ میں چرا کر لایا ہوں؟ تمہیں مال لینا ہے تو لو، نہیں تو واپس کر دو۔“

چمپت راؤ نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”مال تو گیا۔ تو بھی جائے گا۔ شنکر دادا سے ہماری لاکھوں روپے کی ڈیلنگ ہوتی ہے۔ تو تیس کلو چرا کر لائے گا تو کیا ہم دادا کا بھروسا توڑ دیں گے؟“

عمر کا دماغ گرم ہو گیا۔ وہ پکڑا جاتا تو شنکر دادا اسے اُلٹا لٹکا دیتا۔ پھر اسے قسطوں میں تڑپا تڑپا کر مارتا رہتا۔ اب تو جان سے جانا تھا یا اپنی سلمٰی کے لیے کچھ کر گزرنا تھا۔ اس نے فوراً ہی لباس کے اندر سے ریوالور نکال کر اسے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتا تھا... چور، بدمعاشوں اور اسمگلروں سے لین دین کرنے جا رہا ہوں۔ اس لیے یہ چھوٹا سا کھلونا کھیلنے کے لیے لے آیا ہوں۔“

چمپت راؤ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک معمولی آدمی ہتھیار لے کر آیا ہوگا۔ ورنہ اس کے پاس بھی ایک گن میز کی دراز میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ پہلے ہی اسے نکال کر ہاتھ میں رکھ لیتا۔ پھر بھی وہ اسے باتوں میں اُلجھا کر دراز کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

عمر نے ٹریگر کو دبایا۔ گولی اس کے بازو میں لگی۔ وہ تکلیف سے چلایا۔ ”کتے! پچھتائے گا۔ یہاں سے زندہ نہیں جا سکے گا۔“

عمر نے نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ اُٹھا کر کہا۔ ”میں نکالنے آیا تھا، مجھے پہاڑ مل رہا ہے۔ آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

اس نے دوسری گولی اس کی ران میں پیوست کی تاکہ وہ پیچھا نہ کرے۔ پھر دراز کھول کر اس کی گن نکال کر کہا۔ ”میں نہیں جانتا اپنی سلمٰی تک زندہ پہنچ سکوں گا یا نہیں؟ لیکن تم سے چھینی ہوئی دولت اور ہتھیار کے ذریعے راستے میں آنے والوں کو جہنم میں ضرور پہنچاؤں گا۔“

وہ وہاں سے بھاگتا ہوا باہر آیا۔ دو بار گولیاں چلنے کی آواز نے کارندوں کو چونکا دیا تھا۔ وہاں صرف چار افراد ہی تھے۔ ان میں سے دو نہتے تھے۔ ایک زخمی ہو چکا تھا۔ دوسرا دوڑتا ہوا اس کی طرف گولیاں چلاتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ ایک دیوار کی آڑ میں تھا۔ دوڑنے والا ذرا لڑکھڑایا تو اس کے سنبھلنے تک عمر نے اپنے ریوالور کی تیسری گولی سے اسے اُڑا دیا۔

پھر وہ دوڑتا ہوا اپنی موٹر سائیکل پر آ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں اور کتنے مسلح دشمن ہیں؟ اگر نہیں بھی تھے تو اب فون کے ذریعے انہیں اطلاع مل رہی ہوگی۔ وہ ادھر آ رہے ہوں گے اور دنیا کے آخری سرے تک اس کا تعاقب کرنے والے ہوں گے۔ فی الحال وہ لاکھوں روپے سے بھرا ہوا بیگ لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو رہا تھا۔

☆☆☆

مہاراج نے بھوانی شنکر کو فون پر بتایا کہ ایک آدمی اس کا مال چوری کر کے وہاں بیچنے لایا تھا۔ جب اسے پکڑنے کی کوشش کی گئی تو اس نے چمپت راؤ کو زخمی کر دیا اور ایک کارندے کو ہلاک کر کے فرار ہو گیا۔

بھوانی شنکر حیران ہوا کہ ایسی جرأت کس نے کی ہے اس نے مال کا حساب رکھنے والے عمر دراز کو طلب کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ڈیوٹی پر نہیں آیا ہے۔ اپنے گھر میں بھی نہیں ہے۔ پچھلی رات سے موٹر سائیکل پر کہیں گیا ہے اور اب تک واپس نہیں آیا ہے۔

مہاراج کے کارندوں نے بتایا کہ وہ واردات کرنے والا موٹر سائیکل پر آیا تھا۔ ایک کارندے نے کہا۔ ”اس کی موٹر سائیکل کے سامنے لکھا ہوا تھا کہ سلمٰی میری جان ہے۔“

بھوانی شنکر فون پر یہ سنتے ہی اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ غصے سے گرجنے لگا۔ عمر کو گالیاں دینے لگا۔ اس کے آدمی آندھی طوفان کی طرح اس کے گھر پہنچ گئے۔ ایک بوڑھی ماں اور آٹھ برس کی بہن کو باہر نکال کر ان کی پٹائی کرنے لگے۔ پھر انہوں نے گھر کو آگ لگا دی اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ وہ شام تک واپس نہ آیا تو اس کی ماں اور بہن کو ننگا کر کے بازار میں گھمایا جائے گا۔

عمر دراز سمجھ رہا تھا کہ شنکر دادا اس کی ماں اور بہن کے ساتھ انتہائی شرمناک سلوک کرے گا۔ ایک غیرت مند بھائی اور بیٹے کو ان کی سلامتی کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ لیکن کیا کرنا چاہیے؟

بھوانی شنکر اس سرحدی علاقے کا غیر قانونی حکمران تھا۔ قانون کے محافظوں کو اپنی مٹھی میں رکھتا تھا۔ عمر جیسے ملازم کو مٹی کے کیڑے کی طرح جوتے تلے مسلنے والا تھا۔

اگر وہ اس کے مال کی دگنی قیمت ادا کرتا۔ اس سے معافی مانگتا، تب بھی دادا کا دماغ گرم رہتا۔ وہ اعتماد کو دھوکا دینے والے ملازم کو کبھی معاف نہ کرتا۔ اسے گولی مارنے کے بعد ہی اس کا دماغ ٹھنڈا ہو سکتا تھا۔

وہ جیسلمیر سے دو سو کلومیٹر دور ایک تاریخی کھنڈر میں آ کر

بیوی (شوہر سے) ”دیکھیے میں سرخ ساڑی میں کیسی لگ رہی ہوں؟“

شوہر نے بیوی کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا بولا۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے کوئلے کی کان میں آگ لگ گئی ہو۔“

عائذ مشتاق، صفیہ مختار۔ ملتان

بیٹھ گیا تھا۔ وہ ہائی وے سے بہت دور تھا۔ اس کا تعاقب کرنے والے ادھر نہیں آ سکتے تھے۔ وہ آرام سے بیٹھ کر سوچنے لگا کہ دادا کے گرم دماغ کو کیسے ٹھنڈا کر سکتا ہے؟

بھوانی شنکر کے ایک ملازم رام اوتار سے عمر دراز کی اچھی دوستی تھی۔ پچھلے برس اس کی پتنی بہت بیمار تھی۔ ماں بننے والی تھی۔ رام اوتار نے دادا سے گڑگڑا کر کچھ رقم قرض کے طور پر مانگی تھی اور دادا نے صرف ایک ہزار روپے دیے تھے۔ ایسی بھیک سے پوری طرح بیوی کا علاج نہ ہو سکا۔ زچگی کے وقت وہ جانبر نہ ہو سکی۔ بچے کے ساتھ اس دنیا سے اُٹھ گئی۔

تب سے رام اوتار زیرِ لب دادا کو گالیاں دیتا رہتا تھا۔ وہ چیونٹی تھا، ہاتھی کو مار نہیں سکتا تھا۔ چونکہ غریب اور لاچار تھا، لہٰذا اسی کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ عمر کا ذہن سازشی ہو گیا تھا۔ وہ رام اوتار کو اپنا ہتھیار بنانے کے لیے سوچ رہا تھا۔

ایک اور ہتھیار تھا بلکہ تھا نہیں، تھی اور وہ بھوانی شنکر کی بیٹی کماری کلپنا تھی۔ شادی کو پانچ برس ہو رہے تھے اور وہ اب تک ماں نہیں بن پائی تھی۔ وہ باپ کی طرح مغرور تھی اور شوہر کو ٹھوکروں میں رکھتی تھی۔ ماں نہ بننے کے باعث کچھ سنجیدہ اور نرم مزاج ہوتی جا رہی تھی۔

ایک بار دادا نے بیٹی کے لیے کچھ تحفے خریدے اور عمر دراز کو حکم دیا کہ وہ تحفے اس کے سسرال پہنچائے۔ سسرال جے پور میں تھا۔ وہ تحفے لے کر وہاں پہنچا تو کماری کلپنا نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ایک ملازم کو اتنا مان دیا جائے گا۔

اس نے اتنا مان دیا کہ تنہائی میں اپنے ذاتی معاملات پر بولنے لگی۔ وہ اس کے روبرو ایک صوفے پر بیٹھ کر بولی۔ ”تمہیں پتا ہے، میری شادی کو یہ پانچواں برس ہے؟“

وہ بولا۔ ”ہاں، شاید اتنا عرصہ گزر چکا ہے۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”بچپن ہی سے میرے اندر ممتا رچی بسی ہوئی ہے۔ آج میں اپنے بچے کو پالنے... کے قابل ہوں مگر بچہ نہیں ہے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ہاں۔ یہ بہت افسوس کی بات ہے۔"

"میرے تمام رشتے دار بھی افسوس کرتے ہیں لیکن کسی کے افسوس کرنے سے میں ماں نہیں بن سکوں گی۔ یہاں سے لندن تک کئی ڈاکٹر میرا معائنہ کر چکے ہیں۔ سب ہی کی میڈیکل رپورٹ یہی ہے کہ میں بانجھ نہیں ہوں، ماں بن سکتی ہوں۔ البتہ میرا شوہر بانجھ ہے۔ اسی لیے میری منو کامنا پوری نہیں ہو رہی ہے۔"

"یہ تو خدا کو جب منظور ہوگا' تب ہی آپ کی دلی آرزو پوری ہوگی۔"

"میں مانتی ہوں مگر انسان کو بھی اپنی طرف سے کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے سمجھ لیا ہے' صرف دوا اور علاج سے کچھ نہیں ہوگا۔ اسی لیے تین برس پہلے ایک ہینڈسم سے دوستی کی۔ کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اسے ٹھکرا کر دوسرے سے دوستی کی۔ ایک برس گزرنے کے بعد اسے بھی بھگا دیا۔"

وہ بے جھجک ایسی باتیں کر رہی تھی۔ عمر حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی۔ "حیران کیوں ہو رہے ہو؟ کیا مرد اولاد پیدا کرنے کے لیے دوسری تیسری شادیاں نہیں کرتا ہے۔ گھر سے باہر کسی کو رکھیل نہیں بناتا ہے؟"

عمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ "میں عورت ہوں۔ ایک کو چھوڑ کر دوسرے سے پھر تیسرے سے شادیاں کرتی رہوں گی تو یہی کہا جائے گا کہ میں عیاش ہوں۔ مرد داشتائیں رکھ سکتا ہے تو میں بھی رکھ سکتی ہوں۔ میں نے دو رکھے پھر بھگا دیے کسی کو پتا نہ چلا۔ میرے پتی دیو کو معلوم ہے مگر وہ جانتا ہے کہ مجھے بدچلنی کا الزام دے گا تو میرے پاپا اسے گولی مار دیں گے۔"

پھر اس نے عمر سے پوچھا۔ "تمہیں یہ سن کر برا لگ رہا ہوگا مگر انصاف سے بولو' کیا میں عیاش اور بدچلن ہوں یا ایک ماں بننے کے لیے ایسا کر رہی ہوں؟"

وہ بولا۔ "ہاں، آپ مجبور ہو کر ایسا کر رہی ہیں۔ ماں بننے کے بعد ایسا نہیں کریں گی۔"

"میں ماں جگدمبے کی قسم کھا چکی ہوں کہ ماں بننے کے بعد کسی بھی پرائے مرد کا منہ نہیں دیکھوں گی۔"

اس کے بیان کے مطابق وہ حیا والی تھی لیکن عارضی طور پر بے حیا بن گئی تھی۔ عمر کو اس کی اچھائی برائی سے کچھ نہیں لینا تھا۔ وہ اس کے خطرناک آقا کی بیٹی تھی اس لیے چپ چاپ اس کی روداد سن رہا تھا۔

پھر وہ اچانک ہی گھبرا گیا۔ کلپنا اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے صوفے پر آ گئی۔ اس سے لگ کر بولی۔ "تیسرے تم ہو۔ میں تمہیں آزماؤں گی۔"

وہ بوکھلا گیا۔ اس نے کہا۔ "یہ... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ مالک نے دیکھ لیا یا سن لیا تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"پاپا کی فکر نہ کرو۔ میں ان سے نمٹنا جانتی ہوں۔ اب تک جو میری تنہائی میں آئے اور گئے' انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ تمہیں بھی ایک ذرا نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"پھر بھی میں ایک معمولی ملازم ہوں۔"

"مجھے ایک بچہ دو پھر دیکھو معمولی نہیں رہو گے۔ میں تمہیں کھری ٹاؤن کا دادا بنا دوں گی۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا مجھے اپنے باپ کی جگہ پہنچا دو گی؟"

وہ ناگواری سے منہ بنا کر بولی۔ "مجھے ان سے سخت نفرت ہے۔ انہوں نے میری ممی کو اور میرے نانا کو بڑی رازداری سے قتل کرایا تھا۔ میں خیال ہی خیال میں پاپا کو نفرت سے قتل کرتی رہتی ہوں۔ اگر میرا شوہر دلیر ہوتا، ہتھیاروں سے کھیلنا جانتا تو میں اب تک اپنی ممی اور نانا کا بدلہ لے چکی ہوتی۔ لیکن وہ بزدل ہے۔"

پھر وہ عمر دراز کو گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔ "میری یہ باتیں اس کمرے سے باہر جائیں گی تو تمہاری شامت آ جائے گی۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں۔ میں بھلا کسی سے کیوں کہوں گا۔ میں غریب ہوں، اپنی دنیا میں مست ہوں۔ مجھے جانے کی اجازت دیں۔"

"جاؤ مگر یہ سن لو۔ میں نے اس دوسرے کو کل ہی بھگایا ہے۔ اب دو مہینے تک انتظار کروں گی۔ اگر ماں بن گئی تو تمہاری ضرورت نہیں رہے گی۔ نہ بن سکی تو تم پاپا کی نوکری چھوڑ کر یہاں آؤ گے۔ تمہیں دگنی تنخواہ ملے گی۔"

"کیا مالک مجھے یہاں آنے دیں گے؟"

"میں پاپا سے نمٹنا جانتی ہوں۔ ان کی فکر نہ کرو۔ اب جاؤ یہاں سے۔ میں بے شرمی سے بیزار ہو گئی ہوں۔ ماں جگدمبے سے پرارتھنا کرتی رہوں گی کہ تمہاری ضرورت پیش نہ آئے۔"

اس روز عمر کو نجات مل گئی۔ دو ماہ بعد ملنے والی نہیں تھی۔ وہ دعائیں مانگتا رہا تھا کہ اس کے پاؤں بھاری ہو جائیں تب ہی وہ اسے بھولے گی۔ ورنہ پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

اس کے دل و دماغ میں سنگینی سمائی ہوئی تھی۔ کماری کلپنا لاکھ حسین سہی' وہ اس کی طرف مائل نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اب

اس کھنڈر میں بیٹھ کر دشمنوں سے عارضی طور پر پیچھا چھڑا کر سوچ رہا تھا کہ ایسے برے وقت میں کلپنا ہی کام آ سکتی ہے۔ وہ بھی عمر کی طرح بھوانی شنکر کو دشمن سمجھتی تھی۔ اسے اپنی ممی اور نانا کا بدلہ لینے کے لیے ایک دلیر مرد کی ضرورت تھی۔

اس نے حساب لگایا' دو ماہ پورے نہیں ہوئے تھے۔ ابھی چار دن باقی تھے۔ وہ شاید ماں بننے والی ہوگی۔ اسی لیے اسے کال نہیں کی تھی۔ یہ اس کے لیے اچھا تھا کہ گناہ گار بننے کے لیے اس کے پاس نہیں جائے گا۔ اس کے باپ کے خلاف ایک جنگجو سپاہی بن کر اس کے کام آئے گا اور اس کے ذریعے بھوانی شنکر سے نمٹنے کی سہولتیں حاصل کرے گا۔

اس نے فون نکال کر کلپنا سے رابطہ کرنا چاہا پھر رک گیا۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ماں بننے والی نہیں ہوگی تو کیا ہوگا؟ پھر تہذیب اور شرافت کے خلاف بے حیائی قبول کرنی ہوگی۔ اپنی سلمٰی کے اعتماد کو دھوکا دینا ہوگا۔ کیا وہ ایسا کرے گا؟ کیا اسے ایسا کرنا چاہیے؟

سلمٰی کے چاچا شکیل بھردواج نے رکاوٹیں پیدا کر کے اسے چوری کرنے پر مجبور کیا تھا۔ نہ وہ چوری کرتا نہ بھوانی شنکر اس کا دشمن بنتا۔ اس کی دشمنی سے ماں اور بہن پر عذاب نازل ہو رہا تھا۔ وہ چور اور قاتل بن کر بھاگتا اور چھپتا پھر رہا تھا۔

سوال یہ تھا کہ کب تک چھپتا پھرے گا؟ جواب ایک ہی تھا کہ بھوانی شنکر کی موت سے ساری مصیبتیں دور ہو سکتی تھیں اور اس کے لیے موت بننا تب ہی آسان ہوتا جب کلپنا اس کا ساتھ دیتی۔

اسے سلمٰی کے ساتھ زندہ رہنا تھا اور زندہ رہنے کے لیے مجبوراً اپنی سلمٰی کے اعتماد کو دھوکا دینا تھا۔ انسان سے زندگی میں کتنی ہی غلطیاں ہوتی ہیں۔ وہ صرف ایک غلطی کرنے والا تھا۔

اس نے فون کو دیکھا پھر نمبر پنچ کیے۔ تھوڑی دیر بعد کلپنا کی آواز سنائی دی۔ "عمر دراز! میں فون پر تمہارا نام پڑھ رہی ہوں۔"

اس نے کہا۔ "جی۔ میں بول رہا ہوں۔ آپ خوش خبری سنائیں۔ میں نے خواب دیکھا ہے' آپ ماں بننے والی ہیں؟"

"میں بھی یہی خواب دیکھتی آ رہی ہوں۔ میرے دو مہینے کا حساب پورا ہو گیا ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ مگر یہ کیا...؟ یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ کیا تم نے پاپا کے اسٹور سے چوری کی ہے؟"

"اچھا تو یہ خبر تم تک پہنچ گئی ہے؟"

"اور بہت ساری خبریں مل رہی ہیں۔ میں حیران ہوں اور خوش بھی ہوں۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے دلیر ہو کہ تم نے جیسلمیر کے مہاراج کو بھی للکارا ہے۔ اس کے ایک آدمی کو گولی ماری ہے۔ اس کے دستِ راست کو زخمی کر کے لاکھوں روپے چھین کر لے گئے ہو۔ ہائے عمر! تم کیا ہو؟ فوراً یہاں آؤ۔ میں تمہاری بلائیں لوں گی۔"

"مجھے دادا کے اور مہاراج کے آدمی ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ وہ آپ کی طرف بھی آئیں گے تو میں پکڑا جاؤں گا۔"

"کسی کا باپ بھی تمہیں ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ اور کسی کو یہ شبہ نہیں ہوگا کہ میں نے تمہیں چھپا رکھا ہے۔ یہاں چلے آؤ۔"

"آؤں گا۔ پہلے یہ معلوم کروں گا کہ انہوں نے میری ماں اور بہن کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

"مجھے خبر ملی ہے کہ تمہاری ماں اور بہن کے ساتھ برا سلوک کیا گیا ہے اور تمہارے گھر کو آگ لگا دی گئی ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ غصے اور صدمے سے لرز گیا۔ دانت پیس کر بولا۔ "خدا کی قسم جب تک تمہارے باپ کے مال گودام میں آگ نہیں لگاؤں گا' تب تک زندگی کی ایک بھی خوشی کو گلے نہیں لگاؤں گا۔"

"یہاں آ جاؤ۔ میں تمہاری قسم پوری کروں گی۔"

"تمہارے پاس آؤں گا تو عیش و عشرت میں ڈوب جاؤں گا۔ قسم پوری ہونے کے بعد ہی تمہارے پاس آؤں گا۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہی پھر بولی۔ "میں ابھی کال کروں گی۔ انتظار کرو۔"

فون سے رابطہ ختم ہو گیا۔ کھری ٹاؤن میں کلپنا کے کئی نمک خوار اور وفادار تھے۔ وہ ان سے طرح طرح کے کام لے سکتی تھی۔ اب تک اس لیے خاموش تھی کہ اس کے پاس عمر دراز جیسا دلیر جنگجو ساتھی نہیں تھا۔ اب اسے اعتماد حاصل ہوا تھا۔

اس نے ایک وفادار کو فون پر مخاطب کیا۔ "ہیلو چنڈی داس! میں کلپنا کماری بول رہی ہوں۔"

چنڈی داس نے بڑی عقیدت' بڑے جذبے سے کہا۔ "مالکن کی جے ہو۔ یہ سیوک آپ کے آگے پرنام کرتا ہے۔ حکم کریں۔"

"میرے ایک بہت بڑے دشمن سے لڑ سکتے ہو؟"

"نہ لڑ سکا تو اپنی گردن اپنے ہاتھوں سے کاٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈالوں گا۔"
"میرے پاپا کے مال گودام میں آگ لگا سکو گے؟"
وہ ذرا چپ رہا۔ پھر لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ آپ... آپ اپنے پتا جی کو نقصان پہنچائیں گی؟"
وہ سخت لہجے میں بولی۔ "میرا وقت برباد نہ کرو۔ میرے پاپا شیطانوں کے شیطان ہیں۔ پکڑے جاؤ گے تو پورے خاندان کے ساتھ زندہ جلا دیے جاؤ گے۔"
"ماں بھوانی کی قسم ڈرتا نہیں ہوں۔ آپ کی خاطر پورے خاندان کے ساتھ جل مروں گا۔"
"تو پھر آج ہی جتنی جلدی ہو سکے، یہ کام کرو۔ کامیابی کی خبر سناؤ گے تو پچاس ہزار روپے انعام دوں گی۔ میں تمہاری کال کا انتظار کروں گی۔"
اس نے فون بند کیا۔ پھر عمر کو کال کی۔ اسے یقین دلایا کہ اس کا کام ہونے والا ہے پھر اس سے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟ پاپا نے پولیس والوں کو بھی اچھی خاصی رقم دے کر تمہارے پیچھے لگایا ہوگا۔ پاپا اور مہاراج کے کارندے بھی پورے راجستھان میں تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔"
"میں جانتا ہوں، فکر نہ کرو۔"
"کیسے فکر نہ کروں۔ بڑے انتظار کے بعد تمہارے جیسا ہمت والا مرد ملا ہے۔ تم میری ممی اور نانا کا بدلہ بھی لوگے اور ماں جگدمبے نے چاہا تو میری گود میں ایک بچہ بھی دو گے۔"
عمر نے کہا۔ "بیٹیاں اپنے باپ سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہیں۔ کیا یہ عجیب سی بات نہیں ہے کہ تم محض ماں اور نانا کا انتقام لینے کے لیے باپ کو مار ڈالنا چاہتی ہو؟"
"میں نے کب یہ کہا ہے کہ اپنے پاپا کو مار ڈالنا چاہتی ہوں۔ میں تو بس انہیں نقصان پہنچا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتی ہوں۔"
"اور جب دل کی بھڑاس نکل جائے گی تو پاپا سے پھر دوستی ہوگی اور مجھ سے دشمنی...؟"
"ہرگز نہیں۔ پاپا میری ممتا، میرے مزاج کے برعکس ہیں۔ میں انہیں دل سے کبھی نہیں چاہوں گی۔"
"پلیز مجھے سمجھاؤ۔ وہ تمہاری ممتا اور مزاج کے برعکس کیسے ہیں؟"
وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "وہ انسان نہیں درندے ہیں۔ انہوں نے ایک دشمن کی حاملہ بیوی کا پیٹ پھاڑ دیا تھا۔ میں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور لرز گئی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے پاپا نے میرے پیٹ کی اولاد کو مار ڈالا ہے۔"
وہ ذرا چپ ہوئی۔ عمر نے فون پر اس کی سسکیاں سنیں۔ اس کے اندر کی ممتا رو رہی تھی۔ وہ بولی۔ "مجھے لگتا ہے بچے کے ساتھ مرنے والی ماں کی بددعا مجھے لگی ہے۔ اسی لیے میں ماں نہیں بن پا رہی ہوں۔ میں پاپا کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ ان کی درندگی کی سزا مجھے مل رہی ہے۔"
اس نے تسلی دی۔ "کسی کی بددعا نہیں لگتی۔ خدا جو چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے، تم ضرور ماں بنوگی۔"
"تو پھر اپنے دل کی بات پوری ہونے دو۔ یہاں چلے آؤ۔"
"ضرور آؤں گا۔ میری قسم پوری ہوتے ہی چلا آؤں گا۔ میرا ایک کام کرو، اپنے باپ کو سمجھاؤ کہ وہ میری ماں، بہن اور بیوی پر ظلم نہ کرے۔"
"وہ اپنی شیطانی فطرت سے باز نہیں آئیں گے۔ ظلم کے جواب میں جب ان پر ظلم ہوگا... انہیں بھاری نقصان پہنچتا رہے گا، تب شاید انہیں عقل آئے گی۔"
وہ بے بسی سے سوچنے لگا کہ کس طرح اپنی ماں، بہن اور سلمٰی کی حفاظت کرے؟ اس سلسلے میں کلپنا بھی مجبور تھی۔ فی الحال انہیں وہاں سے نکال کر لایا نہیں جاسکتا تھا۔
☆☆☆
سلمٰی کی نیند اڑ گئی تھی۔ پچھلی رات سے یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ کئی دشمن کتوں کی طرح عمر دراز کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں اور کسی وقت بھی اس کی لاش بستی میں لانے والے ہیں۔
وہ اپنے محبوب کی موت کے تصور سے ہی کانپنے لگی۔ خوف سے نہیں، غصے سے کانپنے لگی۔ اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسم کھا چکی تھی۔ اب یہ جنون حاوی ہو رہا تھا کہ اپنے محبوب کے لیے کیا کرے؟
وہ لڑکی تھی۔ اس کی تلاش میں تنہا نہیں نکل سکتی تھی۔ باپ مر گیا تھا، ماں مجبور تھی۔ وہ ماں اپنے دین سے باہر ایک عاشق سے شادی کر کے اس سے اولاد پیدا کر کے پچھتا رہی تھی۔ وہ اولاد آدھی ہندو، آدھی مسلمان تھی۔ نہ اِدھر کی رہی تھی، نہ اُدھر کی رہی تھی۔
چچا چچی، پھوپھی پھوپھا اور تمام کزن ہندو تھے اور اس بات پر ناراض تھے کہ اس نے ایک مسلمان سے شادی کی ہے اور وہ بھی شادی کر کے نہ اِدھر کی رہی تھی نہ اُدھر کی رہی تھی۔

وہ اپنی چھوٹی بہن شکیلہ کے ساتھ وہاب مرزا کے گھر رہنے آئی تھی۔ اس کے میکے والوں نے کہہ دیا تھا کہ عمر دراز نے جرمانہ ادا نہ کیا تو وہ اسے اپنے گھر لے آئیں گے۔ پھر کبھی اس مسلمان کی طرف جانے نہیں دیں گے۔
دوسرے ہی دن یہ خبر ملی کہ عمر نے کھری کے خطرناک دادا بھوانی شنکر سے دشمنی مول لی ہے۔ سلمٰی کو حاصل کرنے کے لیے اس نے دادا کے اسٹور سے ہیروئن چرائی ہے۔ پھر جیسلمیر کے خطرناک مجرم مہاراج جے پال کے ایک آدمی کو ہلاک کیا ہے اور ایک کو زخمی کر کے چھ لاکھ روپے لے گیا ہے۔
اس کے چچا سنیل بھردواج اور دوسرے تمام رشتے دار خوش ہو گئے کہ وہ نہ واپس آسکے گا، نہ سلمٰی کو لے جاسکے گا۔
وہاب مرزا نے کہا۔ "بیٹی! میں نے تمہیں پناہ دی ہے۔ لیکن اب تمہاری حفاظت نہیں کر سکوں گا۔ شنکر دادا نے اس کی ماں اور بہن سے بدسلوکی کی ہے۔ وہ تمہیں بھی نہیں چھوڑے گا۔"
وہ بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ عمر مجھ تک پہنچنے کے لیے پاگل ہو رہا ہوگا۔ میں اس سے کہاں مل پاؤں گی؟"
"بیٹی! ہم جو سوچتے ہیں، وہ نہیں ہوتا... کچھ اور ہو جاتا ہے اور تمہارے ساتھ تو برا ہی ہوتا آرہا ہے۔"
"میں آپ کے گھر سے چلی جاؤں گی۔ ورنہ وہ درندے آپ پر بھی ظلم ڈھائیں گے۔"
اس نے سلمٰی کے بھائی آصف سے کہا۔ "اپنی بہنوں کی سلامتی چاہتے ہو تو انہیں اودے پور لے جاؤ۔ میں اپنی بہن کا پتا لکھ کر دیتا ہوں۔ اسے فون پر تم لوگوں کے حالات بتاؤں گا۔ وہ تم تینوں کو دل و جان سے پناہ دے گی۔"
آصف نے کہا۔ "میں ابھی اپنی بہنوں کو یہاں سے لے جاؤں گا لیکن سنیل چاچا اور دوسرے رشتے دار شکایت کریں گے کہ ہم ان سے مشورہ لیے بغیر چلے گئے۔"
سلمٰی نے کہا۔ "انہیں شکایت کرنے دو۔ ان سے مشورہ لیں گے تو وہ یہی سمجھیں گے کہ ہم کہیں عمر سے ملنے جا رہے ہیں۔ وہ ہمیں جانے نہیں دیں گے۔"
یہ طے ہو گیا کہ کسی سے کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے جانا ہے۔ بہنیں فوراً ہی اپنا مختصر سا سامان لے کر مکان کے پچھلے دروازے سے باہر آگئیں۔ بھائی موٹر سائیکل لے آیا۔ وہاب مرزا نے کہا۔ "میں نے وہاں کا پتا سمجھا دیا ہے۔ ابھی بہن کو فون کروں گا۔ اللہ کا نام لے کر جاؤ۔"
وہ تینوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ آدھ گھنٹے کے بعد ہی سنیل بھردواج اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں آیا۔ ان کے ساتھ دو مسلح جوان بھی تھے۔ اس نے وہاب سے کہا۔ "عمر نے شنکر دادا کا مال چرا کر اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اب وہ سات جنم میں بھی یہاں واپس نہیں آئے گا۔ سلمٰی آج سے ہمارے خاندان میں رہے گی۔ اسے باہر لے آؤ۔"
وہاب نے کہا۔ "وہ نہیں ہے۔ اس کا بھائی آصف آیا تھا۔ اپنی بہنوں کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے گیا ہے۔"
سنیل کے بیٹے نے کہا۔ "وہ ہمارے گھر نہیں آیا ہے۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"
وہاب نے کہا۔ "میرے گھر کا دروازہ کھلا ہے۔ اندر جا کر دیکھ لو۔"
سنیل اپنے بیٹے کے ساتھ اندر گیا۔ وہاں وہاب کے بیوی اور بچے تھے۔ سلمٰی اور شکیلہ نہیں تھیں۔ سنیل نے باہر آکر غصے سے گرجتے ہوئے پوچھا۔ "میری دونوں بھتیجیاں کہاں گئی ہیں، سچ بولو۔ ورنہ ہماری دشمنی مہنگی پڑے گی۔"
"مجھے غصہ نہ دکھاؤ۔ تمہارا بھتیجا آصف انہیں لے گیا ہے۔"
"تم نے ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی؟"
"میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ بہنوں کو لے کر تمہارے پاس گیا ہے؟"
وہ دونوں جھنجلا کر وہاں سے جانا چاہتے تھے۔ اسی وقت شنکر دادا کے مسلح غنڈے وہاں آگئے۔ ان میں سے ایک نے سنیل کو دیکھ کر کہا۔ "ہم تمہارے گھر گئے تھے۔ عمر کی گھر والی کو ہمارے حوالے کرو۔ یہ دادا کا حکم ہے ورنہ تم سب مارے جاؤ گے۔"
سنیل نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ہم دادا کے حکم سے انکار نہیں کریں گے۔ سلمٰی اپنی بہن کے ساتھ اس گھر میں تھی۔ اس کا بھائی انہیں پتا نہیں کہاں لے گیا ہے۔"
ایک کارندے نے سنیل کے سینے پر گن کی نال رکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے اسے بھگا دیا ہے۔"
وہ دیوی دیوتاؤں کی قسمیں کھا کر بولا۔ "ہم خود نہیں چاہتے کہ وہ ایک مسلمان کی پتنی بن کر رہے۔ تم یقین کرو، وہ تینوں بھائی بہنیں عمر دراز سے ملنے کہیں گئے ہیں۔"
سنیل کے بیٹے نے کہا۔ "اگر ہم وہاں تک پہنچ جائیں گے تو تم عمر دراز کو شنکر دادا کے قدموں میں گرا سکو گے۔"
شنکر دادا کے ایک کارندے نے پوچھا۔ "وہ یہاں سے کب گئے ہیں؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہاب نے کہا۔ ”ایک گھنٹا ہو چکا ہے۔“

سنیل نے کہا۔ ”وہ موٹر سائیکل پر گئے ہیں۔ ہم تیز رفتاری سے ان کے سروں پر پہنچ سکتے ہیں۔“

”لیکن یہ معلوم تو ہو وہ کدھر گئے ہیں؟“

ایک کارندے نے سنیل سے کہا۔ ”تم جے پور کے راستے پر جاؤ۔ اپنے بیٹے کو بیکانیر کی طرف بھیجو۔“

پھر اس نے اپنے چار مسلح ساتھیوں سے کہا۔ ”تم دونوں اجمیر کے راستے پر انہیں دیکھو۔ باقی میں دو ساتھیوں کے ساتھ اودے پور جاؤں گا۔“

یہ فیصلہ کرتے ہی وہ سب مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی وہاب نے آصف سے فون پر پوچھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

آصف نے کہا۔ ”ہم جودھ پور پہنچنے والے ہیں۔ تین یا چار گھنٹوں میں اودے پور پہنچ سکیں گے۔“

”شنکر دادا کے تین آدمی اس راستے پر آ رہے ہیں۔ رفتار بڑھاؤ یا ہائی وے چھوڑ کر کسی دوسرے راستے سے اودے پور جاؤ، ورنہ پکڑے جاؤ گے۔“

اس نے انہیں خطرے سے آگاہ کر کے فون بند کر دیا۔

☆☆☆☆☆

عمر دراز کے پاس لاکھوں روپے تھے۔ وہ اودے پور اپنے ایک دوست کے پاس جا رہا تھا۔ یہ ارادہ تھا کہ اپنے دوست مہندر کو پچاس ہزار دے کر سنیل بھر دواج کے پاس بھیجے گا اور سلمٰی کو چٹھی لکھے گا کہ وہ موقع پا کر مہندر کے ساتھ جے پور آ جائے۔

اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اسے جے پور کلپنا کے پاس جانا ہے۔ ابھی وہ اس خبر کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ اپنے باپ کے مال گودام میں آگ لگوانے میں کامیاب ہوئی ہے یا نہیں؟

وہ فی الحال سلمٰی کو اس کے میکے سے نکال لانے اور اس سے کہیں ملنے کی تدبیر پر عمل کر رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ دشمن اس کی ماں اور بہن کے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہیں اور سلمٰی کو پکڑنے کے لیے کتوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

وہ موٹر سائیکل دوڑاتا ہوا اودے پور کی طرف جا رہا تھا۔ پھر ایک پہاڑی ٹیلے کے قریب سے گزرتے وقت ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ بریک لگا کر رُک گیا۔ وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ریت سے بنے ہوئے چھوٹے بڑے ٹیلے تھے۔ وہیں ایک جگہ ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی۔

اسے دیکھتے ہی ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ اپنے مالک بھوانی شنکر کی جیپ کو ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ دماغ نے چیخ کر کہا۔ ”شامت آ گئی ہے۔ میں موت کے آگے بھاگ رہا تھا۔ اب یہ میرے آگے راستہ روکنے آ گئی ہے۔“

وہ چھپنے کے لیے موٹر سائیکل کو دھکیلتا ہوا ایک ٹیلے کی طرف جانے لگا۔ آگے ایک موٹر سائیکل کو دیکھتے ہی پھر رُک گیا۔ وہ اسے بھی پہچانتا تھا۔ وہ سلمٰی کے بھائی آصف کی گاڑی تھی۔

اس نے ایک ٹیلے کے پیچھے چھپتے ہوئے سوچا۔ ’کیا میری سلمٰی کا بھائی بھی مجھے دشمنوں کی طرح تلاش کر رہا ہے؟‘

وہ سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر حدِ نظر تک دیکھنے لگا۔ ہر سُو ویرانی اور سناٹا تھا۔ کوئی دشمن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا۔ گاڑیاں کہہ رہی تھیں، موت وہیں کہیں چھپی ہوئی ہے۔

اس نے سوچا۔ ’دانشمندی یہی ہے کہ چپ چاپ یہاں سے رینگتا ہوا نکل جاؤں۔ ابھی کسی نے مجھے دیکھا نہیں ہے۔‘

اسی لمحے گولی چلنے کی آواز اُبھری۔ وہ جہاں تھا، وہیں دبک گیا۔ پھر اس نے بھی اپنا ریوالور نکال لیا۔ فائر کی آواز ویرانے میں دور تک اور دیر تک گونجتی رہی اور یہ سمجھاتی رہی کہ دشمنوں نے اسے دیکھ لیا ہے، تب ہی گولی چلائی گئی ہے۔

اس نے سر اُٹھا کر دیکھنا چاہا تو پھر ایک گولی چلی۔ پھر جواباً دوسری تیسری گولیاں چلنے لگیں۔ تب یہ اندازہ ہوا کہ دو مخالفین کے درمیان کاؤنٹر فائرنگ ہو رہی ہے۔

اس نے سوچا۔ ’اگر میرا اندازہ درست ہے تو مخالفین کو آپس میں لڑنے دیا جائے۔ مجھے خاموشی سے اپنی گاڑی کو کھینچتے ہوئے دور نکل جانا چاہیے۔‘

وہ ریوالور کو مضبوطی سے تھام کر زمین پر اوندھے منہ لیٹ گیا لیکن آگے نہ بڑھ سکا۔ اچانک ہی ایک نہایت ہی سریلی چیخ سنسناتی ہوئی گولی کی طرح آ کر اس کے دل میں گھس گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

اگرچہ اس نے سلمٰی کو کبھی چیختے ہوئے نہیں سنا تھا لیکن دل و دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی جانِ حیات ہے۔ معشوق کی آہ ہو یا ہائے ہو، وہ عاشق کے دل کو چھو لیتی ہے۔

اس نے پھر ٹیلے کی آڑ سے دور تک نظریں دوڑائیں۔ کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ویرانہ معشوق کی آواز میں بول کر آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ سلمٰی کو چھپا کر چیلنج کر رہا تھا کہ آؤ، میدان میں آؤ اور اپنی جانِ جاں کے لیے بارود کے پھول کھلاؤ۔

بڑے انتظار کے بعد دشمنوں کا سراغ ملا۔ اس ویرانے میں بھوانی شنکر کے دستِ راست جھیرو ماما کی آواز گونجنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ابے او آصف! کیوں حرام موت مرنا چاہتا ہے؟ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔ سلمٰی کو میرے حوالے کر دے اور دوسری بہن کو ساتھ لے جا۔“

عمر دراز اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ سلمٰی کا نام سنتے ہی دل کی دھڑکنیں پاگل ہو گئیں۔ پھر آصف کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”عمر نے تمہارے مالک کے گھر میں چوری کی، تم اسے پکڑو۔ اس کی گھر والی کو نہیں، دلیری نہ دکھاؤ... جاؤ یہاں سے۔“

عمر کے اندر بجلی بھر گئی تھی۔ وہ سلمٰی تک پہنچنے کے لیے چھپتا ہوا، دوڑتا ہوا دوسرے ٹیلے کی طرف جانے لگا۔ ایسے ہی وقت اسے ایک دشمن نظر آیا۔ وہ ایک ٹیلے کی آڑ سے دور کسی کا نشانہ لے رہا تھا۔

پھر اس کے نشانے کی سیدھ میں آصف، سلمٰی اور شکیلہ دکھائی دیے۔ وہ تینوں ایک ٹیلے کے سائے میں تھے۔ ان کے دائیں بائیں کئی چھوٹے بڑے ٹیلے تھے۔ دشمن ان تک پہنچ نہیں پا رہے تھے۔ اس لیے کہ وہاں پہنچنے سے پہلے انہیں آصف کے نشانے پر کھلی جگہ آنا پڑتا۔ وہ ان تینوں کو بھی وہاں سے نکل بھاگنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔

جھیرو ماما کہہ رہا تھا۔ ”آصف! تم موت کے بالکل سامنے ہو۔ میں آخری بار سمجھاتا ہوں، سلمٰی سامنے نہ آئی تو تم سب مارے جاؤ گے۔“

وہ درست کہہ رہا تھا۔ آصف انجانے میں جس دشمن کے نشانے پر تھا، اسے عمر دراز نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر گولی سے اُڑا دیا۔ وہ ایک چیخ مارتا ہوا زمین پر گر کر ڈھلان کی طرف لڑھک گیا۔

وہ تو مر گیا لیکن دوسرے دشمن نے آصف کو گولی مار دی۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ اُبلا تو دونوں بہنیں اس سے لپٹ کر رونے لگیں۔ عمر انہیں بڑے صدمے سے دیکھ رہا تھا۔ ان سے ہمدردی کے لیے قریب نہیں جا سکتا تھا۔

ایک دشمن نے چیخ کر جھیرو سے کہا۔ ”ماما! آصف نے ہمارے ساتھی پر گولی نہیں چلائی تھی۔ وہ گولی ادھر سے آئی تھی۔ اس ٹیلے کے پیچھے کوئی اور دشمن ہے۔“

جھیرو ماما نے کہا۔ ”پاگل کے بچے! یہاں اور کون دشمن ہو گا؟ آصف اکیلا ہم سے مقابلہ کر رہا تھا۔ آخر مارا گیا۔“

عمر خاموش تھا۔ اپنی موجودگی ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ یہ انتظار تھا کہ ان میں سے کوئی اور نشانے پر آ جائے۔ اسے جوش میں آئے بغیر ہوش میں رہ کر بڑی حکمتِ عملی سے اپنی سلمٰی تک پہنچنا تھا۔

جھیرو ماما کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”سلمٰی! اگر تمہارے پاس گن ہے تو اسے پھینک کر سامنے آ جاؤ۔ بھائی مر گیا ہے۔ ہمارے ساتھ چلو۔ تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ عمر دراز کے آنے تک تمہیں عزت سے رکھا جائے گا۔“

ان بہنوں کی حفاظت کے لیے بظاہر کوئی گولی چلانے والا نہیں تھا۔ جھیرو ماما کو یقین نہیں تھا کہ کوئی اور ان کی موت بن کر آ گیا ہے۔ انہوں نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر جہاں چھپے ہوئے تھے، وہاں سے نکل آئے۔

عمر نے دیکھا، جھیرو ماما کے ساتھ دو ہی کارندے رہ گئے تھے۔ وہ محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے ان بہنوں کی طرف جا رہے تھے۔

وہ دونوں سہم کر بھائی کی لاش سے دور ہو گئیں۔ وہاں سے بھاگنے لگیں۔ دونوں کارندے ان کی طرف لپکے۔ جھیرو اس یقین کے ساتھ قہقہہ لگانے لگا کہ اب انہیں بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ قہقہہ بہت ہی مختصر سا رہا۔ اچانک ٹھائیں کی گونجتی ہوئی آواز نے ایک کارندے کو اُچھال کر زمیں بوس کر دیا۔

عمر ماہر نشانہ باز نہیں تھا۔ گولی کارندے کے بازو میں لگی تھی۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ وہ زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اپنی رائفل تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اب دشمنوں کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہاں ان کا کوئی انجانا دشمن موجود ہے۔

جھیرو بھاگتا ہوا ایک جگہ چھپ گیا۔ پھر وہاں سے چیخ کر بولا۔ ”اے! تو کون ہے؟ ہم سے تیری کیا دشمنی ہے؟“

وہ پوزیشن بدلتا ہوا۔ ایک سمت جاتے ہوئے بولا۔ ”دشمنی تمہارے شیطان دادا نے مول لی ہے جھیرو! میں اپنی سلمٰی کی عمر دراز کرنے آ گیا ہوں۔“

سلمٰی نے اپنے محبوب کی آواز سنتے ہی بڑے جذبے سے چیخ کر کہا۔ ”ہائے عمر...! تم آ گئے۔ ہائے میرا جوان بھائی مارا گیا ہے۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جھیرو نے چیخ کر کہا۔ ”اور تیری عمر دراز کرنے والا ابھی تیری آنکھوں کے سامنے مارا جائے گا۔ ابے او! نمک حرام! تو نے دادا کو ڈنک مارا ہے۔ اب اس کا بھیانک انجام دیکھے گا۔“

جو کارندہ زخمی ہو کر زمین پر گرا تھا، اس نے اپنی رائفل تک پہنچنے کے لیے چھلانگ لگائی۔ پھر اسے تھام کر زمین سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اُٹھا تو ایک گولی نے آکر پھر اسے گرا دیا۔ اس بار اس کا نشانہ صحیح تھا۔ وہ جہنم میں پہنچ گیا تھا۔

سلمٰی جھکتی ہوئی دوڑتی ہوئی اس لاش کے پاس آئی۔ پھر وہاں سے رائفل اور کارتوس کی پیٹی اُٹھا کر دوسرے ٹیلے کے پیچھے آگئی۔ اسے شکیلہ کی طرف واپس جانے کا موقع نہ ملا۔ دشمن فائر کرنے لگے تھے۔

جھیرو نے دیکھا جسے حاصل کرنے آیا تھا' اس حسینہ کے ہاتھوں میں رائفل آگئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے بندوق چلانی آتی ہے یا نہیں؟ نہ بھی آئے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ عورت سینڈل اُٹھالے تو مرد بھاگ جاتا ہے۔ اب وہ بے باکی سے اس کی طرف نہیں جاسکتا تھا۔

اس کا ایک ہی ساتھی بچا تھا۔ اس نے کہیں دور سے چیخ کر کہا۔ "ماما...! میں نے اس کی چھوٹی بہن کو پکڑ لیا ہے۔ اسے گاڑی کی طرف لے جارہا ہوں۔"

سلمٰی اور عمر دراز پریشان ہوگئے۔ انہیں شکیلہ کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ماما نے چیخ کر کہا۔ "شاباش! اسے لے جاؤ۔ وہ بھاگنا چاہے تو گولی ماردو۔ میں آرہا ہوں۔"

سلمٰی نے آنسو بھری آواز میں کہا۔ "عمر! شکیلہ کو بچاؤ۔"

وہ دونوں جھیرو کی طرف گولیاں چلانے لگے۔ وہ ایک ٹیلے کے پیچھے خاموش تھا۔ جواباً گولیاں نہیں چلا رہا تھا۔ عمر نے للکارا۔ "شکیلہ کو چھوڑ دو۔ ورنہ ہم تمہیں زندہ نہیں جانے دیں گے۔"

اس کی خاموشی معنی خیز تھی۔ وہ ایک بھی گولی نہیں چلا رہا تھا۔ پھر دونوں ہی چونک گئے۔ دور بہت دور جیپ اسٹارٹ ہوگئی تھی۔ جھیرو وہاں پہنچ گیا تھا۔ سلمٰی اور عمر اُدھر دوڑ لگاتے ہوئے فائر کرنے لگے۔

شکیلہ ان کی گرفت میں تھی۔ انہوں نے ہنستے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔ وہ دوڑتی ہوئی اپنی بہن اور بہنوئی کی طرف آنے لگی۔ ایسے ہی وقت جھیرو نے اسے گولی ماردی۔ اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی۔ وہ اُچھل کر زمین پر گری پھر ہمیشہ کے لیے ساکت ہوگئی۔

سلمٰی نے بہن کو مرتے دیکھا تو صدمے سے چکرا کر گر پڑی۔ عمر دشمنوں کی طرف فائر کرتا ہوا دوڑ رہا تھا لیکن وہ شوٹنگ رینج سے دور تھے۔ اب وہ جیپ تیز رفتاری سے اور دور ہوتی جارہی تھی۔

وہ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جیپ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ واپس دوڑتا ہوا سلمٰی کے پاس آیا۔ وہ بہن کی لاش سے لپٹ کر رو رہی تھی۔

ایسے وقت کہتے ہیں قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ بھائی اور بہن آنکھوں کے سامنے مارے گئے تھے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ عمر دراز نے اسے تھوڑی دیر تک رونے دیا پھر کہا۔ "صبر کرو۔ ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں ہیں۔ جھیرو کسی وقت بھی اور آدمیوں کے ساتھ واپس آسکتا ہے۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "کیا اپنے بھائی اور بہن کو بے گوروکفن چھوڑ کر چلی جاؤں؟ میں تو نہیں جاؤں گی۔ یہیں مر جاؤں گی۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "ہم کیا کر سکتے ہیں؟ وقت کی نزاکت کو سمجھو۔ دشمن میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ کسی وقت بھی پوری تیاریوں کے ساتھ پلٹ کر آئیں گے۔ ہم نادانی میں مارے جائیں گے۔"

"کیا اپنوں کی میت کو چیل کوّوں کے لیے چھوڑ جانا دانش مندی ہے؟ میں یہاں مر جاؤں گی۔ مگر انہیں ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

وہ کیا کرسکتا تھا؟ قبر کھودنے کے لیے کدال اور بیلچہ نہیں تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ انہیں ریت میں چھپا سکتا تھا۔

اس نے یہی کیا۔ جہاں شکیلہ کی لاش پڑی تھی، وہیں ریت کو دونوں ہاتھوں سے کھودنے کے انداز میں ایک طرف ہٹانے لگا۔ تقریباً تین فٹ تک کھودنے کے بعد اس نے لاش کو اُٹھا کر گڑھے میں رکھا۔ بہن نے روتے ہوئے اسے دوپٹے میں چھپایا پھر دونوں نے اوپر سے ریت برابر کردی۔

سلمٰی صدمات سے ٹوٹ گئی تھی اور عمر کو خطرات سے دوچار ہونے کے باوجود مشقت کرتے دیکھ کر متاثر ہو رہی تھی۔ وہ پچھلی رات سے جاگ رہا تھا۔ ایک ذرا پلک جھپکنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اب سلمٰی کے دو پیاروں کی قبریں کھود رہا تھا۔

اس نے آصف کو بھی اسی طرح ریت کی عارضی قبر میں چھپا دیا۔ پھر اس نے سلمٰی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "اپنے دل کو سمجھاؤ۔ حالات سازگار ہوں گے تو ہم جلد ہی یہاں ان کی باقاعدہ تدفین کے لیے آئیں گے۔"

وہ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ ایک طویل انتظار کے بعد معشوق دل کی دھڑکنوں سے آکر لگی تھی لیکن اس کی قربت جذباتی نہیں تھی، ماتمی تھی۔

☆☆☆

مہاراج جیسلمیر سے کھری ٹاؤن بھوانی شنکر کے پاس آگیا تھا۔ وہ غصے سے تلملا رہا تھا۔ اس نے بھوانی شنکر سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہا۔ "وہ کتا میرے چھ لاکھ روپے لے گیا ہے۔ اس نے چیت راؤ کو زخمی کیا تھا۔ ہم نے اسے اسپتال پہنچایا۔ وہ راستے ہی میں مر گیا۔ اس کتے نے میرے دو آدمی مارے ہیں۔ میں اس کے پورے خاندان کو زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔"

بھوانی شنکر نے کہا۔ "میں نے سنا ہے' اس کے خاندان والے دہلی اور مرشد آباد میں رہتے ہیں۔ وہاں ہمارا زور نہیں چلے گا۔ یہاں اس کی ماں اور ایک بہن ہے۔"

مہاراج میز پر ہاتھ مار کر بولا۔ "دونوں کو میرے حوالے کرو۔ میں دونوں کی عزت اُتاروں گا۔ انہیں مادر زاد ننگا کر کے پورے شہر میں گھماؤں گا۔"

"ہم یہی کرنے والے ہیں لیکن آج رات تک اس کتے کے واپس آنے کا انتظار کریں گے۔ وہ اپنی ماں' بہن اور بیوی کی سلامتی کے لیے ضرور آئے گا۔ نہیں آئے گا تو کھری ٹاؤن کے لوگ کل صبح بازار میں ننگا تماشا دیکھیں گے۔"

"دادا... کل بہت دور ہے۔ ابھی میرا غصہ ٹھنڈا کرو۔ اپنے آدمیوں سے بولو، اس کی جوان بیوی کو اُٹھا کر لے آئیں۔ اس کتے سے پہلے میں سہاگ رات مناؤں گا۔"

"وہ یہاں سے بھاگ گئی ہے۔"

وہ پھر میز پر ہاتھ مار کر بولا۔ "اس کی بہن کو اُٹھواؤ۔ میں اسے جوان بنادوں گا۔"

بھوانی شنکر نے اپنے پالتو غنڈوں کو بلا کر کہا۔ "عمر کے گھر جاؤ۔ اس کی ماں اور بہن کے گلے میں رسی ڈال کر انہیں ہانکتے ہوئے یہاں لاؤ۔"

وہ غنڈے حکم کی تعمیل کے لیے چلے گئے۔ بھوانی شنکر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب اس کتے کا گھر کہاں رہا ہے۔ اسے تو ہم نے جلا کر راکھ کردیا ہے۔"

گھر جلتا ہے تو پھر کچھ نہیں بچتا۔ سارا سامان جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ صرف جلی ہوئی دیواریں رہ گئی تھیں۔ دونوں ماں بیٹی مار کھانے کے بعد جلے ہوئے گھر کے سامنے پڑی ہوئی تھیں۔

بیٹی پہلے ہی بیمار تھی۔ بری طرح مار کھانے کے بعد بے ہوش ہوگئی تھی۔ ماں تڑپ تڑپ کر اسے پکار رہی تھی۔ وہ ہوش میں نہیں آرہی تھی۔ محلے والے انہیں ہمدردی سے دیکھ رہے تھے لیکن دادا کے خوف سے کوئی ان کے قریب نہیں آرہا تھا۔

کوئی ڈاکٹر بھی آکر دوا نہیں دے رہا تھا۔ وہ سب جانتے تھے کہ جو بھی ان کے قریب جائے گا' اسے دادا کے آدمی اُٹھا کر لے جائیں گے پھر ان کی لاش بھی گھر والوں کو نہیں ملے گی۔

پولیس والے بھی انہیں دور سے دیکھ کر چلے گئے تھے۔ دادا نے مقررہ رشوت سے کچھ زیادہ رقم تھانے پہنچادی تھی۔ وہ ماں بیٹی سے ہمدردی کرنے کے بجائے عمر دراز کو گرفتار کرنے کے لیے ڈھونڈ رہے تھے۔ اس لیے کہ وہ قانون کے مطابق چور تھا۔ دادا کے اسٹور سے چوری کی تھی۔ مہاراج کے چھ لاکھ چھین کر لے گیا تھا اور قاتل بھی تھا۔ اس نے جیسلمیر میں دو قتل کیے تھے۔ لہٰذا قانون کے محافظ کہلانے والے اسے گرفتار کرنے کا فرض ادا کرنا چاہتے تھے۔

ایک ماں جلے ہوئے گھر کے سامنے بے ہوش بیٹی کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ منہ پر پانی چھڑکنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں کو دیکھا۔ وہ بیماری اور کمزوری کے باعث کچھ بول نہیں پارہی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر تک اٹک اٹک کر سانس لی پھر ایک ہلکا سا جھٹکا کھا کر ابدی نیند سوگئی۔

ماں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ محلے کی کتنی ہی عورتیں اور مرد رو پڑے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ دادا کے پاس جا کر ایک بوڑھی ماں کے لیے رحم کی بھیک مانگیں گے۔ اس بچی کی تکفین و تدفین کے لیے اجازت حاصل کریں گے۔

وہ دادا کے پاس جانے کی سوچ رہے تھے۔ اسی وقت اس کے غنڈے وہاں آگئے۔ انہوں نے ایک بچی کی لاش دیکھی پھر اسے نظر انداز کر کے ماں کی گردن میں پھندا ڈال دیا۔ محلے کی کتنی ہی عورتیں اور مرد دہائی دینے لگے۔ ان غنڈوں نے دہائی دینے والوں کی طرف تھوک دیا پھر ماں سے کہا۔ "چل اُٹھ۔ نہیں چلے گی تو گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ رسی کھینچتے ہی تیرا دم نکل جائے گا۔"

ماں محترم ہوتی ہے۔ صرف اپنی ماں ہوتی ہے، دوسروں کی نہیں... غنڈوں کے لیے وہ ایک عام سی بوڑھی عورت تھی۔

اس بوڑھی عورت نے اپنے گریبان سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک چھوٹی سی بچی سے شرمناک زیادتی کی جائے گی۔ وہ ایسے وقت بیٹی کو زہر دینے والی تھی۔ اس سے پہلے ہی بیٹی نے ماں کی مشکل آسان کردی تھی۔

ماں نے شیشی کا زہر حلق سے اُتار کر کہا۔ "میرے لال! اس کتے دادا کے آگے نہ جھکنا۔ میں نے تجھے ماں اور بہن کی فکر سے آزاد کردیا ہے۔"

غنڈے سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ اپنی جان پر کھیل جائے گی۔ جب وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی تو انہوں نے

قریب آکر دیکھا۔ اس کی گردن میں پھندا تھا جسے کھینچنا نہ پڑا۔ اس سے پہلے ہی موت اسے کھینچ کر لے گئی۔

بھوانی شنکر اور مہاراج نے سنا تو غصے سے اُچھل پڑے۔ وہ نہ تو ایک ماں کو بازار میں بے لباس کر سکے تھے اور نہ انہیں ایک بچی سے شرمناک زیادتی کرنے کا موقع ملا تھا۔ سلمٰی بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور عمر تو انہیں صبح سے دوڑا رہا تھا۔ اب رات ہو گئی تھی۔ انتقام کی آگ بجھنے کے بجائے اور بھڑکتی جا رہی تھی۔

انہوں نے تھانے دار کو بلا کر کہا۔ ”وہ کتا ہمیں نیچا دکھا رہا ہے۔ تم کیا کر رہے ہو؟ وہ اب تک گرفتار کیوں نہیں ہوا؟“

اس نے کہا۔ ”وہ میرے علاقے میں ہوتا تو اب تک اسے آپ کے قدموں میں لا کر پھینک دیتا۔ میں نے تمام بڑے شہر کے تھانوں میں اس کا حلیہ بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں اس کی تصویر ہوگی تو وہ جلد ہی پکڑا جائے گا۔“

”کیا تصویر ضروری ہے؟“

”آسانی ہوگی... سپاہی اسے دور سے یا نزدیک سے کسی بھی بھیس میں پہچان لیں گے۔“

اس کی کوئی تصویر بھوانی شنکر کے پاس نہیں تھی۔ گھر میں مل سکتی تھی۔ لیکن گھر کو تو جلا دیا گیا تھا۔ تمام سامان کے ساتھ تصویر بھی جل چکی تھی۔ وہ جھنجلا رہے تھے۔ ہر طرف سے مایوسی ہو رہی تھی۔

ایسے وقت قریب ہی کہیں سے دل ہلا دینے والا دھماکا سنائی دیا۔ دیواریں لرز گئیں۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ وہ سب بھاگتے ہوئے اس چار دیواری سے باہر آئے۔ وہاں سے سو گز کے فاصلے پر بھوانی شنکر کا مال گودام تھا۔ اس کی چھت اُڑ گئی تھی۔ دیواریں ٹوٹ گئی تھیں۔ اندر شعلے بھڑک رہے تھے۔ اسٹور کیا ہوا تمام سامان جل رہا تھا۔

بھوانی شنکر یہ منظر دیکھ کر لرز گیا۔ اچھا خاصا ہیروئن کا ذخیرہ جل رہا تھا۔ کروڑوں روپے کا مال مٹی ہو رہا تھا۔ اس کے منیجر نے کہا۔ ”میں نے فائر بریگیڈ والوں کو فون کیا ہے۔ وہ آ رہے ہیں۔“

بھوانی شنکر غصے سے مٹھیاں بھینچ کر کہہ رہا تھا۔ ”یہ کس نے کیا ہے؟ کس نے اتنی ہمت کی ہے؟ اسے پکڑو۔ وہ دھماکا کرنے والا زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔“

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک معمولی ملازم اس کی اپنی بیٹی کے ذریعے اتنی بڑی واردات کر چکا ہے۔ یہ جلد ہی معلوم ہونے والا تھا کہ عمر دراز کی ماں اور بہن کی موت اسے بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔

☆☆☆

وہ سلمٰی کے ساتھ جے پور پہنچ گیا۔ وہاں وہاب مرزا کی بہن واجدہ نے بڑی محبت سے ان کا استقبال کیا۔ سلمٰی نے رو رو کر بتایا کہ اس کی بہن اور بھائی کس طرح مارے گئے ہیں۔ واجدہ نے اسے گلے سے لگا کر صبر کی تلقین کی پھر انہیں غسل کرنے کو کہا تاکہ سفر کی تھکن مٹ جائے۔ پھر کھانے کے بعد انہیں سونے کے لیے ایک کمرا دے دیا۔

وہ دولہا دلہن کچھ دیر تک جاگتے رہے پھر پیار کی تھکن مٹا کر گہری نیند سو گئے۔ دوسری صبح بیدار ہوئے تو واجدہ نے انہیں ناشتا کرانے کے بعد عمر سے کہا۔ ”تمہارے لیے بری خبر ہے۔ وہاب نے کل رات فون پر بتایا ہے کہ تمہاری امی اور بہن اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔“

عمر کا سر جھک گیا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ واجدہ نے تفصیل سے بتایا کہ اس کا گھر جلا دیا گیا ہے۔ بہن زخموں کی تاب نہ لا کر مر گئی اور ماں نے زہر پی کر جان دے دی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر بولا۔ ”خدا کی قسم! دشمنوں کا سکون برباد کر دوں گا۔ ان سے جانوروں کی طرح سلوک کر کے انہیں جہنم میں پہنچاؤں گا۔“

سلمٰی نے کہا۔ ”یہ سب ہماری وجہ سے ہو رہا ہے۔ نہ ہم محبت کرتے نہ شادی کرتے، نہ تم شنکر دادا کے اسٹور سے چوری کرتے۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا تو آج ہمارے تمام رشتے، ہمارے تمام چاہنے والے زندہ رہتے۔“

وہ بولا۔ ”میں نے چوری کی۔ یہ ایک چھوٹا سا جرم ہے لیکن چوری کی سزا کتنی ہوتی ہے؟ کیا سزائے موت ملتی ہے؟ انہوں نے تمہاری بہن کو اور بھائی کو، میری امی کو اور معصوم سی بہن کو مار ڈالا۔ ایک چوری کی سزا چار انسانوں کی موت...؟“

سلمٰی نے کہا۔ ”ہماری دنیا میں انصاف نہیں ہے۔ تم پکڑے گئے تو تمہیں عدالت تک پہنچا دیا جائے گا۔ وہ دشمن ہمارے پیاروں کا خون بہا کر آزاد گھوم رہے ہیں۔ قانون کے محافظ انہیں عدالت میں نہیں پہنچائیں گے۔“

واجدہ نے کہا۔ ”میں نے وہاب کو فون پر بتایا ہے کہ سلمٰی کے بھائی اور بہن مارے گئے ہیں اور یہ تمہارے ساتھ آئی ہے۔ یہ سن کر وہاب نے کہا ہے کہ تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ دشمن گھر کے باہر تمہاری موٹر سائیکل دیکھ کر یہاں گھس آئیں گے۔“

عمر نے کہا۔ ”وہ درست کہتے ہیں۔ میں سلمٰی کو آپ کے

پاس چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

سلمٰی نے پوچھا۔ ”مجھے چھوڑ کر کہاں جاؤ گے؟“

وہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ اس کی سوکن کے پاس جائے گا۔ اس نے کہا۔ ”میری فکر نہ کرو۔ میں بھوانی شنکر کو جہنم میں پہنچا کر جلد ہی واپس آؤں گا۔“

وہ اس کے بازو کو جھنجوڑ کر بولی۔ ”پاگل ہوئے ہو؟ پہاڑ سے ٹکراؤ گے؟ ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے۔ کیا مجھے بیوی بناتے ہی بیوہ بنانا چاہتے ہو؟“

”سلمٰی! صرف اپنے جذبات کو نہ دیکھو۔ تمہاری بہن اور بھائی، میری امی اور بہن مٹی میں رینگنے والے کیڑے نہیں تھے۔ خدا نے انہیں جینے کے لیے زندگی دی تھی۔ لیکن دشمنوں نے بڑی آسانی سے وہ تمام زندگیاں چھین لیں۔ میں انہیں حرام موت ماروں گا۔ تب ہی میرا ضمیر مطمئن ہوگا۔“

”میں تمہارے انتقامی جذبات کو سمجھتی ہوں اور یہ چاہتی ہوں کہ شنکر دادا کتے کی موت مرے لیکن تم اکیلے ہو۔ میں تمہیں...“

وہ ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ”بس... مجھے روکنے کی بات نہ کرنا۔ میرے بغیر رہ سکتی ہو، میرا انتظار کر سکتی ہو تو کرو ورنہ میں طلاق دے کر تمہیں آزاد کر کے چلا جاؤں گا مگر جاؤں گا۔ ہر حال میں دشمنوں کی نیندیں حرام کرنے جاؤں گا۔ ان سے لڑتے لڑتے مر جاؤں گا یا انہیں مار کر آؤں گا۔“

وہ رونے لگی۔ عمر اپنے فون کی طرف متوجہ ہوا۔ کالنگ ٹون سنائی دے رہی تھی۔ ننھی سی اسکرین پر کماری کلپنا کا نمبر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ فوراً ہی وہاں سے اُٹھ کر مکان کے باہر آیا پھر بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ”جی کلپنا جی میں بڑی بے چینی سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔“

وہ بولی۔ ”جھوٹ بولتے ہو۔ انتظار تھا تو تم نے کال کیوں نہیں کی؟“

”میں موجودہ حالات میں کال نہیں کر سکتا تھا۔ تم کیا جانو کہ کس طرح آگ اور خون کے دریا سے گزر رہا ہوں۔ تمہارے باپ نے میری ماں اور بہن کی زندگی چھین لی ہے۔ میں قسم کھا چکا ہوں، اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کیا تم نے میرے لیے کچھ کیا ہے؟“

”ایسا زبردست دھماکا کیا ہے کہ پاپا ہل گئے ہیں۔ ان کا مال گودام تباہ ہو گیا ہے۔ کل رات فائر بریگیڈ والے گھنٹوں آگ بجھاتے رہے۔“

وہ خوشی سے جھوم گیا۔ ”ہائے کلپنا! تم نے تو کمال کر دیا۔ میں بھی کمال دکھاؤں گا، انعام کے طور پر تمہاری گود میں ایک بچہ ضرور دوں گا۔“

”تو پھر آ جاؤ۔ کہاں بھٹک رہے ہو؟“

”ابھی یہاں سے چلنے والا ہوں۔ چار یا پانچ گھنٹوں میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

وہ فون بند کر کے مکان کے اندر آیا۔ واجدہ نے کہا۔ ”ایسی کیا ضروری کال تھی کہ باہر گلی میں چلے گئے۔ تمہیں کوئی دیکھ لیتا اور پہچان لیتا تو؟“

اس نے اعتراف کیا۔ ”ہاں مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ اس سے پہلے سلمٰی سے کچھ ضروری باتیں کروں گا۔“

وہ سلمٰی کے ساتھ ایک کمرے میں آ گیا۔ دروازہ بند کر کے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”تم نے مجھے طلاق دینے کی بات کیوں کی؟ میں تم سے بات نہیں کروں گی۔“

”مجھے افسوس ہے۔ میں نے انتقام لینے کے جنون میں ایسا کہہ دیا۔ آئندہ یہ لفظ زبان پر نہیں لاؤں گا۔“

”تم دشمنوں سے نمٹنے کے لیے جرائم کے راستے پر چل پڑے ہو۔ تم نے چوری کی، قتل کیے... آگے اور نہ جانے کیا کرنے والے ہو؟“

”آگے یہ کیا ہے کہ شنکر دادا کے مال گودام کو آگ لگا دی ہے۔ اس نے میرے گھر کو آگ لگائی تھی۔“

سلمٰی نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تم یہاں ہو، وہاں آگ کیسے لگائی ہے؟“

”بندوق چلانے کے لیے کبھی دوسروں کے کاندھے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ مردوں کے کھیل ہیں، تم نہیں سمجھو گی اور نہ ہی تمہیں سمجھنا چاہیے۔ تم یہاں رہو یا جہاں جی چاہے وہاں رہو۔ میں اس دشمن کو خاک میں ملانے کے بعد واپس آؤں گا۔“

وہ بیگ کھولتے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس چھ لاکھ روپے ہیں۔ تمہیں چار لاکھ دے کر جا رہا ہوں۔ تم اسکول میں پڑھایا کرتی تھیں۔ اب اپنا ایک اسکول قائم کر لو۔“

”میں چوری کا ایک پیسا نہیں لوں گی۔ محنت مزدوری کر کے جی لوں گی۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔ تمہاری روزی روٹی کا انتظام کر کے نہیں جاؤں گا تو تمہاری فکر ستاتی رہے گی۔“

”میری فکر نہ کرو۔ میں اکیلی جان ہوں۔ کسی طرح جی لوں گی۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کسی طرح نہیں، جس طرح میں کہہ رہا ہوں، میرے اطمینان کی خاطر اس طرح جیو گی۔"

"میں نے کہہ دیا نا، چوری کے پیسے نہیں لوں گی۔"

"میں چور ہوں، بدمعاش ہوں... میری شریکِ حیات بن کر رہنا ہے تو میری بدمعاش کمائی قبول کرتی رہو۔ ورنہ اپنا راستہ الگ کر لو۔ میں وہ لفظ زبان پر نہیں لاؤں گا۔ آگے تم سمجھ لو۔"

وہ روتے ہوئے اس کے سینے سے لگ گئی۔ وہ اسے پیار کرنے لگا اور سمجھانے لگا۔ وہ بڑی دیر تک پیار میں گم رہے۔ پھر اس نے نوٹوں کی موٹی موٹی گڈیاں نکال کر اس کے سامنے بیڈ پر رکھیں۔ سلمٰی نے اپنے پاس ایک لاکھ روپے گن کر رکھے۔ باقی اسے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے لیے بہت ہیں۔ میں گھر میں بچوں کو پڑھاؤں گی۔ اگر کبھی ضرورت ہوئی تو تم سے مانگ لوں گی۔"

اس نے کہا۔ "ایک موبائل فون خریدو پھر کال کرو۔ مجھے فون کے ذریعے تمہاری آواز کی خوشبو ملتی رہے گی۔"

وہ فرطِ محبت سے لپٹ گئی۔ یہ بات اس کے لیے تکلیف دہ تھی کہ وہ جرائم کی راہوں پر چل پڑا تھا۔ وہ اپنے دل سے اپنی محبت سے مجبور تھی۔ اسے چھوڑ نہیں سکتی تھی۔

وہ ایک گھنٹے بعد کمرے سے باہر آئے۔ عمر نے واجدہ سے کہا۔ "میں اسے آپ کے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ کوئی مسئلہ درپیش ہو تو فوراً مجھے فون پر اطلاع دیں۔ میں مسائل سے نمٹنے دوڑا چلا آؤں گا۔"

اس نے مکان سے باہر آ کر موٹر سائیکل کو چیک کیا۔ پھر اس پر بیٹھ کر سلمٰی پر ایک الوداعی نظر ڈالی۔ وہ دھاروں آنسو رو رہی تھی۔ وہ سر جھکا کر گاڑی اسٹارٹ کر کے وہاں سے جے پور کی طرف چل پڑا۔

آگے کی پلاننگ یہ تھی کہ بھوانی شنکر کو خاک میں ملانے تک کلپنا کے ساتھ رہنا تھا۔ پھر اسے چھوڑ دینا تھا کیونکہ وہ ماں بننے کے بعد خود ہی اسے چھوڑ دینے والی تھی۔

اور ماں نہ بننے کی صورت میں بھی وہ اپنے پچھلے دو علاج کرنے والوں کو چھوڑ چکی تھی۔ اسے بھی چھوڑ دیتی۔ لہٰذا ان کے درمیان عشق و محبت کا سلسلہ جاری رہنے والا نہیں تھا۔ دونوں اپنی اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کم از کم سال بھر ساتھ رہنے والے تھے۔

وہ تیز رفتاری سے فاصلے طے کرتا ہوا اسی کھنڈر میں آ کر رُک گیا۔ وہ اپنی موٹر سائیکل کی وجہ سے پہچانا جا سکتا تھا۔ اسے اسی کھنڈر میں چھوڑ کر آگے جانے والا تھا۔ فی الحال وہاں آرام سے بیٹھ کر اس نے کلپنا سے رابطہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ "کہاں ہو؟ اور کتنی دیر میں آ رہے ہو؟"

اس نے کہا۔ "چتوڑ گڑھ سے شمال مغرب کی طرف ایک کچا راستہ گیا ہے۔ اِدھر ایک صدیوں پرانی عمارت کھنڈر بنی ہوئی ہے۔ میں ابھی اسی کھنڈر میں ہوں۔ اپنی موٹر سائیکل کی وجہ سے پہچانا جاؤں گا۔ اس لیے اسے یہیں چھوڑ دوں گا۔"

"پھر یہاں تک کیسے آؤ گے؟"

ہائی وے تک پیدل جاؤں گا۔ پھر کسی بس میں بیٹھ کر آؤں گا۔"

"ایسی غلطی نہ کرنا۔ جب سے وہ دھماکا کرایا ہے، پاپا پاگل ہو گئے ہیں۔ ان سے کروڑوں روپے کا نقصان برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ وہ خود ہی گاڑیاں لے کر پولیس اور غنڈوں کے ساتھ تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ تمام چھوٹے بڑے شہروں کی پولیس اور کرائے کے بدمعاش بھی جگہ جگہ تمہاری بو سونگھ رہے ہیں۔"

"تمہارے پاس کسی طرح تو آنا ہوگا۔"

"تم نہ آؤ۔ اسی کھنڈر میں رہو۔ میں گاڑی لے کر آ رہی ہوں۔"

"واہ... اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں بےخوف و خطر تمہارے گھر پہنچ جاؤں گا۔"

"میں ابھی نکل رہی ہوں۔ انتظار کرو۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ وہ مسکرا کر سوچنے لگا۔ "شطرنج کی بساط پر کلپنا بہت طاقتور مہرہ ہے۔ میں اس کی ممتا سے کھیل کر بھوانی شنکر کے خلاف کامیاب چالیں چلتا رہوں گا۔"

اس نے اپنے فون کو دیکھا پھر نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ پھر بھوانی شنکر کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟ جلدی بولو۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔"

عمر نے کہا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے۔ تیرے پاس ٹائم کم رہ گیا ہے۔ مال گودام کے بعد تیرے پرخچے اُڑنے والے ہیں۔"

وہ ایک دم سے چیخ کر بولا۔ "تو۔ تو عمر دراز ہے؟ بول تو وہی کتا ہے نا...؟"

"خود بھونک رہا ہے اور مجھے گالی دے رہا ہے۔ میری ماں اور بہن کی موت کتنی مہنگی پڑ رہی ہے، یہ حساب آج سے لکھنا شروع کر دے۔"

"اے سچ سچ بول، کیا تو نے میرے گودام میں دھماکا

کیا ہے؟ نہیں۔ میں نہیں مانتا۔ تو اِدھر ٹاؤن میں نہیں ہے اور تیری اوقات کیا ہے؟ اتنی بڑی واردات کرنے کے لیے ہماری طرح ڈان بننا پڑتا ہے۔"

"میں اسی ٹاؤن میں ہوں۔ تیرے بہت قریب ہوں۔ مگر تو اور تیرے کتے مجھے ڈھونڈ نہیں پائیں گے۔ تجھے جلد ہی یقین ہو جائے گا کہ میں نے تیری تکا بوٹی کرنے کے لیے ایک بہت مضبوط گینگ بنا لیا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اس کی فون کال بھوانی شنکر کے لیے دوسرا دھماکا تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک دوکوڑی کے ملازم نے آر ایکس ڈی جیسے بم سے گودام کو اُڑایا ہے۔ وہ دھماکا ایسا لرزہ خیز تھا کہ صوبائی دارالسلطنت جے پور سے ہوم منسٹر اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران کھری ٹاؤن آ گئے تھے۔ بڑے پیمانے پر انکوائری ہو رہی تھی۔

ایسے وقت بھوانی شنکر نے چیخ کر انٹیلی جنس کے چیف سے کہا۔ "ابھی عمر دراز نے فون کیا تھا۔ اس نے اپنی زبان سے کہا ہے کہ اسی نے میرے گودام میں دھماکا کیا ہے اور وہ یہاں ٹاؤن میں موجود ہے۔"

چیف نے اپنے سراغ رسانوں اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ کھری ٹاؤن کے ایک ایک گھر کی اور ایک ایک شخص کی تلاشی لی جائے۔ پاکستان کی سرحدی پٹی کی سختی سے نگرانی کی جائے۔ وہ اپنی سلامتی کے لیے سرحد پار کر سکتا ہے۔

ہوم منسٹر نے بھوانی شنکر سے کہا۔ "تمہارے فون پر اس کا نمبر آیا ہوگا۔ اسے کال کرو۔ میں بات کروں گا۔"

اس نے وہ نمبر پنچ کیے۔ منسٹر نے فون کو کان سے لگایا۔ رابطہ ہونے پر عمر کی آواز سنائی دی۔ "بول کتے دادا... تیرا سکون غارت ہو رہا ہے؟"

ہوم منسٹر نے اسے ڈانٹا۔ "یو شٹ آپ۔ ہم ہوم منسٹر وکرم جادیو بول رہے ہیں۔ کیا تم عمر دراز ہو؟"

"جی حضور! میں عمر دراز ہوں۔"

"کیا تم نے یہاں کے گودام میں بم دھماکا کیا ہے؟"

"حضور! پہلے شنکر دادا نے میرا گھر جلایا۔ میں نے اس کے جواب میں اس کے گودام کو جلا دیا۔"

"تم قانون کو ہاتھ میں نہ لو۔ ہمارے پاس آؤ۔ تمہیں انصاف ملے گا۔"

"تو پھر پہلے انصاف کریں۔ بھوانی شنکر نے صرف میری ماں اور بہن کو ہی ہلاک نہیں کیا ہے اور بھی کئی قتل کیے ہیں۔ میں ان کے چشم دید گواہ پیش کروں گا جب وہ خبیث عدالت میں پیش ہوگا۔ جب اسے ڈرگ کا سب سے بڑا اسمگلر اور قاتل تسلیم کر کے سزا دی جائے گی، تب میں خود کو گرفتاری کے لیے ضرور پیش کروں گا۔"

"پہلے خود کو پیش کرو۔ بھوانی شنکر کو ضرور سزا ملے گی۔ ہم پر بھروسا کرو۔"

"آپ پر سے عوام کا بھروسا اُٹھ گیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ آپ اور پولیس والے بھوانی شنکر کی سرپرستی فرماتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی اُس کالے چور کے پاس بیٹھے ہیں۔ اس کے موبائل فون سے باتیں کر رہے ہیں لیکن اسے گرفتار نہیں کر رہے ہیں۔"

"تم فضول باتیں کر رہے ہو۔ یہ نہ سمجھو کہ قانون کی گرفت سے بچے رہو گے۔ ہم نے اِدھر کی پاکستانی سرحد سیل کر دی ہے۔ تم پناہ لینے کے لیے سرحد پار نہیں جا سکو گے۔"

"کون کمبخت جا رہا ہے؟ انڈیا میرا دیس ہے۔ میں اپنی دھرتی سے تمہارے جیسے رشوت خوروں اور حرام خوروں کا خاتمہ کرتے کرتے جان دے دوں گا۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ وکرم جادیو نے بھوانی شنکر اور مہاراج کو دیکھ کر فون دیتے ہوئے کہا۔ "اس کے پیچھے کوئی بہت بڑی طاقت ہے جو اسے دولت اور ہتھیار دے رہی ہے۔ وہ خطرناک واردات کرنے والے مجرموں کو خرید رہا ہے، تب ہی ہمارے جیسے منسٹروں کو چیلنج کر رہا ہے۔"

وہ تنبیہ کے طور پر انگلی اُٹھاتے ہوئے بولا۔ "ہوشیار ہو جاؤ۔ اس کی باتوں سے، اُس کے لہجے سے اور اس کے ایکشن میں رہنے سے پتا چل رہا ہے کہ اب وہ کوئی معمولی ملازم نہیں رہا ہے۔"

مہاراج نے کہا۔ "ہم اسے پہلے کی طرح دوکوڑی کا بنا دیں گے۔"

وکرم جادیو نے کہا۔ "ڈینگیں مارنے سے چیونٹی بھی نہیں مرتی اور وہ ہاتھی بن چکا ہے۔ سچ کو تسلیم کرو اور عقل سے سوچو، اس کے یہی تیور رہے تو وہ ڈان بن کر بھوانی شنکر کی جگہ لے لے گا۔"

"اس کا باپ بھی میری جگہ نہیں لے سکے گا۔ میں اسے زندہ نہیں رہنے دوں گا۔"

انٹیلی جنس کے چیف نے کہا۔ "اسے پکڑ سکو گے، تب زندہ نہیں چھوڑو گے۔ ہم اسے ڈھونڈنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ تم کہاں ڈھونڈو گے اور کہاں اسے مارو گے؟"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "دو روز پہلے تک وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑتا تھا۔ مجھے مائی باپ کہتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا، دو ہی دنوں میں اتنا طاقتور کیسے ہو گیا؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

مہاراج نے کہا۔ ”وہ میرے چھ لاکھ روپے سے مجرموں کو خرید کر طاقت دکھا رہا ہے۔ چھ ہی دنوں میں روپے ختم ہوجائیں گے تو جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔“

انٹیلی جنس کے چیف نے اپنے سراغ رسانوں سے کہا۔ ”وہ اسی ٹاؤن میں یا آس پاس کے علاقوں میں چھپا ہوا ہے۔ اگر ممبئی، دہلی، کولکتہ اور مدراس کی طرف نکل جائے گا تو پھر ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہم ان علاقوں کی پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے محتاج ہوجائیں گے۔ اسے کسی بھی طرح یہیں گرفتار کرنے کی کوشش کرو۔“

ہوم منسٹر، انٹیلی جنس کا چیف، بھوانی شنکر اور مہاراج اپنے اپنے ماتحتوں اور کارندوں کو فون کرنے لگے۔ انہیں عمر کی گرفتاری پر انعام کا لالچ دینے لگے۔ اسے کسی بھی طرح پکڑنے کی ہر ممکن کوششیں کی جارہی تھیں۔

☆☆☆

کھنڈر کے چاروں طرف ویرانی تھی۔ ادھر سے کم ہی لوگ گزرتے تھے۔ عمر نے دیکھا بہت دور سے ایک کار چلی آرہی تھی۔ اس نے فون پر پوچھا۔ ”میں ایک کار کو آتے دیکھ رہا ہوں۔ کیا تم آرہی ہو؟“

کلپنا نے کہا۔ ”ہاں... کھنڈر سے باہر آجاؤ۔“

وہ بیگ اُٹھا کر باہر کھلی جگہ آگیا۔ کار اس کی طرف چلی آرہی تھی۔ دور ہی سے پتا چل رہا تھا کہ کار بہت مہنگی ہے۔ وہ اندھی دولت کمانے والے اسمگلر باپ کی بیٹی تھی۔ شوہر بھی کسٹم آفیسر تھا۔ جے پور کے ائرپورٹ سے اس کی بھی اندھی کمائی تھی۔

اس نے قریب آکر کار روک دی۔ عمر نے دروازہ کھولا۔ اس نے باہر آکر اسے سر سے پاؤں تک تعریفی نظروں سے دیکھا۔ پھر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ”زبردست ہو۔ اپنی طرف کھینچ لیتے ہو۔ جب پہلی بار تمہیں کھری ٹاؤن میں دیکھا تھا، تب ہی تم پر دل آگیا تھا۔“

وہ خاموشی سے ایسا جواب دینے لگا کہ وہ بولنا بھول گئی۔ پھر سانسیں درست کرتے ہوئے بولی۔ ”گھر چلو۔“

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آئی۔ وہ دوسری طرف سے آکر اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کلپنا نے کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے چلتے ہوئے پوچھا۔ ”میرے پتی دیو کا نام جانتے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”نہیں۔“

”وجے شرما۔ وہ ایک کسٹم افسر ہیں۔ ان کی ڈیوٹی کا وقت بدلتا رہتا ہے۔ کبھی تمام رات گھر نہیں آتے، کبھی دن کو ڈیوٹی پر جاتے ہیں۔ اسی حساب سے میں کبھی دن کو کبھی رات کو تمہارے پاس آتی رہوں گی۔“

”میرا ٹھکانا کہاں ہوگا؟“

”ہماری ایک عالی شان کوٹھی ہے اور ایک سرکاری خوبصورت سا بنگلا ہے۔ تم اس بنگلے میں رہو گے۔ ایک ملازمہ اور ایک ملازم میرے رازدار ہیں۔ وہ تمہاری خدمت کرتے رہیں گے۔“

”کیا تمہارے پتی دیو وجے شرما مجھے اپنا رقیب نہیں سمجھیں گے؟“

”نہیں۔ وہ کبھی بنگلے کی طرف نہیں آئیں گے اور تم کبھی بنگلے سے باہر نہیں نکلو گے۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے تمہیں تلاش کررہے ہیں۔“

”کیا پولیس والے بنگلے میں کبھی آسکتے ہیں؟“

”کوئی نہیں آئے گا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ وہ بنگلا بھوانی شنکر کی بیٹی اور داماد کا ہے۔ ویسے تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔ تم کھڑکی سے بھی نہیں جھانکو گے۔“

”میں تو قیدی بن کر رہ جاؤں گا۔ مجھے دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے باہر نکل کر بہت کچھ کرنا ہے۔“

”اگر پولیس کی حراست میں رہنے کا شوق ہے تو ضرور باہر نکل جانا۔ میں نے اپنے باپ کے گودام کو کھنڈر بنا دیا ہے۔ انہیں کروڑوں روپے کا نقصان پہنچایا ہے، کیا تمہاری تسلی نہیں ہوئی؟ کیوں باہر نکلو گے؟“

”تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ میں تمہاری جتنی بھی تعریفیں کروں، وہ کم ہوں گی۔ لیکن میں مرد ہوں۔ عورتوں کی طرح چار دیواری میں بیٹھا رہوں گا تو دشمنوں سے انتقام نہیں لے سکوں گا۔“

”کیا ضروری ہے کہ تم باہر نکلو۔ تمہارا جو بھی کام ہوگا، وہ میں کروں گی۔“

”میں مانتا ہوں، تم میرا کام کرتی رہو گی۔ تم بھی یہ مان لو کہ ہماری یہ خفیہ دوستی زیادہ دنوں تک نہیں چلے گی۔ جیسے ہی تم ماں بنو گی، میرا ساتھ چھوڑ دو گی۔“

”تمہارے منہ میں گھی شکر، میں ماں بن جاؤں گی تو تمہیں سر آنکھوں پر بٹھاؤں گی۔ تمہیں بے یار و مددگار رہنے کے لیے نہیں چھوڑوں گی۔“

”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میری ایک بیوی ہے۔ مجھے اس کے ساتھ بھی رہنا ہے۔“

”مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ بیوی والے ہو؟“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تمہیں اس سے کچھ لینا دینا

نہیں ہے۔“

”میں جب تک ماں نہیں بنوں گی، تب تک کسی سوکن کو برداشت نہیں کروں گی۔“

”اور میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ وہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ میری جان ہے۔“

”یوشٹ اپ۔ ایسے الفاظ صرف میرے لیے کہو۔ مجھ سے بھرپور محبت کرو گے تو بچہ خوبصورت اور ذہین ہوگا۔“

”تمہارا بچہ تمہاری طرح خوبصورت ہوگا۔ اپنے بھگوان پر بھروسا رکھو۔“

”کچھ بھی ہو۔ جب تک میرے پاس رہو گے، اس کے پاس نہیں جاؤ گے۔“

اس نے بڑے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”میں نے سلمٰی کو حاصل کرنے کے لیے تمہارے باپ سے دشمنی مول لی ہے اور صرف تمہارے باپ سے ہی نہیں مہاراج، پولیس اور انٹیلی جنس والوں سے بھی نمٹ رہا ہوں۔“

”تم نہیں، میں نمٹ رہی ہوں۔ تمہیں ان سے چھپا رہی ہوں۔ تم نے پاپا کو صرف چند ہزار کا اور مہاراج کو چھ لاکھ روپے کا نقصان پہنچایا ہے۔ میں نے تو ان کے کروڑوں روپے ڈبو دیے ہیں۔“

”مجھے طعنے نہ دو۔ تم نے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کی خاطر یہ واردات کرائی ہے۔ مجھ پر احسان نہیں کیا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ تمہاری اس حرکت سے دشمنوں پر میری دہشت طاری ہوگئی ہے۔ اور میں کیا ہوں... اور کیا کرسکتا ہوں، یہ آنے والا وقت بتائے گا۔“

اس نے کن انکھیوں سے کلپنا کو دیکھا پھر کہا۔ ”یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ بیٹی اپنے باپ سے نفرت کیوں کر رہی ہے؟ ٹھیک ہے کہ اس نے تمہاری ماں کو اور تمہارے نانا کو رازداری سے قتل کرایا تھا۔ بے شک بیٹی کو باپ سے شکایت کرنی چاہیے مگر نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ یہ خلافِ فطرت ہے۔ بیٹیاں اپنے باپ کو جان سے زیادہ چاہتی ہیں۔“

وہ ذرا چپ رہی پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”ہاں۔ میں اپنے پاپا کو جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔ اس لیے انہیں برباد کردینا چاہتی ہوں۔“

”یہ کیا بات ہوئی کہ ڈیڈی کو جان سے زیادہ چاہتی ہو اور پاپا کو برباد کردینا چاہتی ہو؟“

وہ بڑی نفرت سے بولی۔ ”کیونکہ جسے میں پاپا کہتی ہوں، وہ میرا باپ نہیں ہے۔“

عمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ہائی وے پر طوفانی رفتار سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ ان لمحات میں اس کے اندر آندھیاں چل رہی ہوں گی۔

وہ چپ ہوگئی تھی۔ آندھیوں سے لڑ رہی تھی۔ عمر نے پوچھا۔ ”کیا بھوانی شنکر یہ جانتا ہے؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں۔ ممی نے کئی بار پاپا سے کہا کہ وہ اپنا میڈیکل چیک اپ کرائیں۔ لیکن وہ بڑے گھمنڈ سے کہتے تھے کہ مجھے ڈاکٹری رپورٹ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ایک یہاں اور ایک جیسلمیر میں میری دو رکھیل ہیں۔ دونوں کی گود میں میرے بچے ہیں۔ داشتاؤں سے ہونے والی اولاد کو دنیا کے سامنے اپنی نہیں کہنا چاہتا۔ چپ چاپ ان بچوں کا خرچ اُٹھاتا رہتا ہوں۔“

کلپنا نے ناگواری سے کہا۔ ”پاپا خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ ان کی داشتائیں انہیں اُلو بنا رہی تھیں جبکہ وہ بانجھ تھے۔ اگر چیک اپ کرائیں گے تو آج بھی میڈیکل رپورٹ یہی کہے گی کہ وہ مرد تو ہیں لیکن باپ بننے کے قابل نہیں ہیں۔“

”تمہارے اپنے فادر کون ہیں؟ کہاں ہیں؟“

وہ سختی سے ہونٹوں کو بھینچ کر چپ رہی پھر بولی۔ ”میرے وہ ڈیڈی بہت اچھے تھے۔ جب میں اٹھارہ برس کی تھی اور میری شادی ہونے والی تھی، تب میں نے انہیں دیکھا تھا۔

”میری ممی نے تنہائی میں مجھ سے کہا... ’تم بالغ ہوگئی ہو، سہاگن بننے والی ہو۔ تمہیں یہ سچ معلوم ہونا چاہیے کہ جسے تم پاپا کہتی ہو، وہ ہاتھی کا دانت ہے، صرف دکھانے کے لیے۔ اصل کھانے والا دھن راج ورما ہے جس سے تم مل چکی ہو۔ وہ چاہتا ہے، تم ایک بار ڈیڈی کہہ کر اس کے سینے سے لگ جاؤ۔‘

”میں نے پہلے دور سے ڈیڈی کو دیکھا تو عجیب سا لگا۔ چشم زدن میں میری ولدیت بدل گئی تھی۔ ویسے ان کی شخصیت بڑی بھاری بھرکم اور پُرکشش تھی، میں پاس آکر ڈیڈی کہہ کر ان کے سینے سے لگ گئی۔

”حقیقت معلوم ہونے پر پاپا مجھے اجنبی اور پرائے پرائے سے لگنے لگے۔ ڈیڈی کی طرف دل کھنچنے لگا تھا۔ وہ بہت ہی اچھے انسان تھے۔ پھر میری شادی ہوگئی۔ دو سال تک ڈیڈی کبھی کبھی آتے رہے اور مجھے بھرپور محبتیں دیتے رہے۔ ایک دن پاپا نے ممی کو ڈیڈی کے ساتھ تنہائی میں دیکھ لیا۔ نتیجہ ظاہر تھا، دوسرے ہی دن میرے ننھیال میں میرے نانا اور ممی کی لاش پائی گئی۔ ڈیڈی وہاں سے بہت پہلے جاچکے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔ اس لیے محفوظ رہے۔
"میں ان سے ملنے کے لیے بے چین رہتی تھی۔ جے پور میں ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ مجھ سے چھپ کر ملنے آیا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ پاپا نے میری ممی اور نانا کی ہتیا کرائی ہے پھر کہا۔ 'شاید میرا بھی آخری وقت آگیا ہے۔ بھوانی شنکر مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں یہاں سے بہت دور جا رہا ہوں۔ زندگی رہی تو کبھی تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔'
"انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر پیار کیا پھر چلے گئے۔ یہ بتادوں کہ ڈیڈی بھی مجرمانہ زندگی گزار رہے تھے اور اس کوشش میں تھے کہ پاپا کو اس سرحدی ٹاؤن سے کسی طرح بھگادیں یا مار ڈالیں۔ وہ اس پورے علاقے کے حکمران بننا چاہتے تھے۔"
عمر نے کہا۔ "اب وہ ہمارے ساتھ مل کر بھوانی شنکر کو ختم کرسکیں گے؟"
"ڈیڈی کبھی واپس آئیں گے تو ان سے یہی کہوں گی۔ ابھی تو وہ کہیں روپوش ہیں۔ پاپا کے آدمی انہیں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔"
"کیا انہیں کبھی شبہ ہوا ہے کہ تم ان کی بیٹی نہیں ہو؟"
"کیسے شبہ ہوگا؟ جب میں بیس برس کی تھی' تب پاپا نے ممی کو اور ڈیڈی کو تنہائی میں دیکھا تھا۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ ممی حال ہی میں گمراہ ہوئی ہیں۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بیس برسوں سے ان کا رومانس چلا آرہا ہے اور میں ان کے رومانس کی پیداوار ہوں۔"
وہ گاڑی کو ایک موڑ پر موڑتے ہوئے بولی۔ "مرد کو اپنی مردانگی پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ پاپا کو ناز تھا کہ وہ تین بچوں کے باپ ہیں۔ تیسری میں تھی۔ مجھ سے پہلے ان کی داشتائیں انہیں باپ بننے کی سند دے چکی تھیں۔"
عمر پچھلے چوبیس گھنٹوں سے اس کشمکش میں تھا کہ اسے کلپنا پر بھروسا کرنا چاہیے یا نہیں؟ یہ اندیشہ تھا کہ کسی وقت بیٹی کے دل میں باپ کی محبت اُمنڈ آئے گی تو وہ باپ کی گود میں چلی جائے گی۔ ایسے وقت عمر کی شامت آجائے گی۔ وہ دھوکے میں مارا جائے گا۔
اب معلوم ہوا کہ شنکر داداس کا باپ ہی نہیں ہے۔ تب ہی اس نے ماں کی اور نانا کی ہلاکت کا انتقام لینے کے لیے اسے بڑی بے دردی سے کروڑوں روپے کا نقصان پہنچایا تھا۔
وہ بولا۔ "میں تمہاری روداد سن کر متاثر ہو رہا ہوں۔ بھوانی شنکر صرف میری ماں اور بہن کا ہی نہیں' تمہاری ماں اور نانا کا بھی قاتل ہے۔"
"میں سوچتی رہتی تھی کہ کس طرح اس سے انتقام لوں۔ تنہا تھی۔ ڈر لگتا تھا کہ پکڑی جاؤں گی تو وہ بڑی بے دردی سے میری ہتیا کردے گا۔"
"میں ہوں نا۔ اب تم تنہا نہیں ہو۔"
"ہاں۔ تمہاری دلیری اور جواں مردی سے حوصلہ ہوا ہے۔ تب ہی میں نے پاپا کے گودام کو تباہ کرایا ہے۔"
"اتنا بڑا حملہ کرانے کے لیے تم نے کسی کرائے کے آدمی سے کام لیا ہوگا؟"
"نہیں وہ کوئی پیشہ ور مجرم نہیں ہے۔ اس کا نام چنڈی داس ہے۔ ایک عرصے سے میرا تابع دار ہے۔ وہ میرے ایک حکم پر دشمنوں کی تو کیا، اپنی گردن بھی کاٹ کر پھینک سکتا ہے۔"
"مجھے بھی ایسے وفاداروں کی ضرورت ہے۔"
"جب میں تمہاری ہوں تو سمجھو چنڈی داس بھی تمہارا تابع دار بن کر رہے گا۔"
وہ چپ رہا۔ اس نے دل میں کہا۔ "میں کبھی عورت پر بھروسا نہیں کروں گا۔ وہ بھی ایسی عورت جو یار بدلتی رہتی ہے، ہرگز نہیں۔ ایسی حماقت کبھی نہیں کروں گا۔ اپنے وفاداروں اور کرائے کے بدمعاشوں کی ایک الگ ٹیم بناؤں گا۔ اس میں کچھ عرصہ لگے گا۔ کوئی بات نہیں۔ خدا کے بعد صرف اپنی ذات پر بھروسا کروں گا۔"
وہ جے پور کے سرکاری بنگلے میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک ملازمہ اور ملازم نے ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر ان کا استقبال کیا۔ عمر نے انہیں توجہ سے دیکھا۔ ملازم اگرچہ بوڑھا تھا لیکن خاصا صحت مند اور قد آور تھا۔ خوبرو اور پُرکشش بھی تھا۔ اگر وہ دھوتی اور صدری کی جگہ پینٹ شرٹ میں ہوتا تو کوئی بہت ہی تعلیم یافتہ اور امیر کبیر شخص دکھائی دیتا۔
ملازمہ بھی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود صحت مند تھی۔ کسی بڑے گھرانے کی معزز خاتون دکھائی دیتی تھی۔ کلپنا نے ان سے کہا۔ "یہ تمہارے نئے مالک ہیں۔ آج سے ان کی خدمت کرو گے اور انہیں شکایت کا موقع نہیں دو گے۔"
انہوں نے کہا۔ "آج سے آپ ہمارے دیوتا ہیں۔ جس طرح دیوتا کی پوجا کرتے ہیں، اسی طرح ہم آپ کو پوجتے رہیں گے۔"
وہ عمر کے پاؤں چھونا چاہتے تھے۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ "ایسا نہ کریں۔ آپ دونوں میرے بزرگ ہیں۔"

پھر اس نے دل میں کہا۔ "بزرگ ہیں مگر بہروپیے لگتے ہیں۔ مجھ سے پہلے کلپنا کے دو یار یہاں آئے تھے۔ ان ملازموں نے ان کے بھی پاؤں چھو کر انہیں دیوتا کہا ہوگا۔ پھر ان کے ساتھ کیا ہوا تھا، مجھے معلوم ہے۔ یہ ایک دن مجھے بھی کچرے کی طرح بنگلے کے باہر پھینک دیں گے۔"
کلپنا نے اس کے ساتھ اندر آکر اس بنگلے کے تمام کمرے اور ضرورت کی چیزیں دکھائیں اور کہا۔ "اس کے علاوہ تمہاری جو بھی ضرورت ہوگی وہ فوراً پوری کردی جائے گی۔"
وہ ایک بیڈ روم میں آگئے۔ اس وقت وہ اس کے لیے ضروری نہیں تھی۔ وہ آرام کرنا چاہتا تھا لیکن وہ کلپنا کے لیے بہت ضروری تھا۔ وہاں انہوں نے اچھا خاصا وقت گزارا۔ یوں کلپنا نے سمجھ لیا کہ آئندہ بھی اچھی طرح وقت گزرتا رہے گا۔
اسے اپنی کوٹھی میں واپس جانا تھا۔ اس کا پتی دیو ڈیوٹی سے واپس آنے والا تھا۔ بنگلے سے جاتے وقت وہ بہت خوش تھی۔ بار بار کہہ رہی تھی۔ "آئی لو یو۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی۔"
ایسے وقت عمر کے فون سے رنگ ٹون سنائی دی۔ کلپنا جاتے جاتے رک گئی۔ اس کے فون کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "وہ دشمن پکار رہا ہوگا۔"
اس نے کہا۔ "نہیں، یہ بھوانی شنکر کا نمبر نہیں ہے۔ پتا نہیں کون ہے؟"
"اٹینڈ کرو گے تو معلوم ہوگا۔"
اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ پھر سلمٰی کی آواز سنتے ہی خوش ہو کر بولا۔ "ہائے سلمٰی! کیا تم نے فون خرید لیا ہے؟ کیا یہ تمہارے نئے فون کا نمبر ہے؟"
کلپنا کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ غصے سے فون کی طرف دیکھنے لگی۔ سلمٰی کہہ رہی تھی۔ "ہاں۔ یہ میرے فون کا نمبر ہے۔ اسے سیو کرلو۔ یہ بتاؤ تم کہاں ہو؟ تمہارے کھانے پینے اور رہنے کا ٹھکانا کہاں ہوگا؟ یہ سوچ کے دل گھبراتا ہے کہ کہیں دشمنوں کی نظروں میں نہ آجاؤ۔"
"میری فکر بالکل نہ کرو۔ میں ایک محفوظ جگہ ہوں اور بہت عیش و آرام سے ہوں۔"
وہ سلمٰی سے باتیں کرنے کے دوران کلپنا کے بگڑے ہوئے .... تیور دیکھ رہا تھا۔ اس نے فون پر کہا۔ "یہ نئی جگہ ہے۔ مجھے یہاں کے حالات کو اچھی طرح سمجھنا ہوگا۔ ابھی فون بند کرو۔ میں پھر کسی وقت کال کروں گا۔"
ان کا رابطہ ختم ہوگیا۔ اس نے کلپنا سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ ابھی تو تم چہک رہی تھیں، مجھ پر قربان ہو رہی تھیں۔"
وہ تڑخ کر بولی۔ "یہ کون تھی؟"
"میری شریکِ حیات۔ میری جان...."
"یو شٹ اپ! جب تک میں ہوں، تب تک میں ہی تمہاری جان ہوں۔ کوئی اور نہیں ہوگی۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔"
"میں رکھوں گا۔ ایک نیام میں رہے گی۔ دوسری ہاتھ میں۔ جب ہاتھ والی نیام میں جائے گی تو نیام والی ہاتھ میں آجائے گی۔"
وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ "میری بات کو مذاق میں نہ اُڑاؤ۔"
"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ جیسا تم کر رہی ہو ویسا میں کر رہا ہوں۔"
"میں کیا کر رہی ہوں؟"
"تمہارے پاس بھی دو تلواریں ہیں۔ ایک تمہارا پتی دیو گھر کے نیام میں پڑا ہے۔ ابھی وہاں جاؤ گی تو میں یہاں پڑا رہوں گا۔"
"فضول باتیں نہ بناؤ۔"
"یہ میری اور تمہاری زندگی کا سچ ہے۔ اگر یہ فضول باتیں ہیں تو اپنی دو تلواروں میں سے کسی ایک کو پھینک دو.... مجھ کو یا اپنے پتی دیو کو۔"
"تم مجھے غصہ دلا رہے ہو۔ میرے مزاج کو سمجھو۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گی کہ میرا مرد کسی اور کے پاس جائے۔"
"سلمٰی کو معلوم ہوگا تو وہ بھی یہی کہے گی کہ اس کا مرد کسی اور کے پاس نہ جائے۔"
وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ "میرا مقابلہ ایک دو کوڑی کی عورت سے نہ کرو۔ میرے سامنے اس کی اوقات ہی کیا ہے؟"
"میں اپنی محبت کی توہین برداشت نہیں کرتا۔ اس کی اوقات یہ ہے کہ وہ ایک شریف قانونی بیاہتا شریکِ حیات ہے اور تم میری داشتہ ہو۔"
وہ غصے کی شدت سے لرز گئی۔ حلق پھاڑ کر چیختی ہوئی ایک گل دان اُٹھا کر اسے مارنے کے لیے لپکی۔ اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے مارنا چاہتی تھی۔ اس نے اسے اُٹھا کر بیڈ پر پھینک دیا۔ وہ لاتیں چلانے لگی۔ وہ اس پر آکر چھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

گیا۔ اسے اچھی طرح دبوچ کر بولا۔ ”یہ نہ بھولو کہ وہ میری جان ہے۔ اس کے لیے میں نے اپنی زندگی کا رُخ بدل دیا ہے۔ اس کے لیے چور اور قاتل بن گیا ہوں۔ میرے اور اس کے درمیان جو بھی آئے گا، میں اسے دشمن سمجھ کر کچل ڈالوں گا۔“

وہ اس کے بوجھ تلے پگھل رہی تھی۔ اپنی انا اور ہٹ دھری بھول گئی تھی۔ وہ ایسا شکنجہ تھا کہ نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ ”اور سن لو کہ اس کی اوقات کیا ہے؟ میں اس کی خاطر تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“

وہ ایک چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ ”نہیں۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ مجھے ایک بچہ دو۔ پہلے جو بھی آئے، میرے تابع دار تھے۔ مرد تو تھے مگر میرے آگے جھکتے تھے۔ تم زبردست ہو۔ تم ضرور اولاد دے سکو گے۔ مجھے ماں بنا دو پھر چلے جاؤ۔“

وہ ایسے لپٹ گئی تھی کہ اسے چاروں ہاتھوں پاؤں سے جکڑ لیا تھا۔ وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”مجھے غصہ بہت آتا ہے، ایسے وقت میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتی ہوں۔ سب ہی کو باتیں سناتی ہوں۔ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتی مگر تمہاری گھر والی کو برداشت کروں گی۔ اس کے خلاف اب نہیں بولوں گی۔ تم نہ جاؤ۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ جاؤ گے تو تمہارے پیچھے پیچھے آؤں گی۔“

وہ اپنی غلطی اور بدمزاجی کا اعتراف کر رہی تھی۔ اس کی سلمٰی سے سمجھوتا کر رہی تھی۔ عمر نے بھی عارضی طور پر اس سے سمجھوتا کر لیا۔ لیکن دل میں یہ عہد کر لیا کہ اس پر کبھی بھروسا نہیں کرے گا۔

شام ہو گئی تھی۔ اب رات کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ اس نے اپنے پتی سے فون پر کہہ دیا۔ ”آج رات نہیں آؤں گی۔ بنگلے میں رہوں گی۔ فریج سے کھانا نکال کر گرم کر لو یا باہر جا کر کھا لو۔ میں صبح آؤں گی۔“

اس کے پتی وجے شرما نے کہا۔ ”تم نے وعدہ کیا ہے، اس تیسرے کو آزمانے کے بعد ناکامی ہوئی تو پھر یہ سلسلہ نہیں رکھو گی۔ صبر کرو گی اور اولاد کے بغیر جیو گی۔“

”ہاں۔ میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گی۔ اس کے بعد اور کوئی میری تنہائی میں نہیں آئے گا۔ میں تمہارے احساسات کو سمجھتی ہوں۔ تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔ میں تمہیں تکلیف نہیں پہنچاؤں گی۔ تم بہت اچھے ہو وجے! بھگوان کرے دو چار مہینوں میں پاؤں بھاری ہو جائیں۔ پھر میرے اور تمہارے درمیان کوئی نہیں آئے گا۔“

اس نے مزید کچھ باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ عمر نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اسے میرا نام اور میرے حالات بتائے ہیں؟“

”میں پاگل یا احمق نہیں ہوں۔ بے شک وجے میرا فرماں بردار لائف پارٹنر ہے۔ اس کے باوجود میں اس پر بھروسا نہیں کرتی ہوں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ میں نے پاپا کو کروڑوں روپے کا نقصان پہنچایا ہے اور پاپا کے دشمن کو یعنی تم کو یہاں چھپایا ہے۔“

عمر نے دل میں کہا۔ ”میں بھی تم پر بھروسا نہیں کروں گا۔ تم میری سلمٰی کو ہمیشہ برداشت نہیں کرو گی۔ تمہاری بدمزاجی کسی بھی دن مجھے اوندھے منہ گرا سکتی ہے۔“

پھر اس نے چونک کر سوچا۔ ”ہاں، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کلپنا نے جس طرح کسی کے ذریعے بھوانی شنکر کے گودام کو تباہ کرایا ہے، اسی طرح میری لاعلمی میں سلمٰی کو ہلاک کرا دے۔ یا خدا! میں نے اس پہلو سے سوچا ہی نہیں تھا۔ مجھے اس ناگن سے ہوشیار رہنا چاہیے۔“

ابھی وہ نہیں جانتی تھی کہ سلمٰی اودے پور میں ہے۔ ابھی اطمینان تھا کہ اس کے خلاف وہ کچھ نہیں کر سکے گی۔ فی الحال اس کے لیے اہم بات یہ تھی کہ وہ دشمنوں سے جنگ جاری رکھنے کے لیے کلپنا سے فائدہ اُٹھائے لیکن اس پر بھروسا نہ کرے۔

وہ معاوضہ لے کر واردات کرنے والے مجرموں سے براہِ راست رابطہ رکھنا چاہتا تھا۔ کھری ٹاؤن میں رام اوتار اس کے کام آ سکتا تھا۔ ایک اور کارندہ اپنے مالک شنکر دادا سے بدظن تھا۔ دادا نے ایک بار نشے کی حالت میں اس کی بیوی سے زیادتی کی تھی۔ وہ غریب ملازم اپنے مالک کے خلاف کچھ بول نہیں سکتا تھا اس لیے زہر کے گھونٹ پی رہا تھا۔

عمر اس کی نفرت اور غصّے سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ وہ غریب تھا۔ اسے اچھی خاصی رقم دے کر اپنے بہت سے کام نکال سکتا تھا۔ لیکن جگ دیو سے بات کرنے اور معاملات طے کرنے کے لیے اس کے پاس فون نہیں تھا۔

عمر نے اپنے ایک دوست ہمت راؤ سے رابطہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ ”ہیلو۔ کون؟“

عمر نے پوچھا۔ ”کیا تم میری آواز سے مجھے پہچان سکتے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”تم میرے دوست عمر دراز کی طرح بول رہے ہو... میں کیا سمجھوں؟“

”تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں عمر دراز بول رہا

ہوں۔“

”اگر عمر ہو تو تمہیں سلام کرتا ہوں۔ اپنی دوستی پر فخر کرتا ہوں۔ تم زبردست کمال دکھا رہے ہو۔ شنکر دادا انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ تم نے ایک زبردست دھماکا کرنے کے بعد آج اس کے دو باڈی گارڈز کو نرک میں پہنچا دیا ہے۔“

عمر یہ نہیں جانتا تھا کہ شنکر دادا کے دو باڈی گارڈز مارے گئے ہیں۔ وہ حیرانی سے یہ بات سن رہا تھا۔ ہمت راؤ کہہ رہا تھا۔ ”تم اسی شہر میں رہ کر واردات کر رہے ہو۔ لیکن مجھ سے نہیں مل رہے ہو۔ کیا مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟“

”تم پر بھروسا ہے اسی لیے تو ابھی تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ کیا میرے لیے مخبری کرو گے؟“

”دل و جان سے کروں گا۔ بھگوان کو ساکشی رکھ کر کہتا ہوں کہ میرا نام ہمت راؤ ہے مگر میں ہمت والا نہیں ہوں۔ موت سے بہت ڈرتا ہوں۔ بس خیال ہی خیال میں شنکر دادا کی ہتیا کرتا رہتا ہوں۔“

”موت سے ڈرنا چاہیے۔ کیونکہ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔ تم اس درندے کی ہتیا نہ کرو۔ میرے لیے صرف مخبری کرتے رہو۔ وہ جلد ہی حرام موت مارا جائے گا۔“

”میں مخبری کروں گا۔ تم تو جانتے ہی ہو، میں دادا کے دفتر میں چپراسی ہوں۔ یہاں آنے والے تمام اسمگلروں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اندر جو باتیں ہوتی ہیں، انہیں سنتا رہتا ہوں۔ اب یہ باتیں تمہارے پاس پہنچایا کروں گا۔“

”شاباش۔ میں ہر مہینے تمہیں پانچ ہزار روپے دیا کروں گا۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”پھر تو میں سر کے بل دوڑتے ہوئے تمہارا ہر کام کیا کروں گا۔“

”ابھی ایک کام کرو۔ جگ دیو سے فون پر بات کراؤ۔ وہ بھی اس ناگ کا ڈسا ہوا ہے۔ میرے کام آئے گا۔“

”عمر! سوچ سمجھ کر کسی پر بھروسا کرو۔ وہ شنکر دادا کا ایک خطرناک گن شوٹر کہلاتا ہے۔“

”فکر نہ کرو۔ میں تم میں سے کسی کو اپنا پتا ٹھکانا نہیں بتاؤں گا۔ نہ کوئی میرے قریب آ سکے گا، نہ مجھے نقصان پہنچا سکے گا۔“

”اچھی بات ہے۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔ اس سے تنہائی میں ملاقات ہوگی تو تم سے بات کراؤں گا۔“

عمر فون بند کر کے سوچنے لگا۔ ”بھوانی شنکر کے دو باڈی گارڈز کو ہلاک کرنا بچوں کا کھیل نہیں تھا اور کوئی یہ کھیل کھیل گیا تھا۔ کیا کلپنا کے اسی آلۂ کار چندی داس نے انہیں ہلاک کیا ہے؟“

اُدھر بھوانی شنکر اپنے مکان میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس مکان کے اندر اور باہر صرف تھانے دار کو اور اس کے خاص کارندوں کو آنے کی اجازت تھی۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اس کی موجودگی میں دونوں باڈی گارڈز مارے گئے تھے۔ کہیں سے ایک گولی آئی تھی اور اس کے سامنے کھڑا ہوا باڈی گارڈ نشانہ بن گیا تھا۔

بھوانی شنکر دوسرے گارڈ کے ساتھ چھپنے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ ایسے وقت ایک گولی اس کے کان کو چھو کر گزر گئی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گر پڑا تھا۔ تیسری گولی نے دوسرے گارڈ کا کام تمام کر دیا تھا۔

وہ بہت ہی جرأت مندانہ حملہ تھا۔ یہی کہا جا رہا تھا کہ عمر دراز نے بم دھماکے کے بعد یہ دوسری جرأت دکھائی ہے۔ اسے تلاش کرنے کے لیے اور بھوانی شنکر کو سیکیورٹی دینے کے لیے مسلح سپاہیوں کی تعداد بڑھا دی گئی تھی۔

ایک گھنٹے کے بعد ہمت راؤ نے اسے کال کی۔ اس نے فون۔ کان سے لگا کر پوچھا۔ ”کیا جگ دیو سے ملاقات ہوئی؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں، یہ لو۔ اس سے بات کرو۔“

پھر اسے جگ دیو کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو عمر! تم نے شنکر دادا کو للکار کر ہمارے حوصلے بڑھا دیے ہیں۔ جانتے ہو میں نے کیا کیا ہے؟“

”کیا تم بھی کچھ کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں... بہت کچھ کر رہا ہوں۔ تم نے اس کے گودام میں دھماکا کیا تھا۔ میں نے اس کے دو باڈی گارڈز کو اُڑا دیا ہے۔“

عمر نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا وہ حملہ تم نے کیا تھا؟“

”ہاں۔ میں بھی اس کا ایک باڈی گارڈ ہوں۔ وہ کبھی مجھ پر شبہ نہیں کرے گا کہ میں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ دراصل میں دادا کو جان سے مارنا نہیں چاہتا۔ اسے زخمی کر کے، اپاہج بنا کے زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے وہ ابھی سلامت ہے۔“

”یہ تم نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اسے زندہ تو چھوڑ دیا ہے لیکن بری طرح دہشت زدہ کر دیا ہے۔“

”عمر! پھر کہتا ہوں کہ تم سے حوصلہ ملا ہے۔ اگر ہم دونوں مل کر اس سے لڑتے رہیں گے تو وہ اپاہج بن کر رہ جائے گا۔“

”تم میرے دل کی بات کہہ رہے ہو۔ ویسے تم اسے اپاہج کرنے کی بات کرتے ہو۔ اس شیطان کو ہمیشہ کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ختم کرنا کیوں نہیں چاہتے؟"
"وہ مرجائے گا تو ہم سے شکست کھانے کی ذلت سے اسے نجات مل جائے گی۔ میں اسے اپاہج بنا کر زمین پر رینگنے والا کیڑا بنانا چاہتا ہوں۔ اسے دیکھ کر دوسرے عبرت حاصل کریں گے۔"
"درست کہتے ہو اسے مرنا نہیں چاہیے۔ ذلت آمیز زندگی گزارنی چاہیے۔ تم یہ بتاؤ کہ وہاں میرے لیے کیا کر سکتے ہو اور میں یہاں سے تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"
"تم جس دشمن کو کہو گے، اسے گولی سے اُڑا دوں گا۔"
"میں یہی چاہتا ہوں۔"
"تم سے ایک بڑی رقم چاہتا ہوں تاکہ ہم ہتھیار اور کرائے کے قاتلوں کو خرید سکیں۔ فی الحال مجھے تین جنگجو ساتھی مل گئے ہیں۔ ہر ایک کو بیس ہزار دینے ہوں گے۔"
"تم آج ہی جے پور آجاؤ۔ میں ایک لاکھ دس ہزار روپے دوں گا۔ تم دس ہزار ہمت راؤ کو دو گے۔ باقی ایک لاکھ اپنے کام میں لاؤ گے۔"
"میں جے پور نہیں آسکوں گا۔ میں دو گارڈز کی ہلاکت کے بعد دادا کا خاص باڈی گارڈ بن گیا ہوں۔ مجھے کھری ٹاؤن سے باہر جانے کی چھٹی نہیں ملے گی۔"
"کوئی بات نہیں۔ میں یہ رقم ہمت راؤ کے ذریعے تمہارے پاس پہنچاؤں گا۔"
اس سے رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اپنا ایک گینگ بنانے کے سلسلے میں جو سوچ رہا تھا' وہی ہو رہا تھا۔ وہ ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا اور دوسرے اس کے نام سے کام کر رہے تھے۔
تھوڑی دیر بعد ہمت راؤ نے فون پر کہا۔ "عمر! میں تمہاری اور جگ دیو کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ معلوم ہوا کہ تم لوگوں کو واردات کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ میری نظروں میں ایسے کئی بدمعاش ہیں۔ تم چاہو گے تو وہ پیسے لے کر تمہارا کام کرتے رہیں گے۔"
"ہاں، میں چاہتا ہوں۔ تم ان سے کم سے کم ریٹ پر معاملات طے کرو اور جے پور آؤ۔ میں رنبیر کے لیے ایک لاکھ روپے دوں گا اور تمہاری ضرورت کے مطابق رقم ادا کروں گا۔"
وہ بولا۔ "میں آج شنکر دادا سے گاؤں جانے کی چھٹی لوں گا۔ کل دن کو کسی وقت جے پور پہنچ کر تمہیں فون کروں گا۔"
"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

اسے کلپنا کے بنگلے میں چھپ کر رہنے کی جگہ مل گئی تھی۔ وہ فی الحال بہت محفوظ تھا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے ادھر نہیں آسکتے تھے۔ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ وہاں کب تک محفوظ رہ سکتا ہے؟
کلپنا تنک چڑھی تھی۔ حکمرانی کرنے والا مزاج رکھتی تھی۔ وہ سلمٰی کے خلاف سخت رویے کا مظاہرہ کرچکی تھی۔ پھر اس نے جلد ہی اسے سوکن کی حیثیت سے قبول بھی کرلیا تھا جبکہ آمرانہ مزاج رکھنے والی عورتیں کسی حال میں جھکتی نہیں ہیں۔
وہ نادان نہیں تھا' سمجھ رہا تھا کہ کلپنا نے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے عارضی طور پر سلمٰی کو برداشت کیا ہے۔ اسے بڑی مکاری اور بڑی راز داری سے ہلاک کرنے کی کوشش کرے گی اور جس دن ماں بننے کے آثار پیدا ہوں گے' وہ اسے بھی گرفتار کرا دے گی۔
اس کے بارے میں سوچتے ہی اس کی کال آگئی۔ وہ فون کو کان سے لگا کر بولا۔ "ہاں کلپنا! بولو؟"
وہ بولی۔ "ایک چونکا دینے والی خبر ہے۔ کسی نے پاپا پر گولیاں چلائی تھیں۔ وہ تو بچ گئے، ان کے دو باڈی گارڈز مارے گئے ہیں۔ بولو ہے نا چونکا دینے والی خبر...؟"
عمر نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین نہیں ہو رہا ہے؟"
"یقین کیوں نہیں ہوگا جبکہ میں نے ہی حملہ کرایا ہے۔"
وہ شدید حیرانی سے بولی۔ "کیا...؟ کیا تم نے حملہ کرایا ہے؟"
"حیران کیوں ہو؟ کیا صرف تمہارا آلۂ کار ہی واردات کرسکتا ہے؟"
"یہ بات نہیں ہے۔ میں سوچ رہی ہوں' تم نے اتنی جلدی کرائے کے قاتلوں کو کیسے خرید لیا؟"
"میں نے کہا تھا نا، مجھے اپنا محتاج نہ سمجھنا۔ آگے دیکھنا کہ میں کیا کرنے والا ہوں اور تم دیکھ رہی ہو۔ آئندہ بھی بہت کچھ دیکھو گی۔"
"او گاڈ... عمر! تم بہت خطرناک ہو۔ میں سمجھ رہی تھی یہاں میرے ساتھ عیش و عشرت میں مصروف رہو گے اور پاپا سے انتقام لینے کے سلسلے میں مجھ پر تکیہ کرتے رہو گے۔"
"اب سمجھ گئی ہو گی کہ مرد کیا ہوتے ہیں؟"
"ہاں، تم اور زیادہ پُرکشش ہو گئے ہو۔ دل تمہاری طرف کھنچا جا رہا ہے۔ میں شام ہونے کا انتظار کر رہی ہوں۔ رات ہوتے ہی دوڑی چلی آؤں گی۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تو پھر فون بند کرو اور مجھے نیند پوری کرنے دو۔ میں پچھلی رات سے جاگ رہا ہوں۔"

وہ رابطہ ختم کر کے بستر پر آ گیا۔ واقعی اسے سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ فون کو آف کر کے گہری نیند سو گیا۔ اب اس کے جاگنے تک کوئی کال اس کی نیند میں خلل ڈالنے والی نہیں تھی۔

اس کا یہ اندازہ درست تھا کہ کلپنا نے سلمٰی کو اوپری دل سے برداشت کیا تھا۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی بلکہ اس کے ماں بننے تک وہ سلمٰی کے پاس جائے اور عمر صاف طور سے کہہ چکا تھا کہ وہ صرف اس کی بیوی ہی نہیں محبوبہ بھی ہے۔

اور کلپنا اس محبوبہ کو راستے سے ہٹانے کی سوچ رہی تھی۔ یہ بات اس کے ذہن میں پک رہی تھی کہ وہ نہیں رہے گی تو عمر اس کے پیچھے نہیں جائے گا پھر جانے آنے میں یہ اندیشہ نہیں رہے گا کہ وہ کبھی پکڑا جائے گا اور اس کی گود میں بچہ دینے سے پہلے مارا جائے گا۔

یوں بھی وہ عمر دراز کی دراز عمر چاہتی تھی۔ اس پر دل آ گیا تھا۔ وہ کسی طرح سلمٰی کا پتا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتی تھی اور معلوم کرنا آسان نہ تھا۔ عمر اسے وہاں تک کبھی پہنچنے نہ دیتا۔ وہ بہت ضدی تھی۔ بڑے صبر سے کسی موقع کے انتظار میں تھی۔ اپنے ارادے سے باز آنے والی نہیں تھی۔

اور وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ عمر واردات کرنے والے مجرموں کو نہ خریدے۔ اپنا ایک الگ سے گینگ نہ بنائے۔ بھوانی شنکر سے نمٹنے کے لیے ہمیشہ اس کا محتاج رہے۔

وہ تمام دن آرام سے پھیل کر سوتا رہا۔ دوپہر کو کھانے کے لیے بھی اس کی آنکھ نہ کھلی۔ شام کو کروٹ بدلتے وقت اس نے نیند بھری آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا تو وہ کھلا ہوا تھا جبکہ اس نے سونے سے پہلے اسے اندر سے لاک کیا تھا۔

اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ صاف سمجھ میں آ گیا کہ کسی نے باہر سے چابی کے ذریعے اسے کھولا ہے۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ جو آیا تھا وہ جا چکا تھا۔ اس کا بیگ فرش پر پڑا ہوا تھا۔

اس نے بیڈ سے اُتر کر بیگ اُٹھایا۔ اسے کھول کر دیکھا۔ اس کا تمام سامان موجود تھا۔ صرف ایک گن، اس کا موبائل فون اور بیس ہزار روپے نہیں تھے۔

کوئی دروازے پر آیا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ وہاں دروازے پر کلپنا کا قابلِ اعتماد آلۂ کار چنڈی داس تھا۔ اسی نے بھوانی شنکر کے گودام میں دھماکا کیا تھا۔ عمر اسے کھری ٹاؤن میں برسوں سے پہچانتا تھا۔

وہ کمرے میں قدم رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے بیگ سے صرف ایک گن، ایک موبائل فون اور بیس ہزار روپے ملے۔ وہ چھ لاکھ...... کہاں ہیں؟"

عمر نے گھور کر پوچھا۔ "یہ دروازہ مقفل تھا۔ تم کیسے کھول کر آئے؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ مالکن نے کہا تھا، تمہاری نیند خراب نہ کی جائے۔ ورنہ میں تکیے کے نیچے اور میٹرس کے نیچے دیکھتا تو چھ لاکھ مل جاتے۔"

یہ کہہ کر وہ تکیے کی طرف بڑھا۔ عمر نے اچھل کر ایسی لات ماری کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے چلا گیا۔ پھر اس نے گھوم کر دوسری کِک ماری۔ وہ لات اس کے منہ پر پڑی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ستارے سے جلنے بجھنے لگے۔ پھر جب تک وہ سنبھلتا، عمر نے تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال کر کہا۔

"تم سمجھ رہے تھے، میرے پاس بیگ میں ایک ہی گن رکھی ہے۔ وہ تمہارے پاس ہے، میں نہتا ہوں۔ اس لیے تم بھی خالی ہاتھ چلے آئے۔ چلو زمین پر بیٹھ جاؤ ورنہ گولی چل جائے گی۔"

کلپنا کے بوڑھے ملازم نے باہر دروازے کی آڑ سے عمر کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "چنڈی داس پر گولی چلانے کی غلطی نہ کرنا۔ یہ دشمن نہیں ہے۔ مالکن نے اسے یہاں بھیجا ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ تمہارے پاس لاکھوں روپے نہ رہیں۔ تم واردات کرنے والوں کو نہ خریدو اور نہ باہر جا کر پولیس کی نظروں میں آؤ۔ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔"

وہ بول رہا تھا۔ ایسے میں عمر یکبارگی چھلانگ لگا کر ایک بڑی سی الماری کی آڑ میں چلا گیا۔ بوڑھے ملازم کے نشانے سے اوجھل ہو کر بولا۔ "تم لوگ دشمن ہو یا نہیں؟ لیکن خود غرض اور مکار ضرور ہو۔ مجھے دولت اور ہتھیار سے خالی کر کے اپنا تابع دار بنا کر رکھنا چاہتے ہو۔"

بوڑھے نے کہا۔ "ہمیں غلط نہ سمجھو۔ ہم سب مل کر بھوانی شنکر کو نرک میں پہنچانا چاہتے ہیں۔ تم ہمارے لیے بہت اہم ہو۔ گن پھینک دو۔"

"تم اپنی گن پھینکو اور سامنے آ کر گھٹنے ٹیکو، ورنہ یہ مارا جائے گا۔"

ملازمہ کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "مالکن فون پر موجود ہیں۔ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ گولی نہ چلانا۔ میں فون لے کر آ رہی ہوں۔"

"آؤ... مگر دور سے ہاتھ بڑھا کر دو۔"

اس نے یہی کیا۔ کمرے میں آ کر الماری کے قریب پہنچ کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ عمر نے اسے لیا۔ ان لمحات میں عمر کو غافل سمجھ کر چنڈی داس نے فرش پر سے اچھل کر دروازے کی طرف چھلانگ لگائی۔ پھر ٹھائیں کی آواز کے ساتھ وہ چیخ مارتا ہوا فرش پر گر پڑا۔

عمر غافل نہیں تھا۔ اس کی ٹانگ پر گولی ماری تھی۔ وہ فرش پر پڑا تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ عمر نے فون کو کان سے لگایا۔ کلپنا چیخ رہی تھی۔ "میں نے گولی چلنے کی آواز سنی ہے۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ عمر کو فون دو۔ اس سے میری بات کراؤ۔"

وہ غصے سے بولا۔ "چلاؤ مت۔ میں بول رہا ہوں۔ میں نے ابھی صرف ایک گولی چلائی ہے۔ تمہارے چنڈی کو صرف زخمی کیا ہے۔"

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟ ہم سب آپس میں دوست ہیں عمر!"

"مکار عورت! میرے لاکھوں روپے چرا کر مجھے ہتھیار سے محروم کر کے اپنا غلام بنانا چاہتی تھی۔"

"مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔ تمہارے سینے سے لگ کر اتنا پیار دوں گی کہ تمہاری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔"

"یہاں آؤ گی تو تمہیں بوڑھے ملازم کی لاش ملے گی۔ وہ ابھی مجھے نشانے پر رکھ کر گولی مارنے والا تھا۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "نہیں عمر! تم ان کی ہتیا نہیں کرو گے۔"

"میں تو کروں گا۔ اگر میں پھرتی نہ دکھاتا تو وہ چنڈی کو بچانے کے لیے مجھے گولی مار دیتا۔"

"نہیں، وہ صرف دھمکی دے رہے تھے۔ ہم سب نے طے کیا ہے کہ تمہارے جیسے دلیر مرد کو پاپا سے اور قانون کے رکھوالوں سے بچاتے رہیں گے۔ پلیز! ہمارے نیک ارادوں کو سمجھو۔"

"تمہارے نیک ارادوں کی ایسی کی تیسی۔ چلو اس بوڑھے کو ہلاک نہیں کروں گا، زخمی ضرور کروں گا۔"

وہ پھر چیخ پڑی۔ "زخمی بھی نہیں کرو گے۔ انہیں کچھ ہوا تو میں مر جاؤں گی۔ تمہیں حقیقت بتانی ہی ہو گی۔ جس طرح میں نے تمہیں دشمنوں سے چھپا کر رکھا ہے، اسی طرح ڈیڈی وہاں چھپ کر رہتے ہیں۔ وہ میرے ڈیڈی ہیں عمر!"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "واہ... کیا کمال کی عورت ہو۔ ایک ہی چھت کے نیچے باپ کو اور یار کو چھپا کر رکھا ہے۔ تم کیا سمجھ رہی ہو جہاں میرے کمرے میں چوری کی نیت سے گھس آنے والا چنڈی ہو اور مجھے گولی مارنے کی دھمکی دینے والے تمہارے ڈیڈی ہوں، وہاں میں رہوں گا؟"

وہ تڑپ کر بولی۔ "دیکھو عمر! مجھے چھوڑ کر جانے کی بات نہ کرنا۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں ابھی وہاں آ کر چنڈی کی مرہم پٹی کرانے کے بعد اسے واپس کھری ٹاؤن جانے کا حکم دوں گی۔ میرے ڈیڈی سے صلح کر لو۔ میری مجبوریوں کو سمجھو۔ وہ یہاں حفاظت سے ہیں۔"

"میری بھی مجبوری ہے۔ میں تمہاری جیسی عورت پر بھروسا نہیں کروں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا پھر کہا۔ "دھن راج ورما کلپنا نے تمہاری حقیقت بتا دی ہے۔ اگر صلح کرنا چاہتے ہو تو اپنا ہتھیار میرے سامنے پھینک دو۔"

ملازمہ نے کہا۔ "وہ نہیں ہیں۔ یہاں سے جا چکے ہیں۔"

"تم سب جھوٹے اور مکار ہو۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ وہ چھپ کر مجھ پر گولی چلائے گا۔ میں اس کے جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔"

عمر کی چلائی ہوئی گولی چنڈی داس کی ران کا گوشت ادھیڑتے ہوئے نکل گئی تھی۔ ملازمہ اس کی مرہم پٹی کر رہی تھی۔ عمر نے کہا۔ "دھن راج! میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ ہتھیار میرے سامنے پھینک کر کمرے میں آ جاؤ۔ ورنہ ذرا سی چالاکی تمہاری جان لے لے گی۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر اس کی آواز سنائی دی۔ "ابھی میری بیٹی نے فون پر کہا ہے کہ میں تمہاری بات مان لوں اور کسی بھی طرح تمہارا اعتماد حاصل کر لوں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک پستول دروازے سے آ کر کمرے کے فرش پر اس کے سامنے گرا۔ پھر دھن راج دونوں ہاتھ اٹھا کر سامنے آ گیا۔ عمر نے اس کا پستول اٹھا کر اپنے لباس میں رکھا پھر ان سے کہا۔ "تم تینوں باتھ روم میں جاؤ۔"

دھن راج نے کہا۔ "تم جو کہو گے، ہم وہی کریں گے۔ پہلے میری بات سن لو۔"

"پہلے باتھ روم میں جاؤ۔ میں کوئی بات نہیں سنوں گا۔ جلدی کرو ورنہ تمہاری ٹانگ میں بھی گولی لگے گی۔"

وہ فوراً ہی ملازمہ کے ساتھ باتھ روم میں چلا گیا۔ چنڈی داس بھی فرش پر گھسٹتا ہوا ان کے پیچھے چلا گیا۔ عمر نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ دھن راج کہہ رہا تھا۔ "عمر دراز! ہم سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ ہمیں معاف کر دو۔ ہم تم سے سچی دوستی کر کے دکھائیں گے۔"

اس نے میٹرس کے نیچے سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میں تم لوگوں کے قابو میں آجاتا تو تم سچی دوستی کی بات نہ کرتے۔ مجھے اپنا غلام بنا لیتے۔''

وہ اپنا بیگ اٹھا کر بولا۔ ''تمہاری بیٹی یہاں پہنچنے والی ہے۔ تمہیں جلد ہی باتھ روم سے رہائی مل جائے گی۔ میں بہت دور جا رہا ہوں۔''

اس نے کمرے سے باہر آکر بنگلے کے بیرونی دروازے کو کھولا۔ اس کھلے ہوئے دروازے سے یہ معلوم ہوتا کہ عمر دراز وہاں سے جا چکا ہے جبکہ اسے جانا نہیں تھا۔

وہ پلٹ کر پھر اسی بیڈ روم میں آیا۔ جہاں باتھ روم میں وہ تینوں قیدی تھے۔ وہ دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ دھن راج اپنی بیٹی سے کہہ رہا تھا۔ ''کلپنا! باپ کی جان! میں کیا کروں؟ اس نے میری ایک نہیں سنی۔ ہم تینوں کو باتھ روم میں بند کر کے یہ کہتا ہوا گیا ہے کہ وہ بہت دور جا رہا ہے۔''

عمر دراز نے جھک کر بیڈ کے نیچے دیکھا۔ وہاں نیچے دو بڑے صندوق رکھے ہوئے تھے۔ وہ فرش پر رینگتا ہوا ان صندوقوں کے پیچھے آکر بیڈ کے نیچے آرام سے لیٹ گیا۔ اس کمرے میں آنے والوں کو صندوقوں کی جھلک دکھائی دیتی۔ ان کے پیچھے وہ نظر نہ آتا۔

آدھ گھنٹے کے بعد ہی اونچی ایڑی کے سینڈل کی کھٹ پٹ سنائی دی۔ وہ آگئی تھی۔ اس نے کمرے میں آکر ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر باتھ روم کا دروازہ کھول دیا۔ وہ تینوں باہر آگئے۔ کلپنا نے پوچھا۔ ''کیا وہ سچ مچ چلا گیا ہے؟''

دھن راج نے کہا۔ ''ہم سے تو یہی کہا تھا۔ کیا باہر کا دروازہ کھلا ہوا ہے؟''

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ ''ہاں کھلا ہوا ہے۔ وہ جا چکا ہے۔ کیا آپ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے ایک دلیر اور جواں مرد کو کھو دیا ہے؟''

پھر وہ چنڈی سے بولی۔ ''اور تم نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ اس نے تمہارے جیسے سانڈ کو اپاہج بنا کر زمین پر بٹھا دیا ہے۔ پتا نہیں تم کتنے دنوں تک دونوں پیروں سے چل نہیں پاؤ گے۔''

وہ ادھر سے ادھر جاتے ہوئے رو پڑی۔ روتے ہوئے بولی۔ ''وہ مجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاتا۔ غلطی میری ہے۔ میں نے چنڈی کو چھ لاکھ اور اس کی گن چرا کر لانے کے لیے یہاں آنے کو کہا۔ وہ سمجھ رہا ہے' ہم دشمن ہیں جبکہ میں اس کی بھلائی چاہتی ہوں۔ وہ الگ سے اپنا گینگ بنائے گا تو کرائے کے بدمعاش اسے دھوکا دیں گے۔''

وہ پھر ادھر سے ادھر جاتے ہوئے بولی۔ ''میں کیا کروں؟ ابھی وہ نہ جانے کہاں گیا ہے؟ پولیس یا انٹیلی جنس والوں نے اسے پکڑ لیا تو مفت میں مارا جائے گا۔ اپنے آدمیوں کو فون کرو۔ ان سے کہو ابھی وہ اسی شہر میں ہوگا۔ اسے کسی طرح ڈھونڈ کر لائیں۔''

وہ اپنے فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے بولی۔ ''میں اسے واپس لانے والوں کو دس ہزار روپے دوں گی۔ اس سے بھی زیادہ دوں گی۔ اسے کسی طرح لے آؤ۔''

پھر وہ چنڈی سے بولی۔ ''تم چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے اس لیے گھر جاؤ۔ آرام کرو اور علاج کراؤ۔ جلد سے جلد دوڑنے بھاگنے کے قابل ہو جاؤ۔''

وہ لنگڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ دھن راج اپنے کرائے کے تابع داروں سے فون پر بول رہا تھا۔ انہیں عمر کا حلیہ بتا کر کہہ رہا تھا۔ ''اسے کسی بھی طرح صبح ہونے سے پہلے گھیر کر لے آؤ۔ وہ ابھی اسی شہر میں ہوگا۔''

ملازمہ بھی فون پر کسی کو ایسی ہی ہدایات دے رہی تھی۔ پھر اس نے فون بند کر کے کلپنا سے کہا۔ ''بیٹی! فکر نہ کرو۔ تم ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہو۔ دیکھ لینا' وہ صبح سے پہلے یہاں تمہارے سامنے ہوگا۔ ہمارے آدمی بہت ہی تیز طرار ہیں۔ اسے پولیس کے ہاتھ لگنے نہیں دیں گے۔ یہاں لے آئیں گے۔''

کلپنا نے کہا۔ ''ممی! عمر اُن سے بھی زیادہ تیز طرار ہے۔ کھری ٹاؤن سے لے کر یہاں تک پاپا کو اور قانون کے رکھوالوں کو تیزی دکھاتا آ رہا ہے۔ وہ ہمارے آدمیوں کے ہاتھ نہیں آئے گا۔''

کلپنا اس ملازمہ کو ممی کہہ رہی تھی۔ یعنی وہ اس کی دوسری ماں اور دھن راج کی بیوی تھی۔ وہ پورا خاندان ایک ہی چھت کے نیچے تھا۔ وہاں انہوں نے بھوانی شنکر کے خلاف ایک نیٹ ورک قائم کیا ہوا تھا۔

دھن راج نے کہا۔ ''بیٹی یقین کرو۔ وہ صبح سے پہلے یہاں ہوگا۔ دماغ کو ٹینشن فری کرو۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ آؤ ڈائننگ روم میں چلو۔''

''نو ڈیڈ! مجھ سے ایک لقمہ بھی کھایا نہیں جائے گا۔ میں نے زندگی میں کبھی ہار نہیں مانی۔ آج ہار رہی ہوں۔ وہ جب تک نہیں آئے گا، میں سکون سے نہیں رہ سکوں گی۔ پلیز! آپ لوگ جائیں۔ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔''

اس کے ممی اور ڈیڈی چلے گئے۔ عمر نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ اس نے صندوق کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ کمرے میں تنہا تھی۔ اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ وہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ فون پر نمبر پنچ کر رہی تھی۔ پھر اس نے فون کو کان سے لگایا۔ کچھ سننے کے بعد ایک دم سے جھنجلا کر بولی۔ ''یہ کیا بدمعاشی ہے؟ فون بند پڑا ہے۔ ہائے عمر! یہ کیا کر رہے ہو؟ تمہاری آواز بھی نہیں سن پا رہی ہوں۔''

وہ فون بند کر کے اسے بیڈ پر پھینکتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ پہلے عشق و محبت کو بکواس سمجھتی تھی۔ اب میرے دل کی ایک ایک دھڑکن کہہ رہی ہے کہ تمہارے بغیر جی نہیں سکوں گی۔ اگر یہی محبت ہے تو میں چیخ چیخ کر تمہاری محبت کا اعتراف کروں گی۔ کہاں ہو عمر! آجاؤ...''

وہ ایک آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''کہاں ہو؟ ایک بار... صرف ایک بار آجاؤ۔ میں تمہیں پیار کی زنجیروں سے باندھ کر رکھنے کے لیے سوکن کو گلے لگالوں گی... آجاؤ، کیوں ستا رہے ہو؟''

عمر نے لیٹے ہی لیٹے اپنا فون نکالا۔ اسے آن کیا پھر اس کے نمبر پنچ کیے۔ چند سیکنڈ کے بعد ہی کلپنا کے فون سے کالنگ ٹون اُبھرنے لگی۔ اس نے ناگواری سے فون کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈ پر پڑا ہوا تھا اور وہ کسی کی کال اٹینڈ کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

فون اسے پکار رہا تھا۔ آخر اس نے سوچا' شاید کسی تابع دار کی کال ہو اور وہ عمر کے بارے میں کوئی رپورٹ دینا چاہتا ہو۔ اس نے بیڈ کے پاس آکر فون اُٹھا لیا۔ پھر ننھی سی اسکرین پر عمر کا فون نمبر پڑھتے ہی جیسے بجلی کا جھٹکا پہنچا۔ وہ چیخ پڑی۔ ''ہائے عمر مجھے یاد کر رہا ہے۔''

اس نے فوراً ہی بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟ مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟ تمہیں پتا ہے میں پل پل مر رہی ہوں۔ آؤ، ابھی آؤ اور اپنے ہاتھوں سے مجھے مار ڈالو۔''

وہ پاگل ہو گئی تھی۔ دیوانہ وار بولتی جا رہی تھی۔ وہ چپ تھا۔ اس کی دیوانگی پر پیار آ رہا تھا۔ وہ چھپ کر اس کی محبت' اس کا پاگل پن اور اس کی بے چینی دیکھ رہا تھا۔

یہ یقین ہو رہا تھا کہ وہ دشمن نہیں ہے۔ اسے اپنے ہاتھوں میں رکھنے کے لیے اس نے چھ لاکھ چرانے اور اسے ایک الگ گینگ بنانے سے روکنے کی غلطی کی تھی۔ اب اس غلطی پر پچھتا رہی تھی۔

وہ بولتے بولتے چپ ہوئی، اسے احساس ہوا کہ بے تحاشا بول رہی ہے اور اس کی نہیں سن رہی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''عمر! تم خاموش کیوں ہو؟''

اس نے کہا۔ ''تم کچھ بولنے دو گی تو بولوں گا۔''

''سوری عمر! میں پاگل ہو گئی ہوں۔ تم نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ آجاؤ، ابھی آجاؤ۔ نہیں آؤ گے تو کل میری ارتھی یہاں سے اُٹھے گی۔ تب ہی تمہیں میری سچی محبت کا یقین ہوگا۔ تم سن رہے ہو مگر چپ ہو۔ بولتے کیوں نہیں؟''

''جب تم بولتے بولتے تھک جاؤ گی، چپ ہو جاؤ گی' تب بولوں گا۔''

''اوہ سوری... پھر سوری کہتی ہوں۔ سچ مچ پاگل ہو گئی ہوں۔ ابھی چاہتی ہوں کہ دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دوں۔ اوگاڈ! میں پھر بولتی جا رہی ہوں۔ اب نہیں بولوں گی۔ بس ایک بار کہہ دو کہ تم ابھی آ رہے ہو اور کبھی مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ اگر جاؤ گے تو...''

پیار کی شدت کہہ رہی تھی کہ وہ ابنارمل ہو گئی ہے۔ جب تک وہ سامنے نہیں آئے گا، وہ اسی طرح جنون میں مبتلا رہ کر اسے اپنے پاس بلاتی رہے گی۔

وہ بیڈ کے نیچے سے نکل آیا۔ وہ دوسری طرف منہ کیے فون کو کان سے لگائے بولتی جا رہی تھی۔ اس نے زور سے ڈانٹا۔ ''یو شٹ اپ۔ کیا پاگل ہو گئی ہو؟''

وہ حیرت سے اُچھل کر اس کی طرف گھوم گئی۔ اس کے لیے جیسے جادو ہو گیا۔ وہ جادو سے بند کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی آکر اس سے لپٹ گئی۔ اسے ادھر ادھر سے چھو کر یقین کرنے لگی کہ وہ سپنا یا جادو نہیں ہے۔ عمر اس کے قد سے بہت اونچا تھا۔ وہ اُچھل کر دونوں بانہیں اس کی گردن میں ڈال کر جھول گئی.... اسے دیوانہ وار چوم رہی تھی اور بلک بلک کر رو رہی تھی۔

وہ چپ تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ اس کے اندر کا سارا غبار نکل جائے اور غبار نکالے بغیر نہیں نکلتا۔ عمر محبت کے جواب میں اسے محبتیں دینے لگا۔ وہ رفتہ رفتہ نارمل ہونے لگی۔ آخر کار آندھی تھم ہی گئی۔

بڑی دیر بعد ماحول پُرسکون ہوا تو عمر نے کہا۔ ''بھوک لگ رہی ہے۔''

وہ دونوں کمرے کا دروازہ کھول کر کچن میں آئے تو اس کی ممی اور ڈیڈی نے حیرانی سے عمر کو دیکھا۔ کلپنا نے کہا۔ ''ممی! یہ جادوگر ہیں۔ یہ میرے بیڈ روم میں تھے مگر ہم انہیں دیکھ نہیں پائے۔ ڈیڈ! اپنے آدمیوں کو فون پر کہہ دیں کہ انہیں تلاش نہ کریں۔ آرام کریں۔''

ممی اور ڈیڈی اپنے تابع داروں کو فون کرنے لگے۔ کلپنا

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے کھانے کے دوران اپنے باپ سے کہا۔ ”ڈیڈ! عمر کی غلط فہمی دور کریں اور میرا یہ فیصلہ مان لیں کہ آج سے عمر ہمارے گینگ لیڈر ہمارے سرغنہ رہیں گے۔“

عمر نے کہا۔ ”میں اتنی بڑی ذمے داری قبول نہیں کروں گا۔“

”پلیز! میرا فیصلہ مان لو۔“

”تم چاہتی ہو کہ میں آزادی سے اپنا ایک گینگ نہ بناؤں۔ تمہارا محتاج رہا کروں۔ تمہارے گینگ کے تابع دار بظاہر میری تابع داری کریں گے۔ لیکن درپردہ تمہارے وفادار رہیں گے۔“

وہ بولی۔ ”مجھ پر شبہ نہ کرو۔ اس وقت ہمارے دس تابع دار ہیں۔ تم ان سے کوئی تعلق نہ رکھو۔ اپنے ذاتی تابع دار بناتے رہو۔ ہمیں یہ بھی نہ بتاؤ کہ وہ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟ میں تمہارا اعتماد حاصل کرنے کے لیے تمہاری ہر بات مانتی رہوں گی۔“

دھن راج نے کہا۔ ”میری بیٹی تمہیں ہر طرح کی آزادی اور سہولتیں دے رہی ہے۔ یہ مان لو کہ صرف تمہیں اپنا بنا کر رکھنے کے لیے یہ تمہارے اور بھی مطالبات مانتی رہے گی۔ ہم تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں' اسے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ یہ پاگل ہو جاتی ہے۔“

اس کی ممی کانتا دیوی نے کہا۔ ”بیٹے عمر! صرف کرائے کے غنڈوں کو خریدنے سے ایک گینگ نہیں بنتا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو اور سیاست دانوں کو بھی خریدنا پڑتا ہے۔ تب ہی دور تک ایک مضبوط اور منظم نیٹ ورک قائم ہوتا ہے اور یہ ہم کر رہے ہیں۔“

کلپنا نے کہا۔ ”چنڈی نے گودام میں دھماکا کرنے سے پہلے ایک کروڑ روپے کی ہیروئن چرائی تھی۔ اسے فروخت کرنے کے بعد ہم نے صوبائی مرکزی پولیس اور انٹیلی جنس کے چھ بڑے افسروں کو لاکھوں روپے میں خرید لیا ہے۔ ہم جے پور میں قانون کی گرفت سے محفوظ ہیں۔ کل ہم تمہاری سلامتی کے لیے بھی انہیں دس لاکھ روپے دیں گے۔ پھر تم اس شہر میں آزادی سے گھوم پھر سکو گے۔“

دھن راج نے کہا۔ ”بیٹے! ہم سب مل کر ہی ایک مضبوط نیٹ ورک قائم کر سکتے ہیں۔ ہم پر بھروسا کرو۔“

”اعتماد اسی طرح قائم ہوگا کہ میرے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ کل میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جاؤں گا۔ ایسے وقت تمہارا کوئی آدمی نہ میرا تعاقب کرے گا' نہ دور سے نگرانی کرے گا۔ اگر کوئی میری نظروں میں آئے گا تو میں اسے دشمن سمجھ کر گولی مار دوں گا۔“

وہ ماں باپ اور بیٹی ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ پھر کلپنا نے کہا۔ ”تم جو کہو گے، اس سے ہم انکار نہیں کریں گے۔ ہمارا کوئی آدمی دور سے بھی تمہاری نگرانی نہیں کرے گا۔“

وہ دونوں کھانے کے بعد ٹیرس پر آکر ٹہلنے لگے۔ کلپنا نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں، تم سلمٰی سے ملنے جاؤ گے۔“

”یہاں کے معاملات سے نمٹنے کے بعد کسی دن جاؤں گا۔“

”میں اسے بہن بنا کر گلے لگانا چاہتی ہوں۔ تم نہ جاؤ۔ اسے یہاں بلا لو۔ جے پور سے باہر تمہارے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔“

”میں مانتا ہوں کہ خطرات ہیں لیکن دو سوکنوں کو ایک چھت کے نیچے رکھنے کی حماقت کبھی نہیں کروں گا۔“

”سلمٰی کے لیے دوسرے گھر کا انتظام ہو سکتا ہے۔“

”میں اس سلسلے میں سوچوں گا۔ فی الحال نہ اس سے ملنے جا رہا ہوں، نہ دوسرا گھر لینے کی جلدی ہے۔ اس وقت وہ جہاں بھی ہے، بہت محفوظ ہے۔“

کلپنا مایوس ہو گئی۔ اگرچہ وہ عمر کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ تاہم سلمٰی کے لیے ارادے نیک نہیں تھے۔ وہ سونے کے لیے ٹیرس سے اتر کر بیڈروم میں آ گئے۔

☆☆☆

دوسرے دن سے عمر کی مصروفیات کا آغاز ہوا۔ ہمت راؤ نے جے پور آکر شام کو ایک گارڈن میں اس سے ملاقات کی۔ عمر نے اسے ایک لاکھ پچاس ہزار دیے۔ دونوں کے درمیان یہ پلاننگ ہوئی کہ آئندہ بھوانی شنکر کو کیسے نقصان پہنچایا جائے گا۔

تقریباً دو ہفتے بعد ہمت راؤ نے عمر کو یہ خبر سنائی کہ ممبئی سے ایک اسمگلر دوسرے دن کھری ٹاؤن آئے گا اور شنکر دادا سے تین کروڑ کی ہیروئن اور سونے کے بسکٹس لے جائے گا۔

فوراً ہی پلاننگ ہونے لگی۔ عمر دراز کھری ٹاؤن کے قریب ایک چھوٹے سے ٹاؤن میں آ گیا۔ وہاں رنبیر سنگھ اور ہمت راؤ اپنے سات واردات کرنے والوں کے ساتھ پہنچ گئے۔

وہاں یہ طے پایا کہ دو طرفہ حملے ہوں گے۔ ایک حملہ اس وقت ہوگا جب اسمگلر نقد تین کروڑ روپے شنکر دادا کی میز پر رکھ کر جائے گا۔ دوسرا حملہ ہائی وے کے ایک ویران علاقے میں اس اسمگلر پر کیا جائے گا جو ہیروئن اور سونے کے

بسکٹس لے جا رہا ہوگا۔

بھوانی شنکر ایسے وقت اپنی سیکیورٹی بہت مضبوط رکھتا تھا۔ اس کے دس گن مین دفتری عمارت کے باہر تھے اور چار باڈی گارڈز دفتر کے اندر اس کے پاس الرٹ رہتے تھے۔ اس کا چوتھا باڈی گارڈ جگ دیو تھا۔

گھر کا بھیدی لنکا ڈھاتا ہے۔ جگ دیو جانتا تھا کہ باہر دس گن مینوں نے کہاں کہاں مورچے بنائے ہیں۔ وہاں اس کے آدمی چھپ کر پہنچ گئے۔ انہوں نے پیچھے سے آکر حملہ کیا۔ آٹھ کو مار گرایا۔ دو فرار ہو گئے۔

یہ سب اتنی آسانی سے نہیں ہوا' جیسا کہ سوچا گیا تھا۔ جگ دیو کا بھی ایک آدمی مارا گیا۔ عمارت کے اندر بیٹھا ہوا بھوانی شنکر چیخ رہا تھا۔ ”یہ باہر فائرنگ کیوں ہو رہی ہے؟ کون گولیاں چلا رہا ہے؟“

فون پر ایک کارندے نے اطلاع دی کہ کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کیا ہے۔ بھوانی شنکر نے فوراً ہی تھانے دار کے نمبر پنچ کیے لیکن رابطہ ہونے سے پہلے ہی ایک گولی کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی اندر آئی اور اس کے قریب سے گزر کر پیچھے دیوار میں پیوست ہو گئی۔

وہ کرسی سے اُلٹ کر فرش پر آکر میز کے پیچھے چھپ گیا۔ ہاتھ سے ریوالور نکل کر دور چلا گیا تھا۔ وہ حملہ آور کمرے کے اندر گھس آئے۔ وہاں تھوڑی دیر تک کاؤنٹر فائرنگ ہوتی رہی۔ دو باڈی گارڈز مارے گئے۔ باقی پلاننگ کے مطابق جگ دیو کے ساتھ ایک گارڈ کو اور شنکر دادا کو ہتھیار پھینکنے پر مجبور کیا گیا۔

انہیں اپنی سلامتی کے لیے ہتھیار پھینکنے پڑے۔ ایک نے نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ اٹھایا۔ دوسرے نے کہا۔ ”عمر دراز کا حکم ہے کہ بھوانی شنکر کو زخمی کیا جائے۔ یہ ایک گولی تمہارے لیے ہے دادا...!“

اس نے شنکر دادا کی ایک ٹانگ میں گولی ماری پھر وہ حملہ کرنے والے بیگ لے کر چلے گئے۔

ممبئی کے اسمگلرز ہوائی جہاز سے جے پور آتے تھے۔ پھر وہاں سے رینٹڈ کار میں سفر کرتے ہوئے کھری ٹاؤن پہنچتے تھے۔ ڈرگ مافیا کے کارندے وہاں سے ہیروئن لے جاتے تھے۔ یہ مال مدراس کے مشرقی ساحل ویزاگا پٹنم سے مشرق بعید کے ملکوں میں پہنچایا جاتا تھا اور ممبئی کے ساحل سے افریقا اور یورپ کے ملکوں میں اسمگل کیا جاتا تھا۔

وہ اسمگلر بھی شنکر دادا سے کروڑوں کا مال لے کر رینٹڈ کار میں جے پور جا رہا تھا۔ ہائی وے کے ویران علاقے میں دو گاڑیاں سامنے سے آ رہی تھیں۔ ایک گاڑی میں عمر دراز تھا۔ انہوں نے قریب پہنچتے ہی کار کے پہیوں پر گولیاں چلائیں پھر چھلانگیں لگاتے ہوئے اپنی گاڑیوں کے پیچھے چھپ گئے۔

کار کے پہیے بیکار ہو گئے تھے۔ اسمگلر کے دو گارڈز گولیاں چلاتے ہوئے کار کے پیچھے چھپنے جا رہے تھے۔ ایسے میں ایک گارڈ مارا گیا۔ اسمگلر زخمی ہو کر گر پڑا۔ دوسرے نے اپنی گن پھینک کر دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔

عمر کے آدمیوں نے مال سے بھرے ہوئے تین بیگ اُٹھائے۔ ان سب سے موبائل فون چھین لیے۔ پھر عمر نے وہاں سے جاتے ہوئے اسمگلر سے کہا۔ ”مجھے پہچان لو۔ میں عمر دراز ہوں۔ شنکر دادا کے غبارے سے ہوا نکال رہا ہوں۔ جو بھی اس سے سودا خرید کر یہاں سے جائے گا اسے اسی طرح لوٹ لیا جائے گا۔“

وہ اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر اسے واپس موڑ کر وہاں سے چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں کھری ٹاؤن سے جے پور، پھر جے پور سے ممبئی اور مدراس تک ہلچل پیدا ہو گئی۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے حرکت میں تو آتے ہی تھے، اس بار ممبئی اور مدراس کی ڈرگ مافیا ہڑبڑا گئی۔ یہ معلوم کرنے لگی کہ عمر دراز کون ہے؟

انہیں معلوم ہوا کہ بھوانی شنکر اور مہاراج کے مظالم نے عمر دراز کو دو دھاری تلوار بنا دیا ہے۔ ابتدا یوں ہوئی تھی کہ عمر دراز نے سلمٰی نامی ایک لڑکی سے چھپ کر کورٹ میرج کی تھی۔ چھپنے کی وجہ یہ تھی کہ سلمٰی کی ماں مسلمان اور باپ ہندو ہے۔ اس ہندو خاندان کے لوگ سلمٰی کو کسی ہندو سے ہی بیاہنا چاہتے تھے۔ وہ ایک مسلمان کو داماد کی حیثیت سے قبول نہیں کر رہے تھے۔

بہرحال عمر نے سلمٰی کو اپنی شریکِ حیات بنا لیا۔ لیکن سلمٰی کے ہندو رشتے دار اسے عمر کے حوالے کرنے سے پہلے ہزاروں روپے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ عمر نے ان کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے زندگی میں پہلی بار بھوانی شنکر کے گودام سے چوری کی۔ جیسلمیر کا مہاراج اسے گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی سلامتی کے لیے مہاراج کے آدمیوں کو قتل کرنا پڑا۔ یوں وہ قاتل بھی بن گیا۔ مہاراج کے چھ لاکھ روپے لے گیا۔

اس طرح اس کا حوصلہ بڑھتا گیا۔ اس نے بھوانی شنکر کے گودام کو بم دھماکے سے تباہ کر کے اسے کروڑوں روپے کا نقصان پہنچایا پھر کچھ دنوں بعد اس پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اس کے دو باڈی گارڈز کو ہلاک کیا۔ اس کے دشمن کہہ رہے تھے کہ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

روز بہ روز خطرناک ہوتا جارہا ہے۔
اس بار اس کے کارندوں نے بھوانی شنکر کی ایک ٹانگ میں گولی ماری ہے اور اس کے نو گارڈز کو ہلاک کیا ہے۔ وہاں سے تین کروڑ نقد لے گئے ہیں۔
دوسری طرف عمر دراز خود واردات میں شریک تھا۔ اس نے ممبئی سے آنے والے ایک اسمگلر اور ایک باڈی گارڈ کو ہائی وے پر زخمی کیا۔ ایک گارڈ کو قتل کیا اور تین کروڑ کی ہیروئن اور سونے کے بسکٹس لے گیا۔
یہ سب ایک ماہ دس دنوں کے اندر ہونے والی دلوں کو دہلا دینے والی وارداتیں تھیں اور ڈرگ مافیا کے حلقوں میں عمر دراز کا رعب اور دبدبہ طاری کر رہی تھیں۔ انڈر ورلڈ مافیا کے جاسوس اسے پورے راجستھان میں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔
ممبئی کرمنل ورلڈ کے سب سے خطرناک ڈان پربھو دیاوان کی لیڈی سیکریٹری نے اسے فون پر مخاطب کیا اور پوچھا۔ ''مسٹر عمر! پربھو دیاوان کا نام پورے انڈیا کی پولیس جانتی ہے۔ کیا تم جانتے ہو؟''
''ہاں، جانتا ہوں۔ تم کون ہو؟''
''میں پربھو کی پی اے بول رہی ہوں۔ وہ آج شام چھ بجے تم سے بات کریں گے۔ اس وقت تمہارے فون کو مصروف نہیں رہنا چاہیے۔''
وہ بولا۔ ''میں پربھو جی کے فون کا انتظار کروں گا۔''
کلپنا اور دھن راج حیران تھے۔ عمر نے بیک وقت دو ایسی منظم وارداتیں کی تھیں کہ وہ اس کے سامنے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ ہیروئن اور سونے کے بسکٹس سے بھرے ہوئے تین بیگ اس بنگلے میں لے آیا تھا۔ چوری کا مال چھپانے کی فی الحال کوئی جگہ نہیں تھی۔
کلپنا نے شدید حیرانی سے کہا۔ ''عمر! تم کیا ہو؟ تم نے یہاں سے ممبئی اور مدراس تک دھوم مچا دی ہے۔''
وہ بولا۔ ''ہاں، جتنی زبردست کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں، اتنے ہی خطرات بڑھتے جارہے ہیں۔ سنا ہے مہاراشٹر کی پولیس فورس بھی مجھے گرفتار کرنے کے لیے یہاں آرہی ہے۔''
''دوسرے صوبے کی پولیس... میرے پتی کسٹم افسر کا لحاظ نہیں کرے گی۔ اس بنگلے میں گھس آئے گی۔ میں تمہیں کہاں چھپاؤں؟ یہ تین کروڑ کا مال بھی پکڑا جائے گا۔''
''مجھے یہاں سے بھاگنا ہوگا۔''
''بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ جگہ جگہ گاڑیوں کو روک کر جوان اور بوڑھوں کو چیک کیا جارہا ہے۔ ان میں تمہیں ڈھونڈا جارہا ہے۔''
دھن راج نے کہا۔ ''یہاں کے سپرنٹنڈنٹ آف پولیس سے بات کرو... وہ ہم سے اب تک ایک لاکھ روپے لے چکا ہے۔ اسے اور ایک لاکھ کا لالچ دو اور کہو کہ عمر کو مال سمیت اپنے گھر میں چھپا لے۔ جب مہاراشٹر کی پولیس چلی جائے گی تو عمر یہاں واپس آجائے گا۔''
وہ باپ بیٹی اس پولیس افسر سے فون پر باتیں کرنے لگے۔ ادھر سلمٰی نے عمر کو فون پر مخاطب کیا۔ ''تم خیریت سے ہو؟ یہ تم نے کتنا بڑا ہنگامہ کیا ہے اور کتنی مصیبتیں مول لی ہیں۔ یہ کیا کر رہے ہو عمر؟''
''تم خیریت سے ہو یا نہیں؟ اگر ذرا بھی خطرہ محسوس کر رہی ہو تو بولو۔ میں تیر کی طرح تمہارے پاس آؤں گا۔''
کلپنا سن رہی تھی۔ بظاہر چپ تھی مگر حسد کی آگ اندر جلا رہی تھی کہ وہ اسے کتنا چاہتا ہے۔ ہر طرف موت ہی موت اس کی منتظر ہے اور وہ سلمٰی کے پاس تیر کی طرح پہنچنے کی بات کر رہا ہے۔ اور یہ محض بات نہیں تھی۔ وہ اس ضدی مرد کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اگر سلمٰی کو کوئی خطرہ پیش آتا تو وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کی طرف چل پڑتا۔
عمر نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے۔ وہ خیریت سے ہے اور رہے گی۔ کوئی دشمن اور پولیس والا ادھر نہیں جائے گا۔''
کلپنا نے پوچھا۔ ''وہ ایسی کون سی جگہ ہے کہ کوئی دشمن ادھر نہیں جاسکے گا؟''
وہ بولا۔ ''تم یقین نہیں کرو گی۔ وہ عام لوگوں کی طرح ایک فیملی کے ساتھ ہے۔ اللہ اُسے بچا رہا ہے۔''
''میں عقل کی بات سمجھا رہی ہوں۔ اسے یہاں بلاؤ۔ ہم تمہاری طرح اسے بھی چھپا کر رکھیں گے۔''
''میں نے اسے خدا کے حوالے کیا ہے۔ اس کی بات نہ کرو۔''
کلپنا کا منہ بن گیا۔ نہ وہ سلمٰی کو وہاں لا رہا تھا، نہ کبھی بھول سے بھی اس کا پتا ٹھکانا بتا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''سپرنٹنڈنٹ آف پولیس نے کیا کہا؟ کیا میں وہاں چھپ کر رہ سکوں گا؟''
''وہ پولیس افسر بھی پریشان ہے۔ مہاراشٹر کی پولیس کے آنے سے ہماری صوبائی حکومت احتجاج کر رہی ہے۔ تمہاری گرفتاری کا معاملہ سیاسی ہوتا جارہا ہے۔ ایس پی نے کہا ہے کہ حالات سازگار رہے تو آج رات پولیس کی گاڑی آکر تمہیں اور ڈیڈی کو یہاں سے اس کے گھر پہنچا دے گی۔''

عمر نے گھڑی دیکھی۔ آدھ گھنٹے بعد پربھو دیاوان سے فون پر بات ہونے والی تھی۔ اس نے کلپنا سے کہا۔ ''میں چھت پر جارہا ہوں۔ مجھے اپنے لوگوں کے ساتھ کچھ پلاننگ کرنی ہے۔ پلیز اوپر نہ آنا۔''
وہ بولی۔ ''یہ بے اعتمادی اچھی نہیں ہے۔ ہم تمہارے لیے جان لڑا رہے ہیں اور تم اپنے معاملات ہم سے چھپاتے رہتے ہو۔''
''کچھ دنوں بعد اعتماد کرنے لگوں گا۔ ابھی یہ بے اعتمادی برداشت کرلو۔''
وہ اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے آدمی نے پاپا کی ران میں گولی ماری تھی۔ وہ گوشت میں دھنس گئی ہے۔ آپریشن کے ذریعے ہی نکلے گی۔ انہیں یہاں کے اسپتال میں لایا گیا ہے۔ میں ان کی مزاج پرسی کے لیے جا رہی ہوں۔''
رات کی تاریکی پھیلتی جارہی تھی۔ وہ اپنی گن اور فون لے کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر آگیا۔ ابھی چھ بجے جرائم کی دنیا کے ٹائیکون پربھو دیاوان سے بات ہونے والی تھی۔
پربھو دیاوان چالیس برس کا صحت مند جوان تھا لیکن جوانوں کی طرح عیاش نہیں تھا۔ پرائی بہو بیٹیوں کے سامنے نظریں جھکا کر بات کرتا تھا۔ اس نے ممبئی کے ایک علاقے ڈونگری میں ایک بہت بڑا مہیلا آشرم بنایا تھا جہاں بے سہارا عورتیں اور کنواری لڑکیاں عزت آبرو سے رہتی تھیں۔
وہیں ڈونگری میں اس کا شراب خانہ، قمار خانہ اور قہوہ خانہ تھا۔ وہاں قہوے میں افیون کی ذرا سی مقدار حل کی جاتی تھی جسے پی کر لوگ مست ہو جاتے تھے۔
باندرہ کے قریب اس کا ایک ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ تھا جہاں غریب لڑکے اور لڑکیوں کو مفت تعلیم بھی دی جاتی تھی اور طرح طرح کے ہنر بھی سکھائے جاتے تھے۔ وہ ایک طرف غریبوں کی روزی روٹی کے ذرائع پیدا کرتا تھا اور کمزور اور بے سہارا عورتوں کو تحفظ فراہم کرتا تھا تو دوسری طرف اپنے مجرمانہ دھندے جاری رکھتا تھا۔
بندرگاہ کے قریب اس کا ایک مال گودام تھا جہاں تہ خانے میں ہیروئن اور افیون چھپا کر رکھی جاتی تھی۔ وہ تمام مال بحری راستے سے اسمگل کیا جاتا تھا۔
ممبئی کے لاکھوں غریب عوام اسے اَن داتا کہتے تھے۔ ایک بار پولیس کے ایک نئے افسر نے اسے گرفتار کرنا چاہا تھا۔ ایسے وقت لاکھوں عقیدت منداس کے آگے پیچھے دائیں بائیں ڈھال بن گئے تھے۔ وہ افسر اسے ہتھکڑی پہنانے میں ناکام رہا تھا۔ دوسرے ہی دن اس کا تبادلہ ہو گیا۔ اسے ممبئی چھوڑ کر جانا پڑا۔

ممی...... مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے بوائے فرینڈ نے اس فائرنگ رینج پر بلایا ہے...... دغاباز کہیں کا

پربھو دیاوان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ انتہائی شریف اور امن پسند فرشتہ ہے۔ اس نے کبھی کسی کو ایک طمانچہ بھی نہیں مارا۔ کسی دشمن سے ہاتھا پائی نہیں کی۔ وہ بڑی حکمتِ عملی سے اپنے مخالفین کو زیر کرتا تھا۔ اس کے بعد بھی جو دشمن عذابِ جان بن جاتا تھا، اسے چپ چاپ گولی مار کر گزر جاتا تھا۔
انڈر ورلڈ کے درجنوں ڈان اور گاڈ فادرز کی بھیڑ میں پربھو دیاوان کو نمایاں مقام حاصل تھا کیونکہ وہ ایک خطرناک مجرم ہی نہیں، ایک دیوتا بھی تھا۔ مسیحا بھی تھا۔ اس کے بنائے ہوئے اسپتالوں میں غریب اور محتاج مریضوں کا مفت علاج ہوتا تھا۔
عمر دراز اس کی تمام ہسٹری جانتا تھا۔ یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ مجرموں کا باپ دادا کہلانے والا ایک خطرناک شخص اس سے کیا باتیں کرے گا؟ اور کیوں کرے گا؟ آسمان خود بخود زمین کی طرف کیوں جھک رہا ہے؟
ٹھیک چھ بجے کال ٹون سنائی دی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''جی، میں... میں عمر دراز بول رہا ہوں۔''
لیڈی سیکریٹری کی آواز سنائی دی۔ ''انتظار کریں۔ پربھو جی بات کرنے والے ہیں۔''
وہ انتظار کرنے لگا۔ دوسری طرف سے موسیقی کی ایک مخصوص دھن سنائی دے رہی تھی۔ پھر ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''ہیلو...!''
وہ فوراً ہی بولا۔ ''پربھو جی... نمسکار! میں عمر دراز بول رہا ہوں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

پربھو دیاوان نے کہا۔ ”السلام علیکم۔“
عمر بے اختیار بولا۔ ”وعلیکم السلام۔“
وہ بولا۔ ”میں ہندو ہوں۔ اس لیے تم نے نمسکار کہا۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ مسلمان کو اپنے دین کے مطابق سلام کرنا چاہیے یا آداب کہنا چاہیے۔ اگر میں بولنے میں پہل کرتا تو تمہیں نمستے کہتا کیونکہ میں ہندو ہوں۔“
وہ متاثر ہو کر بولا۔ ”جی سمجھ گیا۔“
اس کی آواز اور لہجہ بہت ٹھنڈا اور میٹھا سا تھا۔ وہ بولا۔ ”عمر دراز! میں نے تمہاری ہسٹری معلوم کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تم ایک ماہ بیس دن پہلے ایک عام سے اور سیدھے سادے سے آدمی تھے۔ صرف پچاس دنوں میں تم نے حیرت انگیز تیزی دکھائی ہے۔ ایک کے بعد ایک واردات کی انتہا کر دی ہے۔“
”پربھو جی! میں نہیں جانتا تھا کہ چوری ڈکیتی اور قتل جیسا سنگین جرم کیسے کیا جاتا ہے۔ میں اپنی سلمٰی کا دیوانہ ہوں۔ اسے حاصل کرنے کے راستے میں جو بھی آیا، میں اسے ٹھوکروں میں اڑاتا چلا گیا۔“
”کیا سلمٰی کو حاصل کر چکے ہو؟“
”جی ہاں۔ اسے ایک جگہ چھپا رکھا ہے اور اپنے بدترین حالات سے اس امید پر لڑ رہا ہوں کہ کبھی اس کے ساتھ امن چین سے ازدواجی گھریلو زندگی گزار سکوں گا۔“
”تم آئندہ جرائم کے دلدل میں دھنستے جاؤ گے۔ ہماری دنیا کے کتنے ہی انڈر ورلڈ کے ڈان اور گاڈ فادرز تمہیں اپنے ساتھ شامل کرنا چاہیں گے۔ تم انکار کرو گے تو تمہارے دشمنوں کی تعداد اور بڑھ جائے گی۔“
”کیا آپ میری مدد فرمائیں گے؟“
”میں نے اسی لیے فون کیا ہے۔ میرے ہاتھوں میں رہو گے تو کوئی ڈان، کوئی گاڈ فادر تمہیں چیلنج کرنے کی جرأت نہیں کرے گا اور تم اپنی گھر والی کے ساتھ من مانی زندگی گزار سکو گے۔“
”پھر تو میں آپ ہی کے سائے میں رہوں گا۔“
”یہ سن لو کہ تمہیں اپنی حفاظت میں لینے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ میرے اور تمہارے حالات ایک جیسے ہیں۔ میں بھی ڈان بننے سے پہلے ایک معمولی مزدور تھا۔ کیا تم نے امیتابھ بچن کی فلم دیوار دیکھی ہے؟“
”جی ہاں۔ دیکھی ہے۔“
”اس فلم میں میری زندگی کے ابتدائی واقعات دکھائے گئے ہیں۔ میں بچپن میں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بوٹ پالش کیا کرتا تھا۔ ایک بار انڈر ورلڈ کے ایک بے تاج بادشاہ نے وہاں سے گزرتے ہوئے مجھ سے اپنے جوتے پالش کرائے اور معاوضے کے طور پر ایک چونی میری طرف پھینکی۔ میں نے کہا، صاحب! میں پھینکے ہوئے پیسے نہیں اٹھاتا۔ مزدوری کرتا ہوں۔ بھیک نہیں مانگتا۔ اس نے متاثر ہو کر مجھے حیرانی سے دیکھا۔ پھر چونی اٹھا کر میری ہتھیلی پر رکھی۔
”آج جو میری بیوی ہے، وہ پہلے میری محبوبہ تھی۔ میں تمہاری طرح اسے حاصل کرنے کے لیے جرائم کی دنیا میں آگیا۔ اسی لیے تم سے لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔
”دوسری وجہ یہ ہے کہ میں کھری ٹاؤن سے بھوانی شنکر کو اکھاڑ کر وہاں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں تمہاری کارکردگی نے مجھے خوش کر دیا ہے۔ بھوانی شنکر اس وقت جے پور کے اسپتال میں ہے۔ لیکن اسے تنہا نہ سمجھو۔ اس کی پشت پر بنگلور کی انڈر گراؤنڈ مافیا ہے۔ ان کا سربراہ سوامی نارنگ ریڈی کھری ٹاؤن پہنچنے والا ہے۔ اب وہ بھوانی شنکر کی جگہ سنبھالے گا۔“
عمر نے کہا۔ ”میں اسے بھی سنبھال لوں گا۔ وہ بھی اسپتال پہنچے گا۔“
”نہیں۔ تمہیں سمجھا دوں کہ پہلے اپنے پاؤں تلے کی زمین کو مضبوط کرو۔ پہلے یہ یقین کر لو کہ تمہیں کوئی اکھاڑ نہیں سکے گا۔ اور ابھی تمہارے پاؤں تلے زمین نہیں ہے۔ تم نے کہیں چھپنے کے لیے یقیناً کسی کا سہارا لیا ہو گا اور وہ سہارا کمزور ہو سکتا ہے۔“
”آپ کا تجربہ درست کہہ رہا ہے۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔“
”اپنا پتا بتاؤ۔ چھ گھنٹے کے اندر پولیس کی ایک گاڑی وہاں سے تمہیں نکال لائے گی۔ پریشان نہ ہونا۔ وہ پولیس والے سرکار سے تنخواہ لیتے ہیں لیکن نوکری میری کرتے ہیں۔“
”میں اپنی سلمٰی کو چھوڑ کر نہیں جا سکوں گا۔“
”اس کا بھی ایڈریس بتاؤ۔“
عمر نے اپنا اور سلمٰی کا ایڈریس نوٹ کرا دیا اور یہ معلوم کیا کہ پربھو کے آدمی سلمٰی کے پاس کب پہنچیں گے۔
پھر اس نے کہا۔ ”میرے پاس تین کروڑ کی ہیروئن اور سونے کے بسکٹس ہیں۔ وہ بھی ساتھ لاؤں گا۔“
”لے آؤ۔ تمہیں ان کی پوری قیمت ملے گی۔“
تمام معاملات ہونے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ پھر سلمٰی سے رابطہ کرنے کے بعد کہا۔ ”ہم آج رات ملنے والے ہیں۔ پھر اللہ نے چاہا تو جدا نہیں ہوں گے۔ اطمینان سے گھریلو زندگی گزاریں گے۔“
اس نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”کیا تم نے اطمینان کیا ہے کہ وہاں ہم محفوظ رہیں گے اور تمہارا کوئی دشمن تمہیں پریشان نہیں کرے گا؟“
”دشمن تو قبر تک پریشان کرتے رہیں گے۔ البتہ مجھے ان سے نمٹنے کی سہولیات حاصل ہوتی رہیں گی۔“
”میں بیان نہیں کر سکتی کہ کتنی خوش ہو رہی ہوں۔ اب تمہارے ساتھ رہا کروں گی۔ اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیے۔“
”ایک سفری بیگ میں ضروری سامان رکھو۔ رات کو کسی وقت ایک گاڑی تمہیں لینے آئے گی۔ ایسے وقت میں فون پر تمہیں گائیڈ کرتا رہوں گا۔“
وہ تھوڑی دیر تک پیار و محبت کی باتیں کرتے رہے پھر عمر فون بند کر کے نیچے آگیا۔ وہاں دھن راج اپنی دھرم پتنی کے ساتھ تھا۔ کلپنا بھوانی شنکر کی عیادت لیے اسپتال گئی ہوئی تھی۔
دھن راج نے کہا۔ ”وہ پولیس افسر ہم دونوں کو اپنے گھر میں چھپانے کے دو لاکھ مانگ رہا ہے۔“
اس کی پتنی نے کہا۔ ”وہ ہماری مجبوریوں کو سمجھ کر بھاؤ بڑھا رہا ہے۔“
عمر نے کہا۔ ”میں مجبور نہیں ہوں۔ تم اپنے چھپنے کی بات اس سے کرو اور ایک لاکھ دو۔“
”تم وہاں چھپنے نہیں جاؤ گے تو پھر کہاں جاؤ گے؟“
ایسے وقت کلپنا آگئی۔ دھن راج نے کہا۔ ”بیٹی! یہ عمر کہہ رہا ہے پولیس افسر کے گھر میں چھپنے نہیں جائے گا۔“
وہ بولی۔ ”عمر! میں اسپتال سے یہاں تک دیکھتی آرہی ہوں۔ شہر میں درجنوں پولیس کی گاڑیاں گشت کر رہی ہیں۔ میری کار میں بھی جھانک کر دیکھا گیا تھا۔ ایک افسر نے مجھ سے کہا۔ میڈم! عمر دراز سے ہوشیار رہیں۔ اس کے گرفتار ہونے تک تنہا نہ نکلیں، وہ گن پوائنٹ پر آپ کی کار استعمال کر سکتا ہے۔“
وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”کمرے میں چلو۔ تمہیں ایس پی کے گھر جانا ہی ہو گا۔ ایسا لگتا ہے تمام شہر تمہارا دشمن ہو گیا ہے۔ لوگ انعام کے لالچ میں بھی تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔“
اس نے کمرے کے اندر آ کر پوچھا۔ ”تمہارے پاپا کی کیا حالت ہے؟“
وہ دروازے کو اندر سے بند کر کے بولی۔ ”پاپا کو نرک میں جانے دو۔ وہ اتنی جلدی نہیں مریں گے۔ آپریشن ہو گیا ہے۔ گولی نکل گئی ہے۔ وہ زندہ ہیں۔“
وہ پرس کو بیڈ پر پھینک کر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ”تم آج چلے جاؤ گے تو پتا نہیں کب حالات سازگار ہوں گے۔ کب یہاں واپس آؤ گے۔“
وہ بولا۔ ”جلد ہی آؤں گا لیکن ایس پی کے گھر نہیں جاؤں گا۔ مجھے ایک بہت ہی اہم معاملے میں کسی جگہ جانا ہے۔“
”میں نہیں جانے دوں گی۔ تم پکڑے جاؤ گے۔“
”پولیس والوں کو صرف تم ہی نہیں، میں بھی خرید سکتا ہوں اور خرید چکا ہوں۔ ابھی دو چار گھنٹے میں پولیس والے آئیں گے اور مجھے یہاں سے لے جائیں گے۔“
کلپنا نے شدید حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ”اتنی جلدی تم نے پولیس افسران کو بھی خرید لیا؟ تم اتنی تیزی دکھا رہے ہو تو مان لو کہیں برے پھنسو گے۔ آخر وہ پولیس والے تمہیں کہاں لے جائیں گے؟ تم کیوں اندھے کنوئیں میں گرنے جا رہے ہو؟“
”پلیز! میری فکر نہ کرو۔ تم نے وعدہ کیا ہے کہ میرے معاملات میں مداخلت نہیں کرو گی۔ مجھے اپنے طور پر آزادی سے کام کرنے دو گی۔“
وہ لپٹ کر بولی۔ ”میں تمہیں نہیں روکوں گی لیکن مجھے بھی ساتھ لے چلو۔“
”میں کہیں پکنک منانے جاتا تو اپنے ساتھ لے جاتا۔ یہاں آرام سے رہو۔“
اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھا لیا۔ اسے محبت سے بہلانے لگا۔ اس نے پوچھا۔ ”میرے بچے کا کیا ہو گا؟“
”تمہارے نصیب میں ہو گا تو ضرور ہو گا۔“
”تم آؤ گے نا؟ دھوکا تو نہیں دے رہے ہو؟“
”میں اپنی سلامتی کے لیے بھاگتا پھر رہا ہوں۔ حالات ہمارے موافق ہوں گے تو جلد ہی واپس آؤں گا۔“
وہ اسے پیار سے اور باتوں سے بہلاتا رہا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ آج اسے کہاں لے جایا جائے گا۔ جس طرح اس نے کلپنا پر عارضی طور پر بھروسا کر کے وہاں پناہ لی تھی اسی طرح پربھو دیاوان پر بھی بھروسا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

☆☆☆

رات کے دس بجے پربھو دیاوان کی لیڈی سیکریٹری نے فون پر عمر کو مخاطب کیا۔ وہ فوراً ہی بستر سے اٹھ کر باتھ روم کی طرف جانے لگا۔ کلپنا نے کہا۔ ”ایسی بھی کیا رازداری ہے؟ میرے سامنے بات کرو۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے سنی ان سنی کر کے باتھ روم کے دروازے کو اندر سے بند کیا پھر فون پر کہا۔ ”میں عمر دراز بول رہا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”میں پربھوجی کی پی اے بول رہی ہوں۔ اپنی گھر والی سے بولو کہ آدھ گھنٹے میں ایک بلیک ہنڈا اس کے دروازے پر آئے گی۔ اس میں ایک مسلمان میاں بیوی اور ان کی دو بیٹیاں ہوں گی۔ میاں کا نام محمد ہاشم اور بیوی کا نام جمیلہ بیگم ہے۔ وہ ان کی کار میں بیٹھ جائے۔“

”میں ابھی سلمٰی کو فون کرتا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”گیارہ بجے تک تمہارے دروازے پر پولیس پٹرولنگ وین آئے گی۔ پولیس افسر کا نام نعمت اللہ خان ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تیار رہوں گا۔“

رابطہ ختم ہوگیا۔ عمر نے اسی وقت سلمٰی کو فون پر مخاطب کیا اور اسے بتایا کہ ایک بلیک ہنڈا کار اس کے دروازے پر آرہی ہے اور اسے ایک مسلمان فیملی کے ساتھ انجانی منزل کی طرف سفر کرنا ہے۔

وہ مختصر سی بات کر کے باتھ روم کا دروازہ کھول کر کمرے میں آیا۔ کلپنا نے گھور کر کہا۔ ”میں جانتی ہوں۔ تم اپنی سگی سے باتیں کر رہے تھے۔“

وہ اسے کھینچ کر بازوؤں میں بھر کر بولا۔ ”میں ابھی ایک گھنٹے کے اندر جانے والا ہوں۔ موڈ خراب نہ کرو۔ ہنستے بولتے رخصت کرو۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ایسا لگتا ہے، تم جانے کے بعد واپس نہیں آؤ گے۔“

”تم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ میں تمہیں نہیں بھولوں گا۔ گرفتاری کا خطرہ نہ رہا تو جلد ہی تمہیں محبتیں دینے آؤں گا۔“

وہ فوراً ہی غسل کرنے کے لیے پھر باتھ روم میں آیا۔ اب اسے پاک صاف رہ کر ایک نئے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ غسل کے دوران سلمٰی نے فون پر بتایا کہ وہ محمد ہاشم کی فیملی کے ساتھ ایک کار میں ہے۔ جمیلہ بیگم نے کہا ہے کہ اگلی کسی منزل پر تم سے ملاقات ہوگی۔

”انشاء اللہ ہم ضرور ملیں گے۔“

وہ باتھ روم سے باہر آیا۔ کلپنا کمرے میں نہیں تھی۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا، وہ باہر برآمدے میں کسی سے فون پر باتیں کر رہی تھی۔ اس کے ڈیڈی اور ممی کے بھی کانوں سے فون لگے ہوئے تھے۔ وہ تینوں اپنے کئی تابع داروں سے باتیں کر رہے تھے۔

وہ مسکرانے لگا۔ یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اپنے کرائے کے تابع داروں کو اس کے پیچھے لگانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ یہاں سے نکل کر کہاں چھپنے جارہا ہے۔

آدھ گھنٹے کے بعد ایک پولیس پیٹرولنگ وین بنگلے کے سامنے آکر رک گئی۔ عمر کو فون پر پیغام ملا۔ ”مسٹر عمر! میں نعمت اللہ خان بنگلے کے گیٹ پر ہوں۔“

اس نے پیغام کا جواب دیا۔ ”میں ابھی سامان لے کر آرہا ہوں۔“

اس نے ہیروئن اور سونے کے بسکٹس سے بھرے ہوئے دو بیگ اٹھا کر انہیں باہر لاکر رکھا۔ دو سپاہی انہیں اٹھا کر گاڑی میں لے گئے۔

کلپنا آکر اس سے لپٹ گئی۔ روتے ہوئے بولی۔ ”کیا مجھے چھوڑ کر جارہے ہو؟“

وہ اسے تھپک کر بولا۔ ”عورت کا موڈ کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔ ابھی چند سیکنڈ پہلے تم میرے پیچھے اپنے کتوں کو لگا کر آئی ہو اور آتے ہی آنسو بہا رہی ہو۔“

”نہیں عمر! یہ آنسو میرے دل سے نکل رہے ہیں۔ میں تمہارے بغیر کیسے رہ سکوں گی؟“

”میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں زیادہ باتیں نہیں کر سکوں گا۔ میری یہ وارننگ سن لو کہ تمہارا جو بھی تابع دار میرے پیچھے آئے گا، وہ زندہ واپس نہیں جائے گا۔“

اس نے بڑے پیار سے چوم کر اسے الگ کیا۔ پھر تیسرا بیگ اٹھا کر باہر آکر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جب وہ گاڑی اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھی تو عمر نے نعمت اللہ خان سے کہا۔ ”میں نے اب تک جہاں پناہ لی تھی، ان کا بھی ایک کرمنل نیٹ ورک ہے۔ ان کے آدمی بڑی چالاکی سے میرا تعاقب کرتے ہوئے یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ میں کہاں جا کر چھپنے والا ہوں۔“

”فکر نہ کرو، وہ مرنے کے لیے ہمارے پیچھے آئیں گے۔ ہم آگے جا کر تمہیں چند گھنٹوں کے لیے ایک تھانے کے لاک اَپ میں رکھیں گے۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”میں نے پربھوجی پر اندھا اعتماد کیا ہے... کیا یہ سمجھوں کہ قانون کی گرفت میں آگیا ہوں؟“

”تم پولیس کی حراست میں ہو لیکن قانون کی گرفت میں نہیں ہو۔ پربھوجی کے سائے میں محفوظ ہو۔“

ادھر کلپنا سر پکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ”ڈیڈ! ہم دیکھتے آرہے ہیں کہ وہ کتنا نڈر دلیر اور خطرناک ہے۔ وہ

ہمارے لیے سب سے اہم تھا۔ ہم اسے روک بھی نہیں سکتے تھے۔ روکنا چاہتے تو وہ ہماری موت بن جاتا۔“

دھن راج نے کہا۔ ”ذرا صبر کرو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں جارہا ہے؟ ہم اسے نظروں سے دور نہیں ہونے دیں گے۔“

وہ بولی۔ ”جب تک سلمٰی اس کے دل میں دھڑکتی رہے گی، میں اسے اپنا بنا کر نہیں رکھ سکوں گی۔ ہم کیسے معلوم کریں کہ وہ چڑیل کہاں چھپی ہوئی ہے؟“

کاننا نے کہا۔ ”میں یقین سے کہتی ہوں، اگر وہ کہیں دور راجستھان سے باہر جارہا ہے تو اسے اپنے ساتھ ضرور لے جائے گا۔“

وہ بولی۔ ”بھگوان کرے تمہاری بات درست ہو۔ وہ اس کے ساتھ رہے گی تو ہمارے آدمیوں کی نظروں میں ضرور آئے گی۔ پھر تو میں سارے کام چھوڑ کر اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کروں گی۔“

سلمٰی ایک فیملی کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ محمد ہاشم کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ جمیلہ بیگم اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر سلمٰی ان کی دو جوان بیٹیوں کے ساتھ تھی۔ ریگستانی علاقہ تھا۔ کھڑکی کے باہر رات کی گہری تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں گاڑی ہائی وے کی پختہ سڑک پر تیز رفتاری سے جارہی تھی۔

دونوں لڑکیاں بڑی اچھی باتیں کر رہی تھیں۔ سلمٰی کو اطمینان تھا کہ وہ اس فیملی کے ساتھ محفوظ ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”ہم کہاں جارہے ہیں؟“

ہاشم نے جواب دیا۔ ”یہاں سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک تھانہ ہے۔ بستی کا نام بھی تھانہ ہے۔ وہاں تمہارا مجازی خدا آہنی سلاخوں کے پیچھے ہوگا۔ تم وہیں اس سے ملو گی۔“

وہ گھبرا گئی۔ پریشان ہو کر بولی۔ ”کیا عمر گرفتار ہوگیا ہے؟ اس نے تو کہا تھا کہ...“

جمیلہ بیگم نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ”گھبراؤ مت۔ نہ وہ گرفتار ہوا ہے، نہ تمہارے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے۔ تم میری ان بیٹیوں جیسی ہو۔ ہم تمہارے سہاگ پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”میں نے تو اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ ڈرنے یا گھبرانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہوتا تو وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔“

آسمان کا کنارہ سرخ ہو رہا تھا کیونکہ سُرخی میں ڈوبا ہوا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ رات روشن ہونے والی تھی۔ ایک فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ نعمت اللہ نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”تم لوگوں کا تعاقب کیا جارہا ہے۔ انہوں نے اپنی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بجھا رکھی ہیں۔“

خان نے کہا۔ ”تو پرابلم۔ اب چاند کی روشنی میں نظر آئیں گے۔ قریب آنے والے چھپ نہیں سکیں گے۔ یوں بھی ہم تھانے کے قریب پہنچ رہے ہیں۔“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”ہم ان پر حملہ نہیں کریں گے۔ آگے جا کر وہ خود ہی ہمارے جال میں پھنسنے والے ہیں۔“

فون کا رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ جے پور سے ڈھائی سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ تھانے پہنچ کر انہوں نے گاڑی روک دی۔ وہاں کے تھانے دار نے ان کا استقبال کیا۔ نعمت اللہ سے اور عمر دراز سے مصافحہ کیا پھر عمر سے بولا۔ ”سوری... دشمنوں کو دکھانا ہے کہ تمہیں گرفتار کرلیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے سلاخوں کے پیچھے چلے جاؤ۔“

وہ پربھو دیا وان کے رحم و کرم پر تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے؟ چپ چاپ آہنی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا۔

کلپنا کے کارندوں نے اس تھانے کی چار دیواری سے دور مورچا بنا لیا تھا۔ وہ تعداد میں بارہ تھے۔ اس تھانے کو دو دو کی تعداد میں چاروں طرف سے گھیر رہے تھے۔ پھر ان میں سے چار افراد دو موٹر سائیکلوں میں بیٹھ کر تھانے کے دروازے پر آئے۔ انہوں نے تھانے دار سے کہا۔ ”ہم مسافر ہیں۔ پاربتی جارہے ہیں۔ بھوک لگی ہے، کھانا ہمارے پاس ہے۔ آپ اجازت دیں گے تو ہم یہاں بیٹھ کر کچھ کھا پی سکیں گے۔“

تھانے دار نے انہیں اندر بلایا۔ پھر اور کئی سپاہیوں نے انہیں اپنے نشانے پر رکھ لیا۔ ان کی تلاشی لی گئی تو ان کے لباس کے اندر سے چار گنیں برآمد ہوئیں۔ انہوں نے کہا۔ ”ہمارے پاس ان کے لائسنس ہیں۔ اندھیری رات میں سفر کر رہے ہیں۔ یہ ہتھیار ہمارے لیے ضروری ہیں۔“

تھانے دار نے کہا۔ ”ہم تمہارے متعلق پہلے انکوائری کریں گے۔ تب تک تم چاروں ہمارے مہمان رہو گے۔ جاؤ بھوک لگی ہے تو حوالات میں بیٹھ کر کھاؤ پیو۔“

ان چاروں کو نہتا کر کے سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

گیا۔ نعمت اللہ نے ان سے کہا۔ ”سچ بولو گے تو زندہ رہو گے۔ چلو بتاؤ کہ باہر تمہارے اور کتنے ساتھی ہیں؟“

ایک نے کہا۔ ”ہمارا اور کوئی ساتھی نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں، جھوٹ بولو۔ ابھی سچ سامنے آجائے گا۔ جب کاؤنٹر فائرنگ ہوگی۔“

وہ چاروں یہ دیکھنے آئے تھے کہ تھانے کے اندر عمر دراز کے ساتھ کیسا سلوک کیا جارہا ہے۔ انہوں نے اسے بھی لاک اپ میں دیکھا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد سلمٰی وہاں آگئی۔ عمر دراز کو دیکھتے ہی دوڑتی ہوئی آکر سلاخوں سے لگ گئی۔ دونوں نے محبت سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔

نعمت اللہ نے مسکرا کر کہا۔ ”دروازہ کھول دو، یہ میاں بیوی ہیں۔“

دروازہ کھل گیا۔ سلمٰی اس سے لپٹ کر خوشی کے مارے رونے لگی۔ وہ چاروں قیدی دوسرے سیل سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ ”کلپنا نے اسی عورت کے بارے میں کہا ہے کہ اسے پکڑ کر لائیں گے تو ہمیں پچاس ہزار الگ سے دیں گی۔“

دوسرے نے کہا۔ ”کلپنا بڑی بدھی مان ہے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مجنوں کے پیچھے لیلٰی ضرور آئے گی اور یہ آگئی ہے۔“

تیسرے ساتھی نے کہا۔ ”یہ مجنوں کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اسے ہم لے جائیں گے۔“

باہر رات کے سائے میں ایک فائر کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ سنائی دی۔ کاؤنٹر فائرنگ شروع ہوچکی تھی۔ وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی اور آخری بار چیخنے والوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

تھانے دار نے ان چاروں کے پاس آکر کہا۔ ”تم کہہ رہے تھے باہر تمہارے آدمی نہیں ہیں۔ تم صرف چار ہو۔ اب بھی بتادو، باہر حملہ کرنے والے کتنے ہیں؟“

تھانے دار نے ریوالور سے ایک قیدی کا نشانہ لے کر کہا۔ ”تمہارے ساتھی نرک میں جارہے ہیں۔ تم چاروں بھی جاؤ گے۔“

تین ساتھیوں کے پیچھے کھڑا ہوا قیدی تھانے دار کو پوری طرح نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے سر سے وگ اتاری۔ وگ کے اندر ایک پستول چھپا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی تھانے دار کے ہاتھ پر گولی مار کر اس کا ریوالور گرادیا۔

دوسرے نے بھی اپنی وگ سے ایک پستول نکال کر کہا۔ ”خبردار! ریوالور کو زمین پر رہنے دو۔ اسے اٹھاؤ گے تو مرو گے۔ زندگی چاہتے ہو تو سپاہی سے دروازہ کھولنے کو کہو۔“

سپاہی کو بھی اپنی زندگی پیاری تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ چاروں باہر آگئے۔ نعمت اللہ اور دوسرے سپاہی تھانے کے باہر گولیاں چلارہے تھے۔ انہیں اندر کی خبر نہیں تھی۔ کلپنا کے ان تابع داروں نے اس سیل کا بھی دروازہ کھلوادیا جس میں سلمٰی اور عمر دراز محفوظ تھے۔

وہ سمجھ رہے تھے، عمر نہتا ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں مگر تمہاری عورت کو لے آئیں۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”میں جانتا ہوں تم لوگ کلپنا کے لیے کام کررہے ہو۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔“

اس نے اپنا فون نکالا۔ ایک نے کہا۔ ”تم بعد میں باتیں کرتے رہنا۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہم تمہاری عورت کو لے جارہے ہیں۔“

انہوں نے تھانے دار اور سپاہیوں کو گولی ماردی۔ ان میں سے دو کے پاس ہتھیار تھے باقی جو نہتے تھے، انہوں نے سلمٰی کو دونوں طرف سے پکڑلیا۔ وہ عمر کو نہتا سمجھ کر اسے اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ ایسے ہی وقت اس نے اچانک ریوالور نکال کر ان دونوں کو گولیوں سے بھونتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری جان ہے، اسے ہاتھ لگانے والے جان سے جاتے ہیں۔“

دونہتوں نے اپنے مردہ ساتھی کے پستول کی طرف چھلانگ لگائی تو عمر نے ان سے زیادہ پھرتی دکھائی۔ ایک کو گولی مارتے ہوئے دوسرے کو گھوم کر لات لگائی۔ وہ پستول کے قریب پہنچتے پہنچتے لات کھا کر دور جاگرا۔ پھر اٹھ کر بھاگنے لگا۔ ایسے وقت باہر سے آنے والے سپاہیوں نے اسے گولی ماردی۔

باہر فائرنگ رک گئی تھی۔ نعمت اللہ نے اندر آکر بڑے دکھ کے ساتھ تھانے دار اور سپاہیوں کی لاشیں دیکھیں پھر عمر سے کہا۔ ”پتا نہیں یہ حملہ آور کتنے تھے۔ ان میں سے دو اپنی موٹر سائیکل پر فرار ہوگئے۔ ہم نے ان کی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کو دور جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ بہرحال ہمیں یہاں رکنا نہیں چاہیے۔ آؤ نکل چلیں۔“

وہ سب پھر بڑی سی وین میں آکر بیٹھ گئے۔ تھانے دار نے پربھودیال سے پچاس ہزار رشوت کے طور پر لیے تھے۔ یہ طے تھا کہ نعمت اللہ جب عمر اور اس کی بیوی کو لے کر ادھر سے گزرے گا تو تھانے دار ان کا تعاقب کرنے والوں کو روکے گا اور عمر دراز کو بہ آسانی وہاں سے گزرنے

دے گا۔

تھانے دار نے ڈیلنگ کے مطابق یہی کیا تھا۔ لیکن پچاس ہزار لے کر پانچ سپاہیوں سمیت مارا گیا تھا۔ آگ اور بارود کے کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کلپنا کے بھی کئی آدمی مارے گئے تھے۔ تین زخمی ہوئے تھے اور دو صحیح سلامت رہ کر فرار ہوگئے تھے۔

عمر دراز بھی صحیح سلامت تھا۔ سلمٰی کے ساتھ وین کی پچھلی سیٹ پر تھا۔ ان کے سامنے والی سیٹ پر تین سپاہی تھے اور ڈرائیونگ سیٹ پر نعمت اللہ خان ایک سپاہی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ہاشم اپنی بیوی جمیلہ اور دو بیٹیوں کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا۔ اس کی ڈیوٹی پوری ہوچکی تھی۔

وین کے باہر چاندنی رات تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ آخری سیٹ پر عمر بیٹھا ہوا تھا اور سلمٰی اس کے زانو پر سر رکھے سو رہی تھی۔ نیند تو نہیں آرہی تھی لیکن محبوب کی قربت سے دلی سکون حاصل ہورہا تھا۔

عمر نے اپنا فون نکال کر کلپنا کے نمبر پنچ کیے۔ پھر اسے کان سے لگایا۔ جلدی کلپنا کی آواز سنائی دی۔ ”ہائے عمر! جب سے گئے ہو تمہارے فون کا انتظار کررہی ہوں۔ اتنی دیر بعد میری یاد آئی ہے۔ تم ابھی کہاں ہو؟“

”میں تمہیں کبھی فون نہ کرتا لیکن مجبور ہوگیا ہوں۔ تم آستین کا سانپ ہو۔ آخر تم نے مجھے ڈس ہی لیا۔“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

”وہی کہہ رہا ہوں جو تم نے کیا ہے۔ تمہارے آدمی میرے دشمن بن گئے ہیں۔ میرے راستے میں رکاوٹیں پیدا کررہے ہیں۔“

”یہ جھوٹ ہے۔ میرا کوئی آدمی تمہارے پیچھے نہیں گیا ہے۔ وہ دشمنوں کے کرائے کے ٹٹو ہوں گے۔“

”وہ تمہارے ہی آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ کر کہا تھا کہ کلپنا دیوی نے مجھے نقصان پہنچانے سے منع کیا ہے۔ صرف میری عورت کو چھین لانے کا حکم دیا ہے اور وہ ذلیل کمینے میری سلمٰی کو مجھ سے چھین کر لے گئے ہیں۔“

سلمٰی نے لیٹے ہی لیٹے آنکھیں کھول کر عمر کو دیکھا۔ ادھر کلپنا ایک دم سے خوش ہوکر بولی۔

”کیا سچ کہہ رہے ہو؟ انہوں نے اسے تم سے چھین لیا ہے؟“

”وہ صبح تک سلمٰی کو لے کر تمہارے پاس آئیں گے۔ تم نے میری سلمٰی کو مجھ سے جدا کرکے اچھا نہیں کیا۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”میری محبت کو سمجھو، میں نے دشمنی نہیں کی ہے۔ وہ سوکن میری پناہ میں رہے گی تو تم کچے دھاگے سے بندھے چلے آؤ گے۔“

وہ پریشانی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ”میں کیا کروں؟ سلمٰی کو چھوڑ کر دور نہیں جاسکتا۔ تمہارے پاس واپس آؤں گا تو گرفتار ہوجاؤں گا۔“

”میرے ہوتے ہوئے کسی کا باپ بھی تمہیں گرفتار نہیں کرسکے گا۔ میں تمہیں کلیجے میں چھپا کر رکھوں گی۔ کوئی تمہاری پرچھائیں تک بھی نہیں پہنچ سکے گا۔“

عمر نے کہا۔ ”تمہارے آدمیوں نے بھرپور حملہ کیا تھا۔ مجھے لے جانے والے سپاہی ان کا مقابلہ نہ کرسکے۔ آخر کتنے آدمی تھے تمہارے؟“

”بارہ تھے۔ وہ سب زبردست فائٹر تھے۔ یہ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا۔“

”یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ عورت کی عقل اس کے گھٹنوں میں ہوتی ہے۔ تم سیدھی طرح اقرار نہ کرتیں کہ اپنے آدمیوں کو میرے پیچھے لگایا ہے۔ دیکھو میں نے کس طرح تمہاری کمینگی تمہارے منہ سے اگلوائی ہے۔“

وہ پریشان ہوکر بولی۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

”تمہارے باپ کے باپ بھی میری سلمٰی کو چھو نہیں سکیں گے۔ تمہارے کئی آدمی نرک میں گئے۔ دو جان بچا کر بھاگ گئے۔ وہ تمہارے پاس آئیں گے اپنا دکھڑا سنائیں گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ تم نے مجھے ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔ سلمٰی لیٹے ہی لیٹے بڑے جذبوں سے اس سے لپٹ گئی۔ ”اللہ! تم مجھے کتنا چاہتے ہو، میری جیسی خوش نصیب بیوی کوئی نہ ہوگی۔ میں بیوی بھی ہوں اور محبوبہ بھی۔“

اس نے سلمٰی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اشارے سے سمجھایا۔ ”یہاں دوسرے بھی ہیں، رومینٹک نہیں ہونا چاہیے۔“

وہ بولی۔ ”اتنا تو بتادو، وہ عورت کون ہے جو مجھ سے دشمنی کررہی ہے؟ سچ بولو۔ کیا وہ میری سوکن ہے؟“

عمر نے پھر اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر کہا۔ ”چپ چاپ سوجاؤ۔ ہم کسی محفوظ منزل پر پہنچ کر بات کریں گے۔“

اس نے آنکھیں بند کرلیں پھر دوسرے لمحے میں کھول دیں۔ کالنگ ٹون سنائی دی۔ عمر نے کہا۔ ”وہی ہے۔ تم آنکھیں ہی نہیں، کان بھی بند کرو اور سوتی رہو۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ اسے کلپنا کی آواز سنائی دی۔ "تم مجھے دشمن کیوں سمجھتے ہو؟ یہ کیوں نہیں سمجھتے جو بھی کرتی ہوں' تمہاری محبت سے مجبور ہو کر کرتی ہوں۔"

"اور میں جو بھی کرتا ہوں سلمٰی کی محبت سے مجبور ہو کر کرتا ہوں۔ میں ایک سیدھا سادہ سا چار پیسوں کی نوکری کرنے والا آدمی تھا۔ جب سے سلمٰی کو مجھ سے چھین لینے کی سازشیں شروع ہوئیں، تب سے میں موم سے پتھر اور پتھر سے فولاد بن رہا ہوں۔ تم کبھی مکاری سے محبت کر کے مجھے متاثر نہیں کر سکو گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا، سلمٰی لیٹے ہی لیٹے اس کی آغوش میں کھسکی جا رہی تھی۔ عمر نے بولنے سے منع کیا تھا اس لیے مجبوراً چپ تھی۔ خاموش اداؤں سے اپنی محبت اور عقیدت ظاہر کر رہی تھی۔

پھر کلپنا نے اسے پکارا۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ وہ چیخ کر بولی۔ "فار گاڈ سیک۔ فون بند نہ کرنا، میں مر جاؤں گی۔"

وہ بولا۔ "تم نے اپنی موت کا سامان خود کیا ہے۔ مجھے اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ تمہارے پر کاٹے نہ گئے تو آج ناکام ہونے کے بعد پھر کسی دن سلمٰی کو نقصان پہنچاؤ گی۔ اس سے پہلے ہی میں تمہیں اور تمہارے نیٹ ورک کو خاک میں ملا دوں گا۔"

"مجھے خاک میں ملانے ہی کے لیے آؤ۔ بس ایک بار آ جاؤ، میں پیار دینے کی انتہا کر دوں گی۔"

اس نے فون کو اس بار آف کر دیا۔ اب کوئی کال نہیں آ سکتی تھی۔

☆☆☆

بھوانی شنکر اور مہاراج جیسے دشمنوں کے لیے وہ اندھیرے سے آنے والی گولی بن گیا تھا۔ شنکر کو اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ آپریشن کے بعد اس کے جسم سے گولی نکال دی گئی تھی۔ وہ پھر سے زندگی کی سانسیں لے رہا تھا۔

مہاراج کی نیند اڑ گئی تھی۔ اس نے اپنے آس پاس سیکیورٹی سخت کر دی تھی۔ پھر بھی اندیشہ تھا کہ عمر کسی دن بھی اسے اسپتال نہیں سیدھا شمشان گھاٹ پہنچا دے گا۔

اعلیٰ حکام ہوم منسٹر وکرم جادیو سے پوچھ رہے تھے کہ عمر دراز چیونٹی سے شیر کیسے بن گیا ہے؟ وہ شیر گرفت میں کیوں نہیں آ رہا ہے؟ وہ کوئی تنکا نہیں تھا کہ کسی کو نظر نہ آتا۔ چھ فٹ کا جوان تھا۔ کہیں آسانی سے چھپ نہیں سکتا تھا۔ پھر یہ کہ وہ چھپ کر بیٹھا ہوا نہیں تھا۔ آئے دن وارداتیں کر رہا تھا اور قانون کے محافظوں کو اپنی تلاش میں تھکا رہا تھا۔

ہوم منسٹر پریشان تھا۔ اس نے دوسرے صوبے کی پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو راجستھان میں کارروائی کی اجازت دی تھی۔ اس کے باوجود عمر دراز کی پرچھائیں بھی نہیں مل رہی تھی اور اب انڈر ورلڈ کے ڈان اور گاڈ فادرز فکر میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ نیا طوفان کیسا ہے کہ تھم نہیں رہا ہے۔ سب ہی کو تنکے کی طرح اڑائے لیے جا رہا ہے۔ وہ آخر کون ہے کہ جس کی جھلک بھی دکھائی نہیں دے رہی ہے؟

یہ عمر دراز کی خوش نصیبی تھی کہ وہ انتہائی خطرناک مجرموں اور کتوں کی طرح بو سونگھنے والے سراغ رسانوں سے بچ کر نکل گیا تھا اور اب ممبئی کے بے تاج بادشاہ پربھو دیا وان کی چھتر چھایا میں پہنچ گیا تھا۔

دوسرے دن انڈر ورلڈ کے تمام حکمرانوں نے باری باری فون کال سنی۔ کہا گیا۔ "عمر دراز کو بھول جاؤ۔ پربھو دیا وان اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جو اس کی تلاش میں پربھو جی کی طرف آئے گا، حرام موت مارا جائے گا۔"

اس فون کال نے ممبئی سے لے کر مدراس تک انڈر ورلڈ میں تہلکہ مچا دیا۔ یہ سراغ تو مل گیا تھا کہ وہ ممبئی میں پربھو دیا وان کی ... پناہ گاہ میں ہے۔ لیکن اس کی بیشتر پناہ گاہوں کا پتا نہ دشمنوں کو معلوم تھا اور نہ ہی انٹیلی جنس والے جانتے تھے۔

پولیس اور انٹیلی جنس والے دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ان میں ایک تو وہ تھے جو واقعی فرض شناس تھے۔ عمر دراز کو ہر قیمت پر پھانسی کے تختے تک پہنچانا چاہتے تھے۔ دوسرے وہ تھے جو پربھو دیا وان کے نمک خوار اور وفادار بن گئے تھے۔ قانون کی وردی پہن کر قانون کے خلاف پربھو جی کے اہم تابع داروں کو تحفظ فراہم کرتے رہتے تھے۔

اگر ممبئی میں پربھو دیا وان کی حکمرانی تھی تو بنگلور میں سوامی نارنگ ریڈی کی بے تاج بادشاہت تھی۔ وہ دونوں اپنے اپنے علاقے سے باہر دوسرے خطرناک مجرموں کو اپنے زیرِ اثر لاتے تھے اور ان سے بھتا وصول کر کے ان کی خفیہ طاقت بن جاتے تھے۔

بھوانی شنکر کو بنگلور کے سوامی نارنگ ریڈی کی پشت پناہی حاصل تھی۔ وہ پاکستان اور انڈیا کے بارڈر سے جو کماتا تھا، اس کا ایک حصہ سوامی نارنگ کو دیا کرتا تھا۔ سوامی نے اسپتال آ کر اس کی عیادت کی۔ اس نے کہا۔ "چیونٹی ہاتھی کی سونڈ میں گھس گئی ہے۔ جسے ایک چٹکی میں مسل دیا جاتا ہے، اس سے ہاتھی مات کھا رہا ہے۔"

بھوانی شنکر نے کہا۔ "میں کیا کروں' وہ نظر نہیں آتا۔ ایک بار بھی دکھائی دے گا تو زندہ بچ کر نہیں جائے گا۔"

"وہ کبھی نظر نہیں آئے گا۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی کہ کرائے کے بدمعاش اس کے نام سے تمہیں نقصان پہنچا رہے ہیں۔ وہ خود واردات نہیں کر رہا ہے۔ وہ نہ کبھی قریب آئے گا، نہ کبھی دکھائی دے گا۔"

وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "شنکر! تم بوڑھے ہو گئے ہو اور اب تو اس نے تمہیں اپاہج بنا دیا ہے۔ زخم بھر جائے گا، تب بھی لنگڑا کر چلو گے۔ اس کے پیچھے دوڑو گے کیسے؟"

"میں تمام واردات کرنے والوں کو خرید لوں گا۔ عمر کا کام کرنے والوں کو کھری ٹاؤن میں تلاش کروں گا۔ انہیں چن چن کر گولی ماروں گا۔"

سوامی نارنگ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "زیادہ نہ بولو۔ تم اسپتال میں ہو اور باہر کی دنیا بھول گئے ہو۔ عمر اور زیادہ طاقتور ہو گیا ہے۔ اسے پربھو دیا وان نے پناہ دی ہے۔ جب تک وہ ممبئی اور مہاراشٹر میں رہے گا، ہم میں سے کوئی اس کے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکے گا۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "وہ پربھو دیا وان تک کیسے پہنچ گیا؟"

سوامی نے کہا۔ "میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پربھو نے خود اس سے ڈیل کی ہے۔ وہ کھری ٹاؤن پر حکمرانی چاہتا ہے۔ ہم وہاں کے بارڈر سے سونا کما رہے ہیں۔ وہ تمہیں وہاں سے ہٹا کر عمر دراز کو لانے کی پلاننگ پر عمل کر رہا ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "میں پتا نہیں کب تک اسپتال میں پڑا رہوں گا؟ اسے کھری ٹاؤن میں من مانی کرنے سے کیسے روکوں گا؟ سوامی! آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔"

"میں اسی لیے تم سے ملنے آیا ہوں۔ اپنے آدمیوں کو حکم دو کہ جب تک تم چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو جاؤ گے' میں کھری ٹاؤن کے معاملات سنبھالوں گا۔ وہاں کا دھندا جاری رہے گا۔ تمہارا شیئر تمہیں ملتا رہے گا۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ آپ ہی پربھو دیا وان کو میرے علاقے میں آنے سے روک سکیں گے لیکن..."

سوامی نے کہا۔ "لیکن یہ کہ میں تمہارے علاقے میں ہمیشہ نہیں رہوں گا۔ وہ تمہاری جگہ ہے۔ تم مجھے حصہ دیتے ہو۔ میں وہاں قبضہ نہیں جماؤں گا۔ جیسے ہی چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے، میں وہاں سے چلا جاؤں گا۔"

بھوانی شنکر نے فون پر نمبر پنچ کیے۔ اپنے خاص ملازموں کو، راز داروں کو اور تابع داروں کو حکم دیا۔ "میرے حکم کو توجہ سے سنو اور اس کی تعمیل کرو۔ سوامی نارنگ ریڈی میری غیر موجودگی میں میرا دھندا سنبھالیں گے۔ تم سب ان کے احکامات کی تعمیل کرتے رہو گے۔ ایک آدھ ہفتے میں اسپتال سے چھٹی ہوتے ہی میں کھری ٹاؤن آ کر اپنا دھندا سنبھال لوں گا۔"

سوامی اس سے رخصت ہو کر اسپتال سے باہر آیا۔ اس کے ایک باڈی گارڈ نے کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہاں ایک حسینہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ کار وہاں سے چل پڑی۔

حسینہ نے پوچھا۔ "کیا کھری ٹاؤن پر ہمارا قبضہ ہو گا؟"

"ضرور ہو گا۔ بھوانی شنکر زخمی پڑا ہے۔ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم نے اس کی جگہ نہ سنبھالی تو پربھو دیا وان جلد ہی عمر دراز کو وہاں پہنچا دے گا۔"

وہ بولی۔ "ہمارا قبضہ تو عارضی ہو گا۔ شنکر اسپتال سے آتے ہی اپنی جگہ سنبھال لے گا۔"

"وہ اسپتال سے نہیں آئے گا۔ سرمست خان سے بات کراؤ۔"

حسینہ نے فون پر نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر سوامی نے کہا۔ "سرمست خان دس ہزار ملیں گے۔ آج رات پولیس اسپتال میں آ کر بھوانی شنکر کی دوسری ٹانگ میں گولی مارو۔"

"کیا اسے جان سے نہیں مارنا ہے؟"

"نہیں۔ اسے صرف زخمی کرو گے۔ پھر اس سے کہو گے کہ وہ گولی عمر دراز کی طرف سے ہے۔ عمر کھری ٹاؤن پر قبضہ جمانے کے لیے اسے اپاہج بنا کر رکھے گا۔"

"ٹھیک ہے، ہم یہی بولے گا۔"

سوامی نے حسینہ کو فون دیتے ہوئے کہا۔ "اب وہ ایک دو مہینے تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے گا۔ اس کے بعد بھی ہم اسے ہاتھوں پیروں سے معذور بناتے رہیں گے۔"

☆☆☆

وہ دوسرے دن ممبئی پہنچ گئے۔ انہیں ایک صاف ستھرا کشادہ مکان رہنے کے لیے دیا گیا۔ وہاں نزدیک اور دور تک رہنے والی سب ہی فیملی پربھو دیا وان کی عقیدت مند اور وفادار تھی۔ وہاں کوئی دشمن یا پولیس والا گزرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

سلمٰی اور عمر نے وہاں کچھ وقت پیار اور محبت سے گزارا۔ پھر غسل کرنے کے بعد دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوران عمر اسے کلپنا کے متعلق بتاتا رہا اور وہ بڑے دکھ سے اور سنجیدگی سے سنتی رہی۔
پھر وہ بولا۔ ”تم جانتی ہو میں تمہارا دیوانہ ہوں۔ تمہارے سوا کسی عورت کو چھونا بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن حالات نے مجھے کلپنا کی پناہ میں پہنچا دیا تھا۔“
وہ بولی۔ ”میں جانتی ہوں اس کے پاس جا کر نہ رہتے تو کب کے مارے جاتے۔ تمہیں آج کی طرح طاقتور رہنے کا موقع نہ ملتا لیکن...“
وہ ذرا رک کر بولی۔ ”میں عورت ہوں۔ یہ سن کر برداشت نہیں ہو رہا ہے کہ وہ میرے حصے کی تمام قربتیں تم سے حاصل کرتی رہی۔ میرے حقوق مجھ سے چھینتی رہی۔“
وہ بڑے دکھ سے بولی۔ ”میں تمہارے حالات کو سمجھتے ہوئے یہ برداشت کرلوں گی لیکن یہ کیسے برداشت کروں کہ وہ تم سے ایک بچہ بھی لے گی۔ بچہ تو میاں بیوی کے درمیان ایک مضبوط زنجیر ہوتا ہے۔ مرد کو عورت کے ساتھ باندھ کر رکھتا ہے۔ عورت اپنے مرد کی تمام قربتوں کو اپنے اندر سمیٹ کر محفوظ کرتی رہتی ہے۔ پھر اسے بچے کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ یہ خوش نصیبی کلپنا کو نصیب ہو رہی ہے۔ میں محروم ہوں۔“
”نہ بچہ ہوا ہے نہ وہ ماں بنی ہے۔ جو میرا غلط اور ناپسندیدہ وقت وہاں گزر چکا ہے، اسے بھول جاؤ۔ آئندہ وہ ہمارے درمیان نہ آئے گی، نہ میں اسے دیکھنا... گوارا کروں گا۔“
”پھر بھی میرے اندر یہ بے چینی رہے گی کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بن سکتی ہے۔“
”میں نے کہا نا آئندہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔“
”اب نہ لگانے سے کیا ہوتا ہے۔ جب سے جدا ہوئے ہو اور اس کے پاس گئے ہو جانتے ہو ڈیڑھ ماہ گزر چکے ہیں۔ تم یہ نہیں جانتے کہ بنیاد پڑ چکی ہے یا نہیں؟ یہ تو مہینے دو مہینے میں اچانک ظاہر ہوگا۔“
”جو ابھی نہیں ہوا ہے اس کے لیے سوچ کر پریشان ہو رہی ہو۔ ہم کل سے جاگ رہے ہیں۔ چلو آؤ سو جاؤ۔“
اس نے اسے سمجھایا منایا۔ وہ دونوں ہی تھکے ہوئے تھے۔ جلد ہی سو گئے۔ عمر کو پچھلے ڈیڑھ ماہ سے کلپنا کے ساتھ نیند تو آتی تھی لیکن اندر سے جاگتا رہتا تھا۔ دشمنوں کا خوف نیند سے چونکا دیتا تھا۔ اس روز وہ سلمٰی کے ساتھ گہری نیند سوتا رہا۔ شام سے رات ہوگئی۔ وہ دونوں جیسے بے ہوش پڑے رہے۔ رات کے دو بجے ان کی آنکھ کھلی۔
انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا پھر ایک دوسرے کی آغوش میں آنکھیں بند کرلیں۔ پوری طرح تھکن نہیں اتری تھی۔ پھر یہ کہ موت سے لڑتے ہوئے آگ اور بارود سے گزرنے کے بعد انہیں سکون نصیب ہوا تھا۔ وہ پھر بے ہوشی کی نیند سو گئے۔
دروازے پر دستک سن کر ان کی آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ باہر دھوپ نکل آئی ہے۔ سلمٰی اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ عمر نے بیڈ سے اتر کر دروازے کو کھولا۔ باہر دو گن مین کھڑے تھے... ان کے پیچھے ایک جوان ملازمہ اور ایک بوڑھا ملازم تھا۔ ایک گن مین نے کہا۔ ”ہم پربھوجی کے سیوک ہیں۔ اس بوڑھے نوکر نے ہمیں آکر بتایا کہ تم دونوں کل سے سو رہے ہو۔ ابھی یہ دن چڑھ آیا ہے۔ انہیں شبہ ہوا کہ بے ہوش ہوگئے ہو، یا...؟“
عمر نے مسکرا کر کہا۔ ”ہم زندہ ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں نہا دھو کر فریش ہو جائیں گے۔“
دوسرے گن مین نے کہا۔ ”آج شام پانچ بجے تیار رہیں۔ ہم آپ کو اور آپ کی وائف کو پربھوجی کے گھر لے جائیں گے۔“
یہ کہہ کر دونوں نے ہاتھ جوڑ کر سر کو جھکایا پھر وہاں سے چلے گئے۔ ملازمہ نے پوچھا۔ ”آپ کے لیے کھانا کب لگاؤں؟“
اس نے کہا۔ ”ایک گھنٹے کے اندر ہی کھائیں گے۔ اس سے پہلے تمہیں آواز دیں گے۔“
یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ دونوں آدھ گھنٹے بعد ہی غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر کھانے کی میز پر آگئے۔
کھانا لذیذ تھا۔ لذیذ نہ بھی ہوتا تو وہ پیٹ بھر کر کھاتے۔ پچھلی رات سے بھوکے تھے۔ اب مطمئن تھے کہ وہاں پہنچ کر محفوظ ہیں۔
وہ کھانے کے بعد چائے پینے لگے۔ ایسے وقت موبائل فون نے عمر کو پکارا۔ سلمٰی نے پوچھا۔ ”کس کا فون ہے؟“
اس نے اسکرین پر نام پڑھ کر کہا۔ ”کلپنا ہے۔“
وہ نفرت سے بولی۔ ”بھگاؤ اسے۔ فون بند کردو۔“
”نہیں سلمٰی! دشمنوں سے رابطہ رکھنا چاہیے۔ ان سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔“
”تو پھر اسپیکر لاؤڈ رکھو۔ میں اسے زیادہ بولنے نہیں دوں گی۔“
اس نے بٹن دبا کر اسپیکر آن کیا۔ پھر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو، میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ نہ تم سے تعلق

رکھوں گا، نہ کبھی بھول سے تم پر کبھی بھروسا کروں گا۔“
کلپنا کی ہنسی سنائی دی۔ پھر وہ بولی۔ ”تعلق تو اب مرتے دم تک نہیں ٹوٹے گا۔ میں اتنی بڑی خوش خبری سنا رہی ہوں جس کی تمہیں توقع نہیں ہوگی اور جسے تمہاری سلمٰی سن کر جل بھن کر رہ جائے گی۔“
پھر وہ قہقہہ لگا کر بڑے فخر سے بولی۔ ”میں ماں بننے والی ہوں۔ خوشی سے پاگل ہو رہی ہوں۔“
سلمٰی کے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی۔ کلپنا کہہ رہی تھی۔ ”میری وہ سوکن سن رہی ہوگی، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ میں کسی اور کی نہیں، تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“
وہ ہنس رہی تھی اور بول رہی تھی۔ ”وہ تمہاری بیوی ہے لیکن میں نے اس سے تمہیں چھین کر تمہارے لہو کا پہلا سرمایہ اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اب وہ سوکن تم سے جو بھی حاصل کر رہی ہوگی، وہ میرا چھوڑا ہوا جھوٹا کھانا ہوگا۔“
سلمٰی چیخ کر بولی۔ ”بند کرو اسے۔ تم اس کی بکواس کیوں سن رہے ہو؟“
وہ ادھر سے بولی۔ ”بند کرنے سے پہلے یہ آخری اور اہم فیصلہ تو کرلو کہ ہمارے اس بچے کو مسلمان ہونا چاہیے یا ہندو؟“
”بڑا ہی چونکا دینے والا سوال تھا۔ عمر دراز نے چونک کر سلمٰی کو دیکھا۔ کلپنا بول رہی تھی۔ ”اگر تم نہ آئے تو یہ بچہ میری ممتا کے سائے میں ہندو بنے گا۔ تم آؤ گے اور ماں اور بچے کے ساتھ رہو گے تو اسے مسلمان بنا سکو گے۔ سوچ لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟ ابھی آٹھ مہینے ہیں۔“
سلمٰی نے ہاتھ بڑھا کر فون چھین کر اسے بند کر دیا۔ پھر اسے میز پر پھینک کر روتی ہوئی بیڈ روم میں آگئی۔ عمر فون اٹھا کر وہاں آیا پھر ایک کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیا بولے اور اسے کس طرح رونے سے منع کرے۔ یہ شرمندگی تھی کہ کلپنا کو ایک بیوی کے حقوق دے کر اور اب اسے اپنے بچے کی ماں بنا کر اپنی شریکِ حیات پر ظلم کر رہا ہے۔
وہ تھوڑی دیر تک روتی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس سے منہ پھیر کر بولی۔ ”تم غلیظ ہو، ناپاک ہو۔ آج سے مجھے ہاتھ نہ لگانا۔“
”فضول باتیں نہ کرو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو، میں نے حالات سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے۔ اگر اس کے پاس چھپ کر نہ رہتا تو تم ابھی مجھے زندہ نہ دیکھتیں۔“
”تو پھر اس پر صدقے واری جاؤ، اس نے تمہیں زندہ رکھا ہے۔ اسے اور دو چار بچوں کی ماں بنا دو۔“
”بچے پیدا کرانا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ جو خدا کو منظور تھا، وہ ہو رہا ہے۔ تقدیر کو مانو، وہ کئی مردوں سے تعلقات قائم کر چکی تھی۔ تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ میرا بچہ اس کی کوکھ میں پرورش پائے...“
”پھر بچے کو مسلمان بنائے رکھنے کے لیے اس کی ماں کے پاس جا کر رہو گے؟ جاؤ، مجھے ٹھوکر مارو اور اس کے پاس جاؤ۔“
”میں نہیں جاؤں گا۔ کیوں رو رہی ہو۔ چپ ہو جاؤ۔“
”بچے پاؤں کی زنجیر ہوتے ہیں۔ تمہارے خون کی کشش تمہیں وہاں لے جائے گی۔“
”جب تم میری اولاد پیدا کرو گی تو ادھر کشش نہیں رہے گی۔“
”پھر بھی یہ مسئلہ رہے گا' کیا اسے ہندو بننے کے لیے چھوڑ دو گے؟“
”ہاں، یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ مجھے ذرا سوچنے سمجھنے دو کہ اس سلسلے میں کیا کرسکوں گا۔ سلمٰی! اس وقت مجھے تمہارے آنسوؤں کی نہیں بہترین مشوروں کی ضرورت ہے۔“
”مشورہ یہ ہے کہ فون کی سم بدل دو۔ اس چڑیل کی آواز بھی نہ سنو۔ نہ اس کی آواز سنائی دے گی، نہ وہ تم سے تمہارے لہو کی بات کرے گی۔ نہ یہ معلوم ہوگا کہ وہ پیدا ہوا بھی ہے یا نہیں؟ اس بچے کو خدا پر چھوڑ دو۔“
”خدا پر چھوڑ سکتا ہوں، کلپنا کے بھروسے پر نہیں چھوڑ سکتا۔ میں بچے کو اس کے پاس نہیں رہنے دوں گا۔ اس سلسلے میں کیا کروں گا، یہ ابھی نہیں جانتا۔“

☆☆☆

وہ شام کو مقررہ وقت پر پربھودیاوان کے گھر پہنچ گئے۔ ایک مجرمانہ زندگی گزارنے والے بے انتہا دولت مند ڈان کے متعلق خیال تھا کہ وہ بہت وسیع و عریض عالی شان کوٹھی میں رہتا ہوگا۔ سلمٰی اور عمر دراز نے اسے مٹی اور گارے سے بنی ہوئی ایک جھونپڑی کے دروازے پر دیکھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بڑے ادب... اور بڑی محبت سے ان کا استقبال کیا۔
جھونپڑی کے اندر آرام دہ صوفے اور آرائشی سامان نہیں تھا۔ کچے فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک سفید چادر تھی، گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ پربھودیاوان نے ایک سادہ سی قمیص اور پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ سر پر ایک چھوٹی سی سفید

WWW.PAKSOCIETY.COM

بگڑی تھی۔ وہ سب دری پر بیٹھ گئے۔

عمر دراز نے کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ یوں غریبوں کی طرح زندگی گزارتے ہوں گے۔“

وہ بولا۔ ”میں غریبوں کے ساتھ ان کے دکھ سکھ میں شریک رہتا ہوں اسی لیے مہاراشٹر کی غریب جنتا مجھے دیوتا اور اَن داتا کہتی ہے۔“

سلمٰی نے پوچھا۔ ”آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟“

”وہ سب ائیر کنڈیشنڈ محلوں میں رہتے ہیں۔ بڑے ہی نازک مزاج ہیں۔ میری طرح زندگی گزاریں گے تو بیمار ہوجائیں گے۔ ان کی باتیں چھوڑو، اپنی باتیں کرو۔ میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ آج تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ تم جرائم کی دنیا میں کیسے آگئے؟“

عمر دراز ابتدا سے اپنی رام کہانی سنانے لگا۔ پربھو نے تمام روداد سننے کے بعد کہا۔ ”کلپنا نے تم پر بڑے احسانات کیے ہیں۔ اس نے تمہارے ساتھ اچھا تو کیا ہے لیکن غلطیاں بھی کی ہیں۔ تم دونوں پاپی ہو۔ گناہ گار ہو۔“

پربھو نے سلمٰی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم پچھلے پچاس دنوں سے اپنی بیوی کے حقوق اس عورت کو دیتے رہے اور وہ عورت اپنے شوہر کے حقوق تمہیں دیتی رہی۔“

سلمٰی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پربھو نے کہا۔ ”آنسو پونچھ لو۔ تمہارا یہ شوہر ہرجائی نہیں ہے۔ حالات سے مجبور ہوکر ہرجائی بن گیا تھا۔ اب یہ واپس مل گیا ہے۔ یہ تمہارا ہی رہے گا۔“

سلمٰی نے کہا۔ ”میں عورت کی فطرت کو سمجھتی ہوں۔ جو مرد اس کی گود میں بچہ دیتا ہے، اسے وہ کبھی بھلا نہیں پاتی۔ اس عورت کی دیوانگی کہتی ہے کہ وہ عمر کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔“

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے فون پر عمر سے کہا ہے کہ تم آؤ گے، ماں اور بچے کے ساتھ رہ سکو گے تو اپنے بچے کو مسلمان بنا سکو گے۔“

”ہاں، بچے باپ کے نام سے اور باپ کے مذہب سے پہچانے جاتے ہیں۔ کیوں عمر؟ تمہارے اور کلپنا کے درمیان سمجھوتا ہوا تھا کہ وہ تمہیں پناہ دے گی؟ تمہاری خاطر اپنے نام نہاد باپ کو اس نے کروڑوں روپے کا نقصان پہنچایا ہے، اس نے بلاشبہ تمہارے لیے محبت کی انتہا کی ہے۔ کیا تم نے سمجھوتا کرتے وقت یہ سوچا تھا کہ تم سے ہونے والے بچے کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا تم اسے مسلمان بنا کر رکھ سکو گے؟“

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں۔ اس وقت میں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی۔ حالات ایسے تھے کہ مجھے صرف اپنی اور سلمٰی کی سلامتی کی فکر تھی۔ میں نے اس پہلو پر دھیان نہیں دیا کہ کلپنا ماں بنے گی تو بچہ میرا ہوگا اور اسے کلپنا کے پتی وجے شرما کا نام باپ کے طور پر ملے گا۔ ہم اصل باپ بیٹے ایک دوسرے کے لیے غیر ہوجائیں گے۔“

”تو پھر دانش مندی یہی ہے کہ اس بچے کی طرف سے صفر ہوجاؤ۔ کلپنا سے جو تمہارا سمجھوتا تھا، وہ اس کے ماں بنتے ہی ختم ہوچکا ہے۔ آئندہ اس سے فون پر بھی بات نہ کرو۔“

”میں اس سے باخبر نہیں رہوں گا تو وہ کسی بھی موقع پر سلمٰی کو نقصان پہنچائے گی۔ اب وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہنے کی ضد کررہی ہے۔“

”پورے مہاراشٹر میں سلمٰی جہاں بھی جائے گی، اسے کوئی نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تم کلپنا سے باخبر رہو۔ اسے مجھ پر چھوڑ دو، میرے آدمی اسے سیدھا کردیں گے۔ اور سیدھا کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بالکل ہی ٹیڑھی ہے وہ صرف اپنے مطلب کے لیے، ماں بننے کے لیے اور اس کی گود میں بچہ دینے والے مرد کے لیے لڑ رہی ہے اور اس کی یہ لڑائی جائز بھی ہے۔“

وہ سلمٰی کو دیکھ کر بولا۔ ”میں تمہیں بیٹی مانتا ہوں اور سمجھاتا ہوں کہ کلپنا کی عزت کرو۔ وہ تمہارے شوہر کو خطرناک مجرموں.... اور قانون کے محافظوں سے بچاتی رہی ہے۔ دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے تمہارے شوہر کی طاقت بنتی رہی ہے۔ اگر وہ تم سے جلتی کڑھتی ہے تو تم بھی اس سے نفرت کرتی ہو۔ یہ دو سوکنوں کے فطری تقاضے ہیں۔ لیکن کسی ایک پہلو سے بھی تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ اس نے تمہارے شوہر کو کبھی ایک ذرا سا نقصان پہنچایا ہے۔ یہ تمہارے ساتھ ابھی زندہ سلامت ہے تو یہ اسی کی مہربانی اور محبت ہے۔ اسی لیے سمجھا رہا ہوں اس سوکن سے کوئی تعلق نہ رکھو لیکن اس کی عزت کرو۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”آپ درست فرماتے ہیں۔ اس کی نیکیوں کے باعث میرا شوہر مجھے واپس ملا ہے۔ ہم حسد اور جلاپے کے باعث دوسروں کی اچھائیوں کی قدر نہیں کرتے۔ میں کروں گی۔ میں کلپنا کی عزت کروں گی۔“

”شاباش بیٹی! تم بہت اچھی ہو۔ آئندہ حسد اور جلاپے کے باعث اپنے شوہر کی کمزوری نہیں بنوگی۔ کلپنا کی طرح اس کی طاقت بن کر رہوگی۔“

پھر وہ عمر سے بولا۔ ”اب اپنے دھندے کی بات ہوجائے۔ تم اپنے متعلق کیا سوچتے ہو؟ کیا جرائم کی دنیا میں

اتنی دور تک چلے آنے کے بعد واپس جا سکو گے؟“

”میں نے ایسی خون خرابے والی زندگی گزارنے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اب مجھ پر پڑ رہی ہے تو میں مجبوراً حالات کا سامنا کررہا ہوں اور دل سے چاہتا ہوں کہ ایک شریفانہ ازدواجی گھریلو زندگی گزارتا رہوں لیکن شرافت دکھاتے ہی دشمن مجھے چیونٹی کی طرح مسل دیں گے۔“

”جرائم کی دنیا میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ کبھی کبھی واردات کرتے رہو۔ اپنی دھاک جماتے رہو۔ تم نے دشمنوں ـــ اور قانون کے محافظوں کے دل و دماغ میں اچھی خاصی دھاک بٹھائی ہے۔ میرے پاس آنے کے بعد اور زیادہ ناقابل تسخیر ہوگئے ہو۔ انڈر ورلڈ کے تمام خطرناک مجرم اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ تمہاری اگلی منزل کھری ٹاؤن ہے۔ تم میری مدد سے بھوانی شنکر کو شمشان گھاٹ پہنچاؤ گے اور اس سرحدی علاقے کے بے تاج بادشاہ بن جاؤ گے۔“

عمر نے کہا۔ ”بھوانی شنکر اسپتال میں پڑا ہے۔ فی الحال کھری ٹاؤن میں کس کی حکمرانی ہوگی؟“

”اطلاع ملی ہے کہ بھوانی شنکر کی پشت پناہی کرنے والے سوامی نارنگ ریڈی نے عارضی طور پر اس کی جگہ سنبھالی ہے اور پچھلی رات کسی نے شنکر کی دوسری ٹانگ میں بھی گولی ماری ہے۔ وہ دونوں پیروں سے اپاہج ہوگیا ہے۔“

”کیا اس کی بیٹی کلپنا کے کسی تابع دار نے ایسا کیا ہے؟“

”نہیں۔ اس کے دوسرے پیر کو ناکارہ بنانے والا یہ کہہ کر گیا ہے کہ وہ گولی عمر دراز کی طرف سے ہے۔“

”تعجب ہے۔ میرے نام سے کس نے واردات کی ہے؟“

”سوامی نارنگ دو دھاری تلوار ہے۔ ایک طرف سے دشمنوں کو کاٹتا ہے۔ دوسری طرف سے غیر ضروری دوستوں کو قتل کرتا ہے۔ وہ بھوانی شنکر جیسے تابع دار کو اسپتال سے واپس نہیں آنے دے گا۔ اسے تمہارے نام سے اپاہج بناتے بناتے اس کی ارتھی اسپتال سے ہی اٹھائے گا۔“

”یعنی سوامی نارنگ آئندہ کھری ٹاؤن اور سرحدی علاقے پر حکمرانی کرے گا؟“

”تم کرنے دوگے تو کرے گا۔ آئندہ تم انڈر ورلڈ کے اسی چالباز اور خطرناک شخص سے ٹکراؤ گے۔“

”آپ کا ہاتھ میرے سر پر رہے گا تو میں اس ٹاؤن میں آنے والے ہر خطرناک کو موم کی ناک بنادوں گا۔“

”فی الحال تو یہ ہورہا تھا کہ تمہارے کرائے کے بدمعاش اور کلپنا کے زرخرید تابع دار وہاں تمہارے نام سے بڑی بڑی واردات کرتے رہے تھے۔ اب میرے تابع دار دو چار مہینوں تک تمہارے نام سے بھوانی شنکر اور سوامی کو نقصان پہنچاتے رہیں گے۔“

”آپ مجھے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرتے رہیں گے تو میں خود اپنے دشمنوں سے ٹکراؤں گا۔“

”ذرا صبر کرو۔ دشمنوں کو اور انٹیلی جنس والوں کو یہ یقین ہونے دو کہ تم ممبئی میں چھپے ہوئے ہو اور کھری ٹاؤن میں تمہارے آدمی واردات کررہے ہیں۔ تم اپنی پناہ گاہ سے باہر نہیں نکلو گے۔ جب انہیں یقین ہوجائے گا اور مہاراشٹر کی پولیس اور انٹیلی جنس والے واپس آجائیں گے۔ دشمن یہاں آکر تمہیں ڈھونڈتے پھریں گے تو تم کھری ٹاؤن کی طرف جا کر بھوانی شنکر اور سوامی نارنگ کو اپنی صورت دکھا کر دہشت طاری کروگے۔“

پربھو دیاوان نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی میرے ساتھ رسوئی گھر میں آؤ۔ میں نے بھوجن تیار کیا ہے۔ خود اپنے ہاتھوں سے پکاتا ہوں۔“

سلمٰی اس کے ساتھ کچن میں آئی۔ اس جھونپڑی کے تمام کمرے بہت ہی صاف ستھرے تھے۔ وہاں کوئی ملازم نہیں تھا۔ پربھو دیاوان نے بتایا کہ وہ خود ہی اس جھونپڑی کی اندر اور باہر صفائی کرتا ہے۔ وہ تنہا وہاں محفوظ رہتا ہے۔ وہاں دشمن تو کیا قانون کے محافظ بھی اس کی اجازت کے بغیر نہیں آتے ہیں۔

اس نے کھانے کی ڈشیں عمر دراز کے سامنے لاکر رکھیں۔ پھر تینوں کھانے لگے۔ پربھو نے کہا۔ ”مسلمان جانوروں کو ذبح کرکے کھاتے ہیں۔ ہم ایک جھٹکے سے جانوروں کی گردن اڑا دیتے ہیں۔ میں نے اسلامی طریقے سے مرغیاں ذبح کرکے منگوائی تھیں۔ یہ سالن بے جھجک کھاؤ۔ میں اپنے مہمانوں کے دھرم اور مذہب کا خاص خیال رکھتا ہوں۔“

عمر دراز کھانے کے دوران سوچ رہا تھا۔ صرف ممبئی میں ہی نہیں پورے مہاراشٹر میں دوست دشمن اور پولیس والے پربھو جی کو موت کا ہرکارہ کہتے ہیں۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر باتیں کرتے ہیں اور حقیقتاً یہ دیکھنے میں کیا ہے؟

کچھ نہیں، سادہ سا معمولی سا لباس، ایک معمولی سی جھونپڑی، پیروں میں اسفنج کی چپلیں، جھونپڑی میں کہیں بھی ایک ہتھیار نظر نہیں آرہا ہے۔ باہر ایک بھی مسلح گارڈ نہیں ہے۔ ایک عام غریب آدمی کی طرح زندگی گزارتا ہے اور غریبوں کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

روزگار فراہم کرتا ہے۔ بیماروں کے مفت علاج کے لیے شفاخانے کھول رکھے ہیں۔ اسی لیے پولیس یا آری بھی اس کا محاسبہ کرنے آتی ہے تو لاکھوں کی تعداد میں غریب عوام اس کے چاروں طرف سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ وہاں کی جنتا نے کبھی اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگنے نہیں دیں۔

سلمٰی اور عمر دراز اس سے رخصت ہو کر اپنی رہائش گاہ کی طرف جاتے وقت اس سے بہت زیادہ متاثر ہو گئے تھے۔ کئی مسلح گارڈز نے انہیں کلرڈ شیشوں کی کار میں ان کی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچا دیا۔

انہوں نے اس نئی پناہ گاہ کے اندر آ کر دیکھا۔ وہاں ان کی ضرورت اور عیش و آرام کا تمام سامان موجود تھا۔ ایک بڑے سے کمرے میں کئی طرح کے ہتھیار رکھے ہوئے تھے، وہ سب عمر دراز کے لیے تھے۔ ایسے وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ عمر نے سلمٰی کو دیکھ کر کہا۔ "کلپنا کال کر رہی ہے۔"

اس نے کہا۔ "وہ ہماری محسنہ ہے۔ میں اس کے خلاف کچھ نہیں بولوں گی۔"

وہ بولا۔ "پربھو جی نے سمجھایا ہے کہ مجھے فون پر بھی اس سے بات نہیں کرنی چاہیے۔ چونکہ اس کے احسانات ہم پر ہیں اس لیے آخری بار بات کر رہا ہوں۔"

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر کہا۔ "ہاں بولو"

وہ بولی۔ "کسی نے پاپا کی دوسری ٹانگ پر گولی ماری ہے۔ پاپا کہتے ہیں کہ وہ تمہارا آدمی تھا۔ جبکہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم اب راجستھان کے کسی علاقے میں نہیں ہو۔ کیا تم جانتے ہو، یہ دشمنی کس نے کی ہے؟"

"سوامی نارنگ نہیں چاہتا کہ بھوانی شنکر اسپتال سے واپس آ کر اس سے کھری سرحد کی راج گدی چھین لے۔ تمہارے باپ کی موت اسی اسپتال میں ہوگی۔ یہ سوامی طے کر چکا ہے۔"

"میں اس کے پیچھے اپنے کتے لگا دوں گی۔"

"تم جو بھی کرو، یہ تمہاری آخری کال ہے۔ اس کے بعد میرے فون کی سم بدل جائے گی۔"

"ایسا ظلم نہ کرنا۔ میں تمہاری اولاد کو جنم دینے والی ہوں۔"

"پربھو دیاوان نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں تم سے رابطہ نہ رکھوں لیکن تمہاری عزت کروں۔ بے شک تم نے مجھ پر بڑے احسانات کیے ہیں۔ پربھو جی بھی تمہاری عزت کرتے ہیں۔ اب میں ان کی ہدایت پر عمل کر رہا ہوں۔ خدا کو منظور ہوا تو پھر کبھی آمنا سامنا ہوگا۔ تم جہاں رہو، بچے کے ساتھ خوش رہو۔"

"دیکھو عمر! ابھی فون بند نہ کرنا۔ مجھے بہت سی باتیں..."

اس نے فون بند کر دیا۔ پھر فوراً ہی اس کی سم نکال کر سلمٰی کو دے دی۔ کلپنا رابطہ ختم ہونے پر تلملا رہی ہوگی۔

☆☆☆

وقت گزرنے لگا۔ پربھو دیاوان کے جیالے راجستھان آ کر عمر دراز کے نام سے وارداتیں کر رہے تھے۔ ایک جیالے نے آدھی رات کے بعد اسپتال میں آ کر بھوانی شنکر کو گن کے نشانے پر رکھ کر کہا۔ "میں عمر دراز کا نمک خوار ہوں۔ جو شخص تمہاری دوسری ٹانگ میں گولی مار کر گیا ہے، وہ عمر دراز کا آدمی نہیں تھا۔"

بھوانی شنکر نے کہا۔ "میرا اور کوئی دشمن نہیں ہے۔ کوئی اور مجھے گولی مار کر زخمی کیوں کرے گا؟"

"تم یقین کرو یا نہ کرو، سوامی نارنگ ریڈی دہری چالیں چل رہا ہے۔ تم سے دوستی بھی کر رہا ہے اور دشمنی بھی۔ تم اسپتال میں رہ کر مر جاؤ گے تو کھری ٹاؤن کے سرحدی علاقے پر اس کا قبضہ ہو جائے گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "تمہاری یہ بات دل کو لگ رہی ہے لیکن میں بہت بے بس ہو گیا ہوں۔ میرے تابع دار سوامی کے وفادار بن چکے ہوں گے۔ شاید میں تنہا ہو گیا ہوں۔ کوئی مجھے سوامی سے نہیں بچا سکے گا۔"

اس نے کہا۔ "صرف عمر دراز بچائے گا، میرے ہاتھ میں گن ہے۔ میں چاہتا تو ایک گولی تمہارے سینے میں اتار کر چلا جاتا۔ لیکن نہیں، عمر دراز کا حکم ہے کہ تمہیں یہاں سے زندہ لے جا کر کہیں چھپا دیا جائے۔"

"وہ مجھ سے ہمدردی کیوں کر رہا ہے؟"

"ہمدردی کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم سوامی کے ہاتھوں مارے نہ جاؤ۔ جب تک تم زندہ رہو گے اور چھپے رہو گے تب تک کھری ٹاؤن پر اس کی حکمرانی پکی نہیں ہوگی۔ وہ تمہاری طرف سے اندیشوں میں مبتلا رہے گا۔"

"اور مجھ سے ہمدردی کی دوسری وجہ کیا ہے؟"

"دوسری وجہ یہ ہے کہ تم عمر دراز کا شکار ہو۔ وہ سوامی کو کھری ٹاؤن سے مار بھگانے کے بعد تمہیں اپنے ہاتھوں سے گولی مارے گا۔ اس لیے ہم تمہیں یہاں سے لے جا رہے ہیں۔"

چار مسلح افراد کمرے میں آ گئے۔ ایک نے اس کا منہ ٹیپ سے بند کیا۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے۔ پھر اسے

کاندھوں پر لاد کر وہاں سے لے گئے۔

سوامی گہری نیند میں تھا۔ فون کی کالنگ ٹون نے چیخ چیخ کر اسے جگا دیا۔ اس نے بیزاری سے فون اٹھا کر بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا پھر بولا۔ "ہیلو۔ اتنی رات کو کیا قیامت آ گئی ہے۔ صبح فون نہیں کر سکتے تھے۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ابھی نیند سے بیدار ہو گئے، یہ اچھا ہے ورنہ نیند نہ آتی موت آ جاتی تو فون کی گھنٹی بھی جگا نہ پاتی۔"

وہ غصے سے بولا۔ "کون ہو تم؟"

"وہی ہوں جس کی آواز تم پہلی بار سن رہے ہو۔ نیند حرام کرنے والا عمر دراز ہی ہو سکتا ہے۔"

اس کے دماغ سے نیند کا خمار اڑ گیا۔ وہ سر جھٹک کر بولا۔ "تم عمر دراز ہو؟ میں کیسے یقین کروں؟"

"یقین نہ کرنے کے باوجود میں وہی رہوں گا جو ابھی ہوں۔ تمہیں ایک بُری خبر سنا رہا ہوں، میں بھوانی شنکر کو اسپتال سے لے گیا ہوں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"وہ دو مہینوں میں دونوں پیروں سے چل کر آئے گا اور تمہیں کھری ٹاؤن کی راج گدی سے لات مار کر گرا دے گا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم بھوانی شنکر کے دشمن ہو۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے نہیں دو گے۔"

"میں بھی اس کا ملازم تھا۔ میں نے اس کا نمک کھایا ہے۔ میں نوکر وہ آقا۔ ہم دونوں میں سمجھوتا ہو گیا ہے اور سمجھوتا یہ ہے کہ جب تک وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوگا، تب تک میں تمہاری نیندیں حرام کرتا رہوں گا۔"

فون بند ہو گیا۔ سوامی نے فوراً ہی اسپتال والوں سے فون پر رابطہ کیا۔ تصدیق ہو گئی کہ بھوانی شنکر اپنے بیڈ پر نہیں ہے، بڑی رازداری سے کہیں چلا گیا ہے یا کوئی اسے لے گیا ہے۔ کمرے سے باہر پہرا دینے والے دو سپاہی بے ہوش پائے گئے ہیں۔

سوامی کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ اس کا شکار ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ اسے آہستہ آہستہ مار ڈالنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی عمر دراز اسے لے گیا تھا۔

اس نے پولیس اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران سے باری باری فون پر کہا۔ "تم لوگ وردی پہن کر سوتے رہتے ہو۔ پچھلے تین مہینوں سے عمر دراز کو گرفتار نہ کر سکے۔ وہ بھوانی شنکر کو اسپتال سے اٹھا کر لے گیا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا میں لاکھوں روپے تم لوگوں پر یونہی ضائع کر رہا ہوں؟"

وہ شکایتیں کر سکتا تھا، جھنجلا سکتا تھا لیکن بھوانی شنکر کو واپس نہیں لا سکتا تھا۔ کھری ٹاؤن پر قبضہ جمانے کا منصوبہ کمزور ہو گیا تھا۔ انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسر نے پوچھا۔ "کیا عمر دراز نے خود تم سے فون پر بات کی تھی؟"

"ہاں تم لوگ کہتے ہو وہ راجستھان سے چلا گیا ہے۔ وہ ابھی شنکر کو اغوا کرنے کے بعد مجھ سے بول رہا تھا۔ وہ جے پور میں ہے۔"

"کیا آپ اسے آواز سے پہچانتے ہیں؟"

"میں نے پہلی بار اس کی آواز سنی ہے۔"

"تو پھر مان لیں، وہ عمر دراز نہیں تھا۔ وہ ممبئی میں پربھو دیاوان کی پناہ میں ہے۔"

"عمر کو نرک میں جانے دیں۔ آپ بھوانی شنکر کو تلاش کریں۔ وہ جے پور کے آس پاس ہوگا۔ عمر کے آدمی اسے زیادہ دور نہیں لے گئے ہوں گے۔"

اسے تسلی دی گئی کہ صبح تک بھوانی شنکر کو ڈھونڈ لیا جائے گا۔ زبانی تسلی سے اغوا ہونے والا واپس نہیں آ سکتا تھا۔ یہ خیال قائم کیا گیا کہ جہاں عمر ہے، وہیں بھوانی شنکر کو لے جایا گیا ہے۔ ان دونوں کو ممبئی میں کہیں ڈھونڈنا چاہیے۔ مہاراشٹر کی پولیس اور انٹیلی جنس والے خوامخواہ راجستھان کی صوبائی حکومت پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔

آخر وہ مہاراشٹر والے واپس چلے گئے۔ چار ماہ گزر چکے تھے۔ عمر دراز کے لیے راجستھان لوٹ آنے کی راہ ہموار ہو گئی تھی۔ چار ماہ گزرنے کا مطلب یہ تھا کہ پانچواں مہینا جاری تھا اور ادھر کلپنا کا وزن بڑھ رہا تھا۔

وہ عمر سے ملنے کے لیے، اس کی آواز سننے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ سچ مچ اس کی دیوانی ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار ممبئی جا کر پربھو دیاوان سے ملنے کی کوشش کی تھی، اسی کے ذریعے وہ عمر تک پہنچ سکتی تھی لیکن پربھوان دنوں ممبئی میں نہیں تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ جے پور سے کوئی کماری کلپنا آئی تھی، اپنا فون نمبر دے گئی ہے۔ اس نے فون پر عمر سے کہا۔ "میں موجود نہیں تھا، کلپنا مجھ سے ملنے آئی تھی۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ وہ مجھ سے ملنے کیوں آئی تھی؟"

وہ بولا۔ "تقریباً پچاس دنوں تک اس کا ساتھ رہا ہے۔ میں نے یہی دیکھا ہے کہ دن رات ساتھ رہنے کے باوجود وہ بیزار نہیں ہوتی تھی۔ میرے لیے اس کی دیوانگی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ یہاں آپ کے ذریعے مجھ تک پہنچنے آئی تھی۔"

"میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ وہ اپنا فون نمبر دے گئی ہے۔ اگر میں نے اس سے بات نہ کی تو وہ پھر دوڑی چلی

WWW.PAKSOCIETY.COM

آئے گی۔"

"پلیز! آپ اس سے بات کرکے اسے سمجھا دیں کہ مجھے بھول جائے۔ میری اور سلمٰی کی ازدواجی زندگی میں کسی طرح کی ہلچل پیدا نہ کرے۔"

"شراب منہ کو لگ جائے تو نہیں چھوٹتی۔ عورت کو کسی مرد کا چسکا پڑ جائے تو وہ اس کے لیے دنیا کے آخری سرے تک بھاگتی چلی جاتی ہے۔ جیسا کہ تم نے بتایا ہے، کلپنا کا ایک شوہر ہے، اس کے علاوہ وہ دوسروں سے کھیل چکی ہے۔ وہ کسی کی دیوانی نہیں ہوئی۔ تمہارے لیے پاگل ہو رہی ہے۔ ایسی پاگل عورتوں کو زنجیریں پہناؤ تب بھی اپنے مطلوب تک پہنچ جاتی ہیں۔"

"وہ میری ازدواجی زندگی کے لیے خطرناک ہے۔ میں اس سے دور رہنا چاہتا ہوں۔"

"میرے پاس آؤ۔ سلمٰی کو ساتھ نہ لاؤ۔ میں کلپنا سے بات کروں گا، تم خاموشی سے سنو گے۔ میرے آدمی تمہیں لینے آرہے ہیں۔"

وہ فون بند کرکے لباس تبدیل کرنے لگا۔ سلمٰی نے کمرے میں آکر پوچھا۔ "کہاں کی تیاری ہے؟"

"پربھو جی نے بلایا ہے۔"

"میں بھی چلوں؟"

"نہیں۔ ہم مردوں کے معاملات ہیں۔ پربھو جی نے تمہیں گھر میں رہنے کو کہا ہے۔"

"تم آج کل میں کھری ٹاؤن جانے والے ہو۔ پتا نہیں کب لوٹ کر آؤ گے۔ ابھی تو دور دور نہ رہو۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ ایک آدھ گھنٹے میں آجاؤں گا۔"

اس کے لیے کلرڈ شیشوں والی گاڑی آگئی۔ وہ مسلح گارڈ کے ساتھ پربھو دیاوان کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے عمر سے کہا۔ "تمہارے لیے راجستھان میں حالات سازگار ہیں۔ وہاں بھی پولیس اور انٹیلی جینس کے چند بڑے افسران میرے زرخرید ہیں۔ جے پور سے کھری ٹاؤن تک تمہارے لیے چار محفوظ پناہ گاہیں ہیں۔ تم وہاں جگہ بدل بدل کر رہ سکو گے۔"

"جے پور میں کلپنا ہے۔ وہ مجھے ڈسٹرب کرے گی۔"

"کیا پہلے اس نے ڈسٹرب کیا ہے؟ نہیں، وہ تو تمہاری طاقت بنتی رہی ہے۔ جو سچ ہے، اس سے انکار نہ کرو۔"

"کیا آپ چاہتے ہیں، میں اس سے ملوں؟"

"میں کھری ٹاؤن کی بادشاہت چاہتا ہوں، وہاں تک پہنچنے کے لیے کلپنا کا نیٹ ورک تمہارے کام آئے گا۔"

"ہمارے معاملات اور ہوں گے اور وہ اپنے معاملے میں الجھاتی رہے گی۔"

"تمام دن کی تھکا دینے والی محنت کے بعد جس طرح نیند ضروری ہے، اسی طرح عورت بھی ضروری ہے۔ تم سلمٰی کو کسی بھی معاملے میں دھوکا نہ دو۔ صرف اپنا کام نکالنے کے لیے کلپنا کی کوئی بات اس سے نہ کرو۔ دو عورتوں کو دریا کے دو کنارے بنا کر رکھو۔ ایک کی خبر دوسری تک پہنچنے نہ دو۔"

وہ فون بند کرکے نمبر پنچ کرتے ہوئے بولا۔ "اب میں کلپنا سے بات کر رہا ہوں۔ اسپیکر آن رہے گا، تم سنتے رہو گے لیکن خاموش رہو گے۔"

اس نے فون کو اپنے اور عمر کے درمیان دری پر رکھ دیا۔ رابطہ ہوتے ہی کلپنا کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو... کون؟"

وہ اپنی بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ "میں پربھو دیاوان بول رہا ہوں۔"

کلپنا کی آواز میں ایک دم سے مسرتیں بھر گئیں۔ وہ بولی۔ "آپ پربھو جی بول رہے ہیں؟ میں بڑی بھاگوں والی ہوں' آپ سے ملنے گئی تھی لیکن درشن نہیں ہوئے۔ یہی کیا کم ہے کہ آپ کی آواز سن رہی ہوں۔ یہ میرے لیے بڑی بات ہے کہ آپ نے مجھے فون کیا ہے۔"

"تم بہت بولتی ہو۔ ذرا ٹھہر ٹھہر کر بولو۔"

"شما چاہتی ہوں، اپنے پریمی کے لیے پاگل ہوگئی ہوں۔ یہ جانتی ہوں کہ آپ ہی کی مہربانی سے وہ مجھے ملے گا۔ وہ آپ کی شرن میں خوش اور زندہ سلامت ہے۔ میں بھی آپ کی شرن میں آنا چاہتی ہوں۔ آپ حکم دیں تو ابھی دوڑی چلی آؤں گی۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اس نے مجھے کس طرح پاگل بنا رکھا ہے۔ میں سچ کہتی..."

وہ ڈانٹ کر بولا۔ "تم بولتے وقت کیا سانس لینے کے لیے بھی نہیں رکتی ہو؟"

وہ سہم کر بولی۔ "شما چاہتی ہوں۔ اب نہیں بولوں گی، بس آپ کی ایک مہربانی چاہتی ہوں۔ مجھے عمر سے ملا دیں، ابھی اس سے بات کرا دیں یا اس کا فون نمبر..."

پربھو دیاوان نے فون بند کرکے عمر کو دیکھا پھر کہا۔ "میں سمجھ گیا یہ تمہیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتی ہے اور تم اسے نہ ملے تو اس کا دماغ پھر جائے گا۔ یہ مر جائے گی اور تمہیں بھی ساتھ لے کر ڈوب مرے گی۔"

عمر نے کہا۔ "میں اس کی قدر کرتا ہوں لیکن میں دو عورتوں کے درمیان اپنی زندگی کو جہنم نہیں بناؤں گا۔"

"میں نے کہا تا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے دور رکھو

گے اور ایک کی خبر دوسری کو نہیں ہونے دو گے تو کوئی عورت دردِ سر نہیں بنے گی۔"

رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ وہ کال کر رہی تھی۔ پربھو نے ہاتھ بڑھا کر بٹن کو دبایا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ "پربھو جی! شما چاہتی ہوں۔ میں پاگل کی بچی ہوں۔ اب نہیں بولوں گی، آپ بولیں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "یہ تمہاری مہربانی ہے کہ مجھے بولنے کا موقع دے رہی ہو۔ تم عمر دراز سے ملنے میرے پاس آئی تھیں، مجھے افسوس ہے وہ ممبئی میں نہیں ہے۔ میں اپنے معاملات کسی کو نہیں بتاتا۔ عمر دراز کی روپوشی میرے معاملات سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے فی الحال اس سے نہیں مل سکو گی۔"

"آپ فون پر بات تو کرا سکتے ہیں... پلیز"

"ہاں، فون پر بات کرا سکتا ہوں۔"

"آپ کو بھگوان کا واسطہ دیتی ہوں۔ ابھی کرائیں۔"

"ابھی عمر کو فون کروں گا۔ وہ تمہیں کتنی دیر میں کال کرے گا' یہ میں نہیں جانتا۔"

"پلیز، مجھے اس کا نمبر بتا دیں۔"

پربھو نے جواب نہیں دیا۔ فون بند کرتے ہوئے عمر سے کہا۔ "پرانی سم لگاؤ اور اس سے بات کرو۔"

اس نے یہی کیا۔ سم بدل کر اس کے نمبر پنچ کیے۔ پربھو وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ رابطہ ہوتے ہی کلپنا کی چہکتی ہوئی جوشیلی آواز سنائی دی۔ "ہائے عمر! کہاں ہو تم؟ اب تو میں صرف تمہاری کلپنا نہیں رہی، تمہارے بچے کی ماں بھی بننے والی ہوں۔ میری حیثیت بڑھ گئی' میرا رتبہ بڑھ گیا۔ میں دھرتی سے آسمان ہو رہی ہوں اور تم ہو کہ مجھ سے دور بھاگ رہے ہو۔ کیا میں نے کبھی تمہیں نقصان پہنچایا ہے؟ میری کوئی ایک غلطی بتا دو؟"

"تم نے میری سلمٰی کو اغوا کرانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اگر کامیاب ہو جاتیں تو آج میں سلمٰی کی خاطر تمہارا محتاج بن کر رہ جاتا۔"

"بس میں نے یہی ایک غلطی کی ہے۔ مجھے اور سلمٰی کو پربھو جی کے سامنے پیش کرو۔ میں ان کے سامنے سلمٰی کے قدموں میں گر کر اس سے معافی مانگ لوں گی اور اسے اپنی چھوٹی بہن بناؤں گی۔"

"یہ ناٹک کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں سلمٰی پر کبھی تمہارا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔ کوئی دوسری بات کرو۔"

"ایک بار مجھ سے ملو۔ مجھے وہاں بلاؤ یا خود یہاں چلے آؤ۔"

"میں تو وہاں جاتا آتا رہتا ہوں۔ میں نے تمہارے پاپا کو اسپتال سے اغوا کیا تھا۔"

"او گاڈ! تم میرے اتنے قریب آکر چلے گئے۔ کیا ایک منٹ کے لیے بھی نہیں آسکتے تھے؟ میں نے سلمٰی کے سلسلے میں جو غلطی کی ہے، اس کی تلافی کس طرح کروں؟ بولو کس طرح تمہارا دل جیت سکتی ہوں؟"

"اس طرح جیت سکتی ہو کہ جہاں رہو خوش رہو۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ پھر دل میں تمہاری جگہ بنے گی۔ پھر میں تمہیں یاد کرتا رہوں گا۔"

"صرف یاد کرتے رہو گے تو میری اور تمہارے بچے کی زندگی کیسے گزرے گی؟ کیا اپنے بچے کو پیار کرنے، اسے گود میں لینے نہیں آؤ گے؟"

"یہ میرے لیے بہتر ہے کہ بچے کو بھول جاؤں۔ اسے یاد رکھوں گا تو وہ متنازعہ ہو جائے گا۔ میں اسے مسلمان بناؤں گا اور تم اسے ہندو۔"

"نہیں، میں اسے مسلمان بناؤں گی۔ خود مسلمان ہو جاؤں گی' اپنے پتی کو اپنے دھرم کو چھوڑ دوں گی۔"

عمر دراز کو چپ لگ گئی۔ وہ بہت بڑی بات کر رہی تھی۔ اس کے لیے ایسی پاگل ہو رہی تھی کہ اپنے پتی کو، اپنے دھرم کو چھوڑ سکتی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "چپ کیوں ہو؟ کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں تمہارا دین قبول کرلوں گی؟"

"یقین ہے میں تمہاری دیوانگی کو خوب سمجھتا ہوں تم میرے لیے ساری دنیا کو ٹھکرا دو گی۔"

"پھر بھی مجھ پر پیار نہیں آرہا ہے؟"

"میرا دین قبول کرنے والی پر پیار نہیں آئے گا تو میں کافر کہلاؤں گا۔"

وہ بولی۔ "میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ میں تمہارا دین قبول کروں گی تو تم مجھ سے ضرور نکاح پڑھواؤ گے اور یہ ضرور چاہو گے کہ تمہارا بچہ مجھ سے دینی تربیت حاصل کرے۔"

یہ ایسی باتیں تھیں کہ عمر دراز جھاگ کی طرح بیٹھ گیا جب سے وہ اس کی زندگی میں آئی تھی، اس کی سلامتی اور بہتری کے لیے بہت کچھ کرتی رہی تھی۔ اب اسلام قبول کرنے کی بات کہہ کر اس کے حواس پر چھا رہی تھی۔

اس میں صرف ایک ہی خرابی تھی کہ وہ سلمٰی کو برداشت نہیں کرتی تھی۔ عمر آئندہ بھی اس پر بھروسا نہیں کرسکتا تھا۔ یہ یقین

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں کرسکتا تھا کہ وہ سلمٰی کے لیے نیک پروین بن جائے گی۔

وہ بولی۔ ”تم چپ کیوں ہوگئے، کیا مجھ پر بھروسا نہیں ہے کہ میں تمہیں تمام عمر اپنا بنا کر رکھنے کے لیے سچے دل سے اسلام قبول کروں گی۔“

”کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کرنے والوں کے دلوں میں کوئی نہیں جھانکتا۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ وہی دلوں کے بھید جانتا ہے۔ میرے لیے یہ بات اطمینان بخش ہوگی کہ تم میرے بچے کو اپنے ہندو پتی کے سائے میں نہیں رکھوگی۔ میری مسلمان شریکِ حیات بن کر بچے کی پرورش کروگی۔ تمہارے اندر کوئی کینہ، کپٹ ہوگا تو خدا تم سے سمجھے گا۔“

”بے شک مجھے خدا پر چھوڑ دو۔ تم نے ابھی کہا ہے کہ میں تمہاری مسلمان شریکِ حیات بن کر بچے کی پرورش کروں گی۔ یقین کرو، اس وقت میں فون کان سے لگائے خوشی سے ناچ رہی ہوں۔ بولو... جلدی بولو، کب مل رہے ہو؟ کہاں مل رہے ہو؟“

”اتنی تیز نہ دوڑو گر پڑوگی۔ ذرا صبر کرو، شاید دو چار دنوں تک تم سے رابطہ نہیں ہوسکے گا۔“

”فار گاڈ سیک... ایسا نہ کہو۔ میں دو چار دنوں تک انتظار نہیں کروں گی۔“

”کرنا ہی ہوگا۔ میں اپنی مصروفیات بیان نہیں کرسکتا۔ ابھی میرے فون کی سم بدل جائے گی۔“

”پلیز، ایسا نہ کرو... فون کا تو رابطہ رکھو۔“

”سوری مجبوری ہے اور اب میں زیادہ باتیں نہیں کرسکوں گا۔ میری مصروفیات مجھے مجبور کررہی ہیں۔ او کے پھر ملیں گے۔“

اس نے فون بند کرکے فوراً ہی سم بدل دی تاکہ وہ کال نہ کرے۔ ابھی اسے بہت کچھ سوچنا اور سمجھنا تھا۔ ویسے پربھو دیاوان نے اسے عقل کی یہ بات سمجھائی تھی کہ دونوں عورتوں کو ایک دوسرے سے دور رکھوگے۔ ایک کا ذکر دوسری کے سامنے نہیں کروگے تو دو سوکنوں کے پاٹن کے بیچ کبھی نہیں پسوگے۔

اور اب وہ یہی کرنے والا تھا۔

☆☆☆

جیسلمیر کا مہاراج اپنی وفاداری تبدیل کرچکا تھا۔ بھوانی شنکر سے منہ پھیر کر سوامی نارنگ کی جی حضوری کررہا تھا۔ اس وقت فون پر سوامی سے کہہ رہا تھا۔ ”آپ شنکر کو اسپتال میں ختم نہ کرسکے۔ عمر دراز اسے لے گیا ہے اور عمر دراز تو ہم سے بھی زیادہ اس کا جانی دشمن ہے۔ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا، شاید اسے قتل کرچکا ہے۔“

سوامی نے کہا۔ ”نہیں، عمر نے میرے منصوبے کو کمزور بنادیا ہے۔ وہ بھوانی شنکر کو ابھی زندہ رکھے گا کیونکہ بارڈر سے اسمگلنگ کے ایسے پیچیدہ معاملات ہیں جنہیں شنکر ہی نمٹاتا آرہا ہے۔ بارڈر فورس سے لے کر جے پور کے اعلیٰ سرکاری افسران تک، سب شنکر سے ہی لین دین رکھتے ہیں میں ابھی اس کے قائم مقام کی حیثیت سے کام کررہا ہوں۔ جب تک شنکر زندہ رہے گا، تب تک یہ تمام اوپر والے مجھے اس علاقے کا مالک و مختار تسلیم نہیں کریں گے۔“

مہاراج نے کہا۔ ”ایسی بات ہے تو پھر عمر دراز ضرور شنکر کو زندہ رکھے گا واقعی وہ آپ کے منصوبے کو کمزور بنارہا ہے۔“

”جو اسمگلر مجھ سے مال خرید کرلے جاتے ہیں، انہیں عمر کے آدمی راستے میں لوٹ لیتے ہیں یا ان سے بھاری رقم لے کر مال لے جانے کی اجازت دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ جب تک سوامی نارنگ سے لین دین رکھوگے، اسی طرح نقصان اٹھاتے رہوگے۔“

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ”میں اندر کی بات سمجھ رہا ہوں۔ عمر دراز کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دراصل پربھو اس علاقے پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ اس کے آدمی عمر دراز کے نام سے واردات کررہے ہیں۔ وہ کم بخت عمر ممبئی میں عیش کررہا ہے۔“

اس کی بات پوری ہوتے ہی مہاراج نے چونک کر دیکھا۔ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا تھا وہاں عمر دراز نظر آرہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا۔ دوسرے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ فون اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔

اس نے مہاراج سے کہا۔ ”فون بند نہ کرنا، بولتے رہو۔“

مہاراج نے چور نظروں سے میز کی دراز کی طرف دیکھا عمر نے کہا۔ ”تمہارا ہاتھ دراز تک نہیں پہنچے گا۔ یہ دیکھو کہ باہر کوئی شور ہنگامہ نہیں ہوا اور تمہارے تمام گارڈز گہری نیند سوگئے۔ وہ قیامت کے دن اٹھیں گے۔“

دوسری طرف سے سوامی نے پوچھا۔ ”مہاراج! یہ کون بول رہا ہے۔“

وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”عو عو... عمر دراز بول رہا ہے۔ باہر اس کے آدمی ہیں۔ میرے آدمی مارے گئے ہیں۔“

سوامی نے جلدی سے کہا۔ ”تم اسے باتوں میں لگاؤ۔ میں پولیس فورس کے ساتھ آرہا ہوں۔“

عمر دراز کے کان سے جو فون لگا ہوا تھا، اس سے آواز ابھری۔ ”مسٹر اسوامی دوسرے فون پر نمبر پنچ کررہا ہے۔“

عمر نے مہاراج سے کہا۔ ”سوامی سے کہو، دوسرا فون استعمال نہ کرے۔ موت اس کے بہت قریب ہے۔“

مہاراج نے یہ بات اپنے فون پر دہرائی، سوامی نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ ”اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں دوسرا فون استعمال کررہا ہوں۔ یقیناً یہاں اس کا کوئی آدمی مجھے چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ ٹھہرو، میں ابھی دیکھتا ہوں۔“

وہ دوسرا فون میز پر رکھ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اسی لمحے ایک خاموش گولی اس کے قریب میز کی سطح کو اکھاڑتی ہوئی گزر گئی۔ وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہاں سے پھر اٹھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

اس نے سر اٹھا کر روشن دان کی طرف دیکھا، وہاں ایک ہاتھ میں سائلنسر لگا ہوا پستول دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے بھی مسلح گارڈز باہر مارے گئے تھے اور وہ اپنے کمرے میں تنہا نہتا رہ گیا تھا۔

عمر نے مہاراج کے پاس آکر اس سے فون لے کر کہا۔ ”سوامی! مرنے والوں کی فہرست میں تمہارا نام بعد میں ہے۔ اس لیے میں تمہارے پاس نہیں آیا لیکن حرکت کروگے تو مارے جاؤگے۔ چپ چاپ بیٹھے رہو، میرے آدمی ابھی چلے جائیں گے۔“

وہ بولا۔ ”جو کہوگے وہ کروں گا، بس اتنا بتادو کیا واقعی تم عمر دراز ہو؟“

”مہاراج مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے اور ابھی اپنی دونوں آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔“

اس نے مہاراج کو فون دیتے ہوئے کہا۔ ”اسے بتاؤ میں کون ہوں۔“

وہ فون کو اپنے کان سے لگا کر بولا۔ ”میں عمر دراز کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ یہ خود واردات نہیں کرتا ہے مگر ہم دیکھ رہے ہیں جہاں موت بن کر آنا ہوتا ہے، آجاتا ہے۔“

پھر وہ سہم کر عمر سے بولا۔ ”کیا مجھے مار ڈالوگے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میں تمہارا دشمن ضرور رہا ہوں لیکن اب تک میں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔“

”سب سے پہلے تم ہی نے نقصان پہنچایا ہے۔ میں ایک معمولی سا آدمی تھا۔ اپنی سلمٰی کو حاصل کرنے کے لیے تھوڑا سا سفید پاؤڈر چوری کیا تھا۔ اسے بیچنے تمہارے پاس آیا تھا، اگر تم اس کے عوض تھوڑی سی رقم دے دیتے تو میں احسان مان کر چلا جاتا اور ہمیشہ ایک کمزور سا عام آدمی بن کر رہتا۔ لیکن تم نے وہ تھوڑی سی رقم نہیں دی، مجھے گرفتار کرانا چاہا۔ میری سلمٰی سے مجھے دور کرنا چاہا۔ تب میں نے زندگی میں پہلی بار گولیاں چلائیں اور تمہارے آدمیوں کو ہلاک کرکے تمہارے لاکھوں روپے وہاں سے لے گیا۔ تم پہلے دشمن ہو، جس نے مجھے قاتل اور لٹیرا بنادیا۔ مجھ سے میری سیدھی سادی شریفانہ زندگی چھین لی۔ پھر میں تمہاری زندگی کیوں نہ چھین لوں؟“

یہ کہتے ہوئے اس نے مہاراج کو گولی ماردی۔ وہ تڑپ کر کرسی سے پھسلتا ہوا فرش پر گرا پھر پھڑ پھڑا کر مرگیا۔

دوسری طرف عمر دراز کے وفادار، سوامی نارنگ کے کمرے میں دندناتے ہوئے آگئے تھے۔ اسے نہتا کرنے کے بعد آئرن سیف کی چابیاں لے کر وہاں سے اہم دستاویزات نکال رہے تھے۔

عمر نے مہاراج کے فون پر کہا۔ ”مہاراج گیا، اس کے بعد ایک نام میری فہرست میں ہے۔ اس نام کے بعد تمہارا نام ہے۔ ابھی دو چار دنوں تک سانسیں لے سکتے ہو۔ اگر اپنی طبعی عمر تک جینا چاہتے ہو تو کھری ٹاؤن سے چلے جاؤ۔ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔ اس کے آدمی ڈھیر ساری اہم فائلیں اور نوٹوں کی گڈیاں سمیٹ کر وہاں سے لے گئے۔ باہر سے دروازے کو بند کردیا۔ سوامی عارضی طور پر قیدی بن کر رہ گیا۔ کئی گھنٹوں تک اپنے وفاداروں سے اور پولیس والوں سے رابطہ نہ کرسکا، وہ لوگ اس کے دونوں فون بھی لے گئے تھے۔

جب اسے رہائی ملی تو کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ ایک پولیس افسر نے کہا۔ ”اسے فرار ہونے کے لیے کافی وقت ملا ہے۔ وہ راجستھان سے نکل گیا ہوگا۔ پھر بھی اسے تلاش کیا جارہا ہے۔“

ایک انٹیلی جنس کے افسر نے پوچھا۔ ”مسٹر سوامی! تم بہت سخت سیکیورٹی میں رہتے ہو پھر عمر دراز کے آدمی ایک بھی فائر کیے بغیر تمہارے گارڈز پر کس طرح حاوی ہوگئے؟“

وہ بولا۔ ”سیدھی سی بات سمجھ میں آتی ہے۔ میری سیکیورٹی فورس میں عمر دراز کے آدمی چھپے ہوئے ہیں۔ مجھے انہیں ڈھونڈنا اور پہچاننا ہوگا۔ پھر یہ کہ بھوانی شنکر کے وفادار بھی شاید درپردہ عمر دراز کے زیرِ اثر آگئے ہیں۔“

وہ درست کہہ رہا تھا۔ پربھو دیاوان کے کچھ آدمی بظاہر

WWW.PAKSOCIETY.COM

سوامی کے وفادار بنے ہوئے تھے۔ عمر دراز کے بھی خاص وفادار ہمت راؤ اور جگ دیو وغیرہ وہاں موجود تھے۔ کلپنا کے لیے کام کرنے والے بھی بھوانی شنکر اور سوامی کے وفادار نہیں تھے۔

وہ اَن دیکھے کانٹوں میں گھرا ہوا تھا۔ کھری ٹاؤن جیسی سونا اگلنے والی جگہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور مرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ عقل سمجھا رہی تھی کہ تنہا وہاں رہ کر پربھو دیاوان اور عمر دراز سے نمٹ نہیں سکے گا۔ انڈر ورلڈ کے دوسرے خطرناک سربراہوں کو اپنا اتحادی بنانا ہوگا۔ وہ متحد ہوں گے تو پربھو دیاوان تنہا ان سب کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

اس نے یہی کیا۔ مدراس، مہاراشٹر اور گجرات سے انڈر ورلڈ کے تین خطرناک سربراہوں سے ڈیلنگ کی۔ انہیں بیس بیس پرسنٹ کا شیئر ہولڈر بنایا، اس طرح کھری ٹاؤن میں تین اتحادیوں کا لشکر آ گیا۔

اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ بے انتہا طاقت ور ہو گیا تھا۔ اب عمر دراز بچوں کا کھیل سمجھ کر وہاں کھیلنے نہیں آ سکتا تھا پھر بھی اس کے اپنے وفادار وہاں چھپے ہوئے تھے اور ان تین اتحادیوں میں گجرات سے آنے والا اتحادی درپردہ پربھو دیاوان کا ایک جاں نثار دوست تھا۔

یوں سوامی نارنگ ریڈی بے انتہا طاقت ور ہونے کے باوجود کہیں کہیں سے کمزور بھی تھا۔ آئندہ ان کے درمیان کانٹے کا مقابلہ تھا۔ یہ گزرتا ہوا وقت ہی بتا سکتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے؟

مہاراج کے قتل کے بعد عمر دراز کو تلاش کیا جا رہا تھا۔ یہ سمجھا جا رہا تھا کہ اس نے بھوانی شنکر کو بھی اغوا کرنے کے بعد قتل کر دیا ہے اور اپنے پہلے دو دشمنوں سے انتقام لینے کے بعد پھر ممبئی چلا گیا ہے۔

وہ ممبئی واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ راجستھان میں پربھو نے اس کے لیے کئی پناہ گاہیں بنا دی تھیں۔ وہ کہیں بھی چھپ کر آرام سے رہ سکتا تھا لیکن مہاراج کو ٹھکانے لگانے اور سوامی کو چیلنج کرنے کے بعد وہ جے پور آ گیا تھا۔ رات کی تاریکی میں اپنے وفاداروں سے الگ ہو کر پیدل چلتا ہوا کلپنا کے سرکاری بنگلے میں پہنچ گیا تھا۔

بنگلے کے احاطے میں گہری خاموشی اور ویرانی تھی۔ رات کے وقت کمروں کی لائٹیں آف تھیں۔ باہر ایک بلب روشن تھا۔ وہاں کلپنا کی گاڑی کہہ رہی تھی کہ وہ موجود ہے۔

وہ دیوار پھاند کر احاطے میں آیا پھر دبے قدموں سے چلتا ہوا برآمدے سے گزر کر کلپنا کے کمرے کے سامنے آ گیا۔ اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس آ گیا۔ پردے کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا، کلپنا ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا پتی وجے اس کے آگے ٹہل رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”تم مجھ سے طلاق لینے کی بہت بڑی غلطی کر رہی ہو۔ جو عزت اور نیک نامی میرے نام سے تمہیں مل رہی ہے، وہ تمہیں اور کہیں نہیں ملے گی۔“

وہ بولی۔ ”شادی سے پہلے بھی یہ شہرت تھی کہ میں بھوانی شنکر کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ اگرچہ پاپا بدنام اسمگلر ہیں لیکن اتنے طاقت ور ہیں کہ تمہارے جیسے کسٹم افسران کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ مجھے تمہارے نام سے نیک نامی نہیں چاہیے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ سے طلاق کیوں لے رہی ہو؟ کیا جو تمہیں ایک بچے کی ماں بنا رہا ہے، وہ تمہارے حواس پر چھا گیا ہے؟“

”ہاں میں اس سے شادی کروں گی۔ مجھے تمہاری نیک نامی نہیں، ایک مرد کی مردانگی چاہیے۔“

”تم میری انسلٹ کر رہی ہو۔“

”جب تم عورت کے معاملے میں کمزور تھے تو تمہیں شادی نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن خود کو مرد ثابت کرنے کے لیے مجھے بیاہ کر لے آئے۔“

”میں نے تمہیں چھوٹ بھی دی ہے کہ جس کے ساتھ چاہو، عیش کرو اور تم کرتی آ رہی ہو۔ یہ تیسرا شخص ہے جو تمہارے پاس آ رہا ہے۔ آخر یہ کون ہے؟ کیوں اس کی خاطر مجھے چھوڑنا چاہتی ہو؟“

”میں ایک شوہر کے ساتھ، اپنے بچے کے باپ کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں اور تم شوہر نہیں ہو۔ مجھے دوسرے مردوں کے پاس جانے کی آزادی دیتے ہو۔ نہ تمہارے پاس مردانگی ہے، نہ ایک مرد کی غیرت اور خودداری ہے۔ بس اب اور زیادہ بحث نہ کرو۔ جاؤ یہاں سے اور کل صبح طلاق کا کاغذ لکھ دو۔“

وہ سر جھکا کر بولا۔ ”میں کاغذ لکھ دوں گا۔ تم میری زندگی سے نکل کر ایک بچے کی ماں بنو گی تو دنیا سمجھ لے گی کہ نہ وہ میرا بچہ ہے نہ میں ایک بیوی کے قابل تھا۔ میں ایسی توہین برداشت نہیں کر سکوں گا۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”کل صبح میری لاش کے پاس تمہیں طلاق نامہ اور وصیت نامہ ملے گا۔ ہو سکے تو آج تمام رات سوچو۔ اب تک تمہاری مہربانیوں سے مجھ پر پردہ پڑا رہا، حقیقت چھپی رہی۔ آئندہ بھی میری کمزوری کو چھپا سکتی ہو؟ تم چاہو تو اپنی مہربانی جاری رکھ سکو گی۔“

”سوری، میرا وہ مرد غیرت مند ہے، مجھ پر کسی دوسرے

کا سایہ بھی نہیں پڑنے دے گا۔ شادی کے بعد مجھے تمہارے ساتھ دیکھے گا تو ہم دونوں کو کاٹ کر پھینک دے گا۔ میں جیسا مرد چاہتی ہوں، وہ ویسا ہی ہے اور اب تو وہ میرے بچے کا باپ بننے والا ہے۔ پلیز جاؤ۔ مجھے سونے دو۔“

وہ سر جھکا کر دروازے کی طرف جانے لگا۔ عمر دراز فوراً ہی کھڑکی سے ہٹ کر ایک دیوار کے پیچھے چلا گیا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ کلپنا اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی اس کی کار تک گئی۔ عمر دبے قدموں سے چلتا ہوا اس کے کمرے میں آ کر بیڈ کے پیچھے چھپ گیا۔

کلپنا نے تھوڑی دیر بعد کمرے میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اپنا لباس اتار کر الماری سے ایک ہلکا پھلکا سا لباس نکال کر پہن لیا۔ اس کے بعد بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد کالنگ ٹون سنائی دی۔ پھر نھی سی اسکرین پر عمر کا نام پڑھ کر اچھل کر بیٹھ... گئی چیخ کر بولی۔ ”کہاں ہو؟ تین دن ہو گئے ہیں۔ میں ہر لمحہ تمہاری کال کا انتظار کرتی رہتی ہوں۔ دیکھو فون بند نہ کرنا، میں ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

”اگر میں باتیں نہ کروں اور ابھی تمہارے پاس آ جاؤں تو؟“

”ہائے، میں خوشی سے مر جاؤں گی۔“

وہ بیڈ کے پیچھے سے نکل کر بولا۔ ”پھر تو میں نہیں آؤں گا۔ آتے ہی مر جاؤ گی تو کسے پیار کروں گا؟“

”نہیں... مروں گی نہیں، تمہارے لیے زندہ رہوں گی۔ پلیز بولو نا کہاں ہو؟ کب آ رہے ہو؟“

”پہلے وعدہ کرو کہ اچانک آ جاؤں تو خوشی سے پاگل تو نہیں ہو جاؤ گی۔“

”وعدہ کرتی ہوں، نارمل رہوں گی۔“

”تو پھر انتظار نہ کرو، پیچھے گھوم کر دیکھو۔“

اس نے ایک جھٹکے سے گردن گھمائی پھر اسے دیکھتے ہی چیخیں مارتی ہوئی بیڈ سے اتر کر دوڑتی ہوئی آئی پھر اچھل کر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر جھول گئی۔ مارے خوشی کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

وہ روتے روتے شکایتیں کر رہی تھی۔ ”تم ہرجائی ہو، بےوفا ہو۔ میں تمہارے لیے جان دیتی ہوں اور تم میری قدر نہیں کرتے۔ پہلے بھی ایک بار اچانک اسی بند کمرے میں آ گئے تھے۔ آج بھی کمرا اندر سے بند ہے۔ کیسے آ گئے؟ ایسی اچانک جادوئی خوشیاں دو گے تو کسی دن میرا دم نکل جائے گا۔“

عمر نے اس پر جھک کر منہ بند کر دیا۔ وہ سحر زدہ سی ہو گئی۔ بولنا بھول گئی۔ جب اس نے رہائی دی تو وہ ہانپتی ہوئی اس کی گردن کی بلندی سے فرش پر اتر گئی۔ اپنے کرتے کا دامن اٹھا کر پھولا ہوا پیٹ دکھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ دیکھو، یہ میرا بچہ ہے۔ تم نے دیا ہے۔ یہ ہم دونوں کا ہے۔ اسے چوم لو۔“

عمر نے فرش پر گھٹنے ٹیک دیے اس کی کمر کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لیا پھر اس کے ابھرے ہوئے پیٹ پر اپنا چہرہ رکھ دیا۔ وہ مسرتوں سے مالا مال ہو رہی تھی۔ عمر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”میرے بچے! میرے لال! میری گڑیا رانی! تمہارا باپ آ گیا ہے۔ اپنے باپ سے بولو، کبھی تمہاری ماں کو چھوڑ کر نہ جائے۔“

پھر وہ عمر سے بولی۔ ”ابھی ایسے ہی رہو۔ ابھی تم ہو میں ہوں اور ہمارا بچہ ہم دونوں کے بیچ میں ہے۔ یہ اچھا موقع ہے۔ مجھے کلمہ پڑھاؤ۔ میں اسے پیٹ میں رکھ کر کلمہ پڑھوں گی تو بلاشبہ میری قبولیت میں سچائی ہوگی۔ آج سے اس لمحے

سسپنس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی
سول ایجنٹ برائے یو۔اے۔ای
WELCOME BOOK SHOP
ویلکم بک شاپ
پی او بکس: 27869 کرامہ، دبئی
فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015
موبائل: 050-6245817 ای میل: welbooks@emirates.net.ae
معیاری کتابوں کا اعلیٰ مرکز
WELCOME BOOK PORT
ویلکم بک پورٹ
ریٹیل، ہول سیل، ڈسٹری بیوٹر، پبلشر، ایکسپورٹر
مین اردو بازار۔ کراچی
فون: 32633151, 32639581 (21-92) فیکس: 32638086 (21-92)
ای میل: welbooks@hotmail.com
ویب سائٹ: www.welbooks.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے یہ ایک مسلمان ماں کی کوکھ میں پرورش پاتا رہے گا۔"

اس نے کہا۔ "جاؤ پہلے غسل کرو۔ مسلمان کے لیے سب سے پہلے جسمانی اور ذہنی پاکیزگی لازمی ہے۔"

وہ الماری سے دوسرا لباس نکال کر غسل کرنے چلی گئی۔ عمر نے اسے غسل کرنے کے بعد وضو کرنا سکھایا پھر اسے بتایا کہ بڑے سے دوپٹے کو کس طرح سر پر رکھ کر چہرے کے اطراف لپیٹ کر بازوؤں اور سینے کو اچھی طرح ڈھانپا جاتا ہے۔

اس نے فرش پر قبلہ رو ایک چادر بچھائی پھر اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے کلمۂ طیب پڑھایا۔ اسے سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام معاملات میں ایک ہے، اکیلا ہے۔ کسی بھی معاملے میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور آخری رسول ہیں۔

وہ خوش ہو رہی تھی، بڑے جذبے سے کہہ رہی تھی۔ "مجھے عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ میں بتا نہیں سکتی، میرے اندر کیا ہو رہا ہے۔"

اس نے کہا۔ "میرے ساتھ کھڑی ہو جاؤ اور دو رکعت نماز ادا کرو۔ ادھر سامنے کعبہ ہے، تمام مسلمان اسی سمت منہ کر کے عبادت کرتے ہیں۔ مرد دونوں ہاتھ یوں ناف پر رکھتے ہیں، عورتیں دونوں ہاتھ یوں سینے پر باندھتی ہیں۔"

وہ اس کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو کر نماز پڑھنے لگی۔ جس طرح وہ رکوع میں جا رہا تھا، سجدے کر رہا تھا، وہ بھی کر رہی تھی۔ وہ آیتیں پڑھ رہا تھا۔ یہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ "یا اللہ! میں نہیں جانتی عمر تجھ سے کیا کہہ رہا ہے؟ میں کہہ رہی ہوں کہ میرے بچے کا یہ باپ مجھے ہمیشہ کے لیے مل جائے۔ میں اپنا پتی، اپنا دھرم، اپنی تمام ذات برادری چھوڑ کر تیری عبادت کر رہی ہوں۔ اس کے بدلے صرف عمر کو مانگ رہی ہوں۔ مجھے ساری دنیا نہیں چاہیے بس یہ ایک آدمی چاہیے۔"

دلوں کے بھید خدا جانتا ہے۔ وہ شاید صدقِ دل سے ایک خدا اور آخری رسول کو مان رہی تھی مگر بیچاری عورت تھی۔ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ دل ہی دل میں یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس کے اور عمر کے درمیان سوکن نہ آئے۔ سلمٰی اپنے شوہر سے دور کہیں پڑی رہے یا اس کی زندگی مختصر ہو جائے۔

اس رات وہ عمر کی آغوش میں بڑے سکون سے رہی۔ کوئی جذباتی کشمکش نہیں تھی، اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ اب وہ کہیں بھی جائے گا تو اسی کے پاس کھنچا چلا آئے گا۔ اس نے نکاح کے بندھن میں باندھنے سے پہلے مذہب کی ڈور میں کس لیا تھا۔

وہ بڑی دیر تک اپنے بچے کے بارے میں خوب بولتی رہی پھر عمر دراز خراٹے لینے لگا تو وہ بھی سو گئی۔

بڑی گہری نیند آئی تھی۔ پتا نہیں وہ دونوں کب تک سوتے رہتے۔ صبح نو بجے فون کی کالنگ ٹون نے انہیں جگا دیا۔ کلپنا نے اسکرین پر نظر ڈال کر کہا۔ "ہمارا ایک زرخرید پولیس افسر کال کر رہا ہے۔"

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا اور پھر کہا۔ "یس آفیسر! کیا بات ہے؟"

"میڈم! بہت بری خبر ہے۔ آپ کے پتی دیو نے آتما ہتیا کی ہے۔ پولیس وہاں آنے والی ہے۔ ہوشیار رہیں۔"

وہ فوراً ہی فون بند کر کے بولی۔ "عمر! اٹھو یہاں سے چلو۔ پولیس آنے والی ہے۔ میرے پتی نے آتما ہتیا (خودکشی) کر لی ہے۔ تمہیں یہاں نظر نہیں آنا چاہیے۔"

وہ دونوں تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آئے۔ کلپنا نے اپنے ڈیڈی سے کہا۔ "عمر کو فوراً گاڑی میں لے جائیں۔ یہاں پولیس آنے والی ہے۔"

پھر اس نے پوچھا۔ "عمر! یہاں تمہاری کوئی پناہ گاہ ہے؟"

وہ بولا۔ "تم فکر نہ کرو، میں کہیں نکل جاؤں گا لیکن یہاں سے گاڑی میں چھپ کر جانا ہوگا۔"

وہ دھن راج ورما کے ساتھ وہاں سے گاڑی میں جاتے ہوئے بولا۔ "میں تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی خودکشی تمہارے لیے پرابلم نہیں بنے گی۔"

"فکر نہ کرو تم جاؤ، میں فون کروں گی۔"

وہ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوا۔ فون کے ذریعے پربھو دیا وان کے ایک سیوک سے بولا۔ "میں کسی پناہ گاہ میں پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس وقت ایک کار میں ہوں۔ یہ کار گاندھی اسکوائر کے پاس کھڑی رہے گی۔ میں فون کے ذریعے گائیڈ کرتا رہوں گا۔"

پربھو کے آدمی بیس منٹ کے اندر اپنی گاڑی میں وہاں آ گئے۔ عمر، دھن راج کی کار سے نکل کر ان کی گاڑی میں بیٹھ کر ایک نئی پناہ گاہ میں پہنچ گیا۔

آناً فاناً ملنے والے بچھڑ گئے۔ حالات بدل گئے اور پناہ گاہ بھی بدل گئی۔ کلپنا سرکاری بنگلے سے نکل کر کوٹھی میں آ گئی۔ اس کے پتی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ انٹیلی جنس والے وہاں کے ملازمین سے پوچھ گچھ میں مصروف تھے۔ کلپنا کو دیکھتے ہی اس کے پیچھے پڑ گئے۔ طرح طرح

کے سوالات کرنے لگے۔

سوالات یہ تھے۔ "آپ کے پتی نے آتما ہتیا کیوں کی ہے؟ آپ ان کی پتنی ہیں، ان کی خودکشی کی وجہ جانتی ہوں گی؟"

وہ بولی۔ "یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک پتی اپنے اندر کی تمام اہم باتیں اپنی پتنی کو بتاتا ہو۔ وہ بھی بہت سی پرسنل باتیں مجھ سے چھپاتے تھے۔ پچھلے کچھ دنوں سے پریشان رہنے لگے تھے۔ میرے پوچھنے پر بھی انہوں نے پریشانی کی وجہ نہیں بتائی تھی۔ میں سمجھتی ہوں وہی نامعلوم پریشانی انہیں لے ڈوبی ہے۔"

ایسے وقت وجے کے وکیل نے آ کر کہا۔ "سورگ باشی وجے شرما کے ایک خاص ملازم نے ابھی ایک گھنٹا پہلے یہ لفافہ لا کر مجھے دیا۔ اس میں شرما جی کا ایک خط اور ایک وصیت نامہ ہے۔"

اس نے لفافے سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکال کر انٹیلی جنس کے افسر کو دیتے ہوئے کہا۔ "اس میں لکھا ہے کہ وہ اور جینا نہیں چاہتے اس لیے اپنی مرضی سے آتما ہتیا کر رہے ہیں۔ کسی کو ان کی موت کا ذمے دار نہ ٹھہرایا جائے۔"

پھر اس نے اور تہ کیے ہوئے کاغذات نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ وصیت نامہ ہے۔ اس کی رُو سے اُن کی دھرم پتنی کماری کلپنا ان کی تمام دولت اور جائداد کی بلاشرکتِ غیرے مالک ہیں۔"

اس خط اور وصیت نامے سے یہ ثابت ہو گیا کہ موت کو گلے لگانے والے کو کلپنا سے کوئی عداوت تو کیا، کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔ پتی پتنی کے درمیان یہ راز مرنے والا اپنے ساتھ لے گیا تھا کہ وہ زندہ رہ کر نامرد کہلانا نہیں چاہتا تھا۔

موت کو گلے لگانے والا انتہائی شریف انسان تھا۔ اس نے کلپنا پر بے وفائی کا الزام نہیں لگایا تھا۔ اس پر کسی طرح کی آنچ نہیں آنے دی تھی۔

☆☆☆

اگلے دو ماہ بڑی خاموشی سے گزر گئے۔ عمر دراز کی طرف سے دشمن محتاط رہے مگر اس نے کوئی واردات نہیں کی۔ اسے تلاش کرنے والے تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ یہ یقین سے کہا جا رہا تھا کہ وہ ممبئی میں نہیں ہے۔

تمام دشمن اور قانون کے رکھوالے پہلے تو اس کی وارداتوں سے پریشان تھے، اب اس کی خاموشی بھی پریشان کر رہی تھی۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ کہاں گم ہو گیا ہے؟ یہ خوش کرنے والا خیال بھی پیدا ہو رہا تھا کہ شاید مر گیا ہے۔

تمام اتحادی دشمنوں کو یہ خوش فہمی تھی کہ عمر دراز اتحادی لشکر میں جنگجوؤں کی کثیر تعداد، گولہ بارود اور ہتھیار دیکھ کر بھاگ گیا۔ اب واپس نہیں آئے گا۔

پھر ایسے وقت ایک زبردست دھماکا ہوا۔ جب گودام میں سونے کے بسکٹس کا اور خالص سفید پاؤڈر کا ذخیرہ کیا گیا تھا۔ تقریباً سات ماہ پہلے کلپنا نے اس گودام کو تباہ کروایا تھا۔ اس بار بھی یہی ہوا تھا۔

دو ماہ کی خاموشی رنگ لائی تھی۔ ابھی سوامی نارنگ اور اس کے اتحادی ایسے دماغی جھٹکے کے بعد سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ ہتھیاروں کے گودام میں بھی آگ لگ گئی۔ گولہ بارود کے باعث متواتر دھماکوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ بارود کی آگ دور تک پھیل رہی تھی۔ لوگ گھروں سے نکل کر بھاگ رہے تھے۔ وہاں کے قریبی شہروں سے فائر بریگیڈ کی گاڑیاں دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ راجستھان سے لے کر راجدھانی دہلی تک فون کھڑکائے جا رہے تھے۔ کھری ٹاؤن میں ایسا قیامت کا منظر تھا کہ تمام اتحادی آنکھیں پھاڑے اپنی تباہی، اپنا نقصان دیکھتے رہ گئے تھے۔

ایک اتحادی نے کہا۔ "سوامی جی! ہم دھوکا کھا گئے۔ عمر دراز کی خاموشی سے یہ سمجھ گئے کہ وہ ہماری فوج دیکھ کر ہماری اتحادی قوت سے ڈر گیا ہے۔ اب ادھر نہیں آئے گا۔"

دوسرے اتحادی نے کہا۔ "ہمیں دو ماہ تک خوش فہمی میں مبتلا رکھنے کے بعد اس نے ہمارا لاکھوں کا اسلحہ اور کروڑوں کا مال تباہ کر دیا۔ ہمارے کتنے ہی تابع دار مارے گئے ہیں۔"

"دولت اور ہتھیار کے بغیر جنگ نہیں لڑی جا سکتی۔ اس نے دونوں بنیادی چیزوں سے ہمیں فی الحال محروم کر دیا ہے۔"

سوامی نارنگ نے کہا۔ "ہم سب کو جلد سے جلد اپنے اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکال کر ہتھیار منگوانے ہوں گے۔"

ایک اتحادی نے کہا۔ "یہ تو سراسر گھاٹے کا سودا ہوگا۔ ہم یہاں رقم کمانے آئے ہیں، گنوانے نہیں آئے ہیں۔"

سوامی نے کہا۔ "موجودہ حالات میں کچھ کھو کر ہی پانا ہوگا۔ دشمن اچھی طرح سمجھ رہا ہے کہ ہم جنگ کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ جلد ہی پھر حملہ کرے گا۔"

ایک نے کہا۔ "میرے چھ تابع دار مارے گئے ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "میرے چار مارے گئے ہیں۔"

تیسرے نے کہا۔ "میرے دو اہم جنگجو اسلحہ خانے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔ دھماکے میں ان کے چیتھڑے اڑ گئے۔ ہم نے جانوں کی قربانیاں دی ہیں۔ مالی قربانی نہیں دیں گے۔ ہم نے نقصان اٹھانے کے لیے اتحاد نہیں کیا ہے۔"

"سوامی جی! معاہدے کے مطابق آپ کو زیادہ شیئر ملے گا اور بھوانی شنکر کے بعد آپ ہی اس علاقے کے بے تاج بادشاہ بننے والے ہیں۔ آپ لاکھوں روپے نکالیں اور جلد سے جلد ہتھیار منگوائیں۔ ہمارے تابع دار یہاں خالی ہاتھ مرنے کے لیے نہیں رہیں گے۔"

سوامی نارنگ ریڈی مجبور ہو گیا۔ اس علاقے میں اس کی بادشاہت قائم ہونے والی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ اتحادیوں کے لائے ہوئے ہتھیار تباہ ہو گئے تھے۔ ان کے آدمی مارے گئے تھے۔ اب وہ ان پر مالی بوجھ ڈالتا تو وہ واپس چلے جاتے۔

اس نے انڈر ورلڈ کے آرمز اینڈ ایمونیشنز کے سپلائر سے رابطہ کیا۔ انہیں لاکھوں روپے کی ادائیگی کی۔ تیسرے ہی دن جدید ہتھیاروں اور گولہ بارود سے بھرے ہوئے ٹرک کھری ٹاؤن روانہ کر دیے گئے۔

کھری ٹاؤن تو بہت دور تھا۔ وہ ٹرک راجستھان میں بھی داخل نہ ہو سکے۔ ان پر بڑے منظم طریقے سے حملے ہوئے۔ عمر دراز نے سمجھا دیا کہ وہ ان سے غافل نہیں رہتا ہے۔ ایسے اہم موقعوں کی تاک میں رہا کرتا ہے۔ وہ تمام ٹرک آگ کے شعلوں میں لپٹ گئے تھے۔ انہیں لے جانے والے بھی جہنم میں پہنچ گئے۔

اس بار یہ کھلی حقیقت سب نے تسلیم کی کہ عمر دراز جرائم کی دنیا میں نوزائیدہ ہے۔ وہ ایسا منظم حملہ کر ہی نہیں سکتا۔ یہ پربھو دیاوان ہے جو عمر دراز کے نام سے انہیں نقصان پہنچا رہا ہے۔ صرف تین مہینوں میں اتحادیوں کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ جو تین اتحادی آئے تھے وہ یہ کہہ کر لوٹ گئے کہ ہم اپنے اپنے علاقے کے شیر ہیں۔ یہاں پربھو سے نمٹ نہیں سکیں گے۔

سوامی تنہا رہ گیا۔ کھری ٹاؤن سے سونا کمایا جاتا تھا۔ وہ وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا، سوچ رہا تھا۔ پلاننگ کر رہا تھا کہ وہاں کس طرح مضبوطی سے قدم جمائے رکھ سکتا ہے؟

ایک ہی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا پربھو دیاوان پہلے کبھی راجستھان نہیں آیا۔ عمر دراز کی مجرمانہ شہرت نے اسے شہ دی ہے۔ وہ اس کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہا ہے۔ کسی طرح عمر ختم ہو جائے تو پربھو اتنی دور تک جنگ لڑنے نہیں آئے گا۔ سوامی کی بقا اسی میں تھی کہ عمر دراز مارا جائے۔

کسی کے سوچنے سے کوئی مر جاتا تو تیر تلوار اور بندوق کی ضرورت نہ ہوتی۔ ایک کمزور بھی اِدھر سوچتا اُدھر طاقتور مارا جاتا۔ عمر دراز زندہ تھا۔ ابھی وہ خود نہیں جانتا تھا کہ کب تک اسے جینا ہے۔

وہ کبھی کبھی ممبئی آ کر سلمٰی کے ساتھ پیار و محبت سے بھرپور زندگی گزارتا تھا۔ پھر دشمنوں سے نمٹنے کے لیے راجستھان آ کر کلپنا کے ساتھ ازدواجی لمحات گزارتا تھا۔ اس نے سلمٰی کو بتا دیا تھا کہ کلپنا دینِ اسلام قبول کر چکی ہے اور وہ اسے اپنی شریکِ حیات بنا چکا ہے۔ اب اس کا نام صائمہ ہے۔

سلمٰی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے خوش ہونا چاہیے یا بدلتے ہوئے حالات کا ماتم کرنا چاہیے؟ صائمہ نے دینِ اسلام قبول کیا تھا۔ سلمٰی کو خوش ہو کر اسے مبارکباد دینا چاہیے تھی۔ لیکن وہ مسلمان ہو کر باقاعدہ اس کی سوکن بن گئی تھی۔

عورتیں اپنی فطرت سے مجبور ہوتی ہیں۔ وہ کبھی سوکن سے راضی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے عمر دراز کے سمجھانے سے فون پر صائمہ کو اسلام قبول کرنے کی مبارکباد دی۔

صائمہ نے کہا۔ "شکریہ.... تمہارے شوہر کو حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا لیکن میں نے مسلمان ہو کر ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔ کیا مجھے سوکن بننے کی مبارکباد نہیں دو گی؟"

"پہلے دیکھوں گی کہ تم نے ایک خدا کے آگے جھکنے کے لیے روحانی جذبے سے اسلام قبول کیا ہے یا میرے شوہر کو اپنے آگے جھکانے کے ارادے سے پٹری بدلی ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "مجھے جو کرنا تھا کر چکی ہوں۔ ہندو، یہودی، عیسائی یا مسلمان ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو وہی ایک عورت رہوں گی۔ پہلے ہندو پتی کے دھرم کے مطابق جی رہی تھی۔ اب ایک مسلمان شوہر کی تہذیب کے مطابق زندگی گزاروں گی۔ ایک ریل گاڑی منزلیں طے کرنے کے لیے پٹریاں بدلتی رہتی ہے۔ میں بھی یہی کر رہی ہوں۔"

پھر وہ بولی۔ "پتا ہے آٹھ مہینے گزر گئے ہیں۔ یہ نواں مہینا چل رہا ہے۔ الٹراساؤنڈ کی رپورٹ نے بتایا ہے کہ بیٹا ہو گا۔ میں ایک آدھ ہفتے میں جونیئر عمر دراز کو جنم دینے والی ہوں۔"

وہ بڑے فخر سے بول رہی تھی اور سلمٰی بڑے صدمے سے سوچ رہی تھی۔ "میں عمر کی پہلی محبت، پہلی شریکِ حیات ہوں۔ پہلے مجھے عمر کے بچے کو جنم دینا تھا لیکن یہ اعزاز سوکن کو حاصل ہو رہا ہے۔ یا خدا! یہ تیری قدرت ہے۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

عمر نے اسے گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے تسلی دی۔ "اپنے معاملات خدا پر چھوڑ دو۔ وہ بہتر جانتا ہے، وہی بہتر کرتا ہے۔ وہی معبود ہماری لاعلمی میں فریب دینے والوں کو ان کے اعمال کی سزائیں دیتا ہے۔"

وہ اسے تھپک کر بولا۔ "مجھے دیکھو، میں ایک عام سا آدمی ہوں۔ میں نے کبھی بندوق نہیں پکڑی تھی۔ میں جرائم کی دنیا کے ہتھکنڈوں کو آج بھی اچھی طرح نہیں سمجھتا ہوں لیکن ایسا لگتا ہے کہ میری اور تمہاری سلامتی کے لیے غائبانہ امداد مل رہی ہے۔ مجھے ہتھیار بھی مل رہے ہیں۔ دولت بھی مل رہی ہے اور ایسی طاقت مل رہی ہے کہ میرے خلاف یکجا ہونے والے اتحادی مجھ سے خوفزدہ ہو کر میدان چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ اب میں آخری معرکے کے لیے جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ ہم جلد ہی کھری ٹاؤن والے مکان میں جا کر رہیں گے۔"

"اور وہ سوکن کہاں رہے گی؟"

"وہ جہاں بھی رہے مگر تم دونوں کو ایک چھت کے نیچے نہیں رہنے دوں گا۔ اس کے ساتھ بھی اس وقت تک منصفانہ زندگی گزارتا رہوں گا جب تک وہ صحیح دین دار بیوی بن کر رہے گی۔"

وہ دوسرے دن ممبئی سے جے پور آ گیا۔ پتا چلا صائمہ اسپتال میں ہے۔ زچگی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ وہ اسپتال پہنچا تو ایک بیٹا جنم لے چکا تھا۔ وہ ایک بیٹے کا باپ بن چکا تھا۔

اس نے کمرے میں آ کر دیکھا۔ وہ زچگی کے بعد نڈھال سی ہو گئی تھی۔ بہت کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ نوزائیدہ بیٹا اس کے پہلو میں تھا۔ عمر کو دیکھتے ہی اس کے اندر جیسے بجلی سی بھر گئی۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر بچے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر بولی۔ "دیکھو عمر! دیکھو یہ ہمارا ہے۔ میں نے تمہارے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ دیکھو بالکل تمہارے جیسا ہے۔"

عمر نے بچے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما۔ پھر صائمہ کو چوم کر کہا۔ "تم مایوس ہو گئی تھیں کہ کبھی ماں نہیں بن سکو گی۔ میں نے وعدے کے مطابق یہ بچہ تمہاری گود میں دے دیا ہے۔ میں سمجھ رہا ہوں، اس وقت خوشیاں تمہارے اندر ناچ رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے، میرے بچے کو ایک اچھی اور سچی مسلمان ماں کی گود ملتی رہے گی۔"

تمام حالات عمر دراز کے موافق تھے۔ وہ کلپنا کو صائمہ بنا کر اپنے سانچے میں ڈھال چکا تھا۔ سلمٰی کو فی الحال ممبئی میں تحفظ حاصل تھا۔ سوامی نارنگ کے اتحادیوں کو توڑ کر اسے کمزور بنا چکا تھا اور اپنے پہلے دشمن بھوانی شنکر پر یہ مہربانی کر رہا تھا کہ بڑی رازداری سے اس کا علاج کرا چکا تھا۔

وہ دوسری رات پربھو کے ایک خفیہ اڈے میں پہنچا۔ وہاں کے ایک تہ خانے میں بھوانی شنکر کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ اس وقت وہ ایک بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے عمر دراز کو دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔

عمر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "رسی جل گئی، پر بل نہیں گئے۔"

وہ بولا۔ "مجھے تم توڑ سکتے ہو لیکن کبھی جھکا نہیں سکو گے۔"

"اور مجھے بھی جھکانا اچھا نہیں لگتا، توڑنا اچھا لگتا ہے۔ تمہاری ٹوٹنے کی جو خواہش ہے، وہ جلد ہی پوری ہو گی۔"

"تم نے یہ مہربانی کیوں کی ہے؟ مجھے سوامی کی سازشوں سے بچا کر علاج کرا رہے ہو۔ اب میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

وہ بیڈ سے اتر کر واکر کے سہارے چلتا ہوا عمر کے قریب آ کر بولا۔ "یہاں تمہارے آدمی مجھے بتاتے رہتے ہیں کہ سوامی نے میرے علاقے میں قبضہ جمانے کے لیے تین انڈر ورلڈ کے مجرموں سے اتحاد کیا تھا۔ تم نے ان سب کو مار بھگایا ہے۔ لیکن سوامی وہاں جما ہوا ہے۔ تم نے اسے کیوں نہیں بھگایا؟"

"وہ تمہاری جگہ ہے، تم اسے بھگاؤ گے۔ میں تمہیں رہا کرنے آیا ہوں۔ تم ابھی کھری ٹاؤن جا سکو گے۔"

اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر کہا۔ "میں ایک ایک دن گن رہا ہوں کہ تم کس دن مجھے گولی مارنے آؤ گے۔"

"گولی مارنا ہوتا تو تمہارا علاج نہ کراتا۔ تم اپنے علاقے میں جانے اور اپنی گدی سنبھالنے کے قابل ہو گئے ہو۔ اپنے وفاداروں سے رابطہ کرو۔ ان سے کہو کہ وہ سوامی سے نمٹنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ تم وہاں دو گھنٹے میں پہنچنے والے ہو۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "تم کیا کھیل کھیل رہے ہو؟ مجھ سے دشمنی کرنے کے بجائے میری کھوئی ہوئی سلطنت مجھے واپس دینا چاہتے ہو؟"

"مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہاں سے جاؤ۔ میرے آدمی تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ کر کئی سو میل دور تمہیں چھوڑ دیں گے۔ پھر تم آنکھوں سے پٹی ہٹا کر خود کو کھری ٹاؤن کے قریب پاؤ گے۔"

یہ کہہ کر عمر اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ وہاں ٹی وی، کمپیوٹر اور آڈیو ویڈیو کا سیٹ اپ تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر اسکرین پر بھوانی شنکر کو دیکھنے لگا۔

رہائی پانے کی بات پر اسے حوصلہ مل رہا تھا۔ وہ واکر کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

چھوڑ کر کسی سہارے کے بغیر ایک ایک قدم سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔ یہ حوصلہ ہو رہا تھا کہ کھری ٹاؤن میں سوامی کا مقابلہ کرتے وقت کسی بیساکھی کا سہارا نہیں لینا چاہیے۔

وہ موجودہ حالت میں نہ دوڑ سکتا تھا، نہ تیزی سے چل سکتا تھا۔ البتہ کسی سہارے کے بغیر ڈگمگاتے ہوئے چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس نے کسی قدر مطمئن ہو کر اپنے موبائل فون کے ذریعے ایک وفادار سے رابطہ کیا پھر دوسرے تیسرے وفاداروں کو بھی مخاطب کر کے بتایا کہ وہ واپس آ رہا ہے۔ اسے کھری ٹاؤن میں سوامی نارنگ کی صحیح پوزیشن بتائی جائے۔

وہ تمام وفادار اسے وہاں کے صحیح حالات بتانے لگے۔ ان تمام وفاداروں کو کئی ماہ پہلے عمر دراز خرید چکا تھا۔ انہوں نے عمر کی ہدایت کے مطابق اسے یقین دلایا کہ وہ آج بھی اس کے وفادار ہیں اور مرتے دم تک رہیں گے۔ اسے یہ بتایا گیا کہ سوامی نارنگ ریڈی کی پوزیشن بہت کمزور ہے۔ وہ وہاں آ کر اسے حرام موت مار سکتا ہے یا اسے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

تب اس نے مطمئن ہو کر سوامی کو فون پر مخاطب کیا۔ ”ہیلو! میں بھوانی شنکر بول رہا ہوں۔“

سوامی نے حیرانی سے پوچھا۔ ”شنکر! تم زندہ ہو؟“

وہ بولا۔ ”میری دوسری ٹانگ کو ناکارہ بنانے والے... میں زندہ ہوں اور ابھی دونوں پیروں سے چل کر وہاں پہنچ کر تجھے کتے کی موت مارنے والا ہوں۔“

”تم بہت اچھل رہے ہو شنکر! کیا بات ہے؟ عمر جیسے ایک ملازم کے ہاتھوں اب تک جوتے کھاتے آ رہے ہو۔ اب یہاں آ کر میرے ہاتھوں مرنا چاہتے ہو۔ آؤ میں تم سے نمٹنے کے لیے تیار ملوں گا۔“

وہ بولا۔ ”تمہارے تین اتحادی تمہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ تمہاری طاقت آدھی سے بھی آدھی رہ گئی ہے۔ کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا کہ عمر دراز کسی دن بھی آئے گا تو تم اس کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکو گے۔“

”میں دشمن کی یہ چال سمجھ رہا ہوں۔ دراصل حملہ کرنے تم نہیں آ رہے ہو۔ تمہارے پیچھے وہ آ رہا ہے۔“

”تم جو بھی سمجھو، تمہارا آخری وقت آ گیا ہے۔“

”میرے آخری وقت کی فکر میں کروں گا۔ تم وقت ضائع نہ کرو، آ جاؤ۔“

عمر دراز کمپیوٹر کی اسکرین پر اسے دیکھ رہا تھا اور ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے فون کے ذریعے کلپنا سے کہا۔ ”میں تمہارے پاپا کو رہائی دے رہا ہوں۔ تم اس سے بات کرو۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ تم میری کون ہو؟“

بھوانی شنکر کو آزادی مل رہی تھی۔ وہ نادان نہیں تھا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ عمر دراز اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے اسے رہائی دے رہا ہے۔ جب وہ سوامی کو وہاں سے مار بھگائے گا، تب عمر پھر دشمن بن کر کھری ٹاؤن آئے گا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ ”میں نادان نہیں ہوں، اپنے علاقے میں پہنچتے ہی عمر کی طرف سے بہت محتاط رہوں گا۔ وہ سوامی سے زیادہ خطرناک ہے۔ میں اسے ڈھونڈنے، گھیرنے اور مارنے کی کوشش کروں گا۔“

رنگ ٹون نے اسے چونکا دیا۔ اس نے اپنی بیٹی کے نمبر پڑھے پھر بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”میری بیٹی! مجھے اس قید خانے میں بتایا گیا تھا کہ تمہارے پتی نے آتما ہتیا کی ہے۔ تم ودھوا (بیوہ) ہو چکی ہو۔ مجھے بڑا دکھ ہوا تھا۔ مجھ سے فون چھین لیا گیا تھا۔ میں تمہارے دکھ میں شریک نہ ہو سکا۔ یہ فون مجھے آج ہی دیا گیا ہے۔“

پھر وہ چونک کر بولا۔ ”ارے ہاں۔ یہ نیا نمبر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

وہ بولی۔ ”کسی نامعلوم شخص نے ایس ایم ایس کیا ہے۔ یہ کہا ہے کہ آپ کو رہائی مل رہی ہے۔ میں چاہوں تو کھری ٹاؤن جا کر آپ سے مل سکتی ہوں۔“

”ہاں، میں ابھی جانے والا ہوں۔ تم اُدھر نہ آنا۔ میں اپنا علاقہ سوامی سے واپس لینے کے بعد تمہیں بلاؤں گا۔“

”آپ سوامی سے کیسے نمٹ سکیں گے؟ عمر دراز پھر وہاں آ کر آپ کو نقصان پہنچائے گا۔“

”میں جانتا ہوں۔ وہ دشمن میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ یہاں سے رہائی دے رہا ہے، وہاں جا کر مجھے ہلاک کرنا چاہے گا۔ مجھے تو اپنا علاقہ واپس لینے کے لیے ہر حال میں لڑنا ہے۔ موت کو آنا ہو گا، وہ آئے گی ورنہ پلٹ کر جائے گی تو مجھے کھوئی ہوئی بادشاہت مل جائے گی۔“

”آپ کو ایک خوشخبری سنا رہی ہوں۔ میں ماں بن گئی ہوں۔ میں نے ایک بہت ہی پیارے سے بیٹے کو جنم دیا ہے۔“

”یہ تو بہت بڑی خوشخبری ہے۔ افسوس کہ تمہارا پتی بیٹے کو دیکھنے سے پہلے دنیا سے چلا گیا۔“

”وہ اسی لیے چلا گیا کہ یہ اس کا بیٹا نہیں ہے۔ وہ باپ بننے کے قابل نہیں تھا اس لیے خودکشی کر لی۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟ تو پھر یہ کس کا بیٹا ہے؟ تم نے اپنے پتی سے بیوفائی کی ہے، اسے دھوکا دیا ہے؟“

”ہاں، جس طرح میری ممی نے آپ کو دھوکا دیا تھا، آپ باپ بننے کے قابل نہیں تھے۔“

”کیا بکواس کر رہی ہو؟“

”جو سچ ہے وہی کہہ رہی ہوں۔ آج یہ خوش فہمی ختم کر دیں کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ نہیں... آپ کے دشمن دھن راج ورما کی بیٹی ہوں جس سے میری ممی محبت کرتی تھیں۔ آپ نے میری ممی کو بے وفائی کے جرم میں قتل کر دیا لیکن میرے پتی نے میری جان نہیں لی۔ اپنی جان دے دی۔ کیا آپ مجھے اپنے داماد کی طرف سے وہ سزا دیں گے جو میری ممی کو دی تھی؟“

”مجھے معلوم ہوتا تو بہت پہلے ہی تمہاری ماں کے پاس تمہیں پہنچا دیتا۔“

”کوئی بات نہیں، آپ اپنی یہ حسرت پوری کر سکتے ہیں۔ میں کھری ٹاؤن آ رہی ہوں۔ مجھے اپنی ماں کا اور نانا کا انتقام لینا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ کون کسے نرک میں پہنچاتا ہے۔“

”گولی چلانا عورتوں کا کام نہیں۔ گولی اور بارود سے صرف مرد کھیلتے ہیں۔“

”جبکہ تم مرد نہیں ہو، ہاتھی کا دانت ہو صرف دکھانے کے لیے۔ اگر مرد ہو تو میرے اس یار کو گولی مارو جس نے مجھے اپنے بچے کی ماں بنایا ہے۔“

”کون ہے وہ؟ اسے میرے سامنے لاؤ۔ میں تم دونوں کو نرک میں پہنچا دوں گا۔“

”وہ جب بھی تم سے نمٹنے آتا ہے، تمہیں کروڑوں کا مالی نقصان پہنچا کر جاتا ہے۔ اسی نے تمہیں اسپتال پہنچایا تھا۔ اسی نے تمہیں قیدی بنایا تھا۔ ابھی وہی تمہیں رہائی دے رہا ہے۔“

اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر وہ غصے سے بولا۔ ”کیا تم نے اس مسلمان کے ساتھ منہ کالا کیا ہے؟“

”کالا نہیں کیا ہے، باقاعدہ شادی کی ہے۔ میں نے دینِ اسلام قبول کیا ہے۔ اس سے کورٹ میرج کی ہے۔ وہ جو تمہارے لیے طوفانِ بلا خیز ہے، میں اس کی شریکِ حیات ہوں۔“

وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”جب سے تم عمر کے دشمن ہوئے، تب سے میں اس کی دوست ہوئی۔ سب سے پہلے میں نے ہی تمہارے مال گودام کو بم دھماکے سے اڑایا تھا۔ عمر ہمیشہ میری زلفوں کے سائے میں رہا کرتا تھا۔ نہ تم نہ قانون کے رکھوالے سوچ سکتے تھے کہ وہ ہمارے

سرکاری بنگلے میں رہتا ہوگا۔“

”ہے بھگوان! تم آستین کا سانپ ہو اور میں نے تمہیں بیٹی سمجھ کر تم پر کبھی شبہ نہیں کیا۔ وہ ایسی چالیں چل رہا ہے جو نقصان اٹھانے کے بعد سمجھ میں آتی ہیں۔ کیا مجھے بتاؤ گی کہ وہ مجھے کیوں رہائی دے رہا ہے؟“

”اس لیے کہ ہر قیدی رہائی چاہتا ہے۔ تم بھی چاہتے ہو۔ اگرچہ رہائی خطرناک ہے۔ لیکن قیدی بن کر رہنے سے بہتر ہے۔ تم ضرور وہاں سے جاؤ گے۔ لاکھوں کروڑوں کا سونا اگلنے والے کھری ٹاؤن نہیں جاؤ گے تو فکر سے مر جاؤ گے۔ جاؤ، وہیں تم سے ملاقات ہوگی۔“

فون بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو مسلح شخص کمرے میں آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”تم آزاد ہو، چلو یہاں سے۔ ایک گاڑی تمہیں کھری ٹاؤن کے قریب چھوڑ کر آ جائے گی۔“

ان دونوں نے اس کے دائیں بائیں آ کر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی۔ پھر سہارا دے کر تہ خانے سے باہر لا کر اسے ایک گاڑی میں بیٹھا دیا۔ عمر دراز نے فون پر کلپنا سے پوچھا۔ ”کیا بات ہو گئی؟“

وہ بولی۔ ”ہاں، میں نے بتا دیا ہے کہ اس کی بیٹی نہیں دشمن ہوں اور تمہارے ساتھ رہ کر اسے نقصان پہنچاتی رہی ہوں اور اب میں تمہاری ایک مسلمان شریکِ حیات ہوں۔“

”وہ کیا کہہ رہا تھا؟“

”وہ کیا کہے گا؟ یہ اچھی طرح سمجھ گیا ہے کہ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اسے کھری ٹاؤن پہنچا کر وہاں کے لوگوں کے سامنے اسے ماریں گے۔“

عمر نے کہا۔ ”یہ جاننے کے باوجود کہ اُدھر خطرات ہیں پھر بھی اس امید پر گیا ہے کہ اپنے وفاداروں کے ذریعے ہمیں مات دے سکے گا۔ بہرحال میں ابھی جا رہا ہوں۔ میں جب تک نہ کہوں تم وہاں نہ آنا۔ جب جنگ ختم ہو جائے گی اور کسی طرح کا اندیشہ نہیں رہے گا، تب تمہیں بلاؤں گا۔“

”تم نے وعدہ کیا ہے، میرے پاپا کو جان سے نہیں مارو گے۔ میں اپنی ماں اور نانا کا انتقام لوں گی۔“

”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ تم ہی اسے حرام موت مارو گی۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ پربھو دیاوان کی جنگجو ٹیم میں چند تیز طرار عورتیں بھی تھیں جو گولہ، بارود سے کھیلنا جانتی تھیں اور جاسوسی کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ پچھلے کئی مہینوں سے چند عورتیں کھری ٹاؤن میں مصروف تھیں۔ دو عورتیں اپنے جنگجو

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساتھیوں کے ساتھ بھوانی شنکر کے پیچھے گئی تھیں اور اس وقت ایک عورت عمر دراز اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ایک وین میں جارہی تھی۔

سوامی نارنگ نے اپنے آدمیوں کو ٹاؤن کے اندر اور باہر پھیلا دیا تھا۔ وہ لوگ ٹاؤن میں آنے والوں کو کڑی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جو مشکوک یا مسلح ہوتے تھے ان سے اسلحہ چھین لیتے تھے یا انہیں واپس جانے کا حکم دیتے تھے۔ پھر حکم نہ ماننے والوں کو گولی مار دیتے تھے۔

سوامی کے وفاداروں میں جگ دیو اور ہمت راؤ بھی تھے۔ وہ عمر دراز اور کلپنا کے بھی تابع دار تھے۔ عمر کے آدمیوں نے بھوانی شنکر کو کھری ٹاؤن کے قریب پہنچا دیا تھا۔ وہاں اس کے تین عدد مسلح وفادار گاڑیوں میں موجود تھے۔ شنکر ان کے ساتھ آگے جا کر ٹاؤن میں داخل ہوا تو ان پر فائرنگ ہونے لگی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ شنکر کے آدمی بھی جوابی فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہی فائرنگ کا شور بند ہوگیا۔ بھوانی شنکر نے ہمت راؤ سے پوچھا۔ ''کیا دشمن اتنی جلدی مارے گئے ہیں یا پیچھے ہٹ گئے ہیں؟''

ہمت راؤ نے کہا۔ ''ان دشمنوں میں آپ کے وفادار بھی ہیں۔ وہ بازی پلٹ رہے ہیں۔ آپ بے دھڑک بھوانی ولا میں چلیں۔''

بھوانی ولا وہ عمارت تھی جہاں بھوانی شنکر اسمگلروں اور دیگر مجرموں سے لین دین کرتا تھا۔ اس عمارت کے بہت بڑے دفتر میں سوامی نارنگ ریڈی اپنے تابع داروں کے ساتھ مسلح تھا۔ اسے اطلاع ملی کہ بھوانی شنکر اس کے تابع داروں کو ہلاک کرتا ہوا شہر میں داخل ہوگیا ہے۔

اس نے مایوس ہو کر اپنے ان وفاداروں سے فون پر کہا۔ ''ہوشیار رہو، شنکر ٹاؤن میں داخل ہوگیا ہے۔ اسے یہاں تک زندہ نہ آنے دو۔''

اسے جواب ملا۔ ''ہم زندہ رہیں گے تو اسے زندہ نہ آنے دیں گے۔ سوامی جی! ہم دھوکا کھا گئے۔ بھوانی شنکر کے جن آدمیوں کو آپ نے خریدا تھا، وہ رقم لینے کے بعد پھر گئے ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ مل کر دشمن سے لڑنے آئے تھے لیکن ابھی انہوں نے ہمارے چار وفاداروں کو گولی ماردی ہے۔ مجھے فون پر بات کرنے کو زندہ چھوڑا ہے۔ اب شاید میں بھی...''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گولی چلنے کی آواز سنائی دی پھر فون بند ہوگیا۔ سوامی کے ذہن کو دھچکا لگا۔ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ بھوانی شنکر کے آدمی اس کے اپنے تابع داروں کے ساتھ گڈمڈ ہوگئے ہیں۔ وہ صحیح طور سے اپنے جاں نثاروں کو پہچان نہیں پارہا ہے۔

وہ بھوانی ولا کے وسیع و عریض دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہاں ایک درجن مسلح تابع دار تھے۔ دفتر کے باہر بھی کئی وفادار تھے جن میں جگ دیو سمیت کلپنا کے کئی تابع دار موجود تھے۔ سوامی نے ان سب کو گھور کر دیکھا پھر کہا۔ ''میرے ساتھ وشواس گھات ہورہا ہے۔ تم لوگوں کے اندر دشمن چھپے ہوئے ہیں۔''

وہ ریوالور نکال کر اپنے خاص ماتحتوں سے بولا۔ ''وینکٹ سوامی اور دیپک پردھان! تم دونوں کی وفاداری پر مجھے ناز ہے۔ ابھی یہاں ان سب کو ٹٹولو۔ ان کی تلاشی لو۔ معلوم کرو کہ یہاں کتنے آستین کے سانپ چھپے ہوئے ہیں۔''

اس کے حکم کے مطابق وینکٹ سوامی اور دیپک پردھان آگے بڑھے۔ اسی وقت دو گولیاں چلیں، وہ دونوں ہی چیخیں مارتے ہوئے فرش پر گر کر ٹھنڈے پڑ گئے۔ پھر تو ایسے گولیاں چلنے لگیں جیسے پٹاخے بج رہے ہوں۔ سوامی میز کے پیچھے چھپ کر فائر کر رہا تھا۔ صرف دس منٹ کی فائرنگ کے بعد سناٹا چھا گیا۔ اسے دفتر کے اندر اور باہر صرف لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ کھیل سمجھ میں آگیا کہ وہ مات کھا چکا ہے۔

جگ دیو نے ایک دروازے کی آڑ سے کہا۔ ''سوامی! باہر آجاؤ۔ تمہیں بہت دور جانا ہے۔''

وہ میز کے پیچھے سے نکل آیا۔ اپنا ریوالور دروازے کی طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ ''میں بھوانی شنکر سے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے واپس جانے دے۔ ہمارے درمیان پہلے کی طرح کاروباری تعلق رہے گا۔''

جگ دیو نے اس کی ایک ٹانگ پر گولی ماری۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ اس نے دوسری ٹانگ پر بھی گولی مار کر کہا۔ ''تم نے بھوانی کو دونوں پیروں سے اپاہج بنایا تھا۔ یہی تمہارے ساتھ ہورہا ہے۔ تم اپنے گھر جاؤ گے لیکن وہاں ساری زندگی اپاہج بن کر رہو گے۔''

اس نے قریب آکر اس کے دونوں گھٹنوں پر مزید گولیاں برسائیں۔ وہ چیخ رہا تھا اور رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ تکلیف کی شدت سے نڈھال ہوگیا تھا۔ اس پر بے ہوشی طاری ہورہی تھی۔

دو کارندے وہاں آکر اسے اسٹریچر پر ڈال کر لے گئے۔ عمارت کے باہر اسے گھر پہنچانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا گیا۔ اسی وقت بھوانی شنکر نے وہاں اپنی وین سے اتر کر اسے دیکھا پھر نفرت سے بولا۔ ''کتے کو اپنے علاقے کی رکھوالی دی تھی۔ الٹا مجھے کاٹ کھانا چاہتا تھا۔ تھو ہے تجھ پر۔ جا تجھے اپاہج بنا کر چھوڑ رہا ہوں۔''

گاڑی اسے لے کر چلی گئی۔ اس نے گھوم کر اپنے بھوانی ولا کی عمارت کو دیکھا۔ پھر خوش ہو کر جگ دیو سے بولا۔ ''آج میں نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت پالی ہے۔ مجھے تم لوگوں کی وفاداری پر ناز ہے۔ ابھی میں خوب پیوں گا۔ امپورٹڈ وسکی لاؤ۔ ناچنے والیوں کو بلاؤ۔''

جگ دیو کے ساتھ کئی مسلح افراد عمارت کے بیرونی دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔ بھوانی شنکر اندر جانے کے لیے آگے بڑھا تو کسی نے اسے اندر جانے کا راستہ نہیں دیا۔ وہ سب دیوار بن گئے تھے۔

بھوانی شنکر کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے گھور کر جگ دیو کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ''یہاں کے سکندرِ اعظم تم نہیں ہو، عمر دراز خان ہے۔ وہ دیکھو۔''

شنکر نے پلٹ کر دیکھا۔ قریب ہی ایک گاڑی آکر رکی پھر اس کے دروازے کھلے۔ عمر دراز مسلح گارڈز کے ساتھ باہر آیا۔ اس کے ساتھ ایک حسینہ بھی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تم اس عمارت میں تو کیا، اس ٹاؤن کے کسی بھی گھر کے اندر جا کر رات نہیں گزارو گے۔ صبح تک باہر سڑک پر کہیں پڑے رہو گے۔ تمہاری بیٹی یہاں آکر تمہیں سزائے موت دے گی۔''

اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا گیا۔ وہ چاروں طرف گھوم کر دیکھنے لگا۔ وہاں درجنوں مسلح افراد تھے جنہیں وہ اپنا تابع دار سمجھ رہا تھا۔ سوامی نارنگ ریڈی کی طرح وہ بھی دھوکا کھا گیا تھا۔

اس کا دماغ گرم ہوگیا۔ دل چاہتا تھا کہ ابھی عمر دراز کو گولی مار دے۔ ریوالور چھن جانے کے باوجود وہ نہتا نہیں تھا۔ لباس کے اندر ایک پستول چھپا ہوا تھا۔ وہ انتظار میں تھا کہ اس کی مزید تلاشی لی جائے گی تو وہ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر عمر کو گولی سے اڑا دے گا۔

ویسے عمر کی عمر دراز تھی۔ کسی نے بھوانی شنکر کی تلاشی نہیں لی۔ وہ حسینہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ شنکر وہاں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا مسلح افراد کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک چوراہے کے چبوترے پر آکر بیٹھ گیا۔ یہ یقین ہوگیا تھا کہ سزائے موت پا رہا ہے۔

جگ دیو نے ایک طرف جا کر فون پر کلپنا کو مخاطب کیا۔ وہ بولی۔ ''کیا رپورٹ ہے؟''

''میڈم! سوامی کو بری طرح اپاہج بنا کر زندہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ ساری عمر اپاہج بنا رہے گا۔ بھوانی شنکر کو راستے کا بھکاری بنا دیا گیا ہے۔ اسے کہا گیا ہے کہ آپ صبح تک آکر اسے سزائے موت دیں گی۔''

''عمر کہاں ہے؟''

''وہ اپنی وائف کے ساتھ کسی گھر میں رات گزارنے گیا ہے۔''

''کیا...؟'' وہ چونک کر بولی۔ ''کیا سلمٰی اس کے ساتھ ہے؟''

''میں نے سلمٰی کو کبھی دیکھا نہیں ہے۔ یہ اندازے سے کہہ رہا ہوں۔ اتنی رات کو وہ بیوی کے ساتھ ہی کسی گھر میں جائے گا۔''

''میری کال کا انتظار کرو۔ میں ابھی بات کروں گی۔''

اس نے رابطہ ختم کر کے عمر کو فون پر مخاطب کیا پھر پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''کھری ٹاؤن میں ہوں۔ تمہارا وہ بنا پتی باپ تمام رات کسی سڑک پر رہے گا۔ تم کل صبح یہاں آجاؤ۔''

''میں ابھی کیوں نہیں آؤں؟''

''بچے کے ساتھ رات کو سفر کرنا مناسب نہیں ہے۔''

''صاف کیوں نہیں کہتے کہ رات بھر میری سوکن رہے گی؟''

''یہاں تمہاری کوئی سوکن نہیں ہے۔''

''مجھے الو نہ بناؤ۔ ایک خطرناک جنگ لڑنے کے لیے اسے ساتھ لے گئے ہو اور مجھے وہاں آنے سے منع کر رہے ہو۔''

''بکواس مت کرو۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔''

''وہ جو تمہارے ساتھ ہے، اسے فون دو۔ میں اس سے بات کروں گی۔''

''میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ جو بھی تھی، وہ جا چکی ہے۔''

''یعنی تم سلمٰی کی آواز نہیں سناؤ گے؟''

''میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ تم سے بحث نہیں کروں گا۔ صبح یہاں آکر اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لینا۔''

وہ تھکا ہوا تھا۔ اس نے جھنجلا کر فون کو بند کر کے بستر پر پھینک دیا۔ وہ بھی جھنجلا گئی۔ دماغ میں یہی بات آئی کہ سلمٰی کی موجودگی میں اس نے غصہ دکھا کر فون بند کر کے سوکن کے سامنے اس کی توہین کی ہے۔

اس نے جگ دیو سے فون پر پوچھا۔ ''وہ کس مکان میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے؟ وہاں اس کے ساتھ جو بھی عورت ہوگی، اسے گولی سے اڑا دو۔"

"میڈم! عمر دراز مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

وہ جھنجلا کر بولی۔ "میں نے کب کہا ہے کہ اسے عمر کے سامنے گولی مارو۔ تم کسی دوسرے سے یہ کام لے سکتے ہو۔"

"اوکے میڈم! آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔"

اور تعمیل ہو گئی۔ اس عورت کا نام نرملا تھا۔ وہ پربھو دیا وان کی ایک ٹیم میں رہ کر جاسوسی کے فرائض انجام دیتی تھی۔ اس رات وہ جاگ رہی تھی۔ پربھو نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اسے عمر دراز کی سختی سے نگرانی کرتے رہنا ہے۔

عمر جس رہائش گاہ میں تھا' وہاں اور دو چار تابع دار دوسرے کمروں میں سو رہے تھے۔ نرملا نے رات کے تین بجے عمر کے کمرے میں آ کر دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ حقیقتاً بدترین حالات نے اسے نیند میں بھی محتاط رہنا سکھا دیا تھا۔ نرملا پلٹ کر کمرے سے جانے لگی تو اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس کی فرض شناسی پر مسکرایا پھر آنکھیں بند کر لیں۔

نرملا دبے پاؤں کمرے سے باہر آئی۔ قاتل اس کی تاک میں تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اتنی رات کو عمر کے کمرے سے نکلنے والی سلمٰی ہی ہوگی۔ اس نے سائلنسر لگی ہوئی گن سے گولی چلا دی۔ نرملا کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ گولی اس کے بازو کو چھو کر گزر گئی تھی۔ وہ چھلانگ مار کر تاریکی میں چلی گئی۔ قاتل بھاگ رہا تھا لیکن اس کی شامت آ گئی تھی۔ نرملا نے پھرتی سے پستول نکال کر گولی چلائی۔ وہ بھاگتے بھاگتے لڑکھڑا کر گر پڑا۔ فائر کی آواز نے سب کو چونکا دیا تھا۔ وہاں سب ہی دوڑے چلے آئے۔ نرملا کے دوسرے فائر نے اس کے ہاتھ سے ریوالور کو گرا دیا۔ پھر سب ہی نے آ کر اسے دبوچ لیا۔

عمر نے آ کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "تم جگ دیو کے فوجی ہو... اسے کیوں قتل کرنا چاہتے تھے؟"

وہ بری طرح خوفزدہ تھا۔ ہکلاتے ہوئے بولا۔ "مم... میں نہیں بولوں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔ معاف کر دو۔ ایسی غلطی پھر نہیں کروں گا۔"

ایک نے کہا۔ "جو غلطی کر چکے ہو اس کا حساب کرو۔ اسے کیوں قتل کرنا چاہتے تھے؟"

عمر نے پوچھا۔ "کیا تم سے کہا گیا تھا کہ یہ میری بیوی سلمٰی ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کیا یہ بات جگ دیو نے تم سے کہی تھی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ عمر نے اسے گولی مار دی۔ پھر وہ سب بڑی رازداری سے جگ دیو کے مکان میں پہنچے۔ وہ مکان کے باہر لان میں اپنے آدمی کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ سلمٰی کی ہلاکت کی خبر سننا چاہتا تھا۔ اس کے بعد یہ خبر کلپنا کو سنانا چاہتا تھا۔

اس وقت وہ ایک کرسی پر پاؤں پھیلائے نیم دراز تھا۔ اس نے تھکن دور کرنے کے لیے تھوڑی سی پی تھی۔ ذرا سرور میں تھا۔ ایسے وقت اسے عمر دراز کی آواز سنائی دی۔ "ہائے جگ دیو! جاگ رہے ہو؟"

وہ چونک کے سیدھا بیٹھ گیا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر سامنے رکھی ہوئی گن کو اٹھاتے ہوئے ادھر ادھر تاریکی میں گھورتے ہوئے بولا۔ "تم... تم عمر دراز ہو؟ اس وقت آئے ہو تو سامنے آؤ۔"

رات کے سناٹے میں فائر کی آواز دور تک گونجی۔ گولی جگ دیو کے بازو میں لگی تھی۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی تھی۔

عمر کی آواز سنائی دی۔ "اسے جھک کر اٹھانے کی حماقت نہ کرنا۔ اپنی مالکن کو فون کرو کہ سلمٰی مر چکی ہے۔ تم نے اس کے حکم کی تعمیل کی ہے۔"

جگ دیو نے کہا۔ "عمر! دو سوکنوں کے جھگڑوں میں مجھ سے دشمنی نہ کرو۔ ہمارا اتحاد قائم رہنا چاہیے۔ عورتیں بہت مل جاتی ہیں۔"

عمر نے روشنی میں آتے ہوئے اس کے سینے پر گولی مارتے ہوئے کہا۔ "سلمٰی جیسی کم کم ملتی ہیں۔ اس کی زندگی کم نہیں ہوئی، تمہاری کم ہو گئی۔"

اس نے دوسری گولی ماری۔ پھر کئی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ میں وہ چھلنی ہو گیا۔ زمین بوس ہو کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔ عمر نے قریب آ کر اسے دیکھا پھر وہاں سے پلٹ کر جانے لگا۔

اسی وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ جگ دیو مردہ تھا۔ اس کا فون زندہ ہو گیا تھا۔ عمر نے میز پر رکھے ہوئے فون کو اٹھا کر کلپنا کا نام پڑھا۔ پہلی بار معلوم ہوا کہ اس نے اپنے جاں نثار جگ دیو کو اپنے مسلمان ہونے کی بات نہیں بتائی ہے۔ وہ ابھی تک دنیا والوں کے سامنے کلپنا تھی۔ صرف عمر کے سامنے صائمہ بن کر رہتی تھی۔ یا ہو سکتا ہے اس نے جگ دیو کو اپنی تبدیلی کے متعلق بتانا ضروری نہ سمجھا ہو۔

عمر نے فون کے بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگایا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو جگ دیو! میں انتظار کر رہی ہوں۔ تم نے فون کیوں نہیں کیا؟ کیا کام نہیں ہوا؟ وہ ابھی تک زندہ ہے؟ ہیلو ہیلو جگ دیو..."

عمر نے فون کو بند نہیں کیا۔ اسے چپ چاپ میز پر رکھ کر جانے لگا۔ اسے یقین تھا کہ جواب نہ ملنے پر وہ اسے کال کرے گی۔ معلوم کرنا چاہے گی کہ اس کا اپنا وفادار فون اٹینڈ کیوں نہیں کر رہا ہے؟

وہ اپنی رہائش گاہ میں واپس آ گیا۔ وہاں توقع کے مطابق کالنگ ٹون سنائی دی۔ وہ تھوڑی دیر تک اس کی ٹون سنتا رہا اور سوچتا رہا پھر اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ کلپنا نے کہا۔ "سوری عمر! تمہیں نیند سے جگا رہی ہوں۔ اس وقت چار بج رہے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد دن نکل آئے گا۔ میں یہاں سے روانہ ہو رہی ہوں۔ وہاں سب خیریت ہے نا؟"

وہ خاموش رہا۔ وہ بولی۔ "میں جگ دیو کو فون کر رہی ہوں، اس سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ میرے دوسرے وفادار کا بھی فون بند پڑا ہے۔ تم خیریت سے ہو نا؟"

وہ بہت ہی غمزدہ سا ہو کر بولا۔ "نہیں، میں خیریت سے نہیں ہوں۔ میری دنیا لٹ گئی ہے۔"

وہ آخری فقرہ سن کر کلپنا کے دل میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ خدا نہ کرے تمہاری دنیا لٹ جائے' تمہاری دنیا تو میں ہوں۔"

عمر نے ایک گہری سانس لی۔ ایک سرد آہ بھری پھر کہا۔ "میری سلمٰی...! آہ' میری سلمٰی... اب اس دنیا میں نہیں رہی۔"

وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ پھر فوراً ہی اس چیخ کو ماتمی بناتے ہوئے بولی۔ "نہیں عمر! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ خدا اسے سلامت رکھے۔ تم نے تو کہا تھا' وہ کہیں دوسری جگہ محفوظ ہے۔"

وہ خاموش رہا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تم اسے اپنے ساتھ لائے تھے؟ آخر ہوا کیا ہے؟"

"میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔ میں اسے ساتھ لایا تھا۔ یہاں ابھی ایک گھنٹا پہلے کسی نے اسے گولی مار دی۔ میرے آدمی اس قاتل کے پیچھے گئے ہیں۔"

"اوگاڈ! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تمہیں کیسے تسلی دوں۔ تمہیں سلمٰی کو ساتھ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ وہاں اندھا دھند گولیاں چل رہی ہوں گی اور وہ کسی گولی کی زد میں آ گئی ہوگی۔"

"گولیاں نہیں چل رہی تھیں۔ کھری ٹاؤن پر ہمارا قبضہ ہو چکا ہے۔ میرا کوئی دشمن یہاں نہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "سلمٰی کے ہندو گھرانے والے وہاں کئی دشمن ہیں۔ تم نے اسے وہاں لے جا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔"

"ہاں، میری اس غلطی سے کسی نے زبردست فائدہ اٹھایا ہے۔ میں بہت دل برداشتہ ہوں۔ زیادہ باتیں نہیں کر سکوں گا۔ تم چلی آؤ۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ عمر مایوس ہو کر سوچنے لگا۔ آگ ہر حال میں آگ ہوتی ہے۔ ہر حال میں جلاتی ہے۔ ایک سوکن دوسری کو ڈسنے سے کبھی باز نہیں آئے گی۔

وہ سوچ رہا تھا۔ "صائمہ جب تک دینِ اسلام پر قائم ہے میں اسے اپنی عزت بنا کر رکھوں گا۔ اس نے نرملا کو سلمٰی سمجھ کر حملہ کرایا ہے۔ اس کی یہ غلطی بھی معاف کر دوں گا۔ ہر انسان میں خامیاں ہوتی ہیں تو خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ میرا فرض ہے کہ صائمہ کو غلطیاں کرنے سے باز رکھوں اور اس کی خوبیوں کی قدر کرتا رہوں۔"

وہ دوسری صبح اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے وہاں آ گئی۔ عمر دراز نے بیٹے کو اس سے لے کر اپنے سینے سے لگایا۔ اسے پیار کیا پھر کلپنا سے کہا۔ "آؤ... سلمٰی کا دیدار کرو۔"

وہ عمر کے ساتھ اس کی رہائش گاہ میں آئی۔ اس کی بہت بڑی آرزو پوری ہو گئی تھی۔ وہ مردہ سوکن کو دیکھنے والی تھی لیکن ایک کمرے میں زندہ عورت ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ سلمٰی کو صورت سے نہیں پہچانتی تھی۔ عمر نے کہا۔ "اس پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا۔ خدا نے اسے بچایا ہے۔"

کلپنا کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ زندہ سوکن اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ بولا۔ "تم نے اپنے وفاداروں کو حکم دیا تھا کہ اسے زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ میں نے بھی جھوٹ بول کر تمہیں خوش کر دیا کہ یہ مر چکی ہے۔"

وہ بولی۔ "میں نے کسی کو ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔"

"تم مانو یا نہ مانو۔ میں نے تمہاری فون کال اپنے کانوں سے سنی ہے۔ بہرحال، اس دشمنی کے سلسلے میں تمہیں سزا نہیں دوں گا۔ یہ تو شروع سے کہتا آیا ہوں کہ دونوں سوکنوں کو ندی کے دو کنارے بنا کر رکھوں گا۔ اس وقت بھی سلمٰی تم سے بہت دور ہے۔ یہ ہماری جنگجو ساتھی نرملا ہے۔"

کلپنا نے چونک کر بے یقینی سے نرملا کو دیکھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ عمر نے کہا۔ "تم سلمٰی کو نقصان پہنچانے کے سلسلے میں دوسری بار ناکام ہوئی ہو۔ آئندہ بھی ناکام رہوگی۔ تم کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھ سکو گی۔"

وہ قریب آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "تم میری بہت اچھی شریکِ حیات ہو۔ مجھے دل و جان سے چاہتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو۔ میں تمہیں غلطیوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔‘‘
وہ عمر سے لپٹ گئی۔ بچہ ان کے درمیان تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ ندامت سے رو رہی تھی یا پھر نا کامی اسے رُلا رہی تھی۔ عمر نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ ’’باہر چلو۔ تم نے کہا تھا، میرے دشمن کو تم مارو گی۔ اپنی ماں اور نانا کا انتقام لو گی۔ وہ پچھلی رات سے چوراہے پر پڑا ہے۔‘‘
وہ سب وہاں سے نکل کر چوراہے کی طرف جانے لگے۔ ایسے وقت پربھودیاوان نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ ’’شاباش عمر! تم نے میری پلاننگ کے مطابق زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔ میں کھری ٹاؤن آنے کے سلسلے میں ایسے حفاظتی انتظامات کر رہا تھا کہ پچھلی رات تمہیں مبارکباد نہ دے سکا۔ اب میں آرہا ہوں۔ کیا تمہاری سلمٰی کو ساتھ لے آؤں؟‘‘
’’نہیں پربھوجی! اسے وہیں سلامتی سے رہنے دیں۔ آپ یہاں آئیں گے تو میں اپنے مستقبل کے بارے میں اپنا فیصلہ سناؤں گا۔‘‘
’’میں تمہارے مزاج کو اور فیصلے کو کسی حد تک سمجھتا ہوں۔ تم حالات سے مجبور ہو کر ہماری دنیا میں آئے ہو۔‘‘
’’ہاں اور جب سے آیا ہوں‘ انگاروں پر چل رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ انگارے میرے پیروں تلے بچھے رہیں گے۔ میں نے کبھی ایک دن بھی سکون سے نہیں گزارا ہے۔ میں پھولوں پر چلنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے لیے کیا کر سکیں گے؟‘‘
پربھو نے کہا۔ ’’آئندہ تم جیسی بھی زندگی گزارنا چاہو گے‘ میں ویسی ہی سہولتیں فراہم کروں گا۔ تم جرائم کی دنیا سے دور اپنے اسی دیس میں ایک شریف اور پُرامن شہری کی طرح زندگی گزار سکو گے۔ میں آج شام تک کھری ٹاؤن آکر وہاں کے انتظامات سنبھالوں گا۔‘‘
رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ سب اس چوراہے پر پہنچ گئے جہاں بھوانی شنکر ایک چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔ کھری ٹاؤن کے تمام مرد‘ عورتیں‘ بچے اور بوڑھے وہاں آرہے تھے اور باری باری اس پر تھوکتے جارہے تھے۔
عمر نے اپنے بیٹے کو نرملا کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔ ’’اسے یہاں سے دور لے جاؤ۔ کلپنا اپنی ماں اور نانا کا قرض چکا رہی ہے۔‘‘
نرملا بچے کو لے کر دور چلی گئی۔ کلپنا نے بھرا ہوا ریوالور نکال کر بھوانی شنکر کو دیکھا۔ ان کے درمیان دس گز کا فاصلہ تھا۔ وہ اس کی طرف تھوکتے ہوئے بولی۔ ’’تجھے اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ تھا۔ تو انسانوں کو مٹی کے کیڑوں کی طرح پاؤں تلے مسل دیتا تھا۔ کوئی تیرا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا۔ آج کوئی ہاتھ تجھے بچانے والا نہیں ہے۔ تو نے میری ممی کو اور نانا کو مار ڈالا۔ عمر کی ماں اور بہن کو بڑی بے بسی سے مرنے پر مجبور کر دیا۔ نہ جانے کتنی بہنوں اور بیٹیوں کی عزتیں لوٹ چکا ہے۔‘‘
بھوانی شنکر گھور کر کلپنا کو اور عمر کو دیکھ رہا تھا۔ کلپنا اس کے روبرو ریوالور لیے کھڑی تھی اور عمر‘ کلپنا کے پیچھے تھا۔ باپ بیٹی کے معاملے سے فی الحال الگ تھا۔
وہ بولی۔ ’’تمام بستی والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ میرا باپ نہیں ہے۔ میں کسی اور کی بیٹی ہوں اور تم سب لوگوں پر جو اس نے ظلم ڈھائے ہیں، ان کی سزا اسے دے رہی ہوں۔‘‘
اس نے دونوں ہاتھوں سے ریوالور کو تھام کر اس کا نشانہ لیا۔ انہی لمحات میں بھوانی شنکر نے بڑی پھرتی سے لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر پستول نکالتے ہوئے گولی چلا دی۔
دونوں طرف سے بیک وقت گولیاں چلیں۔ دونوں ہی گولیوں کی زد میں آگئے۔ بھوانی شنکر دراصل عمر کو نشانہ بنانے کا منتظر تھا لیکن سامنے کلپنا تھی۔
وہ سخت جان تھا۔ اس نے دم توڑنے سے پہلے عمر کی طرف گولی چلائی۔ لیکن اس کی عمر اسم بہ مسمّٰی تھی۔ ابھی دراز تھی۔ اس کے تابعداروں نے بھوانی کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔
کلپنا زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ عمر نے اس کے پاس دو زانو ہو کر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے سینے سے لہو بہہ رہا تھا۔ وہ اٹک اٹک کر سانس لے رہی تھی۔ وہ اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔ ’’کلمہ پڑھو... صائمہ! کلمہ پڑھو۔‘‘
وہ جھٹکے کھاتے ہوئے بولی۔ ’’مم... میں ے... را... بچہ...‘‘
نرملا نے فوراً ہی جھک کر بچے کو ماں کے سینے سے لگا دیا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ بچے کو ایک بار بھی چوم سکتی۔ عمر نے پھر کہا۔ ’’صائمہ! کلمہ پڑھو۔ بولو لا الٰہ...‘‘
اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عمر کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ’’میں... جا... جا... رہی... میرا... بچ... چہ...‘‘
وہ بولا۔ ’’ہاں۔ تمہارا بچہ میرا بچہ ہے۔ اسے سینے سے لگا کر رکھوں گا۔ تم کلمہ پڑھو۔‘‘
اس میں جان تھی۔ پڑھنے کی مہلت مل رہی تھی لیکن وہ ٹال رہی تھی۔ پھر اس کا سر جیسے انکار کے انداز میں دائیں سے بائیں ہوا۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے ساکت ہوگیا۔ وہ بالکل آخری سانسوں میں ’بچ‘ سمجھا کر چلی گئی۔

گمشدہ وقت

بشریٰ امجد

ذہنی الجھاوے ہمیشہ کے لیے ہر طرح کی مسرتوں سے دور کر دیتے ہیں... وقت کی بھول بھلیوں کی گرفت میں مقید ایک ایسی ہی گلوکارہ کا دل خراش ماجرا... دل شکستگی نے اسے چور چور کر دیا تھا...

مقتول کو قتل کرنے پر کمربستہ ایک مظلوم کی مجرمانہ سرگرمی...

مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہاں ایک ’’پینٹ ہاؤس‘‘ بھی تھا۔ میں ایک عام سے ہوٹل کے عام سے کاک ٹیل لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ وہیں مجھے ایک عجیب سی عورت نظر آئی جو میرے آنے کے تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچی تھی۔
میں بار کے قریب ایک ٹیبل پر تھی اور گیری کا انتظار کر رہی تھی۔ گیری کا انتظار کرنے والا کوئی بھی ہو، اسے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ ہمیشہ تاخیر سے آتا تھا۔ یہ اس کی برائی نہیں تھی، مجبوری تھی۔ وہ ہمیشہ دیر سے آنے کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

...... معقول جواز رکھتا تھا۔ اسی لیے منتظر کنندہ کو انتظار میں تکلیف اور کوفت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ انتظار کرنے والا گیری کو جانتا تھا۔ اسے یقین ہوتا تھا کہ بالآخر وہ آئے گا ضرور... اور وہ پہنچ جاتا تھا۔ اس نے کبھی اپنے انتظار کرنے والے کو مایوس نہیں کیا تھا۔

چنانچہ میں بھی مطمئن تھی... اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے اس عجیب سی عورت کو دریافت کیا۔ مجھ میں ایک بُری عادت تھی۔ وہ یہ کہ میں دور دور سے افراد کا مطالعہ کر کے انہیں سمجھنے اور کسی خانے میں فٹ کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ خاص طور پر اجنبی لوگوں کو۔ میرا یہ مشغلہ، میرے لیے تو بہت دلچسپ تھا۔ میں تصور اور مشاہدے کی مدد سے کسی کو بھی پڑھنا شروع کر دیتی... اس میں سماعت شامل ہوتی تو مجھے شخصیت کو سمجھنے میں اور بھی آسانی ہو جاتی تھی۔

سیلی پورٹر کو میں شکل سے ہی پہچانتی تھی۔ وہ سیدھی بار تک گئی اور ایک غیر آرام دہ اونچے اسٹول پر جم گئی۔ میں نے حسبِ عادت اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ بارٹینڈر اور ویٹرز اس کے شناسا معلوم ہوتے تھے۔ کسی قدر معزز نظر آنے والا مرد، جس کے بال سیاہ اور چمکیلے تھے اور جو سیلی کے برابر اسٹول پر بیٹھا تھا۔ یقیناً وہ بھی سیلی کو جانتا تھا۔ وہ قریب ہی کہیں رہتی ہے، میں نے سوچا۔

میں نے اس کے لباس کا جائزہ لیا۔ عموماً عورتیں ایک دوسرے کے لباس میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ اس کا لباس مجھے قیمتی لیکن بے ترتیب نظر آیا... میں نے اندازہ لگایا کہ لباس 100 ڈالر سے زیادہ کا نہیں ہے۔ نیز کپڑے صفائی مانگ رہے تھے۔ سرسری نگاہ میں کوئی دوسرا اس چیز کو نوٹ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس کی شخصیت میں کسی کو متاثر کرنے والا گلیمر نظر نہیں آیا۔

کچھ دیر کے مشاہدے کے بعد میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ سیلی نے گلیمر کی جانب توجہ دی ہی نہیں تھی لیکن کیوں؟ اس کے لباس اور اندازِ نشست سے میں نے اندازہ لگایا کہ سیلی کے خوب صورت سرخی مائل بالوں کے نیچے سر میں کچھ پک رہا ہے۔

اس کے برابر سیاہ بالوں والے کا نام بینی تھا... میں نے سماعت ان دونوں کی گفتگو پر مرکوز کر دی۔

"ایمانداری کا تقاضا ہے، بینی۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "تمہیں پیانو پلیئر کو فارغ کر دینا چاہیے... اس نے میرے گیت کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور ایسا اس نے عمداً کیا ہے۔" سیلی نے اپنے مؤقف پر زور دیا۔

بینی کا چوڑا ہاتھ سیلی کی پشت پر آ گیا۔ اس کا انداز پیار سے سہلانے والا نہیں تھا بلکہ وہ مساج کر کے اسے پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بے بی، ایزی... ایزی... تمہارا یہ انداز مجھے تکلیف پہنچاتا ہے۔"

سیلی نے کندھے کو جھٹکا دیا اور عادی مے نوش کے مانند گلاس یک دم خالی کر دیا۔ پھر وہ سیاہ بالوں والے بینی کی طرف تھوڑی سی جھکی، جس کی آنکھوں میں ہمدردی تھی اور اس کا ہاتھ تھراپسٹ کی طرح حرکت کر رہا تھا۔

"بینی! میں چاہتی ہوں کہ تم اسے فارغ کر دو... بالآخر میں تمہارا ٹرمپ کارڈ ہوں... لوگ میرے گیت سننے آتے ہیں۔ سیلی پورٹر کے گیت۔ تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے۔"

"شیور! بے بی... وہ تمہیں چاہتے ہیں۔ ہم آنے والے دنوں میں تمہیں واپس لائیں گے۔"

"لیکن گزشتہ شب! تم نے سنا گزشتہ رات کا گیت... اس نے میرے گیت کا کیا حشر کیا؟"

بینی نے اپنا گلاس خالی کیا اور مزید کا اشارہ کیا۔ وہ سیلی کی جانب دیکھتے ہوئے تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

"گزشتہ شب، بے بی؟ تم نے تو تین ہفتے سے گلوکاری کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔"

بینی کی بات سن کر میں اپنی جگہ پر چونک اٹھی۔ ادھر سیلی نے بے صبری سے ایک ہاتھ لہرایا اور دوسرا گلاس چڑھانا شروع کیا۔ بینی زیادہ مے نوشی کے نقصانات سے سیلی کو آگاہ کر رہا تھا۔ وہ اسے سمجھا رہا تھا کہ اسے چاہیے، غصے کو آگ کے بجائے پانی سے ٹھنڈا کرے۔

ان دونوں کے سر دوسری جانب ہو گئے... بارٹینڈر انہیں کوئی کہانی سنا رہا تھا۔ وہ دونوں بارٹینڈر کی طرف متوجہ تھے۔ مجھ تک آواز صاف نہیں آ رہی تھی۔

میں نے دوسری مارٹینی کا آرڈر دیا اور ڈاکٹر گیری کے بارے میں سوچنے لگی۔ اسے اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر گیری تاخیر کے بعد بھی ملاقاتی کو مطمئن کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

میں نے پھر بار کی طرف توجہ دی، وہ اسٹول پر نہیں تھی۔ اونچے اسٹول پر اس کا کوٹ پڑا ہوا تھا۔ ایش ٹرے کے کنارے پر اس کی ادھ جلی سگریٹ سلگ رہی تھی، تیسرا یا چوتھا لبریز گلاس اس کا منتظر تھا۔

بینی اپنے سیاہ گھنے بالوں میں ہاتھ سے کنگھی کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ پتا نہیں یہ پریشانی سیلی کے بارے میں تھی یا سیلی کی بلانوشی سے متعلق تھی۔

میرے خیال میں دونوں باتیں نہیں تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کسی سنگنگ بینڈ کا لیڈر تھا۔ اس کی پریشانی یقیناً پیشہ ورانہ نوعیت کی تھی۔ سیلی نے تین ہفتے سے گلوکاری نہیں کی تھی۔ جبکہ سیلی کا خیال تھا کہ وہ گزشتہ شب گا رہی تھی اور پیانو پلیئر سے خفا لگ رہی تھی۔ شاید الکوحل کی زیادتی کے باعث وہ ایسا کہہ رہی تھی۔ یا کوئی اور بات تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی اسرار درمیان میں ہے...

سیلی کی غیر موجودگی میں بارٹینڈر جھکا ہوا کچھ کہہ رہا تھا۔

"بڑی شرم کی بات ہے۔ وہ پیانو پلیئر کے بارے میں عجیب بات کر رہی تھی... گزشتہ شب کے بارے میں جو کہہ رہی تھی، ایسا بھونڈا انداز میں نے پہلے کبھی نہیں سنا۔"

"اسے اب اس حالت سے باہر آ جانا چاہیے۔" بینی نے کہا۔

اوہ تو یہ بات ہے۔ میں نے سوچا۔ کوئی جذباتی مسئلہ ہے۔ جسے بھلانے کے لیے وہ بے تحاشا پی رہی ہے۔ کوئی دوسرا گیت کار اس کی جگہ لے چکا ہے۔

وہ واپس آ رہی تھی۔ وہ بالکل ایک سیدھ میں چل رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں پر توجہ مرکوز کی۔ جہاں اداسی کی پرچھائیں تھی۔ کوئی زخمی کر دینے والا الم... معاً مجھے کچھ یاد آیا... گیری نے ہی مجھے ایک مرتبہ بتایا تھا اسموکنگ کے بارے میں "میری جوآنا" کی اسموکنگ کے بارے میں...

گیری نے کہا تھا کہ میری جوآنا کے عادی، اکثر اوقات، وقت کا احساس کھو دیتے ہیں۔ سیلی مختصر سا راستہ یوں طے کر رہی تھی جیسے وہ میلوں طویل مسافت ہے۔

غالباً اس بے چاری کو احساس نہیں تھا کہ وہ اپنے تین ہفتے کہیں کھو آئی تھی۔ وہ بے قرار تھی اور بے تحاشا پی رہی تھی... اس نے گلاس خالی کر کے ایش ٹرے سے سگریٹ اٹھایا۔ پھر اسے واپس ٹرے میں مسل دیا اور دوسرا سگریٹ نکال کر سلگایا۔

اس نے بینی سے سکہ طلب کیا اور فون بوتھ کی طرف چلی گئی... کچھ دیر بعد واپس آئی اور قنوطیت سے کہا۔ "نہیں ہے۔"

میں نہیں سمجھی کہ وہ کس کی غیر موجودگی کا اعلان کر رہی تھی۔ بینی اس کا بازو تھپتھپا رہا تھا۔

☆☆☆

دوسری مارٹینی کے ساتھ ویٹر، میرے لیے ایک پیغام لایا کہ گیری کی آمد 30 منٹ میں متوقع ہے۔ میں چہرے کی تازگی کے لیے لابی کی دوسری جانب پاؤڈر روم کی طرف چل پڑی۔ ڈاکٹر کی بیوی ہونا شروع میں تکلیف دہ لگا تھا۔ بعد ازاں میں عادی ہوتی گئی... گیری مجموعی طور پر ایک اچھا انسان اور شوہر ثابت ہوا تھا۔

پاؤڈر روم سے، ہاتھ منہ دھو کر اور ہلکا میک اپ کر کے میں نکلنے ہی والی تھی کہ کمرے میں سیلی پورٹر داخل ہوئی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لحظہ ٹھٹکی تھی، پھر بولی۔

"عجیب، بے تکی جگہ ہے۔"

میں اس کو کسی حد تک جانتی تھی لیکن اس کے لیے میں قطعی اجنبی تھی۔ ہم دونوں کمرے میں اکیلے تھے... وہ اپنے بیگ کو کھنگال رہی تھی۔ پھر مایوس ہو کر اس نے مجھ سے لائٹر کے بارے میں سوال کیا۔ میں یہاں کمرے میں اس سے بہت قریب تھی۔ اس کا قریبی جائزہ لینا آسان تھا۔ اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے۔ وہ خوب صورت تھی... بالوں کی رنگت بھی قدرتی تھی۔ تاہم ذہنی تناؤ نے اس کے چہرے کے نقوش کو متاثر کیا تھا۔ شب بیداری کی علامتیں موجود تھیں۔ جنہوں نے اس کی آنکھوں کے نیچے شکنیں ڈال دی تھیں۔ اگر وہ ذہنی سکون کی حالت میں ہوتی تو یقیناً صنفِ مخالف کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ مجھے سوالیہ نظروں سے تک رہی تھی۔ میں نے چونک کر اپنا لائٹر اس کے حوالے کیا۔

اس نے عجلت میں سگریٹ سلگائی اور گہرا کش لے کر دھواں اگلا۔ قریب ہونے کی وجہ سے میں نے دھوئیں میں عجیب سی بو محسوس کی۔ یقیناً وہ کوئی سادہ سگریٹ نہیں تھی۔ کش لینے کے بعد وہ گویا ہوئی اور بغیر کسی تمہید و جھجک کے بولی۔

"میں اس آدمی کو ختم کر دوں گی۔"

میں اس اچانک فقرے پر بوکھلائی تاہم اپنے تاثرات کو ہلکے سے قہقہے میں دبانے میں کامیاب رہی۔

"زیادہ سختی نہیں کرنا۔" میں نے پرس بند کرتے ہوئے چلنے کے لیے رخ بدلا اور اس نے میرا بازو تھام لیا۔ مجھے بے چینی کا احساس ہوا۔

"تم ہنس رہی ہو؟" اس نے منہ بنایا۔ "میں حقیقتاً اسے نہیں چھوڑوں گی۔ میں مذاق نہیں کر رہی۔ میں سگریٹ ختم کر کے بذریعہ لفٹ پینٹ ہاؤس تک جاؤں گی اور اپنے شوہر کو مار دوں گی۔ میں شام سے پلاننگ کر رہی ہوں۔"

میں ٹپٹائی۔ میں پہلے سمجھی تھی کہ وہ پیانو پلیئر کو کوئی سبق سکھانے کی بات کر رہی ہے۔ لیکن وہ تو اپنے شوہر کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کر رہی تھی۔ سیلی نے میرا بازو چھوڑ دیا اور کرسی پر گر کر رونے لگی۔ میں حیران اور مجسس تھی۔ میں نے کمرے سے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

"اگر رینڈ پورٹر سمجھتا ہے کہ وہ اس بھوری کتیا کے لیے مجھے چھوڑ سکتا ہے تو یہ اس کی خام خیالی ہے... میں ایسا نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہونے دوں گی۔'' سیلی پورٹر بھیگی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ ''اس سے پہلے میں اسے مار ڈالوں گی۔ رینڈ نے میری چاہت کی توہین کی ہے۔''

وہ کرسی سے کھڑی ہوگئی لیکن پھر کرسی میں ڈھیر ہوگئی۔ میں اس کمرے سے نکلنا چاہتی تھی۔ مجھے گیری کا خیال آیا۔ میری نظر اس کی انگلیوں میں سلگتی قریب الختم سگریٹ پر پڑی۔ اس کا ہاتھ اسکرٹ سے قریب تھا اور وہ سگریٹ کو بھلا بیٹھی تھی۔ میں نے تیزی سے سگریٹ جھپٹی اور ایش ٹرے میں مسل دی۔

وہ چونکی اور دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''رینڈ کل چلا جائے گا۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ پلکیں بھیگی ہوئی تھیں ''رینڈ نے کل رات میرے لیے ایک رقعہ چھوڑا ہے... وہ معذرت خواہ ہے۔'' سیلی مشتعل نظر آنے لگی۔ ''وہ کل کسی جگہ، کسی اور کے ساتھ سوئے گا اور معذرت سے کام چلا رہا ہے... میں برداشت نہیں کرسکتی، وہ آج رات آخری بار مجھ سے ملے گا۔ یہ اس کی آخری رات ہوگی۔ میں ملنے کے لیے تیار ہوں۔''

''میں تمہیں ٹھنڈا پانی دیتی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم بہتر محسوس کروگی۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ بولی۔ ''مجھے پتا ہے کہ میں خوفناک لگ رہی ہوں۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے رقعے میں معافی طلب کی ہے۔ اس کے نزدیک یہی آخری راستہ ہے... یہ آخری راستہ نہیں ہے۔'' سیلی کی آواز بلند ہوگئی۔ ''میں معاف نہیں کرسکتی۔ بالکل نہیں۔''

اس کی آنکھوں کے تاثر اور حرکات وسکنات نے مجھے خوف زدہ کردیا۔ میں اسے پڑھنے میں غلطی نہیں کررہی تھی۔ ایک المیہ جنم لینے والا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کہ وہ پھر بول پڑی۔

''اس کے اذیت ناک رقعے نے کل رات میری گیت نگاری کو برباد کردیا۔''

''کل رات، لاسٹ نائٹ۔ ہنی تم تین ہفتے سے گلوکاری سے دور ہو۔ خود کو سنبھالو... آنے والے دن ضرور روشن ہوں گے۔''

''اب کوئی دن نہیں آئے گا۔'' وہ بھڑک اٹھی۔ ''میں آج ہی عمارت کی بلندی پر پینٹ ہاؤس سے اسے دھکا دوں گی۔'' وہ کمرے سے نکل گئی۔ میرے بدن نے جھرجھری لی۔ وہ مجھے اپنا منصوبہ بتا گئی تھی اور اسے خبر نہیں تھی کہ وہ اپنا منصوبہ کسی پر ظاہر کرچکی ہے۔

میرے لیے یہ کوئی حیران کن امر نہیں تھا۔ اگرچہ میں ابھی الکحل کی زیادتی کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ جس کے نتیجے میں یادداشت کی تختی مٹنے کا تجربہ ہوا ہو۔ بہرحال، میں اس ذہنی کیفیت سے باخبر تھی۔ اوپر سے سیلی پورٹر ''میری جوا...'' سے بھی شوق فرماتی رہی تھی۔

مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ سیلی کے یہاں دوست ... تھے اور اگر اسے یاد آجاتا کہ وہ اپنے منصوبے کا ذکر ایک اجنبی سے کرچکی ہے تو میرے لیے صورتِ حال مخدوش ہوسکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔

نکلتے نکلتے، مجھے سیلی کی آنکھوں کی آہنی چمک یاد آگئی۔ میں کشمکش میں پڑگئی۔ میرے تصور میں ایک خاکہ ابھرا... جس میں ایک شخص پینٹ ہاؤس کنارے سے شہر کا نظارا کررہا تھا۔ وہ سگریٹ نوشی کے ساتھ انتظار میں مشغول تھا۔ اپنی حاسد اور ذہنی انتشار کی حامل بیوی کا انتظار... آخری ملاقات کے لیے... تصور میں، میں نے دیکھا کہ اس کی بیوی نے بلاکسی بحث اور انتباہ کے اسے دھکا دیا... اس کا انتظار ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔

ممکن ہے کہ وہ آخری لمحے میں سیلی کو پکڑنے کی کوشش کرے اور دونوں ہی بلندی سے خلا میں گم ہوجائیں یا پھر بعد میں از خود سیلی خود کو بھی ہلاک کرڈالے۔

سیلی نے کہا تھا کہ ''اب کوئی ''کل'' نہیں آئے گا۔'' وہ ہذیان بکتی رہی تھی، اس نے مجھے ایک دشوار صورتِ حال سے دوچار کردیا تھا۔ اگر میں نے کچھ نہ کیا اور واقعی ایسا کوئی المیہ ہوگیا تو میں خود پر ذمے داری کو بوجھ محسوس کرتی رہوں گی۔

مجھے صرف ایک فون کال کرنی پڑے گی اور میرا ضمیر مطمئن ہوجائے گا۔ میں مسٹر پورٹر کو اس کی بیوی کی دیوانگی کے بارے میں اطلاع دے سکتی ہوں۔

بالآخر میں نے فیصلہ کرلیا اور مسکراتے ہوئے ڈیسک کلرک تک رسائی حاصل کی۔ مجھے کمرا نمبر پتا نہیں تھا۔ میں پوچھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ مجھے سرسری انداز اپناتے ہوئے رینڈ پورٹر کو سرخ بتی دکھانی تھی۔

''برائے مہربانی، کیا تم رینڈ پورٹر سے بات کراؤ گے؟''

معاً کلرک کے چہرے سے یک لخت مسکراہٹ غائب ہوگئی، اس کے چہرے پر تعجب کے تاثرات ظاہر ہوئے۔ میں کسی حد تک چونکنا ہوگئی، لیکن کچھ سمجھ نہ سکی۔

''میڈم! شاید آپ ان کی دوست ہیں... تاہم میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ مسٹر پورٹر اب اس دنیا میں نہیں ہیں... تین ہفتے قبل وہ ٹاپ فلور سے کود گئے تھے۔''

مکافات

اقبال کاظمی

گرد و پیش میں جنم لینے والے واقعات سے جڑی، ایک چشم کشا کہانی

دولت قتل کے سوا ہر جرم کی سزا سے بچا سکتی ہے... جب ہوس زر کے عارضے میں مبتلا والدین کی یہ سوچ ہو اور وہ یہی خیال اولاد کے ذہن میں بھی راسخ کردیں تو سلامتی کے راستے جرم کے اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں... یہ ہوتا آیا ہے کہ بچے اپنے بڑوں سے دو ہاتھ، بلکہ آج کے دور میں چار ہاتھ آگے ہوتے ہیں... اس نے بھی یہی سوچا کہ باپ بزدل تھا، اس زرگزیدہ معاشرے میں اپنے پیسے کی صحیح طاقت کو آزمانے کی ہمت نہ کرسکا... جب ہر جرم کا مول چکایا جا سکتا ہے تو انسانی خون کا کیوں نہیں... اس نے یہ سوچا اور پیش قدمی کر بیٹھا...

بہت عرصہ پہلے روڈنی کے باپ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ قتل کبھی نہیں چھپ سکتا۔ قاتل کتنا بھی ذہین کیوں نہ ہو، قانون کی گرفت میں آہی جاتا ہے۔

روڈنی کو جب بھی اپنے باپ کی کہی ہوئی یہ بات یاد آتی، اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آجاتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کا باپ بہت ذہین آدمی تھا۔ یہ اس کی ذہانت ہی تھی کہ اس نے اپنے گرد دولت کے انبار جمع کرلیے تھے اور اس کا شمار امیر ترین لوگوں میں ہوتا تھا لیکن جہاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

تک قتل اور قاتل کا مسئلہ تھا تو روڈنی کے خیال میں اس کا باپ اس سلسلے میں قطعی ناتجربہ کار تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر عمدہ پلاننگ کی جائے تو قتل کا مجرم بھی قانون کی نظروں میں دھول جھونک کر صاف بچ نکلتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل جب روڈنی کے باپ کا حرکتِ قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا تو اس کی کروڑوں کی جائداد اور دولت اس کے نام ہوگئی۔ اب روڈنی اس ملک کا امیر ترین آدمی تھا۔ معدنیات کی لاتعداد کانیں اور ملیں اس کی ملکیت تھیں۔ گورنر اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا اور جب وہ کسی عوامی تقریب میں مدعو ہوتا تو شہر کا میئر اس کے پیچھے پھرتا۔

روڈنی کا خیال تھا کہ اس جیسے معزز آدمی کو کسی جرم کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ سزا دینا تو درکنار، اگر اس نے کوئی جرم کیا بھی ہو تو قانون کے محافظ اس کے خلاف کسی خیال کا اظہار کرنے کی جرأت بھی نہیں کرسکتے اور کوئی بڑے سے بڑا عہدے دار بھی روڈنی جیسے آدمی کے راستے میں آنے کی حماقت نہیں کرسکتا۔

روڈنی نے میز کی دراز کھول کر اعشاریہ چار پانچ کا وہ آٹومیٹک ریوالور نکال لیا جو آج سے تقریباً دو سال پہلے اس نے خود حفاظتی کے خیال سے سونیا کو تحفے کے طور پر دیا تھا۔ یہ ریوالور دراز میں جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ دو سال کے اس عرصے میں شاید اسے چھو کر بھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ ریوالور کو چیک کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے سونیا اس ریوالور کو اب تک بھول چکی ہو۔ اب اسے یہ سوچ کر ہی ہنسی آرہی تھی کہ اس نے سونیا کو یہ ریوالور حفاظت کے لیے دیا تھا جبکہ اب اسی ریوالور سے وہ اس کی جان لینے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

''کیا کررہے ہو روڈنی؟'' سونیا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم اب پہلوتہی کی کوشش کررہے ہو لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کرلینا چاہیے۔ میں اسی وقت تصفیہ چاہتی ہوں۔''

''کیوں نہیں ڈارلنگ۔'' روڈنی مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

یہ اپارٹمنٹ قیمتی سازوسامان سے آراستہ تھا۔ اس میں رکھی ہوئی ایک ایک چیز اتنی قیمتی تھی کہ کوئی عام آدمی اس کے حصول کے لیے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ سونیا آرام دہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر نظر آنے والا ریشمی گاؤن بھی پانچ سو ڈالر سے کم مالیت کا نہیں تھا۔ وہ خاموش بیٹھی روڈنی کو اپنی طرف آتے دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں روشنی نمایاں تھی۔

''کیوں نہیں ڈارلنگ۔'' روڈنی اس کے سامنے رک گیا۔ ''میں بھی چاہتا ہوں کہ معاملہ ابھی اور اسی وقت طے کر لیا جائے۔''

یہ کہتے ہوئے روڈنی نے کمر کے پیچھے چھپا ہوا ہاتھ سامنے کرلیا۔ ریوالور کی نال کا رخ سونیا کے دل کی طرف تھا اور فاصلہ دو فٹ سے زیادہ نہیں تھا اس سے پہلے کہ سونیا کچھ سمجھ سکتی، روڈنی نے ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کے دل کو چیرتی ہوئی جسم سے نکل کر صوفے کی پشت گاہ میں پیوست ہوگئی۔ سونیا کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ ایک لمحے کو وہ آگے کو جھکی، پھر صوفے کی پشت سے ٹک گئی۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ سکڑ گئے اور آنکھیں پھیل گئیں۔

''ایک اور مائی ڈیئر۔'' روڈنی نے یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر ٹریگر دبا دیا۔ دوسری گولی پہلے نشان کے بالکل قریب لگی۔ اگرچہ روڈنی جانتا تھا کہ دوسرا فائر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن یہ شاید اس شدید نفرت کا ردِعمل تھا جو وہ سونیا سے محسوس کررہا تھا۔

روڈنی کو یاد نہیں آرہا تھا کہ کس منحوس گھڑی میں اسے اس عورت سے محبت ہوگئی تھی۔ لیکن بہرحال یہ طے شدہ بات تھی کہ وہ اس کی زلف کا شکار تھا اور شروع میں اس نے سونیا کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزارا تھا۔ اب دس سال بعد بڑی شدت سے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی حماقت تھی۔ سونیا سے خفیہ شادی کو اب وہ اپنی جوانی کی بھول قرار دے رہا تھا۔ یہ شادی اگرچہ قانونی ہی تھی لیکن ملک سے باہر انجام پائی تھی جسے اب تک یہاں خفیہ ہی رکھا گیا تھا۔

باپ کے مرنے کے بعد ساری جائداد اس کے نام منتقل ہوگئی تو اسے اپنی اس حماقت کا احساس ہونے لگا۔ وہ سونیا سے نجات حاصل کرکے کسی ہم پلہ عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے سونیا سے بھی بات کی تھی کہ وہ ملکی قانون کے تحت اسے طلاق دے دے تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق دوسری شادی کرسکے لیکن سونیا نے بیدردی سے اس کی خواہش کو ٹھکرا دیا تھا۔

روڈنی کو پہلے تو یقین نہیں آیا کہ سونیا ایسا سخت رویہ بھی اختیار کرسکتی ہے۔ روڈنی کو جائداد حاصل کرنے کے لیے اپنے باپ کی موت کا انتظار تھا اور اس دوران سونیا بھی بڑے صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتی رہی تھی۔ اس نے کبھی روڈنی سے کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ وہ جو کچھ لاکر دیتا، اسے مسکرا کر قبول کرلیتی اور اس کے بدلے وہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کردیتی۔

اس سلسلے میں روڈنی کا خیال یہ تھا کہ سونیا اس بات سے خوف زدہ تھی کہ ان کی شادی کا انکشاف ہوتے ہی اس کا باپ سونیا کو نکال باہر کرے گا۔ اسی لیے وہ خاموشی سے کسی مطالبے کے بغیر اس سے نباہ کررہی تھی۔ اس طرح اس کا یہ بھی مقصد تھا کہ اس کی پوزیشن مضبوط ہوجائے گی اور وقت آنے پر روڈنی یا اس کا باپ آسانی سے اس سے پیچھا نہ چھڑا سکیں گے۔

''تم بھول گئی تھیں ڈارلنگ کہ میں بھی اپنے باپ ہی کا بیٹا ہوں۔'' وہ لاش کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

روڈنی چند لمحے خاموشی سے لاش کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ریوالور پر سے اپنی انگلیوں کے نشان صاف کرکے ریوالور لاش کے دائیں ہاتھ میں تھما دیا اور ہر لحاظ سے اطمینان کرنے کے بعد ریسیور اٹھا کر پولیس ہیڈکوارٹر کے نمبر ڈائل کیے۔ ڈیسک سارجنٹ نے جب کال ریسیو کی تو روڈنی نے گلوگیر لہجے میں اسے اس سانحے کی اطلاع دی اور پولیس کو جائے وقوعہ پر پہنچنے کی درخواست کی۔

سونیا کو قتل کرنے سے پہلے وہ کئی ماہ تک اس منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا تھا۔ بالآخر جب اسے یقین ہوگیا کہ اس کے منصوبے میں کوئی جھول نہیں تو اس نے آج ہی اس پر عمل کرڈالا۔

روڈنی جس پوزیشن کا مالک تھا، اس کے پیش نظر اسے اس واردات کو چھپانے یا راہِ فرار اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے پاس بے پناہ دولت تھی۔ دولت میں اتنی طاقت تھی کہ قانون کا..... بڑے سے بڑا محافظ بھی اس پر کوئی الزام عائد کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ بالفرض اگر وہ گرفتار ہو بھی جائے تو جیل کی کوٹھری میں رہتے ہوئے بھی کسی..... ملازم کو اس کے عہدے سے برطرف کروا سکتا تھا ایسی صورت میں اگر اس کے دل میں انتقام کا جذبہ پیدا ہوجاتا تو وہ جج جیوری اور قانون کے تمام محافظوں کو چیونٹی کی طرح مسل سکتا تھا۔ روڈنی کو اپنی طاقت پر بجا طور پر فخر تھا اور دوسرے لوگ بھی اس کی اس طاقت سے آگاہ تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اسے سزا دینے کے بجائے اس کے سامنے بچھ جائیں گے اور اپنی زیادتی کی معافی مانگتے ہوئے اسے باعزت طور پر رخصت کردیں گے۔

اطلاع ملنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ہومی سائڈ ڈویژن کے انچارج کیپٹن کروز کی قیادت میں پولیس کا دستہ پہنچ گیا۔ روڈنی کے خیال کے مطابق پولیس چیف خود اس لیے نہیں آیا تھا کہ اخبارات اس واقعے کو غیر معمولی

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

اہمیت دے کر اچھالیں گے جس سے روڈنی کی نیک نامی متاثر ہوگی۔ اس دستے میں دو لیفٹیننٹ، چھ سراغ رساں اور بڑی تعداد میں ریڈیو، اخبارات اور ٹی وی کے نمائندے شامل تھے۔

ان کی آمد پر جب روڈنی نے دروازہ کھولا تو اس کے چہرے پر نہ تو خوف کے تاثرات تھے اور نہ ہی وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس کے برعکس وہ کچھ افسردہ سا لگ رہا تھا جیسے اس سانحے سے اسے گہرا صدمہ پہنچا ہو۔

"یہ بہت افسوسناک واقعہ ہے آفیسر! سونیا نے یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے کیا کہ میں اسے روک بھی نہ سکا۔" روڈنی نے پولیس افسر کو بتایا۔ وہ تقریباً آدھا گھنٹے تک نپے تلے الفاظ میں انہیں تفصیلات سے آگاہ کرتا رہا۔ اس کے بیان کے مطابق سونیا اس کی بیوی تھی اور محض اس کی وجہ سے وہ خودکشی پر مجبور ہوئی تھی۔

"میں اس سے طلاق چاہتا تھا۔" اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ "ہم کئی ہفتوں سے اس سلسلے میں گفت و شنید کر رہے تھے لیکن وہ بڑی سختی سے میرے مطالبے کو مسترد کرتی رہی۔ میرے خیال میں وہ صرف میری دولت کی وجہ سے طلاق نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اسے بڑی رقم کی پیشکش کی تھی لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ میری بات کو اس شدت سے محسوس کرے گی۔"

"یقین کرو آفیسر! مجھے قطعی یقین نہیں تھا۔" وہ خاموش ہو کر سونیا کی لاش کی طرف دیکھنے لگا اور جب دوبارہ بولا تو لہجے میں قدرے رقت تھی۔

"اس نے ریوالور صوفے کے کشن کے نیچے چھپا رکھا تھا جبکہ عام طور پر یہ میز کی دراز میں پڑا رہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے طے کر چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ آج جب ایک بار پھر طلاق کے موضوع پر بات ہوئی تو اس نے فوراً ہی کشن کے نیچے سے ریوالور نکال کر اپنے آپ کو ختم کر لیا، بالکل اسی طرح۔" اس نے خاموش ہو کر لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں، بالکل اسی طرح۔" ایک لیفٹیننٹ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

کورونر کا ایک اسسٹنٹ سونیا کی لاش پر جھکا ہوا تھا۔ وہ سیدھا ہو کر کیپٹن کو اشارہ کرتے ہوئے ایک طرف لے گیا۔ فوٹوگرافر موقع سے فائدہ اٹھا کر بڑی پھرتی سے تصویریں کھینچنے لگے۔ روڈنی بے پروائی سے کھڑا رہا۔ اسے یقین تھا کہ اپنے رسوخ سے کام لے کر وہ تصویروں کی اشاعت رکوا دے گا۔ اسے کسی معاملے میں ذرا سی بھی پر[illegible] نہیں تھی۔ اس نے بڑی خوب صورتی سے منصوبہ بنایا تھا۔ اس پر زیادہ سے زیادہ یہ الزام عائد ہو سکتا تھا کہ اس نے سونیا کو خودکشی پر مجبور کیا تھا لیکن اس الزام کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اسے اب تک قتل کے شبہ کے الزام میں گرفتار کیا جا چکا ہوتا۔ لیکن وہ روڈنی تھا۔ شہر کا امیر ترین سب سے بارسوخ آدمی۔ لیکن جب کیپٹن کروز اس کے قریب آن کھڑا ہوا تو اسے کیپٹن کے کہے ہوئے الفاظ پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے جناب!" کیپٹن بولا۔ "آپ کو ہمارے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر چلنا پڑے گا۔ میں آپ کو قتل کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔"

"یہ ناممکن ہے کیپٹن۔" روڈنی نے اسے گھورا۔ "میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ یہ خودکشی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے اپنے آپ پر گولی چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"آپ کی بات پر یقین نہیں کیا جا سکتا جناب۔" کیپٹن نے جواب دیا۔

"کیوں یقین نہیں کرتے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے خودکشی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں فلیٹ میں اکیلا تھا۔ کوئی مجھ پر الزام عائد نہیں ....."

"آپ کا بیان ہی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ خودکشی کی نہیں، قتل کی واردات ہے۔ آپ نے ہمیں اطلاع دے کر گویا اپنے آپ کو سزا کے لیے تیار کر لیا ہے۔" کیپٹن بولا۔

"میں سمجھا نہیں کیپٹن۔" روڈنی نے اسے گھورا۔

"اعشاریہ چار پانچ کے ریوالور سے کوئی بھی اپنے آپ کو دو مرتبہ گولی نہیں مار سکتا جناب! اس ریوالور کی پہلی گولی ہی موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ بالفرض وہ فوری طور پر نہ بھی مرے تو زخمی حالت میں اپنے آپ پر دوسری گولی نہیں چلائی جا سکتی۔ سونیا کے جسم پر دو گولیوں کے نشان ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے خودکشی نہیں کی ....."

روڈنی کو کیپٹن کی آواز کسی گہرے کنویں کی تہ سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اب وہ سونیا کی موت کو خودکشی قرار دینے پر اصرار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب اس کی ساری دولت بھی اسے سزا سے نہیں بچا سکتی۔ اس نے فوٹوگرافروں کی طرف دیکھا جو اب بڑی تیزی سے اس کی تصویریں اتار رہے تھے۔

خوش نصیب

سلیم انور

بعض اوقات غلط جگہ... اور غلط وقت پر ان لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے جن سے ملنا کسی طور ضروری نہیں ہوتا... وہ اس بہر ملاقات پر مجبور تھی... اس ادھوری ملاقات نے اپنوں میں چھپے دشمن اور دشمنوں میں چھپے سچے ہمدرد کا پُر درد انکشاف کر دیا تھا۔

بدقسمتی اور خوش نصیبی کے درمیان حائل رکاوٹ کو عبور کرنے والی عورت کا بروقت اقدام...

میں اپنے مقابل بیٹھے ہوئے شخص کو گہری نظر سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے بال سیاہ لیکن کنپٹیوں پر لٹیں خاکستری تھیں۔ اس کی ناک عقاب کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ چہرہ دبلا پتلا تھا۔ اس نے قیمتی، نفیس سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ سوٹ کی رنگت گرے تھی اور اس کا کپڑا اقدامت پسندانہ تھا۔

وہ جاننا چاہتا تھا کہ میں اس کے پاس کیوں آئی ہوں۔

"میرے شوہر جیری کی موت کو ایک ماہ سے زیادہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

..... عرصہ نہیں گزرا۔" میں نے بتایا۔ "اسے چاقو کے وار سے ہلاک کیا گیا تھا۔ وہ ہمارے اسٹور کو بند کرنے کے بعد گھر واپس آرہا تھا کہ اس پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔"

ڈاکٹر آئیوان گریگری نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "ایک پُرتشدد موت ہمیشہ پریشان کن ہوتی ہے لیکن تمہارا کہنا ہے کہ تمہیں نیند نہیں آتی۔ تم کھا پی بھی نہیں رہی ہو۔"

میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"تمہیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ تم جس تجربے سے گزری ہو، یہ اس کے نارمل ری ایکشنز ہیں۔ تمہیں اس صدمے سے سنبھلنے میں کچھ وقت درکار ہوگا۔ رنج و غم کے اپنے درجات ہوتے ہیں۔" ڈاکٹر نے پُرتشفی لہجے میں کہا۔

"لیکن جیفری کو قتل کیا گیا ہے۔ کسی نے جان بوجھ کر اس کو اس کی زندگی سے محروم کیا ہے۔ کیا آپ مجھے سمجھا سکتے ہیں کہ اس قسم کی صورتِ حال میں، میں خود پر کس طرح قابو رکھ سکتی ہوں؟" میں نے اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر گریگری کے ہونٹوں پر ایک دلاسا دینے والی مسکراہٹ ابھر آئی۔ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ قتل ایک ایسا فعل ہے جو حالات اور کیفیات کو پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ اس لیے تم جو کچھ محسوس کر رہی ہو، وہ بلاشبہ جذبات کے حاوی ہونے کے مترادف ہے۔ لیکن اگر تم کوشش کرنے اور مطلوبہ وقت دینے کی خواہش مند ہو تو تمہاری صحت بحال ہو سکتی ہے۔ تم نے قتل کی بات کی ہے..... تو ابتدا اس بات سے کرتے ہیں کہ تم اپنے شوہر کے قاتل کے بارے میں کیا محسوس کرتی ہو؟"

"جیفری کی عمر صرف چونتیس برس تھی۔ ہم ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ہم اپنی فیملی کا آغاز کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ آپ کے خیال میں مجھے کیا محسوس کرنا چاہیے؟" میں نے الٹا سوال کر ڈالا۔

"ان حالات میں غصہ ایک نارمل کیفیت ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قاتل ابھی تک پکڑا نہیں گیا۔ یہی بات ہے نا؟"

"ہاں!" مجھے اپنی ہی آواز اپنے کانوں میں تناؤ زدہ سی محسوس ہوئی۔ "یہ فعل جس نے بھی کیا ہے، وہ ابھی تک آزاد گھوم رہا ہے۔ اور اس کا جو بھی جی چاہے گا، کرتا پھرے گا۔"

"اور یہ بات تمہارے لیے پریشان کن اور تشویش کا باعث ہے؟" ڈاکٹر نے جاننا چاہا۔

میں ڈاکٹر گریگری کی جانب آگے کی طرف جھک گئی جو اپنی چوڑی سیاہ ٹیک کی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ "یقیناً ایسا ہی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ قاتل کو ڈھونڈ نکالا جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ جب جیوری اپنا فیصلہ سنائے تو میں اس وقت عدالت میں بیٹھی ہوئی ہوں۔ میں قاتل کو فیصلے پر پیچ و تاب کھاتے دیکھنا چاہتی ہوں جب اسے یہ پتا چلے کہ میرے شوہر کی جان لینے کی اسے کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی۔"

"میں سمجھ گیا۔" ڈاکٹر گریگری نے اپنے نوٹ پیڈ پر چند نوٹس تحریر کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس کی نگاہیں دوبارہ میرے چہرے پر جم گئیں۔ "آن لائن ایسی بہت سی ویب سائٹس ہیں جو اس معاملے میں تمہاری مدد کر سکتی ہیں۔ ایسی جگہیں ہیں جہاں مقتول کے پسماندگان اپنی اپنی داستانیں ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کر سکتے ہیں۔ کیا تم نے ان کے بارے میں سنا ہے؟"

"حقیقت میں تو سنا ہے۔" میں نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "حتیٰ کہ میرے پاس ان کی ایک فہرست بھی ہے۔ ان ویب سائٹس کو میری ماں نے ڈھونڈا تھا لیکن میں نے ان کا دیا ہوا وہ کاغذ کسی دراز میں رکھ دیا تھا اور اس کے بعد میں نے اسے دیکھنا تک گوارا نہیں کیا۔"

"کیا تم نہیں سمجھتیں کہ ایسی کسی ویب سائٹ پر جانا تمہارے لیے مددگار ثابت ہو سکتا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے کہا پھر سرگوشی کے انداز میں گویا ہوئی۔ "مجھے یقین نہیں کہ میں یہ جاننا چاہتی بھی ہوں کہ نہیں۔"

"تمہیں اپنے غصے اور کیفیت کو برقرار رکھنے میں لطف آتا ہے؟" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"شاید۔" میں نے اعتراف کیا۔ "کم از کم اس طرح مجھے کچھ محسوس تو ہوتا ہے۔"

"مسز جیفری! میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے جذبات کو گہری ٹھیس پہنچی ہے اور احساسات مجروح ہیں لیکن اس دروناک گھڑی میں تم تنہا نہیں ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں اپنے دوستوں اور اپنی فیملی کا پیار اور ہمدردیاں حاصل ہوں گی اور مجھے یقین ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ تم روبہ صحت ہو سکتی ہو۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ یہ آسان ہوگا لیکن مجھے مکمل بھروسا ہے کہ تم اپنی زندگی کو دوبارہ تشکیل دے سکتی ہو۔ اب اس وقت تمہارا کام یہ ہے کہ خود کو اس بات پر قائل کرو کہ تمہاری اپنی ذات بھی اہمیت رکھتی ہے۔" ڈاکٹر گریگری کا لہجہ شفقت سے لبریز تھا۔

میں نے تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے ان آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی جو میری آنکھوں میں بھر آنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔

ڈاکٹر نے میری اندرونی کیفیت بھانپ لی۔ "وہ لمحے تک خاموش رہا پھر ہلکے سے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "اور پولیس نے تمہارے شوہر کی موت کے بارے میں تمہیں کیا بتایا تھا؟"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "پولیس نے بہت کم بتایا تھا۔ انہوں نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ جیفری کے بٹوے میں موجود رقم اور کریڈٹ کارڈز کو چھوا تک نہیں گیا تھا۔ لہٰذا بظاہر یہ ڈکیتی کی واردات نہیں تھی اور ان کا کہنا تھا کہ اس کے جسم پر مدافعانہ زخموں کے نہ ہونے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاید وہ حملہ آور سے واقف رہا ہوگا۔"

"تمہاری بات سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ تم پولیس کی باتوں سے غیر معمولی طور پر متاثر نہیں ہو۔"

میں نے شانے اچکا دیے۔ "اب میں ایک چھوٹے شہر میں رہ رہی ہوں۔ ہمارے یہاں قتل کی زیادہ وارداتیں نہیں ہوتیں۔ مجھے شبہ ہے کہ ان سراغ رسانوں کو اس قسم کے کیسز حل کرنے کا کوئی زیادہ تجربہ رہا ہوگا۔"

"تم سمجھتی ہو کہ یہاں کی پولیس اس سلسلے میں زیادہ بہتر کارکردگی دکھا سکتی ہے؟"

"شاید۔ وہ لوگ کہیں زیادہ پیشہ ور ہیں یا کم از کم ان کے زیادہ ذرائع ہیں۔ میرا تو یہی خیال ہے۔"

ڈاکٹر گریگری نے اب بات کا رخ بدل دیا۔ "قتل کے کیس میں پولیس اکثر میاں یا بیوی پر شک کرتی ہے۔ کیا انہوں نے تمہارے ساتھ ایسا کوئی طرزِ عمل اختیار کیا تھا؟" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک آہ بھری۔ "ہاں اس بات پر مجھے ان کی جانب سے خاصی توجہ حاصل رہی تھی۔"

"تمہیں یہ سب کیسا محسوس ہوا؟ کیا اس بات نے تمہیں خوف زدہ کر دیا تھا؟ یہ امکان کہ پولیس کو مغالطہ بھی ہو سکتا ہے؟ یہ کہ وہ غلطی سے قتل کا الزام تمہارے سر دھر سکتے ہیں؟" ڈاکٹر گریگری نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

"نہیں۔ مجھے یہ سب پاگل پن لگا کہ انہوں نے اس قسم کی فضول باتوں میں اتنا وقت ضائع کیا لیکن میں یہ واضح کر دوں کہ جیفری کی موت کے وقت میری جائے واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت موجود تھا اور پولیس اپنے کام میں اس پہلو کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کرتی۔" میں نے بتایا۔

"تم اس وقت کہاں تھیں؟"

"میں چودہ دیگر خواتین کے ساتھ ملے جلے سامان کے ایک نیلام کے اہتمام میں مصروف تھی۔ ہم نیلامی کی اشیا کو سیٹ کر رہے تھے۔ ہم نے اپنا کام سہ پہر کے بعد شروع کیا تھا۔ پھر چھ بجے کے قریب جو کچھ میسر تھا، اس کے ساتھ ڈنر کیا اور پھر رات گئے تک کام کرتے رہے تھے۔"

"تو پھر تمہارے شوہر کو کس وقت قتل کیا گیا تھا؟"

"پانچ بجے کے کچھ دیر بعد۔ جیفری کو اسٹور سے گھر تک پہنچنے میں لگ بھگ صرف چھ منٹ لگتے تھے۔ لہٰذا بظاہر یہ واردات اس کے اسٹور بند کرنے کے کچھ ہی دیر بعد رونما ہوئی تھی۔ اس کی لاش پارک میں لگ بھگ چھ بجے کے قریب دریافت ہوئی تھی۔" میں نے یہ کہہ کر سر کو ایک جھٹکا دیا۔ "وہ ہمیشہ اسٹور سے گھر آنے کے لیے اسی پارک کے راستے کا انتخاب کرتا تھا۔ میں اسے کئی بار ہوشیار کر چکی تھی کہ وہ ایک ویران راستہ ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ بہتر ہوگا وہ اسٹور آنے جانے کے لیے کار استعمال میں لائے لیکن اس نے میری اس بات پر کبھی دھیان نہیں دیا۔"

ڈاکٹر گریگری نے میز پر ہاتھ بڑھاتے ہوئے ایک کتاب میری جانب کھسکا دی۔ "مسز جیفری! میں تمہیں اس کتاب کی ایک کاپی دے رہا ہوں جس میں ماتم گزاری کے درجات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس میں بہترین طریقے سے بتایا گیا ہے کہ تمہاری توقعات کیا ہونی چاہئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کتاب کو پڑھو۔ میں اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا کہ ہماری ملاقات کی اگلی نشست سے قبل تم اسے ختم کر ڈالو لیکن تم ایک اچھے طریقے سے اس کتاب کے مطالعے کا آغاز کر دو۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم مقتول کے پسماندگان کی ویب سائٹس کو ضرور تلاش کرو۔ اس فہرست کی جانچ کرو جو تمہاری ماں نے تمہیں دی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں پر موجود داستانیں تمہاری تسکین کا باعث بن جائیں اور پھر شاید خوش قسمتی سے تمہیں کچھ امید، کچھ حوصلہ بھی حاصل ہو جائے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر گریگری شفقت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔

☆☆☆

اس سہ پہر جب میں واپس ممی کے اپارٹمنٹ پہنچی تو وہ اس وقت لیونگ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

ممی نے ہی مجھے ڈاکٹر گریگری کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ گزشتہ کئی برسوں سے ان کی بہترین سہیلی کا تھراپسٹ رہا تھا اور کامیابی سے اس کا علاج کر رہا تھا۔

"تمہارا سیشن کیسا رہا؟" ممی نے سوال کیا۔

میں نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہی رہا۔" میں نے اپنا کوٹ اتار کر قریب ترین کرسی کے بازو پر لٹکا دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کیا تم نہیں سمجھتیں کہ وہ تمہاری مدد کر پائے گا؟" ممی نے جاننا چاہا۔
"یہ بتانا ابھی قبل از وقت ہوگا۔ البتہ اس کا رویہ بے حد عمدہ اور شفقت سے بھرپور تھا۔ میں دیکھتی ہوں کہ آگے کیا ہوتا ہے۔"
"کیا تمہیں بھوک لگی ہے؟"
"ابھی تو نہیں محسوس ہو رہی۔"
"تو پھر چائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
"ہاں، وہ پی لوں گی۔"
ممی کچن کی جانب چل دیں۔ میں نے میز کے نیچے سے ایک کرسی کھینچی اور اس پر بیٹھ گئی۔ میری نظریں بڑی سی سیاہ کھڑکی سے باہر چلی گئیں اور میں سڑک پر لگی روشنی میں گردش کرتے ہوئے برف کے گالوں کو دیکھنے لگی۔
ممی کی نگاہوں نے میری نظروں کا تعاقب کیا اور پوچھا۔ "کیا باہر موسم طوفانی ہے؟"
"زیادہ بہتر نہیں ہے۔"
"سڑکوں کا کیا حال ہے؟"
"ان پر پھسلن ہو رہی ہے۔"
"پھر تو تمہیں وقت پر اسٹیشن پہنچنے کے لیے گھر سے ذرا جلدی نکلنا ہوگا۔" ممی نے کہا۔
"یہ بات میرے ذہن میں ہے۔"
"تم نے ڈاکٹر گریگری سے رابطہ کر کے صحیح قدم اٹھایا ہے۔" ممی نے چائے کے لیے برقی کیتلی میں پانی ڈالتے ہوئے کہا۔
میں نے گہرا سانس لیا۔ "ڈاکٹر گریگری نے مجھے پڑھنے کے لیے ایک کتاب دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں سوگ کے مرحلے..... تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔"
"انہوں نے اس بارے میں بالکل صحیح کہا ہے۔ سوگ بھی ایک قدرتی عمل ہے جس کے مدارج ہیں۔ تمہیں اس کے تمام مراحل سے گزرنا ہوگا۔ اس کا کوئی مرحلہ تم سے چھوٹ نہیں سکتا۔ یہ ان مراحل سے عین مطابقت رکھتا ہے جن سے میں اس وقت گزر چکی ہوں جب تمہارے باپ نے مجھے طلاق دی تھی اور میں ....."
پھر وہی طلاق کی باتیں ـــــ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ممی کو ذہن سے نکال دیا۔ ڈیڈی انہیں چھ سال قبل چھوڑ کر چلے گئے تھے اور تب سے میں تقریباً روزانہ ہی خودغرضی اور مفاد پرستی کے اس فعل کا دکھڑا سنتی چلی آ رہی تھی۔ ممی نے آگے بڑھنے کے لیے صرف چند ہی اقدامات کیے تھے۔ مایوسی کی اس کیفیت سے نکلنے کے لیے ان کی تمام کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوئی تھیں۔
میں نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے ان غیر تسلی بخش خیالات کو ذہن سے نکال دیا۔
اس دوران میں ممی چائے لے آئیں۔ چائے خاصی گرم اور تیز تھی اور اس کے پینے کے بعد مجھ میں چستی اور توانائی آ گئی جس کی مجھے اس وقت اشد ضرورت تھی۔ اسٹیشن روانہ ہونے کے لیے میرے پاس ابھی آدھ گھنٹے کا وقت تھا۔ یہ وقت میں نے ممی کے ساتھ غیر معمولی گپ شپ میں گزار دیا۔ اس دوران میں میری ماں کا رویہ بے حد ہمدردانہ اور تسلی بخش رہا تھا لیکن اس کے باوجود اب میں ہمارے درمیان پہلی سی قربت محسوس نہیں کرتی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ میرے ماضی سے بندھی ہوئی ہیں۔ وہ ماضی جو ناقابلِ بازیاب ہو چکا تھا۔
اور مجھے بھی کوئی آئیڈیا نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہی ہوں۔
بہرحال جب اس شب میں ٹرین اسٹیشن پہنچی تو وہاں خاصی بھیڑ تھی۔ ٹریفک جیسے رینگ کر چل رہا تھا۔ ٹرین کے روانہ ہونے میں کچھ ہی وقت باقی رہ گیا تھا۔ میں مسافروں کے ازدحام میں اپنے شانوں سے راستہ بناتی تیزی سے آگ بڑھ رہی تھی۔ کرسمس کا تہوار سر پر تھا۔ یہ بھیڑ بھاڑ اسی وجہ سے تھی۔ نارمل سفر کرنے والے کاروباری مسافروں کے ساتھ بوڑھوں اور بچوں پر مشتمل خاندان بھی کرسمس کی خریداری کے لیے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔
جب میں اپنے ڈپارچر گیٹ تک پہنچی تو رش کافی چھٹ چکا تھا۔ آگے موجود ایک کنڈیکٹر نے مجھے فوراً ٹرین میں سوار ہو جانے کا اشارہ کیا۔
اپنا سامان اوور ہیڈ ریک پر جمانے کے بعد میں اس امید کے ساتھ کھڑکی والی نشست پر بیٹھ گئی کہ میری برابر والی سیٹ خالی رہے اور کوئی دوسرا میرے برابر آ کر نہ بیٹھے۔ لیکن حسبِ معمول قسمت نے مجھ پر یہ مہربانی بھی کرنا گوارا نہیں کی۔
اور اس سے قبل کہ میں اپنے کوٹ کے بٹن کھولنے کا عمل مکمل کر پاتی، مجھے اپنے برابر سے ایک عورت کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔ "ارے، اینجلا ..... یہ تم ہو! میں تو یہاں تمہاری موجودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیا ونڈرفل سرپرائز ہے۔"
میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو اپنی نظروں کو

گلوریا کے چہرے پر مرکوز پایا۔
گلوریا ہائی اسکول کے دنوں میں جیفری کی محبوبہ رہی تھی۔ یہ وہ حقیقت تھی جس کی سخت پریشان کر دینے والی تفصیل اس نے اس وقت میرے گوش گزار کی تھی جب ہم پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے ملے تھے اور اب وہ نشستوں کے درمیانی راستے میں کھڑی تھی۔ اس کا سیاہ رنگ کا کوٹ کھلا ہوا تھا اور اس کے لانبے سنہری بال جو ہوا سے بُری طرح بکھرے ہوئے تھے، اس کے انتہائی خوب صورت چہرے پر سایہ کیے ہوئے تھے۔
ہماری یہ مڈبھیڑ غلط جگہ پر اور غلط وقت میں ہو رہی تھی۔
"اس سیٹ پر کوئی بیٹھا ہوا تو نہیں ہے؟" گلوریا نے میرے ساتھ والی نشست کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
میں جھوٹ بولنا چاہتی تھی لیکن آخر میں، میں نے بس اتنا کہا۔ "یقیناً کوئی بیٹھا ہوا نہیں ہے۔"
"کیسی شاندار قسمت ہے۔" گلوریا نے سیٹ پر بیٹھنے کے بعد چند شاپنگ بیگ نشست کے نیچے کھسکا دیے پھر اپنا سیاہ کوٹ بھی اتار دیا۔
"کیا تم شاپنگ کر کے آ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔
"معمولی سی شاپنگ کی ہے۔ میں ونڈو شاپنگ سے زیادہ لطف اندوز ہوتی ہوں۔"
کرسمس کے سیزن میں بلیک فورڈ سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ٹرین کے ذریعے شہر کی رونقوں کا نظارہ کرنے کے لیے شکاگو آتی تھی۔
"اور تم؟" گلوریا نے مجھ سے پوچھا۔
"میں..... میں اپنی ماں سے ملنے کے لیے آئی تھی۔"
"اوہ، ہاں۔ تمہارا اصل تعلق تو شکاگو سے ہے نا؟"
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"مجھے امید ہے تب تو تمہارا دن بہت اچھا گزرا ہوگا۔"
مجھے گلوریا پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ یا تو اخلاقی طور پر بدھو تھی یا پھر جان بوجھ کر ظالمانہ طرزِ عمل اختیار کیے ہوئے تھی کیونکہ اس نے میرے نقصان یعنی میرے شوہر کی موت کے بارے میں ابھی تک کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا تھا۔
چونکہ میں اس کے رویّے کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھی، اس لیے میں نے اپنا چہرہ اپنے ہینڈ بیگ میں چھپاتے ہوئے تیزی سے ایک چھوٹی سی کتاب نکال لی۔
"مجھے امید ہے تم مائنڈ نہیں کرو گی۔" میں نے کہا۔ "دراصل میں اس کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی اور یہ ابھی آدھی پڑھنا باقی رہ گئی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے سیٹ پر پہلو بدلا اور اپنا رخ اس سے قدرے مخالف سمت کرتے ہوئے کتاب اپنے منہ سے لگا لی۔
چند لمحوں بعد ہماری بوگی کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور آہنی پہیوں کی چرچراہٹ سنائی دی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ ہماری ٹرین اسٹیشن سے چل پڑی ہے۔ میں نے رسک لیتے ہوئے ایک نگاہ گلوریا پر ڈالی۔ اس نے اپنا سر نشست کی پشت سے ٹکایا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ بظاہر سو رہی تھی یا سونے والی تھی۔
میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اپنا سر بھی نشست کی پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔
میں یقیناً گہری نیند میں تھی کیونکہ جو اگلی بات مجھے پتا چلی، وہ یہ تھی کہ گلوریا میرے بازو پر ٹہوکے لگا رہی تھی۔ میرے آنکھیں کھولنے پر وہ بولی۔ "ہم بس گھر پہنچنے ہی والے ہیں۔ میں نے تمہارے لیے کافی خریدی ہے۔"

شگوفے

ڈاکٹر: "آپ کے تین دانت کیسے ٹوٹ گئے؟"
مریض: "جی وہ بیوی نے کڑک روٹی بنائی تھی۔"
ڈاکٹر: "تو کھانے سے انکار کر دیتے۔"
مریض: "جی وہ ہی تو کیا تھا۔"

☆☆☆

(شادی شدہ دوستوں کے لیے ایک خوب صورت بات)
بیوی اگر غصہ کرنے لگے تو اس کو صرف اتنا کہہ دو۔
"بڑھاپے میں تو غصہ آ ہی جاتا ہے۔" آئندہ غصہ کرنے سے پہلے ایک بار ضرور سوچے گی۔

☆☆☆

شوہر: "تمہاری امی کی مذاق کرنے کی عادت نہیں گئی۔"
بیوی: "کیا کہہ دیا امی نے؟"
شوہر: "آج مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ میری بیٹی سے شادی کر کے خوش تو ہو نا؟"

(سید اکبر شاہ کا انتخاب)

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں حیرت سے کافی کے اس کپ کو دیکھنے لگی جو وہ میری جانب بڑھا رہی تھی۔

”تھینک یو۔“ میں نے اس کے غیر متوقع تحفے کو قبول کرتے ہوئے کہا۔

”چینی اور کریم کے پیکٹ بھی ہیں اگر تمہیں ضرورت ہو۔“ اس نے اپنا خالی ہاتھ اپنی پینٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”نہیں، شکریہ۔ میں سیاہ کافی ہی پینا پسند کروں گی۔“ میں نے تیزی سے ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا، پھر اپنا کپ سیلیوٹ کے انداز میں اس کی جانب اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری بڑی مہربانی۔“

”میری خوش نصیبی۔“ اس نے اپنے کپ میں پھونک مارتے ہوئے کہا۔ پھر میرے نزدیک کھسکتے ہوئے بولی۔ ”تم جانتی ہو، جیری اور میں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے؟“

”ہاں، ہائی اسکول کے دنوں میں۔ یہ بات تم بہت پہلے مجھے بتا چکی ہو۔“ میں نے جواب دیا۔

تب وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ ”تم سمجھی نہیں۔“

”ہاں، میں سمجھ رہی ہوں۔ جیری نے تمہارے ہائی اسکول کے رومانس کے بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔“

”اوہ، وہ۔“ گلوریا نے کہا اور ساتھ ہی کھنکھناتا ہوا ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”ٹھیک ہے، تم جلدی سے کافی پی لو۔ ہم تقریباً گھر پہنچ چکے ہیں اور باہر ٹھنڈ بھی بہت ہے۔“

اور پھر چند منٹ بعد ہماری ٹرین بلیک فورڈ کے اسٹیشن پر پہنچ کر رک گئی۔ گلوریا نے وقت کا بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا کیونکہ میں اپنی کافی ختم نہیں کر سکی تھی۔ ٹرین کے رکتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اوور ہیڈ ریک پر سے اپنا اوور نائٹ بیگ کھینچ کر اتار لیا۔ جب میں پلٹی تو دیکھا کہ گلوریا بھی اس دوران میں اپنی نشست کے نیچے سے اپنا شاپنگ بیگ نکال چکی تھی اور دنیا کی نظروں میں اچھے دوستوں کی طرح جو یقیناً ہم نہیں تھے، ایک ساتھ درمیانی راستے سے کمپارٹمنٹ کے دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔

پلیٹ فارم پر گلوریا نے مجھ سے پہلے قدم رکھا۔ جب میں نیچے اتر کر اس کے پاس پہنچی تو وہ پاگلوں کی طرح اپنے ہینڈ بیگ کے اندر کچھ ٹٹول رہی تھی۔

”لعنت ہو۔“ اس نے کہا۔ باہر کی ٹھنڈی یخ ہوا میں اس کی سانسیں سفید دھند کے مرغولے بنا رہی تھیں۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اپنی کار کی چابیاں یقیناً کار کے اندر لا[illegible] کر دی ہیں۔ یا تو یہ بات ہے یا پھر میں انہیں کہیں کھو [illegible] ہوں۔ وہ یہاں بیگ میں موجود نہیں ہیں۔“ اس نے بیگ آگے بڑھاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ پھر بیزاری کے اظہار کے طور پر بولی۔ ”کیا یہاں پر تمہاری کار موجود ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تب تم میرے ساتھ ایک مہربانی کرو گی..... کیا تم مجھے گھر تک لفٹ دے سکتی ہو؟ میرے پاس گھر پر اپنی کار کی فالتو چابیوں کا ایک سیٹ موجود ہے۔“

یقیناً یہ ایک ایسا سوال تھا جو میں اس عورت کے [illegible] سے ہرگز سننا نہیں چاہتی تھی۔ پہلے تو اس نے جیری کے ساتھ اپنی نوجوانی کے رومانس کی یاد دلاتے ہوئے خود کو لطف اندوز کیا تھا اور اب وہ مجھ سے ایک عنایت کی خواہاں تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لی لیکن آخر میں، میں اپنے اندر اتنا حوصلہ پیدا نہ کر سکی کہ اس کی خواہش کے جواب میں اسے یہ بتا سکتی کہ میں اس کے متعلق حقیقت میں کن خیالات کی حامل ہوں۔

”کیوں نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میری کار اس طرف ہے۔“ میں نے پارکنگ لاٹ کے آخری سرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا اور گھوم گئی۔

گلوریا میرے ساتھ قدم ملا کر چل رہی تھی۔

برف کے گالے میرے رخساروں پر چبھ رہے تھے۔ رات کے سناٹے اور یخ ہواؤں سے میرے جسم میں جھرجھری سی آگئی۔

”کیا ابھی مزید چلنا ہوگا؟“ گلوریا نے پوچھا۔

”نہیں۔ بس ہم پہنچ گئے ہیں۔“ میں نے سر کی جنبش سے اپنی کار کی جانب اشارہ کیا جو صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں نے ریموٹ کے ذریعے کار کے دروازے کھول دیے۔ ”تم چل کر اندر بیٹھو۔ میں اس پر جمی برف صاف کرتی ہوں۔“

”او کے۔“

میں نے ڈرائیور کی عقبی نشست پر سے برف صاف کرنے والا برش اٹھایا۔ اس دوران میں گلوریا کار میں بیٹھ چکی تھی۔ مجھے برش کو صرف چند مرتبہ چلانا پڑا اور کار پر سے تمام برف بالکل صاف ہو گئی۔ میں نے کار کی ہیڈ لائٹس اور ٹیل لائٹس دو مرتبہ چیک کیں پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اسنو اسکریپر عقبی نشست پر اچھال دیا۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد برف سے ڈھکی پارکنگ لاٹ سے اپنی کار باہر نکالتے ہوئے میں نے گلوریا سے پوچھا۔ ”تمہارا گھر کس طرف ہے؟“

”بائیں طرف چلو۔ میں گالف کورس کے ساتھ نئی ڈیولپمنٹ میں رہتی ہوں۔“

”آہ!“ میں سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ اس نئے ڈیولپمنٹ ایریا میں ابھی صرف چند مکانات ہی تعمیر ہوئے تھے۔ میں نے اپنی کار کی رفتار بڑھا دی اور سڑک پر رواں ٹریفک کے دھارے میں شامل ہو گئی۔ چونکہ رات خاصی ہو چکی تھی اس لیے ٹریفک کا رش زیادہ نہیں تھا۔

جب میں نے اپنی کار رائٹ لین پر ڈال دی تو گلوریا بولی۔ ”میں حاملہ ہوں۔ کیا تمہیں معلوم ہے؟“

”نہیں۔ حقیقت میں مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔“ میں حیران ہو رہی تھی، اس نے یہ کیونکر سوچا کہ مجھے اس بات کا علم ہوگا۔

تب گلوریا نے ایک تلخ قہقہہ لگایا۔ ”میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ اس حصے کو حذف کر دے گا۔“

”وہ؟“ میں نے پوچھا۔ ساتھ ہی دہشت کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑ سی گئی۔

”تمہارا ہر دلعزیز شوہر جیری۔“ گلوریا نے جواب دیا۔ ”تم کیا سمجھیں میری مراد کس سے ہے؟“

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ عورت ان لوگوں میں سے تھی جو دوسروں کو ایذا پہنچا کر تسکین حاصل کرتے ہیں۔

”کیا تمہارے کہنے کا مطلب ہے اس بچے کا باپ جیری ہے؟“ میں نے پوچھا۔

ساتھ ہی میں سوچنے لگی کہ وہ یہ بات اب مجھے کیوں بتا رہی ہے؟ میں حیرت میں تھی۔ آخر اس کا کیا مقصد ہے؟

گلوریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی۔ میرے برابر کی نشست پر بیٹھی ہوئی اس عورت کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنی گود میں تھے جنہیں اس نے مضبوطی سے دبوچا ہوا تھا۔ لیکن جس بات نے میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑا دی، وہ اس کے ہونٹوں کی جنبش تھی جو گزرتی ہوئی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ سے خاموش طول کلامی میں مصروف ہے۔

اب مجھے اس کے ذہنی توازن کے بارے میں واقعی شک محسوس ہونے لگا۔

میں نے خود کو ایک ذہنی جھٹکا دیتے ہوئے اپنی توجہ سڑک اور گزرنے والے ٹریفک پر مرکوز کر دی۔ برف اب بھی گر رہی تھی۔ میری کار کے پہیوں تلے سڑک اب بھی پھسلواں تھی۔ گلوریا بظاہر کسی قسم کی جذباتی اذیت میں گم تھی۔

کیا میں کار روک دوں؟ اس کو تسلی دینے کی کوشش کروں؟ یا کار ڈرائیو کرتی رہوں؟ جتنی جلدی ممکن ہو سکے اسے اس کے گھر پہنچا کر اس سے چھٹکارا حاصل کر لوں؟ میں اس کی رکھوالی نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی اس کا مجھ پر کوئی قرض تھا۔

”تم ابھی تک سمجھی نہیں..... ہے نا؟“ گلوریا نے اچانک پوچھا۔

”آئی ایم سوری، کیا نہیں سمجھی؟“

”کہ آج رات تم مرنے والی ہو۔ اسی طرح جیسے تمہارے شوہر کی موت واقع ہوئی تھی۔“

میرا منہ لٹک گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری شریانوں میں خون کی جگہ یخ پانی دوڑ رہا ہو۔ گلوریا مجھے قتل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟ اور یہ گلوریا ہی تھی جس نے جیری کو قتل کیا تھا؟

”کیوں؟“ میں نے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔ ”تم نے ایسا کیوں کیا؟“

”تم!“ اس کا لہجہ تلخ تھا۔ ”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ یہ تمہاری غلطی ہے کہ جیری کو مرنا پڑا اور اب تم بھی جلد ہی مر جاؤ گی اور یہ خون تمہاری گردن پر ہوگا..... میری نہیں۔“

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ میں اپنے دل کی تیز دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

”کیا تم نے کبھی یہ سوچا کہ مجھے ہلاک کرنا کوئی اچھا آئیڈیا نہیں ہے؟ اور اس سے تمہیں وہ حاصل نہیں ہوگا جو تم حاصل کرنا چاہتی ہو۔“ میں نے گلوریا کو اپنے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کیسی عجیب بات ہے۔ جیری نے بھی یہی کچھ کہا تھا۔ تم دونوں ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہو۔ تم دونوں ہی نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا تھا۔ تم دونوں جھوٹے ہو...... دونوں!“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”آئی ایم سوری لیکن میں سمجھی نہیں کہ تم کہنا کیا چاہتی ہو۔“

”اوہ، ہاں۔ بھلا تمہیں کیسے علم ہو سکتا ہے؟ تم تو اندھی تھیں کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا، تمہیں اس کا علم نہیں تھا۔ جب بات پابند ہونے کی آئی تو تمہارے

WWW.PAKSOCIETY.COM

مقدس شوہر نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے تمہاری آڑ لے لی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ تمہیں طلاق نہیں دے سکتا اور یہ کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود کہ میری کوکھ میں اس کا بچہ پرورش پا رہا ہے۔ حالانکہ اس سے چند لمحوں قبل وہ مجھ سے اپنی دائمی محبت کے دعوے کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے بتا رہا تھا کہ ہر وہ لمحے جب ہم جدا رہتے ہیں تو اسے کتنی اذیت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ احمق کہیں کا۔“

میری آنکھیں بھر آئیں اور آنسو میرے رخساروں پر بہنے لگے۔ میرا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور مجھے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ جیری نے اس عورت سے کہا تھا کہ وہ اس سے پیار کرتا ہے؟ وہ اسے چاہتا ہے؟ وہ اس کی جدائی میں تڑپتا ہے؟ وہ اس عورت کی کوکھ میں پرورش پانے والے بچے کا باپ ہے؟ اور پھر کیا وہ ہر رات خاموشی سے میرے پاس گھر آجایا کرتا تھا؟

کیا میں واقعی اس شخص کو جانتی تھی؟ میں سوچ میں پڑ گئی۔

”اسی لیے میں تمہیں قتل کرنے والی ہوں۔“ گلوریا نے کہا۔ اس کا لہجہ بھیانک تھا۔ ”کیونکہ میں صرف اور صرف اس کے لیے تھی اور اس نے آخر میں تمہاری طرف داری کرلی۔“

میں کن انکھیوں سے اس عورت کا جائزہ لینے لگی۔ وہ اب بھی اپنی نشست پر اکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ البتہ اس کے گالوں پر ابھی تازہ آنسوؤں کے بہنے کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔

لیکن جس چیز نے میری رگ و پے میں سنسنی سی دوڑا دی، وہ ایک چاقو تھا جو اس نے اپنے داہنے ہاتھ میں دبوچا ہوا تھا اور جس پر میری نگاہ اتفاقاً پڑ گئی تھی۔

یہ چاقو یقیناً اس نے اپنے پرس میں چھپا رکھا تھا۔ کیا وہ ابتدا ہی سے یہ پلان بنا کر آئی تھی؟ میں سوچنے لگی۔ ٹرین میں ہماری ملاقات اتفاقیہ ہرگز نہیں تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ جیری کا تعاقب کرتی رہی تھی۔ اسی طرح وہ میرا بھی تعاقب کر رہی تھی۔

میں سوچ میں پڑ گئی۔ ابھی اس بات میں کتنا وقت باقی ہے کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہو؟ کیا وہ اس وقت مجھے قتل کرنے کی کوشش کرے گی جب میں ڈرائیونگ کر رہی ہوں گی؟ یا وہ اس وقت تک انتظار کرے گی جب تک میں اسے اس کے دروازے تک نہ پہنچا دوں۔ پھر وہ مجھ پر حملہ آور ہوگی؟

سوچو، سوچو..... میں خاموشی سے خود سے کہنے لگی۔

اس پر قابو پانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہوگا۔ مجھے خود کو بچانے اور زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ میں اپنے شوہر کو تو کھو چکی ہوں اور اب تو میں اس اعتماد سے بھی محروم ہو چکی ہوں جو مجھے اپنے شوہر پر تھا۔

لہٰذا اب میں مرنے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

میں نے لگاتار کئی گہری سانسیں لیں تاکہ خود کو پُرسکون رکھ سکوں۔ اگر میں اسی طرح ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا رہی تو میرے زندہ بچ رہنے کے امکانات کم رہیں گے۔ گلوریا کے ارادوں کو شکست دینے کے لیے مجھے بس ایک منصوبے کی ضرورت تھی۔

گلوریا کے آپشنز کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ ڈرائیونگ کے دوران مجھ پر حملہ کرے گی۔ ڈرائیونگ کے دوران حملے کی صورت میں کار کو حادثہ پیش آنے کا خطرہ موجود تھا اور وہ میرے ساتھ خود کو ہلاک کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

جب میں شہر کے وسط میں پہنچی تو میرے ذہن نے وہ منصوبہ دریافت کرلیا۔ اگر میں نے اس منصوبے پر بالکل صحیح عمل کیا تو ہو سکتا ہے کہ میں اپنی زندگی بچانے میں کامیاب ہو جاؤں۔

تب میں نے انڈیکیٹر دیتے ہوئے کار داہنی جانب کولمبس اسٹریٹ پر گھما دی۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ گلوریا نے کار کے گھومتے ہی تیز آواز میں پوچھا۔

”اگر مجھے مرنا ہی ہے تو مجھے امید ہے کہ تم میری گھر تک لانگ ڈرائیو کی خواہش کو مائنڈ نہیں کرو گی؟“ میں نے گلوریا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں۔“ گلوریا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”تم خود کو تھکا ڈالنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

اسے یقین تھا کہ وہ مجھ پر حاوی ہو چکی ہے اور اس وقت اسے بالادستی حاصل ہے۔ میں نے اپنی منزل کے فاصلے کے لحاظ سے بقیہ بلاکوں کی گنتی شروع کردی۔

دو منٹ بعد ہی مجھے وہ اسٹرکچر دور داہنی جانب دکھائی دیا۔ زرد بلاکس، براؤن چھت والی ٹھوس عمارت ہی میری منزل تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ مجھے امید تھی کہ اتنی رات بیت جانے کے باوجود وہ عمارت پولیس مینوں سے بھری ہو گی۔ اگر مجھے مرنا ہی ہے تو خود کو بچانے کے لیے اس سے بہتر

اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ بجائے گلوریا کے الگ تھلگ تاریک گھر کے قریب جہاں تمام امکانات اسی کے حق میں ہوں گے۔ وہاں جونہی میں اپنی کار اس کے گھر کے قریب سڑک کے کنارے روکوں گی، وہ اسی لمحے مجھے کاٹ ڈالے گی اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔

لیکن میں نے عاجزی کے ساتھ کسی بھیڑ کے مسکین سے بچے کی طرح اپنی جان گنوانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔

میں نے پیڈل پر ہلکا سا دباؤ بڑھاتے ہوئے کار کی رفتار قدرے بڑھا دی۔ احتیاط بے حد ضروری تھی۔ میں اپنے ارادوں کو عیاں نہیں کرنا چاہتی تھی اور جب میری کار تقریباً اس عمارت کے متوازی پہنچ گئی تو میں نے پوری قوت کے ساتھ اسٹیئرنگ داہنی جانب گھماتے ہوئے ایکسلریٹر کے پیڈل کو کار کے فرش سے جام کر دیا۔

کار اچھل کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئی اور میں نے اس کا رخ پولیس اسٹیشن کی عمارت کی جانب کر دیا۔ میرے ہاتھوں نے پوری مضبوطی کے ساتھ اسٹیئرنگ وہیل کو جکڑ رکھا تھا۔ ساتھ ہی میرے ہونٹوں سے ایک تیز چیخ بلند ہوئی۔ یہ ایک پاگل عورت کی مایوسی کے عالم میں اپنے بچاؤ کی آخری کوشش کہی جاسکتی تھی۔

اگلے لمحے دھات کی بنی ہوئی کار اور ٹس سے مس نہ ہونے والی مضبوط اینٹوں کے آپس میں ٹکرانے کا دھماکا ہوا۔ میرے جسم نے آگے کی جانب اڑنے کی کوشش کی لیکن میرے سیٹ بیلٹ اور ائر بیگ نے مجھے تھامے رکھا۔ میرا ائر بیگ جس تیزی کے ساتھ ہوا سے بھرا تھا، اسی تیزی کے ساتھ پچک بھی گیا۔ میں نے نیم غنودگی کے عالم میں اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی گلوریا کی جانب دیکھا۔

وہ اپنی سیٹ پر پڑی ہانپ رہی تھی۔ اس کی گود میں ایک دھبا دکھائی دے رہا تھا۔

یہ یقیناً اس چاقو کے زخم کا دھبا تھا جو اس نے اپنے ہاتھوں میں دبوچا ہوا تھا۔ چاقو نے اسے چیر دیا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو نا؟“ میں نے گلوریا سے پوچھا۔

اس نے میری جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ خاموشی کے ساتھ اس دھبے کو دیکھ رہی تھی جو تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔

مجھے کار کے باہر کی جانب سے آوازوں کا شور سنائی دیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو دو پولیس مین ہماری جانب دوڑتے نظر آئے۔ میں دعا مانگنے لگی کہ انہیں میری حیرت انگیز داستان پر یقین آجائے۔

☆☆☆

جب میں ڈاکٹر آئیوان گریگری کے دفتر میں داخل ہوئی تو وہ چند کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ مسکرا دیا۔ میری پچھلی مرتبہ یہاں آمد کو تین ہفتے گزر چکے تھے۔

”تم صحت مند دکھائی دے رہی ہو۔“

”میرا خیال ہے میں زندہ رہوں گی۔“ میں نے جواب دیا۔

”مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔“ اس نے مجھے اپنی میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سو اس دوران تم پر کیا بیتی؟“

”میں خوش نصیب رہی۔ میرے شوہر کی داشتہ نے سب کچھ اگل دیا۔ اس نے پولیس کو پوری داستان سنا دی کہ جیری کے ٹھکرانے کے بعد اس نے کس طرح اس کا تعاقب کیا، کس طرح اس پر چاقو سے حملہ کیا اور کس طرح اس کی لاش پارک میں چھوڑ دی تھی۔ اس نے یہاں تک بتا دیا کہ مجھے اس نے قتل کرنے کا کیا منصوبہ بنایا تھا۔“

”اور اب اس کا کیا حال ہے؟“

”وہ صحت یاب ہو رہی ہے۔ اسے مقدمے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ اچھا ہوا کہ اس کے پیٹ میں موجود بچہ بچ گیا۔ میں نے سنا ہے کہ اس کی بہن بچے کی دیکھ بھال کرلے گی۔“

”اور تم؟ کیا تمہیں کچھ آس بندھی ہے؟“

میں مسکرا دی۔ ”جیسا کہ آپ جانتے ہیں جب میں پچھلی مرتبہ یہاں آئی تھی تو میری شخصیت منقسم ہو رہی تھی۔ ماں چاہتی تھی کہ میں اس کے پاس شکاگو آجاؤں۔ کرسمس اس کے ساتھ گزاروں جبکہ جیری کی ممی مجھے اپنے پاس دیکھنا چاہتی تھیں۔ جیری ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔“

”سو تم نے خود کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے ان دونوں کو خوش کر دیا۔ ایسا ہی ہوا تھا نا؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”میں نے ممی کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ پھر ان دونوں کو کرسمس کے ڈنر پر لے گئی۔ وہ ایک عمدہ ریسٹورنٹ تھا اور مینیو بھی شاندار تھا۔ ان دونوں کو کوئی شکایت بھی نہیں ہوئی اور انہوں نے انجوائے بھی کیا۔“

ڈاکٹر گریگری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”یہ تمہاری تیزی سے صحت یاب ہونے کی علامت ہے۔ اب تم خوشی خوشی زندگی گزار سکتی ہو۔“

میں نے ممنونیت بھری نگاہوں سے اپنے معالج کی طرف دیکھا اور ایک نئے عزم کے ساتھ اس کے دفتر سے نکل آئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

ایم اے پاس خاور سکھر جیل میں سزائے موت کا منتظر تھا۔ اس پر قتل کا جھوٹا الزام ایک گینگ لیڈر نادر شاہ کے ایما پر عائد کیا گیا تھا۔ وہیں ڈاکو کے گروہ کا سردار گاما رستم بھی پھانسی کا منتظر تھا... اس کے ساتھی جیل پر حملہ کر کے اسے چھڑا لے جاتے ہیں۔ گاما، خاور کو ساتھ لے جاتا ہے۔ خاور ایک پرانی غیر آباد حویلی میں پناہ لیتا ہے۔ خاور کو اس حویلی کے کھنڈر میں نورین ملی جو لباسِ عروسی میں تھی اور اپنے شوہر کو قتل کر کے آئی تھی۔ اس کی پرورش کرنے والے چچا نے نورین کی تمام جائداد اور دولت پر قبضہ کر لیا تھا اور زبردستی اس کو اپنے پاگل بیٹے سے بیاہ دیا تھا۔ پاگل چچازاد کی دست درازی سے بچنے کے لیے نورین نے اسے قتل کر دیا اور کھڑکی کے راستے آسیب زدہ مشہور حویلی میں آ گئی۔ کسی نے اسے دیکھا تو بدروح سمجھ کے بھاگ گیا۔ وہ یہاں سلمان خان نامی ایک شخص سے چھپ کر ملتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وعدے کے مطابق وہ یہاں موجود ہوگا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ نورین پریشان تھی کہ پولیس اسے قتل کے الزام میں گرفتار کرلے گی۔ وہیں اس کی ملاقات خاور سے ہوئی۔ اس کھنڈر کی دوسری منزل پر خاور کو سلمان کی لاش نظر آئی۔ وہ وعدہ نبھاتے پہنچا تھا لیکن قتل ہو گیا تھا۔ تلاشی پر خاور کو اس کی جیب سے دس لاکھ نقد ملے۔ خاور نے اپنے کپڑے اسے پہنائے اور خود اس کے کپڑے پہن کے رقم جیب میں ڈال لی۔ سلمان کے پاس ایک ریوالور بھی تھا جو خاور نے چھپا کے رکھ لیا۔ اس نے نورین سے یہ بات چھپائی، اپنا حلیہ بدلا اور نورین کو برقع میں چھپا کر لے گیا۔ وہ اکیلا نورین کے گھر گیا تو اسے علم ہوا کہ نورین پر شوہر کے قتل کا الزام ہے جبکہ نورین نے نکاح نہ ہونے کے باعث اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خاور نے نورین سے جھوٹ بولا کہ سلمان جو پہلے سے بے روزگار تھا نوکری مل جانے پر دبئی چلا گیا تھا۔ باہر جانے میں خطرہ تھا کیونکہ فریدالدین (خاور) کے جیل سے فرار کی اطلاع کے بعد نادر شاہ نے اپنے کارندے اسے تلاش کرنے پر لگا دیے تھے جو کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ دوسرا خطرہ پولیس سے تھا جن کو خاور کے علاوہ نورین کی بھی تلاش تھی۔ خاور، نورین کو لے کر نکلا اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا تاہم وہاں غیر محفوظ ہونے اور نورین کی اچانک طبیعت خراب ہونے پر وہ ایک اسپتال میں آ گئے۔ نورین کو ایڈمٹ کر لیا گیا۔ اچانک وہاں پولیس آ گئی۔ خاور اس صورتِ حال پر پریشان ہو گیا۔ پولیس کمرے سے آتی آوازوں کو سن کر آئی تھی تاہم انہیں کسی طرح کا شک نہیں ہوا اور وہ واپس چلے گئے۔ خاور اور نورین ہوٹل سے نکلے۔ ہر بڑے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور ائرپورٹ پر وہ پکڑے جا سکتے تھے چنانچہ انہوں نے پنجاب کا رخ کیا اور کئی مقامات پر ٹرین بدلتے رہے۔ اس کے باوجود نادر شاہ کے بندوں نے جو ویٹر کی وردی میں تھے، خاور کو پہچان لیا۔ ایک کو خاور نے چلتی ٹرین سے کودنے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے نے نورین اور خاور کو حفاظت اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اس نے ایک تصویر دکھائی جو نورین کی گمشدہ بہن کی تھی جس کی وہ نازی تھی۔ اسے کسی وڈیرے کے بیٹے نے اغوا کر کے اپنے پاس رکھا تھا اور آبروریزی کے بعد قتل کر دیا تھا۔ جذباتی نورین اسے اپنا بھائی تسلیم کر چکی تھی۔ خاور بھی اسے معاف کرنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ قتل، بلیک میلنگ اور غلط فہمی کا نتیجہ تھا، اس کا اصل دشمن نادر شاہ تھا۔ خانپور کے ویٹنگ روم میں رات گزار کے وہ دونوں ایک پرائیویٹ کیری ڈبے سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ نازی نے انہیں رات بھر کے لیے کسی اجنبی قصبے کے... ایک کچے خالی گھر میں رکھا اور انہیں تسلی دی کہ صبح وہ لاہور کے مضافات میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن صبح جاگنے پر نادر شاہ کے آدمی آ گئے اور نورین اور خاور کو لے گئے مگر راستے میں نورین نے جانے کیا کیا کہ گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی۔ خاور بچ گیا مگر نورین کا پتا نہ چل سکا۔ خاور نے رحیم بخش نامی شخص کے گھر میں پناہ لی۔ مقامی چودھری رحیم بخش کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ رحیم بخش کو قتل کر دیا گیا اور ریشم اور خاور کو چودھری کے کارندے اٹھا کر لے گئے۔ ریشم اور خاور وہاں سے بھاگنے کے دوران پکڑے گئے اب انہیں انجام کی فکر تھی مگر ایسے ہی وقت فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔

اب آپ آگے پڑھیے

ایک اضطرابی کیفیت میں چودھری کھڑا ہو گیا...
''اوئے پترا اکبر! یہ کیا ہو رہا ہے؟ باہر دیکھ کوئی ان کے حمایتی تو نہیں ہیں؟'' اس نے مجھ پر اور ریشم پر ایک نگاہِ قہر و غضب ڈالی۔

اکبر نے کسی سعادت مند برخوردار جیسی مستعدی دکھائی۔ ''آپ فکر نہ کریں ابا جی... میں دیکھ لیتا ہوں۔'' وہ جوانی اور طاقت کے غرور میں رستم بنا باہر کی طرف لپکا۔

چودھری اضطرابی کیفیت میں پھر کرسی پر ٹک گیا۔ اکبر کی واپسی تک ہمارے ناقابلِ معافی جرم کی سرسری سماعت کرنے والی عدالت کی کارروائی رک گئی تھی۔ اس عدالت میں چیف جسٹس خود چودھری تھا اور وکیلِ استغاثہ اس کا بیٹا۔ چشم دید گواہ بھی انہی کے جاں نثار نمک خوار تھے اور فیصلہ تو گویا پہلے سے محفوظ تھا۔ ان کے نظامِ انصاف میں نہ کسی ملزم کو صفائی میں کچھ کہنے کی اجازت تھی اور نہ اپیل کا حق تھا۔ نہ جانے کیسے سزا پر عمل درآمد کی گھڑی کچھ دیر کے لیے ٹل گئی تھی۔

ریشم سے ہمدردی اور اس کی مدد کی مجرم خادمہ کی آنکھوں والی فریاد بلب لاش چودھری کے قدموں میں عبرت کی تصویر بنی پڑی تھی۔ نہ جانے وہ کیا جذبہ تھا جس نے اس مفلس و بے نوا عورت کو اپنی جان کی بازی لگا کے ریشم کی مدد پر اکسایا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ناکامی کی سزا کیا ہوگی۔ یہ صریحاً خودکشی تھی۔ شاید عمر بھر مر مر کے جینے والی عورت کا حوصلہ جواب دے چکا تھا اور اس نے دنیا چھوڑنے سے پہلے ایک نیکی کمانے کا فیصلہ کر لیا تھا جو یومِ حساب اس کی بخشش کا ذریعہ بن جائے۔

باہر سے آوازِ اذاں ہوا کے دوش پر میرے کانوں

تک پہنچی، اس کے ساتھ ہی اکبر بڑی مشقت کے ساتھ ایک جسم کو ٹانگ سے پکڑ کے گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا۔ وہ کوئی نحیف و نزار خستہ حال اور سفید ریش بوڑھا تھا جس کے شکستہ سر سے بہنے والا لہو اپنے پیچھے ایک سرخ بدوضع لکیر بناتا جا رہا تھا لیکن اس کے مظلوم چہرے پر نہ اذیت کا احساس تھا اور نہ ذلت کا... وہ صرف ایک لاش تھا۔

اکبر نے اس مردہ جسم کو بھی چودھری کے قدموں میں ڈال دیا۔ ''ایک اور نمک حرام کتا۔''

چودھری کے چہرے پر وہی حقارت اور نفرت کے جذبات تھے۔ ''یہ تو جمعہ خان تانگے والا ہے۔''

اکبر نے ریشم اور میری طرف دیکھا۔ ''ہاں جی... یہ بھی ان دونوں بے غیرتوں کا حمایتی تھا۔ اپنے تانگے میں انہیں بھگا کے لے جاتا۔''

چودھری کی نظر نے بے حسی سے صفِ مجرماں کو دیکھا جن میں سزا یافتہ بھی تھے اور ہم بھی جن کے لیے سزا سنانا باقی تھا۔ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کرتے ہیں ان کا بھی فیصلہ، پہلے میں نماز پڑھ لوں۔''

صرف چودھری ہی نہیں، وہ سب جو اس کے سفاک محافظوں کے روپ میں وہاں موجود تھے، ایسی ہی دوغلی فطرت کے مالک تھے۔ انسانی روپ میں وہ سب درندہ صفت شیطان تھے۔ چودھری کی حویلی کے سنگین فرش پر دو بے کس مظلوموں کا خون فریاد کر رہا تھا اور ان کا قاتل عبادت کے لیے قبلہ رو کھڑا ہو گیا تھا۔

اس احساس نے اچانک میری سوچ کے دھارے کو پلٹ دیا۔ میں اس فرعون کو اپنی طاقت سے شکست نہیں دے سکتا تھا۔ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی... فرمودۂ اقبال یہاں بے محل تھا۔ یہ عیاری اور مکاری... بے ضمیری اور بدمعاشی کی طاقت کے علمبردار شیطان تھے جن کا مقابلہ انہی کے ہتھیاروں سے ممکن تھا۔ بقا کی جنگ میں جائز اور ناجائز برابر... زندگی اور موت کا مسئلہ ہو تو حرام بھی حلال ہے... نیت کا حال میرا خدا جانتا ہے یا میں جانتا ہوں۔ اپنی زندگی کے لیے اپنی بے گناہی ثابت کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے ہر جھوٹ کو ہر قسم کے ساتھ سچ بنانا ضروری ہے۔

یہ چند لمحوں کی سوچ کا وہ فیصلہ تھا جس نے مجھے نیا حوصلہ دیا۔ میں نے ریشم کی طرف دیکھا جو دیوار سے لگی کھڑی تھی اور اکبر اپنی مردانگی کا مظاہرہ اپنے ریوالور کی سرد فولادی نال سے ریشم کے رخساروں کو سہلا کے کر رہا تھا پھر اس کی نظر کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی ریشم کے جسم پر بھٹکنے لگا۔ ریشم کا خوف زدہ ہونا ایک فطری بات تھی لیکن نہ وہ دہشت سے کانپ رہی تھی اور نہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اکبر کی دست درازی بھی بے حسی کے ساتھ برداشت کر رہی تھی۔ ایک لمحے پہلے اس کی اور میری نظر ملی تو میں مسکرایا اور ایک آنکھ دبا کے اور سر کی خفیف سی جنبش سے اسی ہمت اور قوتِ برداشت کا مظاہرہ جاری رکھنے کا پیغام دیا۔ نظر کا یہ پیغام اس کے دل نے سمجھا پھر دماغ نے۔ یہ صرف ایک لمحہ تھا جب چودھری پھر اندر آیا اور اکبر ایک قدم پیچھے ہٹا کہ ریشم نے محسوس نہ ہونے والی مسکراہٹ کے ساتھ ایک آنکھ دبا کے اور سر کی خفیف سی حرکت سے میرے پیغام کا جواب دے دیا۔

چودھری پھر انصاف کی کرسی پر متمکن ہوا ہی تھا کہ میں نے خود کو اس کے قدموں میں گرا دیا۔ یہ حرکت اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ چودھری اور اس کے سپوت کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن اس کا مقصد ریشم کی سمجھ میں ضرور آ گیا ہوگا۔
''جنابِ عالی! آپ مالک اور مختار ہو... بے شک مجھے زندہ بھی دفن کرا سکتے ہو لیکن آپ کو اللہ رسولؐ کا واسطہ... پہلے میری بات سن لو۔''

چودھری نے مجھے ایک گالی دی۔ ''یہ کیا ڈراما کر رہا ہے؟''

میں نے گھٹنوں کے بل اپنا رخ اکبر کی طرف کیا اور ہاتھ جوڑے۔ ''چھوٹے چودھری صاحب! اللہ آپ کو حیاتی دے... بڑے چودھری صاحب کا سایہ آپ پر سلامت رکھے... میری عرضی سن لو۔''

اکبر نے گالیوں کی یلغار میں مجھے ایک ٹھوکر رسید کی اور گردن دبوچ کے سیدھا کھڑا کر دیا۔ ''جلدی بول۔''

یہ میں بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کتنا اچھا ایکٹر ہوں۔ شاید ضرورت ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ میری آواز کانپ رہی تھی اور جسم پر لرزہ طاری تھا۔ ''وڈے چودھری صاحب! میری عرضی سن لو۔'' میں نے بڑی روانی سے اللہ رسولؐ کی قسم کھا کے کہا۔ ''اعتبار کرنا آپ کی مرضی... جھوٹ سچ کا فیصلہ آپ کر سکتے ہو۔''

چودھری نے سر ہلایا۔ ''اچھا، اب بول کیا کہتا ہے۔''

''جنابِ عالی! یہ ٹھیک ہے کہ میں اس لڑکی ریشم کے ساتھ تھا لیکن میں اس کے جرم کا شریک نہیں تھا۔''

''بکواس کرتا ہے... جھوٹ بولتا ہے۔'' اکبر رائفل کا رخ میری طرف کر کے دہاڑا۔

میں نے ہاتھ جوڑ کے پھر اللہ رسولؐ کی قسم کھائی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"آپ ریشم سے پوچھ لیں سرکار... میرا اس سے کیا تعلق... اس کی مدد کرنے والی یہ خادمہ تھی۔ اس نے جمعہ خان کو بلایا تھا، میں نے نہیں۔ میں نے ریشم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے پیروں پر کلہاڑی نہ مارے... میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا اور اس کی کوئی مدد نہیں کروں گا۔ یہ اس کی خوش نصیبی ہے کہ چودھری اکبر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ حویلی میں رہے گی۔ ایسی کس کی قسمت ہوتی ہے... اور بھاگ کے وہ جائے گی کہاں؟"

"یہ کیا کہہ رہا ہے ریشم؟ کیا یہ ٹھیک ہے؟" چودھری نے غرّا کے کہا۔

وہ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا۔ ریشم نے میرے دل کی بات کو نہ سمجھا ہوتا تو اس کا سارا عتاب مجھ پر نازل ہوتا۔ وہ صد ہزار بار مجھ پر لعنت بھیجتی کہ اس نے میری باتوں پر اعتبار کیا اور ایک بے غیرت، کم ہمت اور بے اعتبار شخص پر بھروسا کیا لیکن میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرا مبہم سا اشارہ اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان اعتماد کا مضبوط رشتہ استوار تھا۔ میری یہ قلابازی بے مقصد نہیں ہو سکتی تھی۔ اس جان لیوا لمحے کو ٹالنے کے سوا فوری طور پر میرا مقصد کیا ہو سکتا تھا۔ آئندہ کی آئندہ دیکھی جائے گی۔

ریشم نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا دیا۔

چودھری نے بیٹے کو مخاطب کیا۔ "چل تُو اس کڑی نوں لے جا اندر... اپنی ماں کے حوالے کر دے... وہ چاہے تو اسے اناج کی کوٹھری میں تالا لگا کے بند کر دے... جب تک اس کا دماغ نہ ٹھکانے آجائے، اسے بند رکھنا ہے۔"

اکبر نے بڑی سختی سے ریشم کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ وہ چلّاتی رہی، مچلتی رہی لیکن اکبر جیسے طاقتور اور توانا مرد کے آگے اس کی کیا چلتی... پھر چودھری حویلی کے مسلح محافظوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "ان نمک حراموں کو بوری میں ڈال کے پچھواڑے لے جاؤ اور آخری کونے میں گاڑ دو..."

"جمعہ خان کے تانگے، گھوڑے کا کیا کریں جناب؟"

"اوئے کچھ اپنی عقل بھی ہے یا نہیں... ٹکڑے کر دو تانگے کے... جلانے کی لکڑی ہو گی... گھوڑے کو بھی پیچھے لے جا کے ذبح کر دو اور گوشت تقسیم کر دو مسکینوں میں... کہہ دینا گائے قربان کی ہے صدقے میں... یہ سال چھ مہینے میں گوشت چکھنے والے... انہیں کیا پتا چلے گا ذائقے کے فرق کا... خوش ہو جائیں گے تو دعا دیں گے... چلو اب دیر مت کرو۔"

بندوق برداروں نے چودھری کو سلام کیا۔ بندوقیں کندھے پر لٹکایا اور لاشوں کو اسی طرح ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے دروازے سے باہر لے گئے۔ ان کے سر آواز کے ساتھ پتھریلے فرش پر ٹکرا رہے تھے لیکن موت کی بے حسی نے انہیں درد اور اذیت کے احساس سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اکبر اپنی کامیابی پر سینہ چوڑا کیے اندر آیا۔

چودھری اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس بندے سے بعد میں بات کریں گے... جھوٹ بول رہا ہے کہ سچ۔ اسے بھی اندر لے جا کے ڈک دے... میں ذرا تھک گیا ہوں... تھوڑی دیر آرام کر لوں۔"

اکبر نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا۔ ریوالور اس نے پھر نکال لیا تھا۔ "ابھی جان بچالی تُو نے پتر ڈراما کر کے لیکن تیری بھی اُدھر ہی بنے گی۔" اس کے غلام مجھے دھکیلتے ہوئے پچھلے حصے میں زینے سے نیچے لے گئے۔

مجھے ایک کمرے میں دھکیل کر باہر سے دروازے کو تالا لگا دیا گیا۔ کمرے میں زمانے بھر کا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا اور ابھی بالکل اندھیرا تھا۔ اوپر ایک دیوار کے سوراخ سے جو چھت کے قریب تھا، صبح کا اجالا جھلک رہا تھا اور یہ مشرق کی سمت تھی۔ چند منٹ میں میری نظریں تاریکی میں دیکھنے لگیں تو میں نے فرش کے بجائے ایک پرانے شکستہ صوفے پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ اس پر بھی پرانی گرد جمع تھی لیکن یہ نیچے بیٹھنے سے بہرحال بہتر تھا۔ ابھی ریشم کی اور میری جان بچ گئی تھی چنانچہ یہ مہلت غنیمت تھی۔ اس تہ خانے سے زندہ سلامت نکلنا میرا پہلا مقصد تھا۔ یہ کام صرف عقل اور ہوشیاری سے ہی ممکن ہو سکتا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر میں نے اپنے خدا کو یاد کیا۔ بے شک میرے معبودؑ میں بھی تیرا ایک حقیر اور گناہ گار بندہ ہوں لیکن میرا بھروسا بھی تجھ پر ہی ہے۔ تو جانتا ہے کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا جس کی پاداش میں دشمن مجھے تختۂ دار تک لے گئے تھے۔ پہلے بھی میرا محافظ و معاون تُو ہی تھا، آئندہ بھی میری مدد کر۔

چودھری کی حویلی بہت زیادہ قدیم اور تاریخی نہیں تھی۔ اسے سامنے سے جدید انداز کی کوٹھی کا روپ دے دیا گیا تھا لیکن اندر سے اس کا وہی روایتی نقشہ تھا۔ یہ ایک مستطیل عمارت تھی جس کا سامنے والا دومنزلہ حصہ زرد پتھر سے بنا ہوا تھا۔ نیچے کشادہ ہال کے آخری حصے میں ایک تخت پر قالین بچھا ہوا تھا اور دیوار کے ساتھ مخملی غلاف والے تکیے رکھے تھے۔ قالین نیچے بھی تھا اور تخت کے بعد کے ایک تہائی

حصے میں دونوں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ صوفے لگائے گئے تھے۔ ظاہر ہے یہ انتظام خاص اور اہم مہمانوں کے لیے تھے۔ پھر دو رویہ کرسیاں تھیں۔ پانچ ایک طرف، پانچ دوسری طرف۔ درمیان میں دس فٹ سے زیادہ چوڑی گزرگاہ تھی۔ کرسیوں پر کم تر درجے کے وہ مہمان بٹھائے جاتے تھے جن کو چودھری کی طرف سے مدعو کیے جانے کا اعزاز حاصل ہوتا تھا۔

ہال کے ایک طرف وہ کھانے کا کمرا تھا جس میں پچاس مہمانوں کے لیے کھانے کی میز تھی۔ یہ کمرے میں ہی بنائی گئی تھی اور ظاہر ہے خاص مہمانوں کے لیے تھی۔ اوپر کے حصے میں مہمانوں کے قیام کے لیے کمرے بنائے گئے تھے اور یہاں بھی خاص اور عام کے فرق کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔ مہمان خانے کے اس بلاک کے سامنے وسیع چار دیواری میں باغ اور گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے جگہ تھی۔ اس کے پیچھے ایک بہت بڑا مربع صحن تھا جس کے دونوں طرف طویل برآمدے تھے اور گھر والوں کی خواب گاہیں... آخری حصے کی احاطہ بندی سرونٹ کوارٹر، کچن اور مویشی خانے کرتے تھے۔ ہر گاؤں، دیہات میں وڈیروں، جاگیرداروں کی طرز رہائش کا یہی انداز تھا۔

جس تہ خانے میں مجھے بند کیا گیا تھا، وہ بھی آخری حصے میں تھا۔ اس کی چھت کی بلندی کچھ کم تھی۔ معلوم نہیں مجھے کب تک اس میں ٹھہرنا تھا اور اپنے قدموں پر چل کے اپنی دنیا میں جانا تھا یا کسی نامعلوم مدفن تک پہنچایا جانا تھا۔ گھڑی میں صبح کے سات بجنے کو تھے۔ روشن دان سے دکھائی دینے والا آسمان پہلے کے مقابلے میں زیادہ روشن ہو گیا تھا۔ اوپر کے حصے میں ایسے کئی روزن تھے لیکن انہیں بند رکھا گیا تھا۔ شاید گرد و غبار اور پرندوں کی آمد و رفت کو روکنے کے لیے۔

اس تہ خانے میں مجھے کب تک قید رکھا جائے گا، یہ بالکل غیر یقینی تھا۔ اپنے انجام کے بارے میں اگرچہ میں خاصا پُرامید تھا لیکن ناامیدی کم نہ تھی۔ یہ حویلی اور پس ماندہ علاقوں میں ایسی سیکڑوں ہزاروں حویلیاں ہیں جن کی بلند و مضبوط سنگین چار دیواریوں کے اندر وڈیروں، جاگیرداروں اور چودھریوں کی اپنی اپنی سلطنت محض طاقت اور دولت کی بنیادوں پر استوار ہے اور جہاں کتابوں میں لکھے گئے کسی ضابطۂ اخلاق یا قانون کا کوئی دخل نہیں۔

مجھے ملنے والی زندگی کی مہلت عارضی ہے۔ مجھے پھر کب چودھری صاحب کی عدالت میں پیش کیا جائے گا اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا موقع دیا جائے گا یا نہیں...

یا اسی قید خانے میں پھینک کے یوں بھلا دیا جائے گا جیسے میرا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وقتِ مقررہ پر نمودار ہو کے فرشتۂ اجل مجھے قیدِ حیات سے ہی نجات دلا دے۔ ان تمام سوالات پر سوچنا لاحاصل تھا۔ ہاں ریشم کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ خطاکار ہونے کے باوجود چھوٹے چودھری اسے اپنی رحم دلی سے کام لیتے ہوئے صرف اتنی سزا دیں گے کہ ہر رات اس کے حسن و شباب کا جرمانہ وصول کرتے رہیں۔

میں نے گھبرا کے سر کو جھٹکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ شامتِ اعمال مجھے کہاں لے آئی۔ تقدیر نے ایک زندان سے نکالا تو دوسرے میں پہنچا دیا اور عین اس وقت جب مجھے اپنی خوش نصیبی پر اعتبار آچکا تھا۔ غلطی ریشم کی بھی نہیں تھی کہ اس نے عجلت دکھائی... کوئی اکیلی کمزور ہرنی کسی بھوکے بھیڑیے کا کیسے مقابلہ کرتی۔ اس نے فرار اختیار کیا تو یہ بھی اس کی حیوانی جبلت کا تقاضا تھا۔ سارا کھیل قسمت کا ہے جو عین وقت پر دغا دے گئی۔

اچانک میرے کانوں نے ایک آہٹ سی سنی۔ میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرے سامنے ایک ہال سا تھا۔ شاید چھتیس فٹ لمبا اور اس سے نصف چوڑائی۔ بظاہر یہ بے مصرف اور فالتو سامان کا گودام تھا۔ درمیان میں پرانا فرنیچر ڈھیر کر دیا گیا تھا جس میں صوفے اور کرسیوں کے علاوہ مسہریاں بھی تھیں۔ پتا نہیں چودھری جیسے دولت مند کے لیے مستقبل میں بھی اس کا کیا مصرف ہو سکتا تھا۔ شہروں میں عام لوگ ناکارہ فرنیچر کباڑی کے حوالے کر دیتے ہیں خواہ وہ لکڑی کے بھاؤ کیوں نہ لے۔ یہاں کباڑی نہیں تھے پھر بھی مستحق تو بہت تھے۔

ایک دیوار کے ساتھ بھاری بھرکم صندوقوں کی قطار تھی۔ کچھ ٹین کے اور کچھ لکڑی کے۔ شاید ان میں پرانے برتن ہوں گے یا مہمان خانے کے لحاف گدّے۔ آخری حصے میں دیوار پر نصب الماری نے مجھے متوجہ کیا۔ فرش سے چھت تک پھیلی ہوئی الماری چھ چھ فٹ اونچی اور چار فٹ چوڑی بہت سی چھوٹی الماریوں کا مجموعہ تھی۔ گرد نے اس کے شیشوں کو بھی ڈھانپ رکھا تھا اور اس ماحول میں یہ خیال مجھے آسیب کی طرح لگتا تھا کہ شاید خود میں بھی اس غیر ضروری اور بے مصرف اسباب کی طرح بھلا دیا جاؤں گا اور سال بھر بعد جب چیونٹے اور حشرات الارض میرے جسم کا سارا گوشت چاٹ چکے ہوں گے تو میں ایک گرد آلود ہڈیوں کا ڈھانچا بنا پڑا رہ جاؤں گا۔ اس وقت یہ خیال میری دلچسپی کا سبب بن گیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ الماریوں کے پیچھے کتابیں ہیں۔

اس دنیا میں کتاب کا کیا کام؟ میں نے سوچا۔ جہاں اللہ کی کتاب کو بھی جزدان میں لپیٹ کر اور کسی طاق پر رکھ کے بھلا دیا گیا ہو کہ کہیں ہدایت کی روشنی سے جہالت کی وہ تاریکی نہ مٹ جائے جس پر انہیں بھی اسلاف کی طرح فخر ہے۔ تجسس نے مجھے مجبور کیا۔ میں احتیاط کے ساتھ الماری کی طرف گیا۔ تہ خانے میں اب اتنا اجالا تھا کہ میں فرش پر پڑی کسی چیز سے ٹھوکر کھائے بغیر آگے جاسکوں۔ کچھ میری نظر بھی اندھیرے میں دیکھنے لگی تھی۔ ایسا سوچنے کی وجہ نہ تھی کہ نہ جانے اس قید خانے میں آنے والے کتنے دن یا ماہ و سال گزریں گے مگر مجھے یہ خیال ضرور آیا کہ ایسا ہوا تو میری تنہائی کی رفیق یہی کتابیں ہوں گی۔

آہستہ سے میں نے ایک الماری کے گرد آلود پٹ کو ہلایا۔ پٹ مقفل نہیں تھا۔ تھوڑا سا زور لگانے سے الماری کھل گئی۔ اندر کے خانوں میں واقعی کتابیں بڑے سلیقے اور ترتیب سے رکھی تھیں۔ روشنی اتنی کم تھی کہ کسی کتاب کی جلد پر لکھے ہوئے موضوع یا مصنف کا نام پڑھنا دشوار تھا۔ میں نے ایک کتاب کو نکال کے اوپر روشن دان سے آنے والی روشنی کے رخ کیا تو عنوان واضح ہو گیا۔ یکے بعد دیگرے میں کتابوں کو نکالتا اور پھر اپنی جگہ رکھتا گیا۔ میں نے پہلے ہر خانے سے دو چار کتابوں کو دیکھا پھر دوسری الماری کی طرف چلا گیا۔ ہر الماری کا سرسری جائزہ لینے کے بعد مجھے بخوبی یہ اندازہ ہو گیا کہ تمام کتابیں انگریزی اردو ادب، تاریخ، سماجی علوم اور عمرانیات کے موضوع پر سند کی حیثیت رکھنے والی تصانیف ہیں۔ صرف ایک ایسی الماری تھی جس میں فنِ تعمیر کی کتابیں تھیں۔ یہ سب غیر ملکی مصنف تھے اور غالباً یہ نصابی کتب تھیں جو بیرونِ ملک کسی یونیورسٹی میں آرکیٹیکچر میں ڈگری لینے والے پڑھتے ہوں گے۔ اندھیرے میں نہ عبارت پڑھی جاسکتی تھی اور نہ مصنف کا نام لیکن ہر کتاب میں مختلف ممالک کے طرزِ تعمیر کے نمونے تصاویر کی صورت میں موجود تھے۔

اس دریافت نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ تعلیم و تہذیب کے اجالے سے صدیوں کے فاصلے پر جہالت اور ظلمت کے اس جزیرے میں یہ علم کا خزانہ ایسا ہی تھا جیسے کسی صحرائے بے آب و گیاہ میں گلابوں کے رنگ و روپ اور خوشبو سے مہکتا گلستاں... کتابوں کے ذخیرے کو چھانتے میں نے دو گھنٹے گزار دیے تھے اور مجھے وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ میں وہیں ایک پرانے مٹی سے اٹے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ ایسا تعلیم یافتہ اور باذوق یہاں کون ہو سکتا ہے؟ بڑا چودھری یا چھوٹا؟ پہلا تو سر تا پا قدامت کی تصویر تھا۔ اپنے آباؤ اجداد کے دورِ جہالت کی جیتی جاگتی تصویر جو اسی کو اپنی قابلِ فخر میراث سمجھتا تھا جن کے نزدیک شرافت اور شائستگی یا عاجزی اور انکساری انسان کے کمزور اور کمتر ہونے کی دلیل تھے۔ اس کے سپوت کی عادات و اطوار میں بھی ایسی کوئی ''خرابی'' نظر نہ آئی تھی جو تعلیم اور تہذیب سے پیدا ہو۔ مجھے اس کی خاندانی تاریخ کا کچھ پتا نہ تھا۔ اس نے حرم کو چار کی شرعی حد میں رکھا تھا۔ کچھ سیانے خود کو یوں گناہ گار نہیں کرتے کہ ایک نئی منکوحہ کو داخل کرنے سے پہلے کسی ایک کو خارج کر دیتے ہیں۔ جدی پشتی رئیسوں کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلی جگہ اپنے والدین کی خوشی کے لیے کسی چاچے مامے کی بیٹی کو دے دیتے ہیں جہاں وہ ان کے گھر کی سلطنت میں وزیرِاعظم کی حیثیت سے ہمیشہ ممتاز اور فائز رہتی ہے۔ باقی کابینہ کے ارکان کی طرح بدلتی رہیں تو انہیں نہ فرق پڑتا ہے، نہ اعتراض ہوتا ہے۔ حویلی میں انہی کا حکم چلتا ہے اور انہی کا بڑا بیٹا روایات کے مطابق باپ کی جگہ بھی لیتا ہے۔ اکبر کے علاوہ مجھے حویلی میں کوئی شہزادہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ چودھری کی اکلوتی اولاد ہو یا واحد اولادِ نرینہ ہو۔ باقی سب بیٹیاں ہوں یا بیٹے ہوں تو بیرونِ ملک... کسی لڑکی کے اتنا تعلیم یافتہ ہونے کا تصور بھی کرتا تو مجھے اپنے ذہنی عدم توازن کا یقین آجاتا۔ شہری کلچر میں بڑے لوگ اپنی کوٹھیوں میں اسٹڈی بھی بناتے تھے اور جو پبلک لائف میں زیادہ ایکٹیو ہوں، وہ میڈیا کے نمائندوں کو خوب صورت جلد والی کتابوں سے بھری الماریوں والی لائبریری میں انٹرویو دیتے تھے اور مطالعے کی میز پر بیٹھ کے... جاننے والے جانتے ہیں تو کیا کہ ان کی ڈگری جعلی ہے یا کہ خود کو علم کا سمندر بتانے والے درحقیقت جہالت کا جوہڑ ہیں۔

تاہم یہاں لائبریری کی موجودگی سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ خصوصاً اس تہ خانے کی قید میں۔ مقصد اگر نمود و نمائش ہوتا تو یہ سب اوپر کے مہمان خانے میں نظر آتا اور ایک مضافاتی پسماندہ گاؤں میں ایسی ''فضول خرچی'' بھی کون کرتا ہے۔

ایک بار پھر میں نے وہ آہٹ سنی جس نے مجھے چونکا دیا۔ اس مرتبہ واضح طور پر یہ الماری کے پیچھے دیوار کی دوسری طرف سے آئی تھی۔ یہ صاف برتن پھینکے جانے کی آواز تھی۔ پھر کسی نے غصے میں دہاڑ کے مردانہ آواز میں گالیاں دیں۔ ان کا جواب کسی نے بھی نہیں دیا۔ کوئی دروازہ بند ہوا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ کتابوں کی الماری کے پیچھے بھی کوئی کمرا تھا اور وہ کسی ایسے شخص کے استعمال میں تھا جو گالیاں دینے کا اختیار رکھتا تھا۔ ظاہر ہے اس نے گالیاں دیوار کو نہیں دی ہوں گی۔ گالیاں سننے والا محکوم و مجبور تھا کہ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا اور خاموش لوٹ گیا۔ الماری کے پیچھے اینٹوں کی چار انچ والی دیوار بھی ہوتی تو کوئی آواز گزر نہ پاتی۔ کیا درمیان میں صرف الماری کے تختے تھے اور کتابیں؟

دن کا باقی حصہ میں نے ایک گھنٹے میں ساٹھ بار گھڑی دیکھتے... اٹھتے بیٹھتے... جماہیاں اور انگڑائیاں لیتے اور درمیان کی خالی جگہ میں ٹہلتے بڑی اذیت میں گزارا۔ اس دن پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ قیدِ تنہائی کتنی بڑی ذہنی اور جسمانی سزا ہے۔ اس کا احساس مجھے جیل میں ذلت اور مشقت برداشت کرتے ہوئے نہیں ہو سکتا تھا۔ بارہا مجھے شک ہوا کہ گھڑی کی سوئیاں ساکت ہیں اور وقت تھم گیا ہے، یعنی زمین کی گردش رک گئی ہے۔ کئی مرتبہ میں نے تہ خانے میں اترنے والے زینے کے واحد راستے تک جا کے دروازے کو زور زور سے بجایا اور گلا پھاڑ کے کہا۔ ''کوئی ہے؟'' مگر وہاں یہ آواز سننے والا بھی میرے سوا کوئی نہ تھا۔ ایک امید یہ تھی کہ کتابوں کی دیوار کے پیچھے شاید وہ ہی میری پکار سن لے جس کی گالیاں میرے کانوں نے سنی تھیں۔

رفتہ رفتہ انسانی کمزوریاں غالب آنے لگی تھیں اور مجھے بھوک پیاس کا احساس ہونے لگا تھا۔ یہ سارے خوف اب زیادہ شدت کے ساتھ میرے اعصاب پر طاری ہو رہے تھے کہ مجھے اس کشادہ مدفن میں قید کرنے والے پلٹ کر نہیں آئیں گے۔ بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کے میں اپنے ہی جسم کی غلاظت میں دم توڑ دوں گا۔ دیوانہ وار دیواروں سے سر ٹکرا کے... ریشم یا نورین کو... (نورین؟ جواب ایک بھولی بسری کہانی... صرف ایک نام ہے) کبھی معلوم نہ ہو گا کہ وہ جو فرید یا سلیم تھا... وہ اب ہے تو کہاں اور نہیں ہے تو کیوں نہیں...

رفتہ رفتہ روشن دانوں سے چمکنے والا آسمان تاریک ہونے لگا۔ اندر بھی اندھیرا گہرا ہو گیا۔ صاف نظر آتا تھا کہ کچھ دیر میں اندر سیاہ رات بھر جائے گی جس میں اپنا سایہ ہی نہیں، سب کچھ گم ہو جائے گا اور مجھے صبح تک تنہائی کے ساتھ اندھیرے کی قید کا عذاب بھی جھیلنا ہو گا۔ ابھی میرا مقدمہ زیرِ سماعت تھا۔ حوالات میں بھی قیدی کو کھانے پینے

کے لیے ضرور پوچھا جاتا ہے مگر مجھے تو جیسے اسیر کرنے والے اس تہ خانے میں پھینک کر بھول ہی گئے تھے۔ ایک بار پھر میں نے دروازے کو ہاتھوں اور لاتوں سے پیٹا لیکن شور صرف میرے کانوں نے سنا۔ باہر کی دنیا کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

تھک ہار کے میں بیڈ پر گر گیا اور سونے کی ناکام کوشش میں مصروف ہو گیا۔ بھوک پیاس کی انتہا کے ساتھ اعصابی دباؤ بھی ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ ایسے میں نیند کہاں آتی۔ گھڑی میں وقت دیکھنے کا فائدہ بھی کچھ نہ تھا۔ مجھے لگا کہ میں مر چکا ہوں اور وہ تہ خانہ میری قبر ہے۔ پھر مجھے ریشم کا خیال آیا۔ وہ کہاں ہو گی؟ چودھری اکبر کی خلوت گاہ میں؟ وحشتِ خیال نے میرے تصور میں انتہائی شرمناک مناظر بھر دیے جو سب اخلاق باختہ فلموں کے ٹوٹے تھے مگر ان میں کوئی پروفیشنل نہیں، ریشم تھی۔ اس کی داد فریاد کا اس ہوس کے شکاری پر کیا اثر ہو سکتا تھا۔

اچانک خاموشی کو کسی مرد کی آواز نے توڑ دیا۔ وہ چلا رہا تھا۔ ''جاؤ چلی جاؤ... کیوں آتی ہو تم میرے پاس آخر۔''

جواب میں کسی عورت کی سسکی سنائی دی۔ ''میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''

یہ شاید رات کے سکوت کا اثر تھا کہ مجھے دیوار کے اس پار کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں لپک کر بیڈ پر سے اٹھا اور الماری کھول کے ایک قطار کی ساری کتابیں باہر گرا دیں۔ خالی ہو جانے والے شیلف میں منہ ڈالنے سے آوازیں زیادہ واضح ہو گئیں۔

''جس دن میں مر گیا، تمہیں معلوم ہو جائے گا۔''

''خدا کے لیے ایسا مت کہو۔'' عورت نے فریاد کی۔ ''سب تمہاری ضد کی وجہ سے ہو رہا ہے۔''

''شہزادے سے کہو کہ خود آ کے مجھے گولی مار دے۔ اگر خود بادشاہ سلامت میں ہمت نہیں ہے۔''

''میرے جیتے جی ایسا نہیں ہو سکتا۔'' عورت نے کہا۔

''کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں... اس پر تمہارا اختیار کب ہے۔ جاؤ سونے دو مجھے۔''

''آج دن میں بھی تم نے کھانا نہیں کھایا۔ چلو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاتی ہوں۔''

برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی مرد چلایا۔ ''مت کرو یہ ڈراما... جاؤ۔''

عورت کے رونے کی آواز کے ساتھ ہی کوئی دروازہ بند ہوا پھر خاموشی چھا گئی۔ یہ اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوسرے حصے کو الگ کرنے والی لکڑی کی الماری ہی ہے اور اس کی پچھلی دیوار کا تختہ زیادہ موٹا نہیں ہوسکتا ورنہ ادھر ہونے والی گفتگو کا ہر لفظ یوں صاف سنائی نہ دیتا۔ اب میرے ذہن میں ایک نئی الجھن نے جنم لے لیا تھا۔ آخر الماری کے پیچھے والے حصے میں کون تھا؟ کیا وہ بھی میری طرح کوئی قیدی تھا؟ وہ قیدی تھا تو اس کا جرم کیا تھا؟ وہ عورت کون تھی جو اس کے کھانا نہ کھانے سے دکھی تھی؟

دوسری طرف اب مکمل خاموشی تھی لیکن سوالات خود بخود میرے ذہن میں پیدا ہوتے جارہے تھے اور یہ زنجیر لمبی ہوتی جارہی تھی۔ بالآخر میں نے رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ دوسری طرف میرے جیسا کوئی بدقسمت ہے تو ہم ایک دوسرے کی غم گساری تو کرہی سکتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ کوئی لاوارث نہیں تھا۔ حویلی میں ہی کوئی عورت تھی جو اس کے لیے دکھی تھی لیکن وہ اس کے لیے کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ وہ قیدی کی ماں تھی، بہن یا بیوی... اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس سے رابطے میں کوئی رسک میرے لیے نہیں تھا۔ آخر وہ شہزادہ اور بادشاہ سلامت کسے کہہ رہا تھا؟ چھوٹے اور بڑے چودھری کو؟ وہ مجرم تھا تو اسے قید میں زندہ رکھنا کیوں ضروری تھا اور اب تک سزائے موت کیوں نہیں دی گئی تھی؟

میں نے پھر اندھیرے میں اندازے سے سمت کا تعین کیا اور کتابوں کی الماری کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ باہر گرائی ہوئی کتابوں کو دور ہٹا کے میں نے سیدھے ہاتھ سے الماری کے پیچھے والے تختے کو بجایا۔ یہ تختہ دیوار جیسا نظر آتا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس پر اوپر سے نیچے تک سفید کاغذ بڑی صفائی سے چسپاں کیا گیا تھا اور کاغذ پر بھی بار بار سفیدی ہوتی رہی تھی۔ ہاتھ لگاتے ہی مجھے اس کا اندازہ ہوگیا۔ میں نے ناخن سے کھرچ کے کاغذ کو ایک جگہ سے چھیلا اور کھینچ کر پھاڑ دیا۔ لکڑی کے تختوں میں جھری نے روشنی کی ایک لکیر سی کھینچ دی۔ میرا حوصلہ دوچند ہوگیا۔ میں نے دوسری بار زیادہ زور سے تختے پر ہاتھ مارا۔

ایک مختصر وقفے کے بعد دوسری طرف سے کسی نے خوابیدہ لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

میرا دل ایک دم دھڑکا۔ ”کیا میں تم سے بات کرسکتا ہوں؟“

جواب میں کچھ حیرت شامل ہوگئی۔ ”کیا بات کرنی ہے اس وقت؟... کون ہو تم؟“

”ایک قیدی ہوں میں... چودھری کا مجرم۔“

”وہ تو میں بھی ہوں... مجھ سے کیا چاہتے ہو تم؟“

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ معمولی کامیابی بھی مجھے اس روشنی کی لکیر جیسی لگی جو درز میں نمودار ہوگئی تھی۔

”اگر تم قریب آجاؤ تو ہم ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتاسکتے ہیں۔“

”پہلی بات تو یہ کہ میں قریب نہیں آسکتا۔ میرے ایک پیر میں زنجیر ہے اور وہ صرف دس فٹ لمبی ہے اور ایک دوسرے کے بارے میں جان کے بھی کیا ہوگا؟“

”شاید رہائی کی کوئی صورت نکل آئے۔“

”تم نے کیسے فرض کرلیا کہ میں رہائی کا خواہش مند ہوں؟“ وہ تلخی سے بولا۔

”تم نے اپنی خوشی سے تو پاؤں میں بیڑی نہیں پہنی ہوگی۔“

”اگر ہمت ہے تو درمیانی تختے توڑ کے راستہ بناؤ اور ادھر آجاؤ۔“ وہ بولا۔

”شاید میرے لیے یہ مشکل ہوگا، ناممکن نہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ پھر میں تمہارے پیر کی زنجیر بھی کاٹ دوں۔“ میں نے کہا۔

”کیا؟“ وہ طنز سے بولا۔ ”کوشش کرکے دیکھ لو۔“

ذہنی و جسمانی تھکان کے باوجود اس اچانک سامنے آنے والی صورت حال نے میرے جسم میں توانائی بھردی۔ میں نے الماری کے خانے میں لیٹ کر تختے کو شانے سے دھکے دیے لیکن وہ شیشم کی مضبوط لکڑی تھی۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میرا شانہ درد کرنے لگا۔ باہر نکل کے میں نے اپنی دونوں ٹانگیں تھوڑی سی اٹھا کے خانے میں داخل کردیں اور تختے کو زور زور سے لاتیں ماریں۔ وہ اتنی مضبوطی سے جڑا گیا تھا کہ ہلا تک نہیں۔ اب میں نے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس کباڑ خانے میں کیا کچھ ہے اور ایسی کون سی چیز ہے جسے میں تختہ توڑنے کے لیے استعمال کرسکتا ہوں اور وہ چیز کہاں پڑی ہوئی ہے۔ آج میرا اس قید خانے میں پہلا ہی دن تھا۔ اندر کا نقشہ میرے تصور میں تھا اور احتیاط سے چل کر میں کسی بھی جگہ منہ کے بل گرتے ہوئے بچ بھی سکتا تھا لیکن تمام کاٹھ کباڑ میں ایسی کوئی چیز مجھے یاد نہ آئی جس کو میں ہتھوڑے کی طرح استعمال کرسکتا۔

”کیا ہوا؟“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ہمت ہار گئے؟“

”میں اتنی جلدی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”سوچ رہا ہوں تختہ توڑنے کے لیے کیا استعمال کروں... مگر اندھیرے میں سجھائی کچھ نہیں دیتا۔“

”تمہاری طرف بجلی کی روشنی نہیں ہے؟“

”سوئچ اور ہولڈر تو لگے ہوئے ہیں۔ بلب نکال لیے گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

اچانک مجھے بان کی ایک پرانی چارپائی کا خیال آیا۔ اس کے ساتھ ہی جیسے مجھے مسئلے کا حل مل گیا۔ اب میں نے آنکھیں بند کرکے اس ہال جیسے کمرے کا تصور کیا کہ اس میں کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی ہے۔ میں نے بہت آہستہ آہستہ فرش پر قدم بڑھائے کہ اندازے کی غلطی سے میں ٹھوکر کھا کے منہ کے بل نہ گروں۔ اس کے باوجود میری پنڈلی پر چوٹ لگی۔ اندھیرے میں جھک کر ہاتھ چلاتا میں اس چارپائی تک پہنچ ہی گیا۔ یہ بان کی پرانی چارپائی تھی جو شاید بارش اور دھوپ میں پڑی رہی ہوگی۔ نیچے بیٹھ کر میں نے ایک پائے کو ہلا کر دیکھا۔ وہ ٹائٹ فٹ نہیں تھا۔ پائے کو ایک ہاتھ سے پکڑ کے میں نے پٹی ہلائی اور پھر زور لگایا تو چند جھٹکوں میں پایہ ایک طرف سے الگ ہوگیا۔ میرا کام آسان ہوگیا۔ دوسری پٹی زیادہ آسانی سے نکل گئی۔ پایہ اب ایک خاصے بڑے ہتھوڑے کی طرح میرے ہاتھ میں تھا لیکن میں اس سے الماری کے تختے پر ضرب لگاتا تو گونج دونوں طرف سنائی دیتی۔

کامیابی اب مجھے اپنی دسترس میں دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے ایک پرانے بستر کے اوپر سے کپڑے کا استر جدا کیا اور اسے پگڑی کی طرح پائے پر باندھ دیا۔ یہ آواز دبانے کا موثر طریقہ تھا مگر پھر بھی مجھے یوں لگا جیسے دھماکا اوپر تک سنا گیا ہوگا۔ اب جو ہو سو ہو۔ میں نے سوچا اور تختے پر دوسرا اور زیادہ قوت سے کیا۔ تختہ ضرور ہل گیا ہوگا۔ جب میں نے اس پر لات ماری تو وہ نکل کے دوسری طرف جا پڑا۔ دوسری طرف کی روشنی ایک دم مجھ پر پڑی۔ میں نے ایک نظر میں پورا منظر دیکھ لیا۔

وہ نسبتاً چھوٹا اور ضروری سامان سے آراستہ کمرا تھا۔ آخری حصے کی مسہری پر ایک شخص پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے ایک پیر میں زنجیر تھی جس کا دوسرا حصہ دیوار میں پیوست تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے زیادہ نہ تھا۔ اگر فرق ہوگا تو دو چار سال کا لیکن وہ جسمانی طور پر انتہائی کمزور تھا۔ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا۔ اس کے سر کے بال بے ترتیب انداز میں بڑھے ہوئے اور داڑھی بھی چہرے پر خود رو گھاس کی طرح اگی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر ملیشیا کے رنگ کا شلوار قمیص تھا اور وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں خلا سے نازل ہونے والی مخلوق ہوں۔

میں نے خود کو الماری کے خلا سے گزارا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ”میرا نام میاں سلیم ہے۔“ میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ ”آج کل۔“

اس نے اپنا کمزور ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور مسکرایا۔ ”میں انور علی ہوں۔ اس حویلی کا مالک... آج کل۔“

میرے ذہن کو شاک سا لگا۔ ”تم... اکبر علی کے بھائی ہو؟“

”ہاں... بڑا بھائی۔“ وہ بولا۔ ”ایک سال سے میں نے باہر کی دنیا نہیں دیکھی... بیٹھو۔“

میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی بات کو غلط سمجھنے کی وجہ ہی کوئی نہ تھی۔ وہ ہوش مند آدمی تھا اور اس کے لہجے میں سچ کا اعتماد تھا۔ ”اگر تم چودھری کے جانشین ہو تو... کس جرم میں قید ہو؟“

”یہ لمبی بات ہے۔ وہ سب کتابیں میری ہیں جو تم نے الماری میں دیکھی ہوں گی۔“

میرے ذہن کو حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ ”وہ... ادب اور فنِ تعمیر پر کتابوں کا ذخیرہ...“

”ہاں... مجھے پڑھنے کا شوق تھا مگر اسی تعلیم نے میرا دماغ الٹ دیا تھا۔ جب میں لاہور کے گورنمنٹ کالج سے بی اے کررہا تھا تو مجھے تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ پرانے شہر اور قدیم عمارات نے مجھے مسحور کرلیا۔ پھر میں پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا۔ آٹھ سال باہر ہی رہا اور روم سے مصر تک پھرتا رہا۔ میں نے فنِ تعمیر میں ڈگری لے لی۔ ظاہر ہے اس کا یہاں کوئی مصرف نہ تھا۔ میں نے غلطی کی جو واپس آگیا۔ تم کون ہو؟“

میں نے حیرانی پر قابو پا کے کہا۔ ”ابھی صرف اتنا بتانا کافی ہے کہ میں ایک مفرور مجرم ہوں۔ پولیس کے علاوہ بھی بہت سے لوگ میری تلاش میں ہیں۔“

”تمہارا جرم کیا تھا؟“ وہ بولا۔

”کچھ لوگوں کا واحد جرم شمار کیا جائے تو صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ غلط وقت پر یا غلط جگہ پیدا ہوگئے مگر ظاہر ہے یہ جرم نہ کرنا ان کے اختیار کی بات نہیں ہوتی۔ پھر وہ زندگی میں جو بھی کرتے ہیں، جرم بن جاتا ہے یا بنا دیا جاتا ہے۔ شاید میں اور تم بھی انہی میں شامل ہیں۔“

”بتانا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔“

میں نے کہا۔ ”میری بات بھی لمبی ہے۔ وہ جو دنیا جانتی ہے اگر تم بھی جان لوگے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔“ میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے کہا اور اسے وہ سب بتا دیا جو سچ تھا۔ میری نظر اس قید خانے کا جائزہ لیتی رہی جو شاید پندرہ فٹ کا ویران کمرا تھا۔ سادہ سے پرانے بیڈ کے علاوہ اس میں ایک مختصر سی میز بھی اور ایک کرسی۔ میز پر ایک ٹرے میں کھانا تھا۔ کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں۔ سالن اور پانی کا ایک گلاس۔

اس نے دیکھا کہ میری نظر کہاں ٹھہر گئی ہے۔ ”تم نے کھانا کھایا ہے؟“

میں نے خفت سے کہا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ... کل رات کھایا تھا۔ اس کے بعد نہیں۔“

”پھر تکلف مت کرو۔ یہ کھانا تم کھالو۔“

میں نے انکار کیا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا... پھر تم بھوکے رہ جاؤ گے۔“

”میری بھوک پیاس مر چکی ہے۔ زندہ رہنے کی خواہش زندہ ہے اس لیے کھانا پڑتا ہے ہم دل چاہے نہ چاہے۔ دن کا کھانا بھی میں نے شام کو کھایا تھا۔ اس وقت بالکل خواہش نہیں ہے۔“

”مجھے قائل کرنے کے لیے تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کل کھانا نہ آیا پھر کیا ہوگا؟“

وہ تلخی سے ہنسا۔ ”اس ایک سال میں جو میں نے اسیری میں گزارا ہے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ تم نہیں کھاؤ گے تو یہ کھانا پڑا رہے گا... صبح ناشتا لانے والا اٹھا کے لے جائے گا۔“

”اتنا خیال رکھا جاتا ہے تمہارا... کیوں؟“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”خدا کی مصلحت خدا ہی جانے... میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس نے زندگی کی جتنی مہلت رکھی تھی، وہ ابھی تمام نہیں ہوئی چنانچہ اس نے کسی کو وسیلہ بنا دیا ہے۔ تم کھانا کھاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا، یہ ہم دونوں شیئر کر سکتے ہیں۔“

”یہ تکلف کی جگہ نہیں ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ میں رات کا کھانا نہیں کھاتا۔“

کرسی پر بیٹھ کے میں نے میز کو اپنی طرف کھسکا لیا۔ ”اوکے... وہ تمہیں قید رکھنے والا بھائی تو نہیں ہو سکتا... پھر کون ہے جو تم پر اتنا مہربان ہے؟ جو چاہتا ہے کہ تم زندہ رہو۔“

”کون ہو سکتا ہے وہ اس کے سوا جس کے وجود کا میں حصہ ہوں۔“

میرا ہاتھ رک گیا۔ ”تمہاری ماں؟“

”اس کی قسم نے مجھے پابند کر دیا ہے کہ میں حوصلہ نہ ہاروں۔“ اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”اب میں چاہوں تب بھی مر نہیں سکتا۔ وہ میرے سامنے ڈھال بن گئی ہے۔ اس نے قاتل کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔ اکبر میں اتنی ہمت نہیں کہ پہلے اسے راستے سے ہٹائے۔“

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں کھانا ختم کر کے میں نے پانی کا گلاس حلق میں انڈیلا اور خدا کا شکر ادا کر کے ایک گہری سانس لی۔ شاید یہ کھانا ہم دونوں کو بھی کافی ہوتا جو شدید بھوک میں اکیلا میں ندیدوں کی طرح نگل گیا۔ میری جسمانی توانائی کا گراف تیزی سے بڑھا۔ تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ مجھے اور انور علی کو اس قید خانے میں ڈال کر بھول جانے والے چودھری اکبر علی سے بھی ایک بھول ہوگئی تھی۔ اس نے خود کو قضا و قدر کے فیصلے کرنے پر قادر سمجھ لیا تھا۔ یہ بھول گیا تھا کہ وہ قادر مطلق نہ چاہے تو زنجیروں اور دیواروں میں کون کسی کو اسیر رکھ سکتا ہے۔

انور علی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”کس خیال میں گم ہو؟“

”کچھ نہیں، یہ سوچ رہا تھا کہ ایک دیوار نے کتنی آسانی سے راستہ دے دیا مگر باقی دیواریں موجود ہیں۔“

”ایک اور ایک گیارہ ہو گئے ہیں۔ یہ وہی اندھے اور لنگڑے کی کہانی ہے۔ ایک آنکھوں سے راستہ دکھاتا تھا، دوسرا ٹانگوں سے آگے بڑھتا تھا۔ ہم اور تم الگ الگ تھے تو بے وسیلہ تھے۔ اب میں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔ کرو گے تم کیونکہ تمہارے پیروں میں زنجیر نہیں ہے۔“

میرا دل ایک نئے جوش اور ولولے سے بھر گیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور کھڑا ہو گیا۔

وہ مسکرایا۔ ”ابھی نہیں... صبح ہونے دو۔“ اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں بھی ایک زینہ ہے۔ اس دروازے کے باہر بھی قفل ہے۔ اوپر دوسرے دروازے میں بھی۔ اوپر ایک مسلح محافظ چوبیس گھنٹے موجود رہتا ہے۔ صبح جب میرے لیے چائے لائی جائے گی تو وہ پہلے اوپر والا دروازہ کھولے گا۔ اس کی آواز صاف سنائی دے گی پھر وہ ناشتا لانے والے کو اندر داخل کرنے کے لیے نیچے کا دروازہ ایک منٹ کے لیے کھولے گا اور باہر کھڑا اس کی واپسی کا انتظار کرے گا۔ یہ ایک منٹ کا وقفہ ہوگا جس میں تم کچھ کر سکتے ہو۔“

”ایک منٹ تو بہت ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ساڑھے سات سیکنڈ کافی ہوں گے اسے ناک آؤٹ کرنے کے لیے۔“

”اچھا... کیا تم باکسر ہو؟“ وہ مسکرایا۔ ”وہ بھی مضبوط جسم کا جوان آدمی ہے اور فوج میں بھی تھا۔“

”میں نے جیل میں بھی جوڈو کراٹے کی پریکٹس چھوڑی نہیں تھی۔ وہاں ایک بلیک بیلٹ عمر قید کاٹ رہا ہے۔ اس نے ایک رقیب کی گردن توڑ دی تھی۔ میری مہارت کا عملی مظاہرہ تم بھی دیکھ لو گے۔“

”وہی میری زنجیر کے تالے کی چابی رکھتا ہے مگر پہلے تمہیں اس سے اسلحہ لینا ہوگا۔“

”ناشتا لانے والا کون ہوگا؟“

”وہ فائٹر نہیں ہے۔ کوئی ملازم ہوگا کچن کا۔“

میں نے کہا۔ ”کیا اس گارڈ کی وردی میرے جسم پر فٹ آ جائے گی؟“

”فٹ تو نہیں... مگر آ جائے گی۔ تھوڑی سی بڑی ہو گی لیکن تمہیں بھیس بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟ آگے راہنمائی میں کروں گا۔ اوپر والے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی میں قیدی نہیں رہوں گا، مالک ہو جاؤں گا۔ تمہاری راہ میں کوئی حائل ہونے کی ہمت کر سکتا ہے تو خود اکبر علی۔“

”اس سے میں نمٹ لوں گا۔ بڑے چودھری صاحب کا کیا ہوگا؟“

”کچھ نہیں۔ وہ بے بس اور خاموش تماشائی ہے۔ بڑے بیٹے کی جگہ اس قید خانے میں چھوٹا آ جائے گا، وہ تب بھی چپ رہے گا۔ شاید اسے موقع ملتا تو وہ بھی میری رہائی کے لیے کوشش کرتا۔ اس ایک سال میں یقیناً اسے اندازہ ہوا ہوگا کہ میرے مقابلے میں چھوٹے بیٹے کی حمایت اسے مہنگی پڑی۔“

”آخر اس اختلاف کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟“

”ہاں، یہ زمین اور جائداد... ہم سب اس پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے تو زندہ ہیں۔ خون کا رشتہ کبھی زمین کے رشتے سے زیادہ طاقتور نہ تھا، نہ ہوگا۔ ہم اس پر سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ اپنی جان بھی... ہم اس کے ایک ایک انچ کی خاطر جان دینا اور لینا دونوں جائز سمجھتے ہیں۔ میں جب دنیا گھوم کے آیا تو میرے خیالات بدل چکے تھے۔ میں نے اعلان کر دیا کہ اپنے حصے کی زمین چھوڑ دوں گا۔ اس پر کاشت کرنے والے میرے غلام ہاری نہیں، زمین کے مالک ہوں گے۔ پیداوار سب ان کی ہوگی۔ سب کے حقوق برابر ہوں گے۔ مرتبہ ایک ہوگا۔ سب نے کہا کہ میرا دماغ زیادہ پڑھنے سے خراب ہو چکا ہے۔“

”شاید ایسا ہی ہوا تھا۔“ میں نے ہنس کے کہا۔ ”یہاں تمہیں علاج کے لیے رکھا گیا تھا۔“

”اگر ایسا ہوتا تو سب سکھی ہو جاتے۔ میں... میری ماں اور میرے معالج... یعنی میرا باپ اور میرا بھائی۔“

”تمہارے باپ کا خیال بھی یہی تھا؟“

”اس کو یہ سوچ ورثے میں ملی تھی۔ یہ ایک نسل سے دوسری نسل تک خون میں منتقل ہوتی تھی اور عمر کے ساتھ ساتھ پختہ تر ہوتی جاتی تھی۔ آباؤ اجداد کے زمانے سے یہی خالص خون کی پہچان رہی ہے۔ حاکمیت اور نام و نسب کی برتری کا غرور ہی ہماری پہچان رہا ہے چنانچہ میری باتیں بڑے چودھری صاحب کے لیے تشویش اور پریشانی کا سبب بن گئیں۔ ان کے نزدیک یہ کم ذات اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں کی سوچ تھی۔ اگر میں اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر نہ گیا ہوتا تو شاید جواب دہ میری ماں کو ہونا پڑتا کہ وہ میرے اصل باپ کا نام بتائے اور اس گناہ کا تاوان بھگتے۔ حویلی کی چار دیواری کے کڑے پہرے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ عورت اپنے مجازی خدا کے سوا کسی کے بارے میں سوچنے کی ہمت بھی کر سکے۔ مگر ایک اور بنیادی عقیدے کے مطابق گناہ صرف عورت کی سرشت میں ہے اور مرد کو بھی گناہ کی طرف وہی لے جاتی ہے چنانچہ وہ پہرے داروں کو بھی گناہ کی دلدل میں کھینچ سکتی ہے۔ میرے کیس میں الزام خود مجھ پر اور میری تعلیم پر آیا۔ مغربی تعلیم کفر و گناہ کی طرف لے جاتی ہے، آگہی اور شعور کی طرف نہیں۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ سب افسوس سے کہتے تھے کہ مجھے اتنا پڑھانے کی ضرورت کیا تھی اور ولایت بھیجنا تو بڑے چودھری صاحب کی غلطی نہیں گناہِ کبیرہ تھا۔ پھر جب میں کہتا تھا کہ میں تو آج بھی یہ جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا... میرے لاجواب کر دینے والے دلائل سے زچ اور پاگل ہو کے باپ نے عاق کرنے کی روایتی دھمکی سے میرا علاج کرنا چاہا اور بالآخر چھوٹے بھائی نے کسی سرجن کی طرح خاندان کے اس کینسر کو جڑ سے نکال پھینکنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے باپ نے بادل ناخواستہ بہت مجبور ہو کر اس کی... منظوری دے دی۔ اس وقت ماں کی ممتا اس فیصلے پر عمل درآمد کی راہ میں دیوار بن گئی۔ مجھے کوڑھیوں کی طرح اس قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ باپ پہلے بھی یہ امید لے کر آ جاتا تھا کہ شاید میرے خیالات میں کوئی تبدیلی آئی ہو مگر پہلے سے زیادہ دکھی اور مایوس ہو کے لوٹ جاتا تھا۔ صرف ایک میری ماں سب کی مرضی کے خلاف مجھے ہر ممکن سہولت فراہم کرتی رہی۔“

”تم نے یہ زندگی کس امید پر قبول کی؟“

”ایک تو میرا اپنا ایمان تھا کہ خدا بہرحال منصف مزاج ہے۔ اسے زندہ رکھنا ہوگا تو اس کی سبیل بھی پیدا کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

دے گا۔ دوسرے ماں نے میرے گرد جذبات کی حفاظتی دیواریں کھڑی کر دیں جو میں عبور نہیں کر سکتا تھا۔ ماؤں کا سب سے موثر حربہ کیا ہوتا ہے؟ اپنی قسم... اپنا دودھ نہ بخشنے کی دھمکی... یوم حشر دامن گیر ہونے کی دھمکی... اور مسلسل یقین دہانی کہ اللہ بہتر کرے گا۔ میرے خیالات وہ بھی نہیں بدل سکی تھی۔ اس نے مجھ سے زبان بند رکھنے کا مادری حلف نامہ لے لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے جیسے ناخلف اور باغی پر اپنی ماں تا نچھاور کرنے کی اسے کیا سزا بھگتنا پڑتی ہے۔"

خاموشی کے ایک اور وقفے کے بعد میں نے کہا۔ "اس ایک سال کی قیدِ تنہائی سے تمہیں کوئی افاقہ ہوا؟"

"علاج کرنے والے جانتے تھے کہ میں دنیادار بھی نہیں ہوں اور دین دار بھی۔ مجھے اکیلا رہنا مشکل نہیں ہوگا اگر میری خواہش کے مطابق مجھے کتابیں، اخبار، رسالے فراہم کر دیے گئے تو میں تنہائی میں بھی اپنی دنیا آباد رکھ سکتا ہوں۔ چنانچہ مجھے زندہ رہنے کے لیے صرف جسم کی غذا فراہم کی گئی۔"

"یعنی رہائی پا کے تم وہی کرو گے جو کرنا چاہتے تھے؟"

"شاید... دراصل یہ اتنا آسان بھی نہیں... اس زمین کا حقِ ملکیت حاصل کرنے کے لیے مجھے صرف قانونی جنگ نہیں... وہ جہاد کرنا پڑے گا جس میں میرے دشمن میرے اپنے ہوں گے... اگر کسی طرح مجھے اپنے حصے کی زمین پر ملکیت کا حق حاصل ہو جائے تب بھی مشروط ہوگا کہ انہیں میں اپنے پاس رکھوں... اس کا ایک ٹکڑا خیرات میں بھی کسی کو نہ دوں... اور بفرضِ محال... میں اعلان کر دوں کہ میرے مزارع آ کے مجھ سے ملکیت کا حق لے لیں تو کس میں ہمت ہے کہ یہ حق لینے آئے... اور پھر زندہ بھی رہے۔ وہ اور اس کا خاندان اسی زمین میں گاڑ دیے جائیں گے۔ یہ اندازہ ہو گیا ہے مجھے۔"

"پھر... کیا تم یہ زمین بیچ بھی نہیں سکتے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی اپنی ماں کی عزت بیچ سکتا ہے۔ یہاں دھرتی کو ماں سے بڑھ کر سمجھا جاتا ہے لیکن میں نے اس قید میں سوچنے کا بہت کام کیا۔ میری ساری مصروفیت یہی تھی۔ مجھے اور بہت کچھ سوجھا ہے جو قابلِ عمل ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں ایک ڈیل کر کے اپنے حقِ ملکیت سے دستبردار ہو جاؤں۔ اس کی قیمت وصول کر لوں اور پھر جہاں چاہوں چلا جاؤں... جو چاہے کروں... یہ ڈیل نہ ہو سکی تو پھر وہی ہوگا جو تخت نشینی کی جنگ میں اورنگ زیب نے بھی کیا تھا۔ تخت بہرحال ایک ہی ہے... دوسرے کے لیے تختہ۔"

"فنا اور بقا کی جنگ میں ہر جگہ ہر دور میں ایسا ہی ہوا ہے۔ بقا صرف طاقتور کے لیے ہے، مستحق کے لیے نہیں۔"

میں نے ایک بار پھر غیر ارادی طور پر گھڑی دیکھی۔

"وقت تمہارے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے اور تمہارا بار بار گھڑی دیکھنا مجھے بھی نروس کر رہا ہے۔ ایک سال گزر گیا مگر ایک رات مجھے بھی زیادہ لمبی لگ رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ایک شعر سناؤں حسبِ حال...

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کا
طولِ شبِ فراق کو تو ناپ دیجیے

وہ مسکرایا۔ "اس رات کی صبح بھی ہو جائے گی۔ آسمان پر اجالا ہوگا تو پہلے روشن دان سے دکھائی دے گا۔ پھر فیصلہ کن لمحہ اپنی آمد کی اطلاع دے گا جب اوپر والے دروازے کا قفل کھولے جانے کی آواز آئے گی۔ تم نے فیض کی نظم "زنداں کی ایک صبح" پڑھی ہے؟ اس میں کیا کمال منظرکشی ہے۔ رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آ کر... چاند نے مجھ سے کہا جاگ سحر آئی ہے... دیکھو... روشن دان سے ہماری زنداں کی آخری شب کے آخر کا چاند جھانک رہا ہے۔"

میں نے اس کے نزدیک جا کے دیکھا۔ چاند جیسے مسکرا رہا تھا اور چاندنی کی کرنوں سے مبارک باد بھیج رہا تھا۔ ہم دونوں منہ اٹھائے چاند کو اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک کہ وہ روشن دان سے آگے نہیں نکل گیا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے بھی اس منظر نے اتنا جذباتی کر دیا کہ خوشی اور شکر گزاری کے آنسو میری آنکھوں سے بھی بہہ نکلے۔ اس کے اور میرے لیے ایک نئی زندگی کی نوید اور امید کسی کوشش یا دعا کے بغیر اچانک آئی تھی۔ میں بہت پُرامید تھا پھر بھی ناکامی کے امکانات کو مسترد نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت مختلف تھی۔ اب تک خدا کے منصف مزاج ہونے پر اس کا یقین راسخ رہا تھا۔ اب جیسے میری صورت میں خدا نے تائید ایزدی فراہم کی تھی تو وہ امید اور ناامیدی کے پلِ صراط پر سے گزر رہا تھا۔ آنے والی صبح اس کے لیے آزادی اور نئی زندگی کی نوید لائے گی یا اس کی زندگی کی آخری صبح ثابت ہوگی... اس کا انحصار میری کامیابی یا ناکامی پر تھا۔ وہ خود اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اسے آنکھیں بند کیے سر جھکائے دیکھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ دعا مانگ رہا تھا یا سو رہا تھا؟ مجھے اس کی حالت پر افسوس ہوا۔ میری طرح وہ بھی جرمِ بے گناہی کی سزا کاٹ رہا تھا۔ اس کی اصل عمر تیس سال سے کم ہی ہوگی مگر وہ چہرے کی تھکن اور اذیت... گہرے حلقوں میں اتری ہوئی ویران آنکھوں اور کمزور جسم سے پچاس سال کا بیمار بوڑھا نظر آتا تھا۔ ایک حساس سوچنے والا ذہین دماغ جس میں دنیا بھر کی کتابوں کی دانش اور سیاحت کا تجربہ بھرا ہوا تھا، اس کا سب سے بڑا عذاب تھا۔ شاید جسم مزید کچھ عرصہ پابندِ سلاسل رہتا تو روح از خود اس اذیت خانے کو چھوڑ دیتی۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "انور علی! تم چاہو تو کچھ دیر کے لیے سو جاؤ۔"

اس نے آنکھیں کھول کے سر اٹھایا۔ "جیل میں تم سزائے موت کے منتظر تھے۔ اگر تمہارے لیے پھانسی کی تاریخ آ جاتی تو کیا آخری رات تم سو سکتے تھے؟"

"اللہ سے بہتری کی امید رکھو۔" میں نے کہا۔

باہر نہ جانے کہاں سے موذن کی صدا ابھری۔ دور سے آنے والی یہ آواز میں تب سے سن رہا تھا جب سے ہوش سنبھالا تھا مگر اس وقت جیسے اس آواز نے میرے دل کے تاروں کو جھنجوڑ دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے ہفت افلاک سے پکارنے والی یہ صدا مجھے احساس دلا رہی ہے کہ دیکھ بندے... تو لاکھ اپنے رب کی طرف سے غافل ہو، یہ اس کی شانِ ربوبیت ہے کہ وہ اپنے بندے سے غافل نہیں۔ مجھے کوئی اندازہ نہ تھا کہ قبلہ کس سمت میں ہوگا۔ نہ یہاں وضو کا اہتمام تھا مگر میں نے دست بستہ ہو کے نیت باندھ لی۔ مجھے زندگی کی وہ پہلی عبادت لگی جس میں میرا جسم ہی نہیں، روح بھی شریک تھی۔ اس کیفیت میں بلا اختیار آنکھوں کا اشکبار ہونا بھی ایک قدرتی بات تھی۔

جب میں نے سلام پھیرا تو مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ انور علی بھی شریکِ نماز تھا۔ اس نے مسکرا کے میری طرف دیکھا۔ "ایسی صبح میری زندگی میں کبھی نہ آئی تھی۔"

"یہ سب کتنا غیر متوقع تھا اور اچانک۔" میں نے اپنے قید خانے اور اس کمرے کے درمیان کی دیوار کو دیکھا جس میں ایک تختہ نکل جانے سے راستہ نکل آیا تھا۔

"ایسا میں نے بھی کبھی سوچا نہیں تھا۔"

"تم نے یہ ضرور سوچ رکھا تھا کہ کبھی رہائی نصیب ہوئی تو تم کیا کرو گے؟"

"ہاں، پہلے بہت سے خیالی منصوبے تھے۔ وہ مکمل ہو گئے تو میں نے سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔"

"میری زندگی بھی ابھی ایک مسلسل فرار ہے۔"

"تم چاہو تو یہاں قیام کر سکتے ہو۔ میرے ساتھ خیالی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تو میرا واحد مقصدِ حیات نورین کو تلاش کرنا ہے۔ اگر وہ اسی دنیا میں ہے تو زندگی کی آخری سانس تک میں تلاش جاری رکھوں گا اور اس تلاش میں کبھی کوئی مقام ایسا آیا جہاں مجھے اعتبار آ گیا کہ اب اس سے پھر میدانِ حشر میں ہی ملاقات ہوگی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ لوٹ کے تمہارے پاس ہی آؤں گا۔"

"پھر تو میں بھی دعا کروں گا کہ نورین تمہیں جلد از جلد مل جائے۔"

"مجھے دکھ اور پچھتاوا ہے کہ میں نے ایسا نہ چاہتے ہوئے بھی یہاں اتنا عرصہ قیام کیا۔ میں انتظار کرتا رہا کہ وہ جہاں بھی ہو، لوٹ کے یہاں آ جائے... اور اس خیال سے مجھے بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا... اگر مجھے کوئی ثبوت مل جاتا کہ نورین کی زندگی اس حادثے کی نذر ہو گئی تو مجھے صبر آ جاتا... حادثہ بہت سنگین تھا لیکن میں بچ گیا تھا... کیا پتا وہ بھی بچ گئی ہو۔"

"مجھے بتاؤ اس تلاش میں کس طرح میرے وسائل تمہارے کام آ سکتے ہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میری زندگی صرف ایک تلاش ہی نہیں... فرار بھی ہے، ان سے جو مجھے تلاش کر رہے ہیں... میری ایک ذمے داری ریشم بن گئی تھی۔ وہ میں تمہارے سپرد کر جاؤں گا۔ تم اس کی حفاظت کر سکتے ہو۔"

اس نے درمیان کی دیوار کے خلا کی طرف دیکھا۔ "جو اندر آئے گا اس کی نظر پہلے یہ دیکھے گی۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ تمہیں بروقت خیال آ گیا۔ اسے میں بند کر دیتا ہوں۔"

الماری کا الگ ہونے والا تختہ ٹوٹا نہیں تھا۔ وہ بہت سی باریک اور چھوٹی کیلوں کے نکل جانے سے الگ ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کے احتیاط سے واپس اپنی جگہ لگایا۔ کیلیں سیدھی تھیں۔ اوپر نیچے کی چند کیلیں اپنے سوراخ پر بیٹھ گئیں تو باقی خود بخود اپنی پرانی جگہ پر جم گئیں۔ میں نے تختے کو آہستہ سے دبایا تو ہر کیل نے اپنی جگہ پکڑ لی۔ میں نے اسے گھٹنے سے دبایا تو تختہ اپنی پرانی جگہ پر قائم ہو گیا۔ کھڑے ہو کے میں نے اس پر چاروں طرف کک ماری۔ اب تختے کے پھر نکلنے کا کوئی چانس نہ تھا۔

انور علی نے سر ہلا کے اطمینان کا اظہار کیا۔ "اب کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے روشن دان کے اجالے کو دیکھا اور ایک بار پھر گھڑی کی طرف۔ ”سات بجنے والے ہیں۔“

”گیٹ ریڈی... اب کسی بھی وقت ایکشن کا لمحہ آسکتا ہے۔“

میری اعصابی کشیدگی کا یہ وقفہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ میں نے کمرے میں ہی چل پھر کے اور ہاتھوں پیروں کو ایکشن کے انداز میں ہلا کے دس منٹ بھی نہیں گزارے تھے کہ اوپر سے تالا کھولے جانے کی آواز آئی پھر دروازہ کھلا۔ انور علی نے ایک دم لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں اور میں دوڑ کر اندر والے دروازے کے ساتھ دیوار سے چپک گیا۔ اس طرح کہ اندر آنے والے کی نظر دوسری طرف ہو اور میں پیچھے سے اسے دبوچ لوں۔

میں نے سانس روک کے سنا۔ اوپر سے دو افراد کے نیچے اترنے کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ ایک نے کچھ کہا اور دوسرے نے جواب میں کہا۔ ”روز ایک ہی بات نہ بولا کر۔ میں کون سا گھنٹا لگاتا ہوں۔“ پھر دروازے کا تالا باہر سے کھولا گیا۔ میرے اعصاب پوری طرح کھنچ گئے اور میں نے آنکھیں بند کر کے آخری بار اپنے معبود اور مسجود سے مدد مانگی۔ پھر دروازہ کھلا اور ایک داڑھی والا ادھیڑ عمر شخص اپنے دونوں ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے اندر آیا۔ میں نے گہری سانس لی اور دس تک گنا۔ ٹرے والا انور علی کے بیڈ تک نصف فاصلہ طے کر چکا تھا جب میرا جسم حرکت میں آیا۔ نصف کھلے دروازے کے پیچھے میں کسی کی موجودگی کو محسوس کرسکتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے کان اس کے تنفس کی آواز بھی سن رہے تھے۔

وہ ایک مسلسل حرکت تھی کہ میں دروازے کی اوٹ سے جن کی طرح نمودار ہوا اور اس سے پہلے کہ دروازے کے عقب میں آخری سیڑھی پر کھڑا ہوا گارڈ سنبھلتا، میں نے ایک ہاتھ اس کے گریبان پر ڈال کے اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس کے حلق سے ایک بے ساختہ ”ہا“ کی صدا نکلی جس میں حیرت سے زیادہ خوف شامل تھا۔ وہ آگے آیا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اس نے ایک سیڑھی نیچے خود کو سنبھالنا چاہا مگر ناکام رہا اور جب وہ منہ کے بل فرش چومنے جارہا تھا تو میری لات اس کی کمر پر لگی۔ وہ چاروں شانے چت پتھر جیسے فرش پر گرا۔ اس کے جسم کی ساری ہڈیاں اوپر سے نیچے تک بج گئی ہوں گی لیکن جتنی آواز سے اس کی پیشانی فرش پر لگی تھی، اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ سر بھی اٹھا سکتا۔

ٹرے لانے والے ملازم نے آدھے فاصلے کے بعد پلٹ کر دیکھا اور وہیں منجمد ہوگیا۔ میں نے زینے کا دروازہ آہستہ سے بند کیا اور نیچے جھک کر اس گوریلے جیسے گارڈ کی واسکٹ میں سے آٹومیٹک ریوالور نکال لیا۔ اس کی بے پروائی نے میرا کام بہت آسان کردیا تھا۔ ہر روز وہ اسی طرح آتا تھا تو چند منٹ دروازہ پکڑے کھڑا رہتا تھا اور ملازم ٹرے رکھ کے لوٹ آتا تھا۔ وہ انور علی کو ایک سال سے ان زنجیروں سے بندھا دیکھ رہا تھا اور خطرے کے خیال کا بھی اس کے ذہن سے گزر نہ ہوا تھا۔ وہ کمزور، بیمار بوڑھوں جیسا جوان تالا کھول کے یا زنجیر توڑ کے حملہ کردے، یہ اتنا ہی ناممکن تھا جتنا اس کا اڑ کے روشن دان سے پرواز کر جانا۔ بفرضِ محال ایسا ہو جاتا تو وہ ایک مکے میں اپنے بڑے مالک کو فرش پر اسی طرح لٹا دیتا جیسے اب خود لیٹا ہوا تھا۔ دروازہ کھولتے وقت ریوالور نکال لینا اس کے نزدیک بے مقصد ہوگیا تھا۔

ملازم پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور کانپ رہا تھا۔ ”مم... مجھے... مجھے مت مارنا۔“ وہ ہکلایا۔

میں نے سکون سے کہا۔ ”ٹرے رکھ دو میز پر اور دیوار کی طرف منہ کر کے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔“

انور علی پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہا تھا۔ ”دس سیکنڈ... صرف دس سیکنڈ میں تم نے تختہ الٹ دیا۔“ اس نے خوشی سے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ”میں نے سب دیکھا۔“

”یہ سب تائیدِ ایزدی ہے انور علی! ورنہ اسی سین میں محافظ کی جگہ میری خون آلود لاش پڑی ہوتی... اگر ریوالور اس نے ہاتھ میں رکھا ہوتا۔“ میں نے جھک کر بے سدھ پڑے ہوئے چھ فٹ قد اور دو سو پونڈ کے سیاہ فام گارڈ کو سیدھا کیا۔ میں پوری طرح تیار تھا کہ گارڈ مجھے دھوکا دینے کے لیے مکر سے کام لے رہا ہوگا تو ایک دم مجھ پر جھپٹے گا۔ ایسا ہوتا تو میں اپنے ہاتھ کے ریوالور سے اس کے سر پر وہ فیصلہ کن وار کرتا جو اسے سچ مچ دنیا و مافیہا سے بے خبر کردیتا۔ لیکن اس کی کھوپڑی میں دماغ ہل گیا تھا۔ وہ سچ مچ بے ہوش تھا۔ اوپر نیچے کے دروازوں کی چابیاں قفل میں لٹک رہی تھیں۔ انور علی کی زنجیر میں پڑے تالے کی چابی کسی جیب میں نہ تھی۔ یہ بات میرے لیے کچھ تشویش کا سبب بنی۔ پھر یہ چابی مجھے لاکٹ کی طرح اس کے گلے میں پڑی نظر آگئی۔ ایک ہاتھ کے جھٹکے سے زنجیر ٹوٹ گئی۔ گارڈ آہستہ سے کراہا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ بہت جلد وہ ہوش میں آجائے گا۔

میں چابی لے کر الٹے پاؤں زنجیر میں پڑے قفل کی طرف گیا۔ میری نظر ایک لمحے کے لیے بھی گارڈ سے نہ ہٹی۔ اپنا ہاتھ پیچھے کر کے میں نے انور علی کو چابی تھمائی۔ ”یہ لو... تمہاری آزادی کا پروانہ... تمہاری جگہ اب یہ لے گا... جلدی کرو۔“

”لے آؤ اسے۔“ انور علی نے جذبات سے کانپتی آواز میں کہا۔

میں نے گارڈ کو کالر سے پکڑ کے اٹھایا اور اپنی طرف گھسیٹا۔ پیر گھسٹنے سے اس کا ایک بوٹ نکل گیا۔ وہ پھر کراہا۔ میں نے اسے نیچے ڈالا اور اس کے ایک پاؤں میں زنجیر ڈال کے قفل بند کردیا۔ ملازم نے سر گھما کے یہ منظر دہشت سے دیکھا۔

انور علی نے اس کے ایک لات رسید کی۔ ”اس نمک حرام کی سزا کیا ہوگی؟“

ملازم نے اس کے پیر پکڑ لیے۔ ”میں... میں مجبور تھا مالک... میں انکار نہیں کرسکتا تھا... مجھے معاف کردو۔“

میں نے کہا۔ ”چلو انور علی! اس سے بعد میں نمٹنا۔ یہ کہیں نہیں جاسکتا... کم آن۔“

انور علی دروازے کی طرف بڑھا تو میں نے ملازم سے کہا۔ ”تمہارے لیے معافی اسی صورت میں ہے کہ خاموش بیٹھے رہو۔“

اس نے سر ہلایا اور میں انور علی کے پیچھے زینہ چڑھ گیا۔ دروازے کو باہر سے قفل لگا کے میں، انور علی کے پیچھے لپکا جو بڑی مستعدی سے اوپر کے زینے تک پہنچ گیا تھا۔ ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا کے میں نے اوپر والے دروازے کی چابی انور علی کو دی۔ اب ہم کسی اسٹور میں تھے۔ اس میں بھی اجناس کا ذخیرہ تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے دوسرے کنارے پر زینے کے بعد تھا۔

”اب راہنمائی تم کرو گے۔ ہم پہلے بادشاہ سلامت کو بتائیں گے کہ ان کی حکومت کا تختہ الٹا جا چکا ہے۔“

انور علی خواب میں چلنے والے کی طرح بولا۔ ”کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟“

کمرے کے باہر ایک برآمدہ تھا۔ پہلے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ انور علی تیزی سے اگلے دروازے کی طرف بڑھا۔ آخری کمرے کا دروازہ کھول کے کوئی عورت باہر آئی اور اپنی جگہ منجمد ہوگئی۔ انتہائے خوف اور حیرت نے اس کی چیخ ہی روک لی تھی۔

”یہ ہے اکبر علی کا کمرا۔“ انور علی بولا۔

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اکبر علی باہر آگیا۔ میں نے اسے اچانک اپنے مقابل پایا۔ میرے ایک دھکے نے اسے واپس کمرے میں پہنچا دیا۔ ”بس اکبر علی! تمہارا کھیل ختم ہوا۔“

ایک گالی دے کر وہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اسے اپنے گھٹنے پر لیا اور ٹانگ اٹھا کے ایک ہاتھ سے اسے الٹ دیا۔ وہ زمین پر گرا ہی تھا کہ میں نے ایک کک ماری۔ وہ گرتے ہی تڑپ کے اٹھا تھا۔ کک اس کے منہ پر لگی۔ کسی عورت نے دل دہلا دینے والی چیخ ماری۔

”اکبر... میں گولی ماردوں گا تجھے۔“ انور علی چلّایا۔

اب میں نے اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور دیکھا۔ یہ شاید اکبر علی کا ریوالور تھا۔ ”انور علی! خود پر قابو رکھو۔“

عورت چلّائی۔ ”بھائی جی... میں ہاتھ جوڑتی ہوں... اسے مت مارنا۔“

اکبر علی کے منہ سے خون رس رہا تھا۔ میری ٹھوکر سے اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور سامنے والے دو دانت غائب ہوچکے تھے۔ بیک وقت دو ریوالوروں کا رخ اپنی طرف دیکھ کے اس نے اپنی ہار مان لینے میں عافیت دیکھی۔ ”گولی مت چلانا بھائی جی...“ اس نے خرخراہٹ کے ساتھ کہا۔

دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ ”کیا ہوا شانو؟“ ایک بوڑھی عورت نے اندر آتے ہوئے کہا... پھر میں نے اس کی چیخ سنی۔ ”انور... کیا تُو بھائی کے خون سے ہاتھ رنگے گا؟“ اس نے چلّا کے کہا۔ ”تجھے میری قسم۔“

”نہیں ماں جی... آپ کو قسم دینے کی ضرورت نہیں۔ اسے مارنا ہوتا تو میں اب تک مار چکا ہوتا۔“

میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کے دروازے کے قریب پوزیشن لے لی۔ باہر سے کسی مرد نے پوچھا۔ ”یہ کیسا شور ہے؟“ پھر بڑے چودھری نے اس سین میں انٹری دی۔ وہ اندر آیا اور اپنی جگہ پر بُت کی طرح ساکت ہوگیا۔ اس کی نظر نے یہ منظر دیکھا اور سمجھ لیا کہ معاملات پر اب نہ اس کا اختیار ہے، نہ اس کے حاکم بیٹے کا... اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کردیا اور اپنی بیوی کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

”اباجی! اکبر کو بچالو۔“ کمرے میں پہلے سے موجود عورت نے زاروقطار روتے ہوئے فریاد کی۔

”میرا انور اتنا ظالم نہیں ہے شانو کہ خود تجھے بیوہ کرے۔“ انور کی ماں نے روتے روتے کہا۔

”پہلے یہ بتا دے کہ اب تُو اپنے بھائی کے ساتھ کیا کرے گا انور... اور مجھے کیا سزا دے گا؟“ چودھری نے کانپتی آواز میں کہا۔

صورتِ حال اب پوری طرح کنٹرول میں آچکی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ انقلاب کامیاب ہوگیا تھا اور جیسا کہ کہا اور سمجھا جاتا ہے، کامیابی ہی کامیابی کے لیے سب سے بڑی سند ہوتی ہے۔ میں نے کہا۔ ”چودھری صاحب! آپ پُرسکون رہیں اور بیٹھ جائیں۔“

چودھری نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ ”یہ سب تیری وجہ سے ہوا۔“

”رائٹ... اور اسی لیے میں آپ کو ضمانت دے رہا ہوں کہ آگے بھی آپ کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ انور علی کے بھی والد ہیں اور اس کے لیے زیادہ باعثِ عزت... آپ بھی بیٹھ جائیں ماں جی۔“

وہ دونوں پیچھے ہٹ کے ایک صوفے پر بیٹھ گئے تو انور علی نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا۔ ”بیٹھ جا تو بھی... لیکن خیال رکھنا کہ باہر سے تیرا کوئی حامی اور جاں نثار اندر نہ آئے... ورنہ مارا جائے گا۔“

زخم خوردہ سانپ کی طرح بل کھانے والا اکبر علی اپنی بیوی کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ”تو میری جگہ نہیں لے سکتا انور... تیری یہ بدمعاشی چلے گی نہیں۔“

”تیری یہ غلط فہمی بھی بہت جلد دور ہو جائے گی اکبر... جب میری جگہ تو لے گا۔“

اکبر کی بیوی شاہینہ نے پھر رونا شروع کیا۔ ”اسے معاف کردو بھائی جی۔“

”کبھی میرے لیے ایک بار بھی تیرے دل میں رحم جاگا تھا؟ یہ بات ایک بار بھی کہی تھی تو نے میرے لیے اپنے شوہر سے... کیا ضرورت تھی تجھے... تو بنی ہوئی تھی مہارانی... راج پاٹ کی مالک۔“ انور علی نے نفرت اور حقارت سے کہا۔

”پوچھ لو ان سے... کتنی بار میں نے ہاتھ جوڑے، پاؤں پکڑے۔“

”بس کر بھابی... جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ابھی تُو قرآن اٹھا کے قسم بھی کھانے کو تیار ہو جائے گی اور بعد میں اللہ سے بھی معافی مانگ لے گی کہ وہ میری مجبوری تھی۔ لیکن کیا میں جانتا نہیں کہ اکبر کو تُو نے کتنا اکسایا تھا میرے خلاف... اندھا بہرا نہیں تھا میں... سب معلوم ہے مجھے کہ تُو کیا چاہتی تھی... تُو نے اپنی ساس کے خلاف اکبر کو کتنا بھڑکایا تھا کہ سانپ کو زندہ چھوڑو گے تو موقع ملتے ہی وہ ڈس لے گا... اور اب تُو کہے گی کہ دیکھا میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ میری مان لیتے تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ کیا اب تیرے مشورے پر میں عمل کروں؟ نصیحت پکڑوں اس بات سے؟“

انور کی ماں نے کہا۔ ”دیکھ پتر! اس کی ماں بھی ہوں میں... اس نے کوئی بات تو مان لی تھی میری۔“

انور نے کہا۔ ”خدا کے لیے ماں جی! اب اور کوئی قسم نہ دینا مجھے... اکبر کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کروں گا میں... یہ بھی زندہ رہے گا اور شاید زیادہ آسانی کے ساتھ... مجھے دیکھ رہی ہو نا... تمہیں یاد تو ہوگا کہ جب مجھے تہ خانے میں پھینکا گیا تھا تو میری صحت کیسی تھی... بولو؟“

”ہاں، صحت تو پہلے جیسی نہیں رہی تیری۔“

”اس کی وجہ کا بھی علم ہے تمہیں؟“ انور نے نظر ماں پر مرتکز رکھی۔ ”چپ کیوں ہو؟ اس کی وجہ نہ وہ قید خانہ ہے نہ وہ زنجیر یا خوراک کی کمی... کیا تمہیں معلوم ہے کہ مجھے کھانے میں زہر دیا جا رہا تھا؟“

انور کی ماں نے ایک چیخ ماری... ”یہ غلط ہے... جھوٹ ہے۔“

”یہ سچ ہے ماں جی... اور اس کا ثبوت بھی مل جائے گا آپ کو۔“ انور نے زہرخند کے ساتھ کہا۔

”ہم سب بھی وہی کھاتے تھے۔“

”صرف ایک وقت... تم نے دیکھا کہ میں ایک وقت کھانا کھاتا تھا... اس لیے میں زندہ بچ گیا۔ تم نے جب پوچھا میں نے بہانہ کر دیا کہ بھوک نہیں لگتی۔“

اکبر غرایا۔ ”اس سے پوچھو کیا فرشتے اسے بتا دیتے تھے... یا یہ اپنی کتے جیسی ناک سے سونگھ لیتا تھا۔“

”مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ زیادہ طاقتور ہے اکبر... تُو یہ بھی بھول گیا تھا طاقت کے غرور میں کہ سو دن چور کے ہوتے ہیں تو کوتوال کا ایک دن... اور اس دن چور پھانسی پر لٹکتا ہے۔ تجھے یہ بھی غرور تھا کہ تُو اپنے جیسے فانی انسانوں کی زندگی اور موت پر اختیار رکھتا ہے۔“

”تیرے ہی وفاداروں میں سے ایک تھا جس کی طرف سے مجھے وارننگ مل جاتی تھی۔ ایسے کہ کسی کو شک بھی نہ ہو۔ اگر میں یہ بات ماں کو بھی بتا دیتا تو تجھے معلوم ہو جاتی اور تُو ان سب کو بدل دیتا جو میری حفاظت اور مجھے خوراک کی فراہمی پر مامور تھے۔“

”چل اب بتا دے اس کا نام۔“ بڑے چودھری نے کہا۔

”نہیں... اس کا نام کبھی میری زبان پر نہیں آئے گا... کبھی نہیں۔ اب مجھے اس کے احسان کا بدلہ چکانا ہے۔ میں اس کی زندگی کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ لیکن میدانِ حشر میں ضرور سامنے آئے گا اور تب اس کی گواہی کو مسترد نہیں کیا جائے

گا۔ اس نے مجھے ایک پیغام دے دیا تھا کہ جس کھانے میں زہر ہوگا اس میں سارے برتن ایک رنگ کے ہوں گے، سوائے ایک پلیٹ کے... وہ مختلف رنگ کی ہوگی یا کسی ایک پلیٹ کا کنارا ٹوٹا ہوا ہوگا... شروع کے چند ہفتوں میں ایسا نہیں تھا لیکن جب کھانے میں زہر ملانے کا سلسلہ شروع ہوا تو مجھے وارننگ دیر سے ملی۔ کئی دن میں زہر آلود کھانا کھاتا رہا، شاید کئی ہفتے... میری بھوک اس سے مر گئی۔ مجھے پیاس بہت لگتی تھی اور منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اثر کرنے والا زہر تھا۔ پھر بھی میری صحت تیزی سے گری... پھر مجھے خبردار کر دیا گیا اور میں کھانے کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔ میرے محسن کی بات غلط نہ تھی۔ شاید وہ خود اس کا خیال رکھتا تھا۔ میں نے خود کو ایک وقت کھانے کا عادی بنا لیا پھر میں آدھا کھانا چھپا کے رکھنے لگا۔ بیڈ کے نیچے... میرا وزن بہت کم ہوا ہے مگر میں زندہ ہوں اور صحت مند۔“

یہ ایسی بات تھی جو انور علی نے مجھے بھی نہیں بتائی تھی... دانستہ یا پھر وہ بھول گیا تھا۔

”میں تجھے زہر نہیں دوں گا اکبر! کھانا تو اماں اپنی نگرانی میں بنوائے گی۔ وہ خود لے جانا چاہے تو اس کی مرضی... تجھے اپنے ہاتھ سے کھلانا چاہے تو یہ بھی اس کی مرضی... چل اب اٹھ۔“

شاہینہ چلائی۔ ”بھائی جی! رحم کرو۔“ اور ایک دم انور کے پیروں سے لپٹ گئی۔

انور نے اسے بڑی بے رحمی سے بال پکڑ کے جھٹکا دیا اور الگ کر دیا۔ ”خطرہ تیرے شوہر نے بھی مول نہیں لیا تھا، میں بھی نہیں لوں گا۔“

میں نے بیڈ پر اکیلے بیٹھے ہوئے اکبر کو ریوالور سے اشارہ کیا۔ ”چل بھئی تیری سزا کا وقت شروع ہو چکا۔“

اکبر دہشت زدہ ہو کے پیچھے ہوا۔ ”نہیں، میں نہیں جاؤں گا... ماں جی... مجھے بچا لو۔“

میں نے بہتر سمجھا کہ اس میلو ڈرامائی سین کو مختصر کر دوں۔ اکبر جسمانی طور پر مجھ سے زیادہ طاقتور نہیں تھا۔ میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کے کھینچی اور وہ نیچے گرا تو اسے کالر سے پکڑ کے کھڑا کر دیا۔ ”چلو چھوٹے چودھری صاحب آگے...“ میں نے اسے پیچھے سے دھکیلا اور دروازے سے باہر کر دیا۔

میں نے اس کی بیوی کی دل خراش چیخوں کو بھی نظرانداز کیا اور اس کی ماں کی سینہ کوبی کو بھی۔ وہ دھاڑیں مار مار کے رو رہی تھی۔ ”یا میرے مولا! مجھے موت کیوں نہیں آجاتی۔ جن کو میں نے جنا، وہ کتوں کی طرح ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہو گئے؟ انور پتر! تُو بہت پڑھا لکھا اور سیانا ہے... تیرا دل کیوں پتھر ہو گیا ہے؟“

میں پیچھے سے بار بار اکبر کو دھکیلتا رہا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی۔ اپنے ملازموں اور جاں نثاروں کو پکارا مگر اب میرے ہاتھ میں ریوالور تھا اور میں نے دہاڑ کر سب سے کہہ دیا تھا کہ جو سامنے آئے گا مارا جائے گا۔ انور علی خود برآمدے میں پوری اتھارٹی کے ساتھ موجود تھا۔ محافظ اور ملازم اس کے تیور پہچان رہے تھے۔ ان کا مالک وآقا بدل گیا تھا۔ بالآخر وہی آ گیا تھا جو بڑے چودھری کا اصل جانشین تھا۔ یہ قدرت کے انصاف کا تماشائے عبرت تھا جسے وہ خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی وفاداری بدل لی تھی۔

شاہینہ میرے پیچھے دوڑی۔ ”بھائی جی! مجھے بھی ساتھ جانا ہے۔ میں اس کے ساتھ رہوں گی۔“

انور نے اسے روک لیا۔ ”تنہائی ہی تو اس کی سزا ہے۔ اب یہ کبھی اپنوں کی شکل پھر نہ دیکھے گا۔ تو بھی دیکھ لے آخری بار اسے۔“

بھابی کے منہ سے گالیوں اور بددعاؤں کا گندا نالہ بہنے لگا۔ موڑ پر میں نے دیکھا، اس کی ماں پیچھے کھڑی اسی طرح فریاد کر رہی تھی۔

اکبر نے میری توقع سے کم مزاحمت کی۔ وہ جسمانی طور پر اتنا کمزور بھی نہیں تھا۔ دیہات کی خالص خوراک اور نازونعم میں پلا ہوا اکبر قد کاٹھ میں بھی اچھا تھا۔ وہ برابر کی جنگ لڑنے کی کوشش کرتا تو یقیناً مار کھاتا کیونکہ میں بہرحال مارشل آرٹ کی تربیت بھی رکھتا تھا اور جیل میں بھی پریکٹس نے میری مہارت میں اضافہ ہی کیا تھا۔ لیکن اکبر کے اندر ایک مجرم کی بزدل روح تھی جس نے اس سے مقابلے کی سکت بھی چھین لی تھی۔ وہ ہار سے پہلے ہار مان چکا تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا، آنے والے روز و شب کے عذاب کا خیال اس کو بے جان کر رہا تھا۔ اس کی حالت پھانسی گھاٹ پر جانے والے قیدی جیسی ہو رہی تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے تھے اور اس کا غصہ یوں خارج ہو چکا تھا جیسے غبارے کی گیس نکل جائے تو وہ اوپر اڑنے کے بجائے فرش پر رینگنے لگتا ہے۔ وہ منت سماجت اور خوشامد پر اتر آیا تھا۔ معافیاں مانگ رہا تھا کہ اس نے مجھ سے بدسلوکی روا رکھی، مجھے لالچ دے رہا تھا۔

زینے پر پہنچ کے تو مجھے اس کو دھکیلنے کے بجائے سنبھالنا پڑا ورنہ وہ لڑھک جاتا۔ میں نے کہا۔ ”مرد بنو اکبر علی! دیکھو تمہارے بھائی نے کیسے مردانہ وار تمہارا ظلم برداشت کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہاں بہت فرصت ہوگی تمہیں... سوچنا کہ تم کیا کرتے رہے تھے۔ کس کے ساتھ تم نے کیا زیادتی کی، کس پر کتنا تشدد کیا... کس کا حق مارا اور کسے بے خطا مارا... خدا سے اپنے گناہوں اور بداعمالیوں کی معافی مانگتے رہنا... اس سے کچھ بعید نہیں کہ تمہارا وقت بھی ایسے ہی بدل جائے جیسے انور علی کا بدل گیا۔“

نیچے پہنچ کے میں نے اسے بیڈ پر دھکا دیا اور اپنا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے الٹا چلتا ہوا اس گارڈ کی طرف گیا جو زنجیر میں بندھا پڑا تھا۔ اب وہ ہوش میں آچکا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ناقابلِ تصور منظر دیکھ رہا تھا۔ میں نے چابی اس کی طرف پھینکی۔ ”اپنے پیروں میں پڑی زنجیر کا تالا کھولو اور چابی مجھے واپس دو۔ خیال رکھنا کہ تم نے ذرا بھی غلط حرکت کی تو اس ریوالور کی گولی تمہارے سر میں اتر جائے گی۔ میرا نشانہ کیسا ہے... یہ تم مرنے سے پہلے اندازہ کرلو گے۔“

اس نے خاموشی سے چابی لی اور تالا کھول کے مجھے واپس کر دی۔ اکبر علی اسے گالیاں دینے لگا۔ ”حرام زادے... کتے... نمک حرام... غدار... اس دن کے لیے پالا تھا میں نے تجھے۔“

میں نے اس سے کہا۔ ”اکبر علی کے پیروں میں زنجیر ڈال کے تالا لگا دو۔“

وہ اکبر علی کی طرف بڑھا تو اکبر علی اس پر حملہ آور ہوا۔ گارڈ دھکے سے پیچھے گر گیا۔ اکبر علی دیوانہ وار زینے کی طرف دوڑا تو میں نے ٹانگ اڑا دی اور وہ بُری طرح منہ کے بل فرش پر گرا۔ محافظ نے اسے پیچھے سے دبوچ کے اٹھایا اور گھسیٹ کر لے گیا۔ زنجیر کی جھنکار کے ساتھ ہی تالے کا کھٹکا سنائی دیا اور محافظ پیچھے ہٹ گیا۔ اکبر علی فرش پر اوندھا گر کے دھاڑیں مارنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”میں تو یہاں سے چلا جاؤں گا، تمہارے مستقبل کا فیصلہ انور علی کرے گا۔ جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا، میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ انور علی کے معاملات وہ جانے۔“ میں پلٹا اور گارڈ کو آگے رکھ کے دروازے سے زینے پر چڑھ گیا۔ دروازے کو خود میں نے لاک کیا لیکن چابی گارڈ کو نہیں دی۔ ہاتھی جیسے وجود کے ساتھ اس میں دم خم ایک چوہے جتنا بھی نہیں رہا تھا۔ نمک خوار ایسے ہی ہوتے ہیں... جس کا کھائیں گے اسی کا گائیں گے۔

جب میں واپس اوپر پہنچا تو صورتِ حال میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ معزول و معتوب حکمراں کی لاوارث رہ جانے والی شریکِ حیات بیک وقت اپنے سہاگ اور اپنے اقتدار سے محرومی کا ماتم کر رہی تھی۔ ابھی تک اسے اعتبار نہیں آیا تھا کہ جو اس کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں، وہ کوئی بھیانک خواب کا حصہ نہیں ہے۔ یہ عرش سے فرش پر پھینکے جانے کی صورتِ حال تھی جو کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوگی۔ اس کا صدمہ کسی حادثاتی موت کی خبر جیسا تھا۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن صدمے نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کرلی تھی۔

بڑے چودھری کو چپ لگ گئی تھی۔ وہ ہر طرف سے پس رہا تھا۔ پہلے اس نے بڑے بیٹے کے خلاف چھوٹے کی حمایت کرنے کی غلطی کی تھی۔ آج صرف وہ نہیں، اس کا خمیازہ سب بھگت رہے تھے۔ دونوں حریف ایک ہی ماں کے بیٹے تھے اور اس کے جذبات میں ماںتا کے سوا کچھ نہ تھا۔ پہلے بھی وہ ان کی دشمنی کے درمیان پس رہی تھی جو اسی کا دودھ پی کر جوان ہوئے تھے۔ آج وہ پہلے سے بھی زیادہ عذاب میں تھی۔ بڑا بیٹا ایک مختلف ذہن رکھتا تھا اور اسے مجبور سمجھ کر معاف بھی کرسکتا تھا مگر چھوٹے کے لیے وہ کیا کرے۔ وہ تو ماں ہی کو الزام دے گا کہ تم نے مجھے ایک سانپ کا سر نہیں کچلنے دیا۔ اس وقت میں نے تمہاری نہ سنی ہوتی تو آج سزا مجھے نہ بھگتنا پڑتی۔ میں نے اسے مار کے کہیں گاڑ دیا ہوتا تو اب تک نہ کہیں اس کی قبر کا نشان ہوتا اور نہ تمہارے دل میں اس کی یاد... تم چار دن رو کے سب کچھ بھول جاتیں مگر اب تم سدا روتی رہو گی۔

”ماں جی! اپنی بہو کو لے جاؤ یہاں سے۔“ انور علی نے رکھائی سے کہا۔ ”میرے دل پر اب آنسو اثر نہیں کرتے۔ ایک سال میں صدمات جھیل جھیل کر یہ دل پتھر کا ہو گیا ہے۔“

”انور! یہ ماں بننے والی ہے۔“ ماں نے روتے روتے کہا۔

”یعنی قدرت بھی تیرے چھوٹے بیٹے کی سزا کو زیادہ سخت بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ کیسا ہوگا جب باپ کبھی اپنے بیٹے کی صورت بھی نہ دیکھ پائے گا۔ خوشی کی بات اس کے لیے یہی ہوگی کہ اس ساری زمین کا وہ اکیلا مالک ہے۔“

”ابھی یہ زمین نہ اس کی ہے نہ تیری۔“ ماں چلائی۔

”ہو جائے گی کسی دن۔ ابا جی یہی چاہتے تھے نا کہ میرا حصہ بھی اسے ملے۔ انہیں بہت اعتبار تھا اس پر کہ ان کی جدی پشتی جائداد کا وہی صحیح وارث ہے جو اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔ بڑا بیٹا ہرگز اس قابل نہیں۔ زمین ساری رہنی چاہیے۔ اولاد ساری رہے نہ رہے... کیوں ابا جی؟“

بڑے چودھری کی آنکھوں سے دو آنسو چھلک پڑے جو اس نے بڑی دیر سے روک رکھے تھے۔ ”میں تسلیم کرتا ہوں اپنی غلطی کو انور! کیا تو میری غلطی کو معاف نہیں کرسکتا؟ اگر میں اپنی زمین جائداد آدھی آدھی تم دونوں کے نام کر دیتا تو یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا مجھے۔“

”ایسا اب بھی ہو سکتا ہے انور۔“ اس کی ماں نے کہا۔

”پہلے مجھے گزرے ہوئے سال کا ایک ایک دن... ایک ایک لمحہ لوٹا دو... وقت کو پھر وہیں لے جاؤ جہاں سے تمہاری خطا میری سزا بنی تھی۔ تم اب بھی جانبداری سے کام لے رہے ہو محترم والدین! کیا ہمارے بچپن میں تم نے ہمارے درمیان کوئی فرق رکھا تھا؟ کسی ایک کے ساتھ زیادتی کی تھی؟ نہیں کی تھی نا؟ جو ایک کو ملتا تھا وہی دوسرے کو... جو وہ کھاتا تھا، وہی میں... اسے انعام ملتا تھا تو مجھے بھی... اور قصور پر مار مجھے پڑتی تھی تو اسے بھی... فرمائش اس کی پوری ہوتی تھی تو میری بھی... پھر آج سزا صرف میرے لیے کیوں؟“

چودھری نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ انور کی ماں کے آنسو رائگاں گئے۔

”کم سے کم ایک سال تو اس کی سزا بھی دیکھیں... پھر رحم کی اپیل کریں یا مجھے بتا دیں کہ ایسی ہی کوشش آپ نے میری رہائی کے لیے بھی کی تھی؟“

”تو جانتا ہے کہ میں نے بھی کوشش کی تھی تجھے زندہ رکھنے کی۔“ ماں نے فریاد کی۔

”اب تمہیں یہ کوشش کرنے کی ذلت بھی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ میرا اسے مارنے کا کوئی ارادہ نہیں، نہ زہر دے کر اور نہ تشدد کر کے... تمہیں اس کے لیے کوئی رعایت حاصل کرنے کے لیے مجھ سے التجا نہیں کرنی پڑے گی۔ تم جو چاہو گی، اسے فراہم کر دیا جائے گا پھر بھی تم خوش نہیں ہو... اسے کوئی اذیت نہیں ہوگی جو میں نے برداشت کی تھی۔“

”جیسی تیری مرضی انور! سزا پہلے بھی میرے لیے تھی... اب بھی میرے لیے ہے۔“

”اس کا قصور وار میں کیسے ہو گیا؟ فیصلہ کرنے والے تو ابا جی تھے۔“ انور نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

اس کی ماں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چل میرے ساتھ آجا بہو... کچھ نہیں ملے گا تجھے بھائی جی سے ذلت کے سوا۔“

انور علی کا یہ رویہ میری توقعات سے خاصا مختلف تھا۔ اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس سے وہ ایک باشعور اور باذہن رکھنے والا نرم دل اور مساوات پر یقین رکھنے والا انسان ثابت ہوتا تھا جو اس جاگیردارانہ معاشرے اور خاندان میں ایسے ہی تھا جیسے آذر کے گھر میں ابراہیم لیکن اب میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یہ سال بھر کی اسیری اور ذلت کا ردِعمل تھا یا اس کے اندر چھپ کر بیٹھا ہوا جاگیردار جواب آزادی پاتے ہی باہر نکل آیا تھا کہ اس نے سنگ دلی کا غیر لچک دار رویہ اختیار کیا اور کسی قسم کی جذباتی یلغار سے متاثر نہیں ہوا۔ اس کی جگہ اکبر علی ہوتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتا اور کسی کے ساتھ ذرا بھی رعایت نہ کرتا۔ بے شک اس نے اپنا کیس دلیل کے ساتھ لڑا تھا اور کسی کے پاس اس کے عائد کیے ہوئے الزامات کا نہ جواب تھا اور نہ جواز۔ اس نے قائل چاہے نہ کیا ہو مگر ثابت کر دیا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، عین انصاف ہے اور اکبر علی کے ساتھ ”جیسے کو تیسا“ کے مطابق یہی سلوک ہونا چاہیے تھا۔

اس کی ماں اپنی بہو کو لے گئی تو صورتِ حال بہت حد تک پُرسکون ہو گئی۔ اب تک میں بھی کھڑا ہوا تھا اور انور علی بھی۔ اب ہم بڑے چودھری صاحب کے قریب دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے اور اپنے اپنے ریوالور جیب میں ڈال لیے۔ پھر انور علی نے کسی کو آواز دی اور پچاس ساٹھ سال کا ایک مسکین صورت پگڑی والا سفید پوش نمودار ہوا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔

”گل چاچا! کیسے ہو تم؟“ انور علی نے باوقار انداز میں پوچھا۔

”اللہ کا شکر ہے... آپ کا نمک کھا کے جی رہے ہیں چودھری صاحب۔“ گل چاچا نے جواب دیا۔

”دیکھو چاچا... آج تمہیں کچھ کام پہلے کرنے ہیں۔“ وہ کچھ دیر کے لیے رکا۔

”آپ حکم کریں سرکار۔“ چاچا نے کہا۔

”سب سے پہلے میرے کپڑوں کا بندوبست کرو۔ جو میں پہلے استعمال کرتا تھا، شاید اب وہ مجھے ڈھیلے ہوں۔ تمہیں درزی کو بلانا ہے۔ کپڑوں کے بارے میں وہ جانتا ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ اس کے بعد... جو میرا کمرا تھا... کیا وہ بند ہے؟“

”نہیں سرکار! وہ چھوٹی بی بی کے استعمال میں ہے۔“

”اور جو پہلے ان کا بیڈروم تھا؟“

”وہ بھی... ان کا کچھ سامان ہے وہاں۔“

”اچھا تو پھر ان سے پوچھ لو کہ اب وہ کس کمرے میں رہنا چاہتی ہیں۔ ایک خالی کراؤ اور دوپہر تک میرے استعمال کے قابل بنا دو۔ مجھے آرام کرنا ہے۔ کچھ کام رہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

جائے تو شام تک یا پھر کل تک کر لینا۔"

"ہو جائے گا سرکار۔" چاچا نے کسی روبوٹ کی طرح کہا۔

"حویلی میں گزشتہ ایک سال کے دوران کتنے ملازم بدلے گئے ہیں؟"

"تین سرکار! دو گارڈ تھے۔ ایک چھوٹی بیگم کی خدمت کرنے والی عورت... بڑے سرکار کے حکم سے۔"

انور علی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ جو پرانے باقی ہیں ان کو سمجھا دو کہ حکم اب صرف میرا چلے گا۔ میں بہت مختلف آدمی ہوں لیکن ڈسپلن اور کریکٹر کے بارے میں بہت سخت ہوں۔ اگر کسی کو غلط فہمی ہے تو وہ دور کر لے۔ جو تین بدلے گئے ہیں انہیں حاضر کرو۔"

"ابھی حاضر کرتا ہوں سرکار۔"

"میرا بھروسا تم پر ہے۔ تم میرے مزاج کو بھی سمجھتے ہو اور ملازموں کو بھی جانتے ہو۔ ان سے نمٹنا تمہارا کام ہے۔ تم کو وہاں ہونا چاہیے جہاں میں ہوں اور تمہیں آواز دے کر بلا سکوں۔ خود تمہیں کہیں جا کے اپنی نگرانی میں سب کرانے کی ضرورت نہیں۔ تم اسے بلاؤ جس کا کام ہے اور سمجھا دو... کام نہ ہو تو مجھے بتاؤ۔"

گل چاچا کے لیے شاید انور علی کا یہ روپ اور انداز غیر متوقع اور نیا تھا لیکن اس نے اپنے چہرے سے کسی حیرانی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ میں خاموشی سے انور علی کی کایا کلپ کرنے والے انقلاب کا جائزہ لیتا رہا۔ کہاں وہ شخص جس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اپنی ساری زمین مزارعوں میں بانٹ دینا چاہتا تھا اور کہاں یہ روایتی وڈیروں، جاگیرداروں کا انداز... ایسا لگتا تھا کہ تہ خانے کے اوپر آتے ہی اس نے عنان حکومت سنبھالی تو جیسے حویلی میں پہلے سے موجود اس کے آباؤ اجداد کی روحوں نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا اور اس کے اندر وہی روایتی حکمرانی کا انداز سرایت کر گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی پر جنات کا سایہ ہو تو نارمل شخص نارمل نہیں رہتا۔ وہ خود نہیں جانتا کہ اس کا طرز عمل کتنا بدل گیا ہے لیکن وہ ذہنی طور پر بے بس ہو جاتا ہے۔

انور علی کے احکامات کا سلسلہ زیادہ دیر جاری نہیں رہا۔ آخری حکم اس نے میرے لیے دیا کہ مجھے ایک معزز مہمان کا پورا پروٹوکول ملنا چاہیے۔ گل چاچا نے اس پر بھی "جی سرکار" کہا۔ یہ اسے معلوم تھا کہ میرے قیام و طعام کے سلسلے میں اسے کیا انتظامات کرنے ہوں گے۔ وہ جانے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ انور علی نے کہا۔ "کوئی اور کام کرنے سے پہلے چائے کافی بھجواؤ اور دوپہر کے کھانے کا بتا دو۔"

گل چاچا کے جانے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ "کیسی رہی میری پرفارمنس؟"

"مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تم وہی انور علی ہو۔"

"وقت نے بڑا تلخ سبق سکھایا ہے مجھے دوست۔ یہاں تم دنیا کو جوتے تلے نہیں رکھو گے تو دنیا تمہیں جوتے مارے گی اور اپنی ٹھوکروں میں رکھے گی۔ جو مجھے کرنا ہے، کرنا ہے لیکن اس سے پہلے اپنی اتھارٹی قائم کرنی ہے تاکہ جو میں چاہوں کر سکوں اور جو کہوں وہ ہو جائے۔"

"چلو پھر ایک کام میرا بھی کرو۔ معلوم کرو کہ ریشم کہاں ہے۔ اسے اکبر نے ملازموں کے حوالے کیا تھا کہ ماں کے پاس لے جاؤ۔"

"تم نے کہا تھا کہ یہ ریشم اسی گاؤں کی لڑکی ہے؟"

"ہاں، بابا رحیم بخش کو جانتے ہو تم؟" میں نے کہا۔

"اب لوگ مجھے نہیں جانتے اور میں لوگوں کو نہیں جانتا۔ پہلے تعلیم کے سلسلے میں چار سال لاہور ہی میں رہا۔ لڑکے یہاں سے میٹرک پاس کرتے ہیں، وہ لاہور کے کالجوں میں ہی پڑھنے جاتے ہیں اور روز آتے جاتے ہیں۔ کچھ سائیکلوں پر... چند ایک کے پاس موٹر سائیکل ہے... باقی تانگوں یا بسوں پر سفر کرتے ہیں لیکن میں گورنمنٹ کالج کے ہاسٹل میں رہا تھا۔ عید بقرعید کسی کی شادی یا موت کے سوا میرا گاؤں آنا نہیں ہوتا تھا۔ گرمی کی چھٹیاں میں اندرون شہر کے پرانے لاہور کی قدیم عمارات پر تحقیق کرتے گزارتا تھا اور یہ شوق حویلی کا بارود خانہ دیکھنے کے بعد شروع ہوا تھا۔ کسی کے ذریعے میں اندر جانے میں کامیاب رہا اور سچ تو یہ ہے کہ یہاں صلاح الدین نے میرا شوق دیکھتے ہوئے مجھے آثار قدیمہ کے طرز تعمیر پر ریسرچ کی جانب راغب کیا۔ پھر اسی نے مجھے آرکیٹیکچر کی تعلیم کے لیے باہر جانے پر اکسایا۔ میں نے کسی کو یہ نہیں کہا تھا کہ میرے باہر جانے کا مقصد کیا ہے۔ میں نے جھوٹ بولا تھا کہ باہر میں لندن اسکول سے اکنامکس کی ڈگری لوں گا۔ اگر میں یہ کہتا کہ میں فن تعمیر پڑھوں گا اور سمجھاتا کہ یہ عمارتیں بنانے کا فن ہے تو حیرت سے زیادہ مخالفت کا طوفان کھڑا ہو جاتا کہ میں راج مستری بننے ولایت جا رہا ہوں۔ باہر میں آٹھ سال رہا۔ سب کو یہاں معلوم ہوتا تھا کہ میں کبھی قاہرہ جاتا ہوں، کبھی روم یا پیرس تو خیال یہی تھا کہ میں صرف آوارہ گردی کر رہا ہوں۔ بس ایک جھوٹ بول کے مجھے واپس بلا لیا گیا۔"

"کیسا جھوٹ؟" میں نے کہا۔

"مجھ سے کہا گیا کہ تمہارے باپ کو دل کا شدید دورہ پڑا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے تمہارا چہرہ دیکھ لیں۔ میں کیا کرتا۔ پہلی فلائٹ سے آ گیا۔ یہاں آ کے پتا چلا کہ میرے ساتھ دھوکا کیا گیا۔ مجھے واپس بلانے کی دو وجوہ تھیں۔ والد صاحب چاہتے تھے کہ زمینداری کو اکبر دیکھے اور میں چونکہ پڑھا لکھا ہوشیار ہوں تو آنے والے انتخابات میں صوبائی اسمبلی کا امیدوار بنوں... اباجی نے تو سارے انتظامات کر لیے تھے۔ اکبر کو جائداد کا مختار کل بنا دیا تھا اور میرے لیے سیاست کے ایک کنگ میکر سے معاملات طے کر لیے تھے۔ صوبے کی سب سے اہم اور طاقتور جماعت مجھے ٹکٹ دیتی۔ اباجی... کی بھاگ دوڑ نے میرا راستہ ہموار کر دیا اور پارٹی چیف نے میرے نام کی منظوری دے دی لیکن میرے انکار نے سب کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ میں نے صاف کہا کہ میں لعنت بھیجتا ہوں سیاست کے گندے جوہڑ پر۔ میں نے جو پڑھا ہے اس لیے نہیں پڑھا ہے۔ اس کے بعد کوشش ہوتی رہی مجھے سمجھانے کی۔ سب سے مضبوط دلیل یہ دی جاتی تھی کہ ہم خاندانی زمیندار، جاگیردار لوگ ہر کام نہیں کر سکتے۔ سول سروس میں جانے کی بات اور ہے۔ اس کے لیے میری عمر نکل گئی۔ دوسری کوئی نوکری ہماری خاندانی شان کے شایان نہیں ہو سکتی اور بزنس کا کوئی سوال نہیں کیونکہ ہم پرچون یا جوتوں کی دکان بھی نہیں کھول سکتے۔ کارخانہ لگا سکتے ہیں تو اس کے لیے کسی کا تجربہ نہیں اور کروڑوں کا کھیل تجربے کے لیے نہیں کھیلا جا سکتا۔ اس وقت یہ ایک ردعمل تھا جس میں سوچے سمجھے بغیر میں نے یہ کہہ دیا کہ میرے حصے کی زمین مجھے دے دی جائے۔ پھر میں جو چاہوں کروں لیکن یہ زیادہ ناممکن تھا کہ خاندانی جاگیر دو حصوں میں بٹ جائے اور آدھی کو میں ٹھکانے لگا دوں۔ ادھر میں اڑ گیا کہ اب تو یہی ہوگا۔ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ زمین کا میں کیا کروں گا تو میں نے کہہ دیا کہ مزارعوں میں تقسیم کر دوں گا۔"

"یعنی یہ تمہارا کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہیں تھا؟"

"نہیں... لیکن بعد میں یہ خیال مجھے قابل عمل لگا۔ بس اس پر ڈٹ گیا اور انجام وہ ہوا جو تم نے دیکھا۔"

"اب تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں؟"

"نہیں... میں اس حاکم و محکوم کی روایت کو بدلوں گا۔"

"کیسے؟ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ راتوں رات تم نے ایک بدلے ہوئے انسان کا روپ دھار لیا ہے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "ابھی یہ کردار ضروری تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ پہلے میں ان سب کو اطاعت سکھاؤں گا جو میرے آس پاس ہیں۔ اس کے لیے یہ روایتی کردار کرنا پڑ رہا ہے۔ سب میرے کنٹرول میں آ جائے گا اور میرا سکہ چلنے لگے گا تو پھر آہستہ آہستہ میں اپنی رعایا کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے اقدامات کروں گا۔ ان کے لیے زندگی آسان بناؤں گا۔ حاکم و محکوم کے درمیان فاصلے کو کم کروں گا۔ اس دنیا یا ملک... شہر یا صوبے کو مثالی بنانا تو میرے بس میں نہیں۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں خوشی اور خوش حالی لانے کی کوشش ضرور کروں گا۔"

"اس گاؤں میں ایک چھوٹا سا کاشت کار تھا رحیم بخش... اس کی تھوڑی سی زمین تھی۔ دریا سے نکالے جانے کے بعد میں اسی کے گھر میں تھا اور میری حالت بہتر ہوئی تب بھی میں نے وہیں رک کے نورین کو تلاش کیا۔ رحیم بخش کی صرف ایک لڑکی تھی ریشم... بدقسمتی سے وہ بہت خوب صورت بھی تھی اور بہت ذہین اور باہمت بھی۔ تمہارے چھوٹے بھائی کا اس پر دل آ گیا لیکن وہ لڑکی قابو نہ آئی۔ پھر اس نے شادی کا جال پھینکا۔ ریشم نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ اس کا بھائی کوئی نہیں تھا۔ بوڑھا باپ خود کاشت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے ایک کسان شامو کو زمین زراعت کے لیے دے رکھی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ وہ کسان ہی زمین پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور اکبر اس کو اکسا رہا ہے۔ اتفاق سے شامو نے میرے سامنے رحیم بخش کو دھمکی دی اور کچھ بکواس میرے بارے میں کی کہ بڈھے نے ایک اجنبی کو جوان بیٹی کے ہوتے گھر میں رکھ لیا ہے۔ میں نے شامو کو بے عزت کر کے بھگا دیا اور دھمکی بھی دے دی کہ وہ زمین اس سے لے لی جائے گی اور اسے میں خود کاشت کروں گا۔"

"یہ صرف دھمکی تھی؟"

"ظاہر ہے، میں اس گاؤں میں مستقل قیام کیسے کر سکتا تھا۔ ہر وقت مجھے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پولیس یا نادر شاہ کے بندے مجھے تلاش کرتے آ جائیں گے۔ میں مقابلے میں نہ مارا گیا تو واپس جیل ضرور پہنچا دیا جاؤں گا۔ پھانسی پہلے ہی میرا مقدر ہو گئی تھی۔ اب فرار جیسا سنگین جرم میرے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا تو سزا پھانسی سے بھی بڑھ جائے گی۔ اگلے دن میں نکل جاتا لیکن بدقسمتی سے اسی رات رحیم بخش کا قتل ہو گیا اور الزام مجھ پر آیا مگر ریشم کی گواہی نے مجھے بچا لیا۔ اس کے باوجود کیس دبانے کے لیے پولیس نے مجھ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

پچاس ہزار رکھوا لیے جو اس وقت تو تمہارے چاچا نے فراہم کیے تھے مگر بعد میں یعنی اگلے دن میں نے انہیں لوٹا دیے۔ وہ ریشم کو اپنے ساتھ گھر لے گئے تھے کیونکہ اب باپ بھی نہیں تھا۔ وہ اکیلی میرے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن وہ خود ریشم کی بات مجھ سے کر بیٹھے، اکبر کے لیے... ریشم ان کے گھر سے بھی نکل آئی۔ اسی رات اکبر کے بندوں نے مجھے اور ریشم کو اٹھوا لیا۔ جب میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ریشم کو اپنے ساتھ لے کر نکل جاؤں گا کیونکہ وہ کسی صورت بدکردار اور عیاش اکبر سے شادی پر راضی نہیں تھی۔ مجھے مزاحمت کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ہاکی مار کے مجھے ناک آؤٹ کر دیا گیا تھا۔ ہوش آیا تو ہم چودھری اصغر کی تحویل میں تھے۔ میں نے ڈپلومیسی سے کام لیا اور تمہارے ابا کو قائل کر لیا کہ ریشم کا انکار ظاہری ہے اور باپ کی موت کا صدمہ بھول جانے کے بعد وہ حویلی کی بہو بننا قبول کر لے گی۔ اس طرح میں نے اپنی اور ریشم کی جان بچا لی لیکن ریشم نے ایک ملازمہ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ہم صبح فرار ہوتے وقت پکڑے گئے۔ ریشم کو اس وقت تو اکبر کی ماں کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ میرا معاملہ زیرِ التوا تھا۔ مجھے تہ خانے میں ڈال دیا گیا اور چودھری صاحب بھول گئے یا اکبر نے انہیں کہہ دیا کہ اسے مرنے دو تہ خانے ہی میں... باقی تم جانتے ہو۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ "ریشم کا باپ... کیا نام تھا اس کا... بابا رحیم بخش... کیا اس کا چہلم ہو چکا؟"

"ابھی کہاں، اس کی موت کو تو دس دن بھی نہیں ہوئے۔"

"پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں... ریشم محفوظ ہو گی۔"

"تمہیں اس بات کا یقین کیوں ہے؟ اکبر اس جنگل کا شیر ہے۔"

انور نے سر ہلایا۔ "بے شک وہ جنگل کا بادشاہ ہے لیکن ریشم تھی ماں کی تحویل میں۔ ماں کے آگے اس کی نہیں چل سکتی۔ اگر چودھری صاحب بھی اسے گھر کی بہو بنانے پر تیار ہیں تو پھر اکبر کو انتظار کرنا پڑے گا۔ شادی کا اس کے باپ کے چہلم سے پہلے کوئی سوال نہیں۔ یہ میرے باپ کو بھی منظور نہیں ہوگا اور میری ماں کو تو ہرگز نہیں۔ تم ایک دو دن ٹھہرو۔ یہ تو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں ہے۔ تمہارا پیغام بھی اس تک پہنچایا جا سکتا ہے مگر ملاقات کی بات ابھی نہ کرنا اچھا ہے۔ تمہیں صبر کرنا ہوگا۔"

"مجھے ملنے کی ایسی کوئی بے تابی نہیں۔ بس تم اسے بتا دو کہ میں خیریت سے ہوں۔"

انور علی نے صدا لگائی۔ "گل چاچا۔"

گل چاچا چراغ کے جن کی طرح دروازے سے اندر آ گیا۔ "جی سرکار۔"

"ریشم کہاں ہے؟"

گل چاچا نے جواب میں کچھ وقت لیا۔ "بڑی بیگم صاحبہ کے ساتھ... ان کے کمرے میں۔"

"ابھی اپنی بیوی سے کہو کہ ریشم کو اطلاع کر دے کہ سلیم بالکل خیریت سے ہے۔" پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ "وہ بڑی بیگم صاحبہ کی کنیزِ خاص ہے۔ ان کی خدمت پر مامور ہے۔ گل چاچا... مہمان کا کمرا تیار ہوا؟"

"جی سرکار! آپ چاہیں تو نہا دھو کے کپڑے بدل لیں۔" گل چاچا نے ہم سے مخاطب ہو کے کہا۔

"اور میرے کمرے کا کیا ہوا؟"

اس نے کچھ تذبذب کے ساتھ کہا۔ "سرکار! چھوٹی بیگم صاحبہ سے آپ خود ہی بات کر لیں۔"

"اچھا، یعنی وہ کوئی کمرا خالی کرنے پر رضامند نہیں۔ شرافت سے کام نہیں چلے گا۔ اس وقت وہ کس کمرے میں ہیں؟"

"اس میں جو پہلے آپ استعمال کرتے تھے... دوسرا مقفل ہے۔"

"اس کی چابی کس کے پاس ہے؟" انور علی نے پوچھا۔

"انہی کے پاس... سرکار! خفا نہ ہوں تو کچھ عرض کروں۔" گل چاچا نے کہا۔

"ہاں بولو۔"

"ابھی آپ مہمان کے ساتھ انہی کے کمرے میں رہیں۔ نہا دھو کے کپڑے بدل لیں۔ میں نے مہمان کے لیے بھی صاف کپڑے رکھ دیے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد آپ آرام فرمائیں۔ شام تک میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ رات تک آپ کے لیے ایک کمرا سیٹ ہو جائے گا۔"

انور علی نے کچھ دیر سوچا۔ "تمہیں یقین ہے؟ اور اگر عورت اپنی ضد پر قائم رہی... پھر؟"

گل چاچا نے کہا۔ "وہ بڑی بی بی کی بات مانیں گی۔ انہیں میں بتا دوں گا کہ ضد سے نقصان ہوگا۔"

"چلو ٹھیک ہے لیکن یہ رعایت مغرب تک ہے۔ مغرب کے بعد تالا کھول کے سامان باہر رکھوا اور اسے میرے لیے سیٹ کرو۔"

"جی سرکار! ایسا ہی ہوگا۔"

انور علی کھڑا ہو گیا۔ "آؤ یار کچھ ایزی ہو جائیں۔"

مہمان خانہ میری توقع سے بہتر ہی تھا۔ باہر والوں کے قیام کے لیے کمرے باہر کی طرف تھے۔ یہاں گھر کے اندر آنے والے مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ اس میں دو بیڈ پہلے سے موجود تھے۔ انور علی نے پہلے مجھے موقع دیا اور میں نے باتھ روم میں جا کے گرم پانی سے بھرپور غسل کیا۔ وہاں میرے سائز کے شلوار قمیص کا جوڑا پہلے سے رکھ دیا گیا تھا۔ شاید وہ انور علی کی وارڈ روب سے نکالا گیا تھا اور استعمال شدہ نہیں لگتا تھا۔ انور علی جب تک غسل سے فارغ ہوا، میں صرف ریلیکس کرنے کے لیے بیڈ پر نیم دراز ہوا تھا مگر سکون اور احساسِ تحفظ نے مجھے ایسا مغلوب کیا کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ رات بھر کی تھکن اور ٹینشن کے بعد یہ ایک فطری بات تھی۔ وہ کچھ خیال و خواب کی سی کیفیت تھی جس میں مجھے یوں لگا جیسے نورین نے مجھے پکارا ہو۔ میں نے اس کے حسنِ بے مثال کو یوں تصور میں دیکھا جیسے روزِ اول دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس نے بڑی ناراضی سے کہا۔ "سو رہے ہو... کتنے مزے سے مجھے بھول گئے۔ پاگل میں تھی جس نے تم پر اتنا بھروسا کیا اور نکل آئی تمہارے ساتھ... کاش مجھے اندازہ ہوتا کہ تمہارے سارے وعدے محض لفظوں کے جال تھے۔ اب کیا ضرورت ہے تمہیں میری... وہ سب تمہیں مل گیا جس پر میں نے تکیہ کیا تھا میری جگہ بھی کسی اور نے لے لی ہے۔ یہ تو مجھے یہاں آ کے معلوم ہوا... بالآخر میں نے ہی تلاش کیا تمہیں... تمہارے لیے تو میں مر گئی تھی۔ یہ زبردستی کی ذمے داری کا بوجھ تھا جو اتر گیا۔ بے وفائی نہ سلمان خان نے کی، نہ تم نے۔ تقدیر نے کی۔"

"نہیں... نہیں۔" میں نے بے اختیار کہا اور اسے اپنے بازوؤں میں تھامنے کے لیے آگے بڑھا۔ "میں بے وفا نہیں ہوں۔" نورین جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ میری راہ میں میز حائل ہوئی اور میں گرتے گرتے بچا۔ میری ٹانگوں میں چوٹ آئی اور میں نے انور علی کی ہنسی کی آواز سنی۔

"کس کی طرف سے ہے یہ الزام بے وفائی... خواب میں کسے دیکھ رہے تھے... ریشم کو؟"

میں پلنگ پر بیٹھ کے خفت سے پنڈلی کو سہلانے لگا۔ "ابھی آ گئی تھی مجھے..."

"ریشم آئی تھی... تمہیں سوتا دیکھا تو جھانک کے واپس چلی گئی۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "شاید اسی کی آواز سنی ہو گی میں نے... اسے بلاؤ۔"

"چلو کھانا کھا لو پہلے۔ ریشم حویلی میں ہی ہے پھر آ جائے گی۔" اس نے میز کی طرف اشارہ کیا جس پر شاید دس افراد کی ضیافت کا اہتمام تھا اور بہت پُرتکلف۔ اس کی خوشبو نے میرے حواس پر یلغار کی تو میری اشتہا جاگ اٹھی۔ انور علی اب ایک بالکل بدلی ہوئی شخصیت کے روپ میں بہت پُراعتماد تھا۔ شیو اور غسل کے بعد جو لباس اس کے لیے فراہم کیا گیا تھا، وہ بھی بالکل مختلف تھا۔ وہ پینٹ شرٹ میں تھا جو اسے فٹ تھا۔ معلوم نہیں اتنے کم وقت میں گل چاچا نے اس کا بندوبست کہاں سے اور کیسے کیا تھا۔

ابھی ہم نے کھانا ختم بھی نہیں کیا تھا کہ باہر پہلے شور سنائی دیا پھر ایک فائر ہوا اور کسی نے چیخ ماری۔ میں نے گل چاچا کی آواز سنی۔ اس نے چلّا کے کسی کو خبردار کیا تھا۔ "رک جاؤ نہیں تو میں گولی مار دوں گا۔"

ایک دھماکے سے کوئی اندر آیا اور اس نے انور علی کا نشانہ لے کر گولی چلائی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے بائیں بازو میں انگارہ سا اتر گیا ہو۔ میں نے ایک فطری ردِعمل کے طور پر ایک دم اٹھ کے غوطہ مارا اور کھانے کی میز کے نیچے غائب ہو گیا۔ اسی وقت پھر فائر ہوا اور کوئی... دل خراش چیخ کے ساتھ زمین پر گرا۔ اس وقت تک انور علی بھی نیچے گر گیا تھا۔ میں نے اسے بھی میز کے نیچے پڑا دیکھا۔ پھر میری نظر اس شخص پر گئی جو مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ وہ کوئی گارڈ تھا۔ گل چاچا اس کے پیچھے کھڑا تھا اور جس ریوالور سے اس نے حملہ آور کو نشانہ بنایا تھا، وہ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی گولی نے حملہ کرنے والے کے سر میں سوراخ کر دیا تھا۔ گولی دوسری طرف سے نکلی تھی اور اب مرنے والے کا خون اور بھیجا قالین پر پھیل رہا تھا۔

انور علی نے میری طرف دیکھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

"ہوں... جان بچ گئی ہے۔" میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"تمہیں گولی لگی ہے۔" انور علی نے تشویش سے کہا۔ "گل چاچا! ڈاکٹر کو فون کرو... جلدی۔"

"جی سرکار! پہلے ان کے زخم پر پٹی باندھنی ضروری ہے تاکہ خون رک جائے۔"

انور علی دہاڑا۔ "یہ میں کر لوں گا، تم وہ کرو جو میں نے کہا ہے۔"

"جی سرکار۔" گل چاچا ایک دم پلٹا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسی وقت ریشم دیوانہ وار چلاتی ہوئی اندر آئی۔ "سلیم!" اس نے خون دیکھ کے چیخ ماری اور مجھ سے لپٹ گئی۔

"ریشم! کچھ نہیں ہوا مجھے۔" میں نے اسے بمشکل تمام اپنے سے الگ کیا مگر میرا لہو اس کے لباس کو داغ دار کر چکا تھا۔

انور علی نے ایک دم اس کا دوپٹا کھینچ لیا۔ "ہٹو ایک طرف بے وقوف لڑکی... مجھے پٹی باندھنے دو۔"

زاروقطار روتی ریشم لرزتی رہی۔ "تم کو مرنا نہیں ہے سلیم... میرے لیے تم زندہ رہو گے۔"

میں نے ہنس کے اسے دوسرے ہاتھ سے اپنے قریب کیا۔ "پاگل! کچھ بھی نہیں ہوا ہے مجھے... معمولی خراش ہے۔"

انور علی نے مجھے بٹھا کے میرے بازو پر ریشم کا دوپٹا کس کر باندھنا شروع کیا۔ "ابھی دس منٹ میں ڈاکٹر آ جائے گا۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

اسی وقت میں نے بڑے چودھری صاحب اور انور علی کی ماں کو دیکھا۔ وہ بت بنے کھڑے تھے۔ آہستہ آہستہ انور کی ماں آگے آئی۔ "اللہ نے تجھے بچا لیا انور... میں ابھی صدقہ دیتی ہوں۔" پھر اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ "تو فکر نہ کر... میں تیری جان کا صدقہ بھی اتاروں گی۔ تو بھی بیٹا ہے میرا۔"

"آپ کی مہربانی ہے کہ آپ ایسا سمجھتی ہیں۔"

"انور کی جگہ تیرا خون بہا ہے۔ اس کا قرض تو ہے نا مجھ پر۔" اس نے آنسو پونچھے اور انور کو گلے لگا لیا۔

یہ بڑا جذباتی منظر تھا جس نے مجھے بھی آبدیدہ کر دیا۔ یہ خیال انتہائی لرزہ خیز تھا کہ اگر گولی خطا نہ کرتی تو کیا ہوتا۔ ایک بار پھر ولی عہد کی لاش پر قدم رکھ کے معزول و مقید شہزادہ تخت نشین ہوتا۔ چند گھنٹوں کا انقلاب خود اپنی موت مر جاتا۔ وہ یقیناً اکبر علی کا کوئی وفادار جاں نثار تھا جس نے اپنی جان کی بازی لگا کے حق نمک ادا کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

انور علی میرے زخمی بازو پہ بڑی توجہ اور تشویش سے پٹی لپیٹ رہا تھا۔ اس نے میری قمیص کی خون آلود آستین کو کندھے پر سے الگ کر دیا تھا اور زخم پر ڈھائی گز لمبے دوپٹے کو کس کے باندھ رہا تھا۔ ریشم میرے قریب گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گئی تھی اور اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے میرے بازو کو کہنی کے نیچے سے سہارا دے رکھا تھا۔ اب وہ شاک کے ہسٹریا سے نکل آئی تھی

لیکن دکھ اور تشویش کے آثار اس کے چہرے پر مسلط تھے۔ بار بار وہ مجھ سے پوچھتی تھی۔ "درد تو نہیں ہو رہا؟" اضطراری عمل تھا۔ میں اسے کیا کہتا کہ لڑکی... گولی لگی ہے درد کیوں نہیں ہوگا۔ ابھی اس کا احساس کم تھا لیکن کچھ دیر میں زخم کی ٹیس کا بڑھ جانا لازمی تھا۔ گولی نے ہڈی کو نہیں چھوا مگر گوشت سے گزر گئی تھی۔ یہ شاید ایک انچ گہرا زخم تھا۔

ایسی ہی جذباتی باتوں کی تکرار انور علی کی ماں کی زبان پر جاری تھی۔ وہ مسلسل وہی باتیں دہرا رہی تھی۔ "تیرا شکر ہے میرے مولا... تو نے میرے بچے کی جان بچائی۔" پھر مجھ سے حوصلہ افزا شفقت کے ساتھ کہتی تھی۔ "رب نے بڑی مہربانی کی۔ حوصلہ رکھ پتر ابھی ڈاکٹر آ جاتا ہے۔" وہ بار بار صدقہ کرنے کا عزم بھی دہرا رہی تھی لیکن اس دوران میری نظر نے بڑے چودھری کو دیکھا جو اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا اور اس ناکام قاتل کو دیکھ رہا تھا جو مقتول ہو چکا تھا اور اپنے ہی خون میں غلطاں فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے ان کی نظر میں بیٹے کی زندگی محفوظ رہنے کی خوشی سے زیادہ اس حملہ آور کی ناکامی اور موت کا صدمہ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ محض میرا وہم ہو لیکن میرا تاثر کچھ ایسا ہی تھا۔ شاید اس کی بنیادی وجہ ان کی مسلسل خاموشی تھی۔ اب تک وہ بت بنے دور کھڑے تھے اور ان کی زبان سے بیٹے کے لیے ایک لفظ نہیں نکلا تھا۔ وہ ایک بار تو کہتے کہ خدا کا شکر ہے جس نے بچا لیا۔ ماں یہ بات مسلسل دہرا رہی تھی۔ بار بار اپنی تشویش کا اظہار کر رہی تھی۔ بے شک عورت زیادہ جذباتی ہو جاتی ہے خصوصاً ماں... لیکن باپ بھی بے حس تو نہیں ہوتے۔

"چل تو لیٹ جا سیدھا۔" انور علی نے میرے بازو پکڑ کے اوپر کیے اور مجھے لٹا دیا۔ ریشم اٹھ کے میرے سرہانے ہی بیٹھ گئی۔ وہ اتنی نروس تھی کہ اسے مطمئن کرنے کے لیے میں نہ صرف درد برداشت کر رہا تھا بلکہ خوش دلی سے مسکرا رہا تھا اور اسے تسلی دینے کے لیے اس سے لائف موڈ میں باتیں بھی کر رہا تھا۔

کسی کی موجودگی کا احساس کیے بغیر وہ میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کے بیٹھی تھی جو یہاں کے ماحول میں یقیناً بے شرمی کی بات تھی۔ یہاں تو سب کے سامنے کوئی بھی شوہر سے اپنایت کا ایسا اظہار نہیں کر سکتی۔ دیہات، تحصیلوں... لو... صوبوں کے کلچر اور تہذیبی تقاضے شہروں کے جدید ماحول سے اس درجہ مختلف ہیں۔ بعض جگہ میاں بیوی دن میں کسی بزرگ کے سامنے بات نہیں کرتے۔ اپنے بچے کو پیار نہیں کر سکتے۔ ایک پلیٹ میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک جگہ بیٹھ کے کھانا نہیں کھا سکتے۔ یہ بے حیائی سمجھی جاتی ہے۔ میں نے ایک ٹی وی پروگرام میں ایک تعلیم یافتہ عورت کو اعتراف کرتے سنا تھا کہ آج چودہ سال بعد وہ اپنے سسر سے پہلی مرتبہ فون پر بات کر رہی ہے۔ ظاہر ہے یہ پرانی روایات اب عجوبہ بن گئی ہیں۔

ریشم نے تیسری بار انور علی سے اضطراب کا اظہار کیا۔ "آخر ڈاکٹر کیوں نہیں آیا ابھی تک؟"

میں نے کہا۔ "تم تو ایسے نروس ہو جیسے گولی مجھے نہیں تمہیں لگی ہے۔"

بڑے چودھری نے خفگی سے کہا۔ "چل لڑکی تُو اندر جا۔ دوپٹا لے سر پر۔ ڈاکٹر بھی آنے والا ہے۔"

انور علی مسکرایا مگر اس کی ماں نے شوہر کی حمایت میں سر ہلا کے ریشم سے کہا۔ "ہاں پتر! ہم ہیں نا اس کا خیال کرنے کے لیے۔"

ریشم کو یکلخت اپنے بے قابو جذبات اور نامناسب رویے کا احساس ہوا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچا اور اٹھ کے باہر چلی گئی۔ وہ گاؤں کی عام لڑکیوں جیسی کم ہمت اور زیادتی برداشت کرنے والی لڑکی نہیں تھی تاہم اتنی بے شرم بھی نہیں تھی کہ ڈھیٹ بنی بیٹھی رہتی۔ اس کے جانے سے پہلے چودھری صاحب نے بالآخر قریب آ کے کہا۔ "اللہ نے بڑی خیر کی۔" لیکن صاف محسوس ہوتا تھا کہ یہ الفاظ بھی رسمی ہیں جو اخلاقی مجبوری میں کہے گئے مگر ان میں جذبات کا حقیقی دکھ نہیں ہے اور نہ خوشی اور شکر گزاری کا احساس۔ پھر وہ پلٹ گئے۔ "میں لاش اٹھواتا ہوں۔"

انور علی نے محسوس نہ ہونے والے طنز کے ساتھ کہا۔ "کیا پولیس کو اطلاع دینا ضروری نہیں ہے؟ یا آپ کے خیال میں معاملہ ختم ہو گیا؟"

چودھری رک گیا۔ "اگر تُو کہتا ہے تو بلا لیتے ہیں تھانے دار کو بھی... مگر اب وہ کیا کرے گا؟"

"پولیس کیا کرتی ہے؟ ظاہر ہے تفتیش کرے گی۔ معلوم تو ہونا چاہیے کہ اس نے جو کچھ کیا، وہ اس کا ذاتی فعل تھا یا اسے کسی نے یہ ذمے داری سونپی تھی۔ اور اس کے علاوہ کون ہے جو اکبر سے وفاداری کا حق ادا کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے پر تیار بیٹھا ہے؟"

"چودھری انور! یہ ولایت کی پولیس نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے یہ آپ کی پولیس ہے۔ اس کا فرض صرف آپ کی اطاعت ہے۔ یہ وردی سرکاری پہنتے ہیں، تنخواہ سرکار سے لیتے ہیں اور غلام آپ کے ہوتے ہیں۔ آپ سے میری مراد ہے آپ جیسے وڈیروں کے... آپ اسے بلائیں... میں ملوں گا اس سے۔"

چودھری نے تلخی سے کہا۔ "اور اس کے گلے میں اپنا پٹہ ڈالے گا؟"

"یہ میں دیکھ کر فیصلہ کروں گا کہ وہ تھانے دار ہے یا کتا۔" انور علی نے کہا۔ "اور بھونکنے والا ہے یا کاٹنے والا۔"

باپ، بیٹے کے درمیان یہ "محبت بھری" گفتگو اور چلتی اگر ڈاکٹر بیل کی طرح اندر نہ آتا۔ وہ یوں داخل ہوا جیسے کسی نے اسے دھکا دے کر روانہ کیا ہے۔ وہ گول مٹول چھوٹے قد کا آدمی فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا سیدھا آیا۔ "لو جی اپنے چودھری صاحب! آپ تو بھلے چنگے ہشاش بشاش کھڑے ہو۔ مجھے تو بتایا گیا تھا کہ چودھری صاحب کو گولی لگی ہے خدانخواستہ... میں تو جناب دوڑتا آیا سر کے بل۔"

"آپ ادھر توجہ فرمائیں۔" انور علی نے کہا۔ "ہم سب یہاں چودھری ہیں لیکن گولی لگی ہے اسے جو لیٹا ہے اور جس کے بازو پر یہ خون آلود پٹی اندھا بھی دیکھ سکتا ہے اندھیرے میں۔ یہ مہمان ہیں۔"

ڈاکٹر ڈھیٹ قسم کا خوشامدی تھی۔ "جناب عالی! اور میں نے بھی دیکھ لیا ہے۔ اب آپ بے فکر ہو جاؤ۔ اوہو، جی آپ ہو اپنے چودھری انور علی صاحب۔ بڑے عرصے بعد دیکھا۔ خیر سے آپ تو سال کے بارہ مہینے رہتے ہو دورے پر... لندن، پیرس اور نیو یارک میں جی۔ یہ اپنے چودھری اکبر صاحب کے مہمان ہوں گے۔" ڈاکٹر نے ریشم کی جگہ بیٹھ کے دوپٹے کی رنگین پٹی کھولنا شروع کی جس کے بسنتی رنگ میں میرے لہو کی سرخی شامل ہو چکی تھی۔

"مہمان ہم سب کا مہمان ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب۔ آپ زبان سے زیادہ ہاتھ کا استعمال کریں۔"

"وہ تو آپ دیکھتے جائیں جناب! ابھی ہمارے ہاتھ میں آ گیا کیس، آپریشن آپ کے سامنے ہوگا۔ گولی باہر اور بندہ ایسے ہشاش بشاش اور بھلا چنگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔"

"مگر گولی تو پہلے ہی باہر ہے۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"لو جی، مریض تو ہمارے ہاتھ لگاتے ہی بچ گیا۔ اب آپ ذرا گرم پانی منگوا دو کسی دیگ یا دیگچے میں۔" ڈاکٹر کی زبان رکے بغیر چلتی رہی۔ یہ اس کی خامی سے زیادہ خوبی تھی کہ اس نے ماحول کی کشیدگی کا اثر نہیں لیا اور کسی حد تک سب کو مطمئن کر دیا۔ اس نے زخم کی صفائی کی اور خون روک کے پٹی باندھ دی۔ اس نے مجھے تین چار قسم کے انجکشن

لگائے جو اس نے اپنی مداری کی پٹاری جیسے بیگ میں سے برآمد کیے تھے۔ اس کا بیگ بھی اسی جیسا تھا۔ پھولا ہوا اور مضحکہ خیز نظر آنے والا۔ کوئی انجکشن ضرور خواب آور تھا کہ مجھ پر سکون کے ساتھ غنودگی غالب آنے لگی اور ڈاکٹر کے جانے سے پہلے ہی میں سو گیا۔ اس کی موجودگی میں ہی حویلی کے ملازم فرش پر پڑی لاش کو اٹھا کے لے گئے تھے مگر اس نے جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اس نے یقیناً سمجھ لیا تھا کہ وہی گولی چلانے والا تھا جو فوراً مار دیا گیا تھا۔ جب تک اسے کہا نہ جائے، وہ حویلی کے اندر مرنے والے کو بچانا بھی اپنی ذمے داری نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے مقتول کے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں کیا اور یوں اپنے کام میں لگا رہا جیسے کمرے میں اور کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔

میری آنکھ کھلی تو رات کی تاریکی غالب آ چکی تھی۔ میرے پاس صرف ریشم خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا لباس بدل لیا تھا۔ غالباً میرے خون کے داغ اس کے کپڑوں پر بھی لگے ہوں گے۔ دن کی نسبت وہ زیادہ فریش لگ رہی تھی مگر اداس اور متفکر بھی نظر آتی تھی۔ مجھے بیدار دیکھ کے وہ مسکرائی اور مجھ پر جھک گئی۔ "کیسی ہے اب طبیعت؟"

میں اٹھ بیٹھا۔ "میری طبیعت کو کیا ہوا تھا؟"

"کیا کرتے ہو۔ لیٹے رہو نا آرام سے۔ زخم تازہ ہے۔" اس نے مجھے ایک ہاتھ سے روکنے کی کوشش کی۔

میں نے اس کا ہاتھ کلائی سے تھام لیا۔ "تم واقعی پاگل ہو۔ یار! ایسی خراشیں تو لگ جاتی ہیں کسی کو بھی۔ یہ کوئی زخم ہے؟ ہڈی متاثر ہوتی تو الگ بات تھی۔ تمہارا ہاتھ بھی تو کٹتا ہو گا کبھی سبزی بناتے ہوئے یا پھل کاٹتے ہوئے... چولھے پر کھانا پکاتے ہوئے جلا ہو گا۔"

"یہ سب میری وجہ سے ہوا نا؟" اس نے رونے کی تمہید باندھی۔

"واقعی، نہ ہم پکڑے جاتے نہ حالات ایسے پلٹا کھاتے۔ کبھی بدقسمتی کے پردے میں خوش نصیبی ہوتی ہے جو ہم سمجھتے نہیں۔"

"اس میں خوش نصیبی کیا نظر آتی ہے تمہیں؟"

"نہ چودھری اکبر نے مجھے اور تمہیں اٹھوایا ہوتا، نہ ہم فرار کی کوشش کرتے اور پکڑے نہ جاتے تو نہ جانے کہاں بھٹک رہے ہوتے۔ اکبر کے شکاری کتے ہماری بو سونگھتے ہمارا تعاقب کرتے... آج ہم شاہی مہمان ہیں۔ مجھے [illegible] جاتا تو اکبر جیسے خطرناک دشمن کا مقابلہ ہمارے بس کی بات کہاں تھی۔ وہ مجھے مروا دیتا اور تم سے زبردستی شادی کر لیتا یا شادی نہ بھی کرتا تو تم اس کا کیا بگاڑ سکتی تھیں۔ وہ تو اپنے باپ کی سننے والا نہیں تھا۔ آج انور علی کی مدد کر کے میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے ایک ظالم اور غاصب کو کیفر کردار تک پہنچانے میں اپنا رول ادا کیا اور حق دار کو اس کا حق دلایا تو یہ رضائے الٰہی تھی۔ اس نے مجھے وسیلہ بنایا... تمہاری وجہ سے۔"

"میری وجہ سے... تمہاری مشکلات بھی میری وجہ سے شروع ہوئیں۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "لو، اب میں کہوں کہ جان بچ جانے کے بعد میں تمہارے گھر نہ پہنچتا تو کچھ نہ ہوتا۔ چھوڑو ان سب باتوں کو۔ اتنی خرابی کے بعد جو ہوا اچھا ہوا۔ مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ اکبر نے غلط رویہ تو اختیار نہیں کیا تھا بعد میں... مجھے بہت فکر تھی تمہاری؟"

"اور مجھے تمہاری۔ ماں جی نے مجھے بتایا کہ تمہیں اکبر نے حویلی میں ہی قید کر رکھا ہے۔ بڑے چودھری صاحب نے مجھے تو اکبر کی ماں کے حوالے کر دیا تھا اس لیے میں محفوظ رہی۔ اکبر کو شادی کی جلدی پڑ گئی تھی مگر ماں نے اسے کہا کہ شرم کرو۔ ابھی لڑکی کے باپ کا چالیسواں بھی نہیں ہوا۔ وہ پہلے ہی دکھی ہے۔ اس پر ظلم نہ کرو۔ اکبر مجبور ہو گیا۔ تاہم بابا کے چہلم کے بعد وہ انتظار نہ کرتا مگر میں بھی طے کر چکی تھی کہ ایک مہینے میں نکل جاؤں گی تمہارے ساتھ اور یہ نہ کر سکی تو اکبر کی جان پہلے لوں گی، اپنی بعد میں... ظاہر ہے اس کے بعد مجھے زندہ کون چھوڑتا۔ اس کی بیوی شانو پہلے ہی مجھ سے سخت خفا تھی... جیسے میں نے پھانس لیا تھا اس کے شوہر کو۔ میرا اپنی صفائی میں کچھ کہنا لاحاصل تھا۔ ساس کی وہ پہلے سے دشمن ہے حالانکہ وہ اکبر کے تایا کی بیٹی ہے تو اس کی خالہ زاد بھی ہے۔ دہرا رشتہ پہلے سے تھا لیکن یہ تیسرا رشتہ قائم ہوا تو پہلے والی بات الٹی ہو گئی۔"

میں نے کہا۔ "ایسا تو ہونا لازمی ہے۔"

"لازمی کیوں ہے؟"

"شادی کے بعد دولہا کی ماں اور بیوی... دونوں کے خون میں نئے دشمنی کے ہارمون پیدا ہوتے ہیں۔"

وہ میری بات سمجھی نہیں۔ "اکبر کی ماں کا رویہ تو پہلے جیسا ہی ہے مگر بھانجی کے لیے اب وہ خالہ نہیں ساس ہے۔ اکبر کی ماں نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ شوہر سے لڑے گی تو الٹا نقصان کرے گی۔ مرد کو بھلا دوسری یا تیسری شادی سے کون روک سکتا ہے۔ اگر وہ طے کر لے تو اسے روکنے کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ ریشم بے چاری تو خود مجبور ہے مگر اس نے اسے بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساس کی حمایت سمجھا بیٹے کے لیے۔ پھر میں نے اس سے مدد مانگی کہ وہ کسی طرح حویلی سے نکلنے میں میری مدد کرے۔ میں یہاں سے نکل جاؤں گی تو پھر کسی کے ہاتھ نہیں آؤں گی۔ میں نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ اکبر میری لاش سے شادی کر سکتا ہے مجھ سے نہیں۔ میں اسے ماردوں گی یا خود مر جاؤں گی۔ اس کے بعد شانو نے مجھ پر اعتبار کیا اور کہا کہ میں رات کو تیار رہوں۔ وہ مجھے فرار کرا دے گی۔ میں نے کہا کہ اکیلی کہاں جاؤں گی میں... سلیم سے بات کرلوں پہلے... جیسے ہی اسے موقع ملا، ہم دونوں ایک ساتھ نکل جائیں گے... وہ بے چاری جو مدد کے جرم میں ماری گئی، شانو کی خاص ملازمہ تھی۔ اکبر نے بیوی کو بھی مارا کہ تو نے میرے خلاف سازش کی تھی۔"

"یہ مخبری کس نے کی کہ ہم صبح فرار ہوں گے؟"

"اس کا کچھ پتا نہیں۔ لیکن ظاہر ہے اندر ہی کسی نے کوئی بات سن لی۔ شانو نے بے وقوفی نہیں کی تو اس کی ملازمہ نے کی ہوگی۔ اس معاملے میں میرا شانو پر اعتماد کرنا بھی رسک تھا۔"

"میری مدد تو خدا نے کی یا شاید مجھے انور کی رہائی کا وسیلہ بنایا۔ مجھ سے کہیں زیادہ ظلم اس پر ہوا تھا۔ ماں نے اس کی زندگی تو بچالی مگر وہ اس کو رہائی نہیں دلا سکتی تھی۔ اس بے چاری کو تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ اکبر نے کیسے بڑے بھائی کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس پر ایسے عمل کر رہا تھا کہ ماں بھی بے خبر تھی۔ وہ انور کو آہستہ آہستہ قتل کر رہا تھا۔"

"آہستہ آہستہ کیسے؟" ریشم کنفیوز ہو گئی۔

"اسے ایک وقت کے کھانے میں زہر دیا جا رہا تھا۔"

"زہر؟" ریشم نے دہل کے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھا۔ "پھر وہ مرا کیوں نہیں تھا؟"

"ریشم! ایسے زہر ہوتے ہیں جو آہستہ آہستہ اثر کرتے ہیں۔ اندر پہنچنے کے بعد... پہلے تھوڑی تھوڑی مقدار میں دیے جاتے ہیں پھر مقدار بڑھاتے جاتے ہیں تاکہ جسم عادی نہ ہو۔ بندہ گھل گھل کے مرتا ہے۔ رزق، موت اور زندگی سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے... کسی بندے کے ہاتھ میں نہیں۔ اس نے وسیلہ مجھے بنا دیا۔ میں نے انور کی مدد کی اور ہم ایک ساتھ نکل آئے۔ اس کے پیروں میں زنجیر تھی۔ مجھے ابھی بیڑی نہیں پہنائی گئی تھی۔ کھانا لانے والے کے لیے دروازہ کھولا گیا تو میں نے محافظ کو قابو کرلیا۔"

"اور وہ تمہیں مار دیتا... پھر؟"

"میں یہ نہیں کہتا کہ وہ مجھ سے زیادہ طاقتور نہیں تھا یا خالی ہاتھ لڑنا مجھے اچھا آتا ہے۔ بس یہ خدا کی مرضی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے اسے باندھ کے ڈالا اور انور کے ساتھ نکل آیا۔ اب تم دیکھ لو جیسے ایک مچھر نے نمرود کو مار دیا تھا... میرے جیسے اجنبی اور کم حیثیت آدمی نے حکومت الٹ دی۔ یہ میرا منصوبہ ہرگز نہیں تھا۔"

کسی نے دروازے کو باہر سے بجایا۔ "لیلیٰ مجنوں کی خلوت میں فرق نہ پڑے تو میں اندر آ جاؤں۔" انور نے کہا۔

"حد کرتے ہو یار تم... نہ ہم لیلیٰ مجنوں ہیں اور نہ تم غیر ہو۔"

وہ مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ "پہلی بات میں نہیں مانتا، دوسری مان لیتا ہوں۔"

ریشم کا رنگ لال ہو گیا۔ وہ خاموشی سے نکل گئی۔ میں نے کہا۔ "تم سے کوئی پردہ نہیں۔ یہ سچ ہے ابھی تک۔"

"سچ یک طرفہ نہیں ہوتا۔ اس لڑکی کے بارے میں شرط جیت سکتا ہوں میں۔ وہ تمہاری محبت میں غرق ہے گوڈے گوڈے... اور جب عشق کی آگ ایک طرف بھڑکے تو دوسرا کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟"

"یار! میں ابھی تک نورین کو بھول نہیں سکا۔ حالانکہ اس کا ملنا بھی یقینی نہیں اور مل جائے تو اس سے میری محبت بھی یک طرفہ ہے۔ اس کے عشق میں صرف میں مبتلا ہوں۔ وہ کسی اور کے عشق کی مریض ہے۔"

"ایسا فلموں اور ڈراموں میں ہوتا ہے۔"

"آپ کی یہ تھیوری وہاں بھی غلط ثابت ہو رہی ہے۔ ابھی تک میرے عشق کی آگ سے وہ محفوظ ہے۔"

"چلو یار! اس مشکل کا حل بھی نکل آئے گا۔ آج کا مجنوں دو سچے عشق کر سکتا ہے اور دونوں کو پا سکتا ہے۔ ابھی بتاؤ تم اندر سے کیسا محسوس کرتے ہو۔ باہر سے تو ٹھیک لگتے ہو۔"

"میں اندر سے بھی سو فیصد فٹ ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے فکرمند لگتے ہو۔"

وہ صوفے پر ٹک گیا۔ "ہاں، ایک بات ہے جو شاید تمہیں قائل نہ کرے... چھٹی حس کی وارننگ کے کس حد تک قائل ہو تم؟"

"واجبی حد تک۔ جواب سو فیصد ہاں یا نہ میں نہیں دیا جا سکتا۔"

"یہ دراصل آدمی کے اندر کی سوچ ہوتی ہے۔ ایسے خوف جن کا وہ ادراک یا اعتراف نہیں کر سکتا۔ انہیں اپنا وہم سمجھ کے ٹالتا رہتا ہے مگر وہ بھی سو فیصد وہم نہیں ہوتے۔ جیسے

موسمی پیش گوئی کچھ مشاہدے اور کچھ امکانات پر کی جاتی ہے اور اب عموماً ٹھیک ہوتی ہے کیونکہ مشاہدے کے بہتر اور زیادہ قابلِ اعتماد ذرائع دستیاب ہیں... تو ایسے ہی کچھ اندیشے میرے ذہن میں یوں سر اٹھاتے تھے جیسے افق پر بادل اٹھے تو خیال آتا ہے کہ بارش ہوگی مگر آدمی فوراً چھتری نہیں تان لیتا۔"

"بالکل ٹھیک... اب مسئلہ بتاؤ۔"

"تم یقین کرو نہ کرو، آج دن میں جو شخص مجھے قتل کرنے آیا تھا وہ صرف معزول حکمراں یعنی اکبر بادشاہ کا حامی اور وفادار نہیں تھا۔ اسے دکھ شاید ہو کیونکہ وہ اکبر کا باڈی گارڈ تھا اور ڈرائیور بھی لیکن اس کی وفاداری کے جذبے کا استحصال کیا گیا۔ اسے بغاوت پر اکسایا گیا۔ غالباً گمراہ کیا گیا کہ اب تمہاری بھی خیر نہیں۔ جو وفاداری میں پیش پیش تھے، ان کو فارغ کیا جائے گا۔ کیسے فارغ کیا جائے گا؟ یہ کسی قاعدے دستور کے مطابق نہیں ہوگا۔ حویلی کی روایات میں ایک سے وفاداری دوسرے سے غداری کا جرم بھی جاتی ہے۔ چھوٹی بیگم صاحبہ کی خاص ملازمہ کو ابھی کل دفن کیا گیا ہے۔ بہت جلد دوسرے نمک حرام گاڑ دیے جائیں گے جنہوں نے ولی عہد کے بجائے اس کا ساتھ دیا جو حق دار نہیں تھا۔"

میں اسے غور سے دیکھتا رہا۔ "تمہارے خیال میں اسے کس نے اکسایا؟"

"اس نے جو میری حق تلفی کا ذمے دار تھا... جس نے غلط فیصلہ کیا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے بڑے چودھری صاحب؟"

"ہاں، ان کو وہ خطرہ اب سر پر منڈلاتا نظر آ رہا ہے جسے انہوں نے اپنی دانست میں بروقت ٹال دیا تھا۔ ان کے آبا و اجداد کی سلطنت یہ جاگیر ہے۔ میں جاگیرداری نظام کی مخالفت کرنے والا اس کی کیسے حفاظت کروں گا۔ ان کی سوچ کا جانشین تو اب رہا نہیں۔ وہ خود کتنے دن رہیں گے۔ یہ ان کے اختیار میں نہیں کہ تختہ الٹ دیا گیا ہے اسے پھر سیدھا کر دیا جائے۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ تم نے شاید ان کے رویے پر غور نہ کیا ہو۔ وہ متفکر تھے۔ وہ ماں کی طرح غیر جانب داری کا عذاب نہیں جھیل سکتے۔ ان کے لیے جانب داری ایک سیاسی ضرورت ہے۔ ان کی خاموشی کے پیچھے اندیشے تھے۔ انہوں نے یقیناً مشکل فیصلہ کیا پھر امکانات کو دیکھا جس میں الزام ان پر نہ آئے۔ تمام مہرے چیک کیے... کون اس حد تک بے وقوف اور جذباتی ہے کہ اسے استعمال کیا جا سکے اور پھر صحیح آدمی چن لیا۔"

"اگر یہ نظریہ درست ہے تب بھی خطرہ تو ٹل گیا۔ اللہ نے تمہیں محفوظ رکھا۔"

"خطرہ ٹلا ضرور ہے، ختم نہیں ہوا۔ بڑے چودھری صاحب ایک ناکامی کو شکست مان سکتے ہیں... آخری شکست نہیں۔"

میں نے کہا۔ "پھر... اب وہ کیا کر سکتے ہیں؟"

"آج اس حملہ آور کا مارا جانا ایک درسِ عبرت تھا، ان کے لیے جو اپنے دماغ میں غلط قسم کی توقعات رکھتے تھے۔ سب کو ایک سبق ملا کہ کسی نے وفاداری کو ظاہری رکھا تو مارا جائے گا۔ یہ معمولی حیثیت کے ملازم ویسے ہی بہت کم ہمت ہوتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ان کو درسِ عبرت بنا دیا جاتا ہے۔ میں جو تھا یا سمجھا جاتا تھا، اب نہیں ہوں... حالات کی ستم ظریفی نے مجھے سخت دل بنا دیا ہے معلوم ہے میں نے آج کیا غیر انسانی حرکت کی۔ میں نے اس حملہ آور کی لاش کو ننگا کر کے حویلی کے صحن میں الٹا لٹکا دیا۔"

میرا دل لرز گیا۔ "اوہ مائی گاڈ... انور علی! اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی یار... بلکہ مجبوری تھی۔ اس منظر نے سب کو دہلا دیا۔ جب اس کی بیوی نے لاش کے سامنے سینہ کوبی کی اور بچوں نے چیخ پکار مچائی تو میں برآمدے میں گن لیے بیٹھا تھا۔ میری ماں کمرے سے نہیں نکلی۔ ریشم کے بارے میں سنا ہے بے ہوش ہو گئی تھی۔"

"اس نے ذکر نہیں کیا مجھ سے۔"

"اب کسی میں ہمت تک نہیں ہے بات کرنے کی۔ میری بھابی نے خود اپنا سامان اٹھوایا اور میرا پرانا کمرا خالی کر دیا۔"

"تم بہت بڑے سیاسی بازی گر ہو... یہ مجھے اندازہ نہ تھا۔"

وہ ہنسا۔ "خود مجھے کب اندازہ تھا۔ ایک اور دلچسپ بات سنو۔ سہ پہر کے بعد مقامی تھانے دار آ گیا۔ اندر آتے ہی لٹکی ہوئی لاش دیکھ کے وہ جیسے پتھر کا ہو گیا۔ وہ ایسے کسی منظر کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اس نے مجھے دیکھا کہ ریوالور میرے سامنے میز پر رکھا ہے اور میں کافی پی رہا ہوں۔ اس ایک لمحے میں تھانے دار کے اندر کا بزدل آدمی لرز گیا۔ تاہم وہ بڑی متانت سے آیا اور میں نے ہاتھ ملا کے اسے دوسری کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ پھر اس کے بات کرنے سے پہلے میں نے کہا کہ تھانے دار کے لیے چائے لائی جائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے محتاط لہجے میں پوچھا کہ چودھری صاحب! یہ کیا ہے... میں نے پُرسکون رہتے ہوئے جواب دیا... وہی جو تمہیں نظر آرہا ہے۔ ظاہر ہے تم وجہ جاننا چاہتے ہو... اس نے مجھے قتل کرنے کے لیے مجھ پر گولی چلائی تھی جو میرے مہمان کو لگی مگر اس کی جان بھی محفوظ رہی۔ وہ صرف زخمی ہوا اس لیے دوسرا فائر کرنے سے پہلے میں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ تھانے دار کچھ دیر چپ رہا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ سزا تو آپ نے دی وہ درست ہے مگر یہ تماشائے عبرت کس لیے؟ ایسا وہ خود بھی کرتا ہے تھانے میں آنے والوں کے ساتھ۔ میں نے اس کی تشریف آوری کا مقصد پوچھا تو جو سوال وہ جارحانہ انداز میں کرتا، وہ بہت محتاط ہو کے کیا کہ چھوٹے چودھری صاحب نظر نہیں آرہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں وہ شوقین مزاج اور سیلانی آدمی ہے۔ میں نے بھی اسے کل رات کھانے کی میز پر دیکھا تھا۔ اس پر وہ مزید چونکا کیونکہ گزشتہ رات تو اس کی معلومات کے مطابق میں قید خانے میں بندھا پڑا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے بڑے چودھری صاحب سے کام تھا تو میں نے کہا کہ ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ عمر کا تقاضا ہے، کچھ دل کا مسئلہ ہے۔ کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں... وہ کہنے لگا کہ آپ سے تو بہت عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ اس کا مقصد مجھ سے یہ سننا تھا کہ ملاقات کیسے ہوتی، میں تو قید خانے میں تھا... مگر میں نے اسے سخت مایوس کیا۔ میں نے کہا کہ دراصل میرا دھیان زیادہ تر کتابوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ اتنا عرصہ باہر پڑھ کے آیا... تعلقات بھی بہت ہیں باہر... ان سے اب نیٹ پر رابطہ رہتا ہے۔ یہ زمین، جائداد کے تمام معاملات ابا جی اور بھائی جی چلا رہے تھے۔ اب ابا جی نے کہا کہ میاں کچھ ادھر بھی دھیان دو۔ بھائی جی کا مزاج ہے رنگین... ان کے مشاغل بھی دوسری طرح کے ہیں، آپ تو جانتے ہوں گے... تو اب میں نے یہ ذمے داری سنبھالی ہے اور بھائی جی کو دے دی ہے کھلی چھٹی کہ آپ موج کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہو... کرو موجاں... ہم تو ابھی چھڑے چھانٹ ہیں... دیکھ لیں گے یہ دنیاداری کے معاملات... تو بس ان کو مل گئی کھلی چھٹی... وہ مزید پریشان ہوا کہ نہ میں شکوہ کررہا ہوں، نہ شکایت کا موقع دے رہا ہوں... کیسے کہے کہ میں نے کچھ اور سنا تھا۔"

"کیا سنا تھا اور کس سے؟"

"یہ بتانا اسے مشکل ہو جاتا... کیسے کہتا کہ بڑے چودھری صاحب سے سنا تھا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ انہوں نے شکایت کی ہوگی۔"

"سو فیصد... اور میں پرانا فقیرانہ مزاج والا انور علی ہوتا تو وہ صاف کہتا کہ مجھے شک ہے آپ نے بڑے بھائی کو مارا نہیں تو اسی حویلی میں قید کر رکھا ہے۔ میرا ہلاکو خان والا رول دیکھ کر اس کی ہمت نہیں پڑی لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ وہ ابا جی کے کہنے پر حکام بالا تک معاملہ پہنچائے گا اور پھر خانہ تلاشی کے وارنٹ لے کر آئے گا۔ کچھ تفتیش کرے گا پرانے ملازموں سے میرے بارے میں۔ شاید کوئی بک دے کہ میں تو قید میں پڑا تھا، نیچے تہ خانے میں... وہاں اب اکبر علی پڑا ہے اور اس کا ذمے دار ہے یہ مہمان... پھر یہ بھی پتا چل جائے گا کہ تم کس قسم کے معزز مہمان ہو۔ ریشم کا معاملہ سامنے آئے نہ آئے، یہ بھید ضرور کھل جائے گا کہ سلیم تمہارا اصل نام نہیں... تم تو سکھر جیل سے ڈاکوؤں کے ساتھ فرار ہوئے تھے اور سزائے موت کے منتظر قیدی تھے۔ بس اشارہ کافی ہے، تم دھر لیے جاؤ گے۔"

ایک دم میرے اندر خطرے کی گھنٹی بہت بڑا گھنٹا بن کے گونجنے لگی۔ "پھر... کیا کرنا چاہیے مجھے؟"

"ہاں، یہ وہ سب معاملات تھے جن پر میں نے سوچا۔ اس حملہ آور کی لاش تو میں نے تھانے دار کے سامنے ہی اتارنے کا حکم دے دیا تھا... اور یہ بھی کہ اس کی تدفین عزت و احترام سے کی جائے۔ ہمارے مزاج کا دوغلاپن پوری طرح اس نے دیکھا۔ ایسی ذلت کی موت کے بعد باعزت تدفین کا کیا مطلب ہے۔ میں نے مولوی کو بھی طلب کیا اور مرنے والے کی بیوہ کو بھی۔ ہاں، یہ بتانا بھول گیا کہ جب تھانے دار آیا تو وہ لاش کے سامنے فرش پر سر پٹخ رہی تھی۔ چلا چلا کے مجھے کوس رہی تھی اور ایسے بین کررہی تھی کہ پتھر کا دل بھی پگھل جائے۔ میں نے تھانے دار کے سامنے ہی یہ حکم دیا تھا کہ اس عورت کو ہٹاؤ یہاں سے۔ بہت شور کررہی ہے۔ پھر تھانے دار کے سامنے ہی اسے لایا گیا تو میں نے اس کو ایک مربع زمین دینے اور اس کے بچوں کی ذمے داری لینے کا حکم نامہ بھی جاری کیا۔ یہ سب ایکٹنگ اداکاری کا مظاہرہ تھا جس پر مجھے آسکر ایوارڈ مل سکتا تھا۔ میں نے جو ڈائیلاگ بولے اور جیسے مطلق العنان سفاک، بااختیار اور طاقتور حاکم کا رول کیا، وہ مثالی تھا۔ تھانے دار کی دوبارہ ہمت نہ پڑی کہ بڑے چودھری صاحب کی بات بھی کرے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ حکم کس کا چل رہا ہے۔" سلام کرکے رخصت ہو گیا لیکن مجھے یقین ہے کہ نئی لائن اسے ابا جی دیں گے کہ ہاتھ ڈالو اس معزز مہمان پر۔ ایک نہیں، مقدمات اس پر بناؤ یہاں... ایک حدود آرڈی نینس کے

تحت... سارا گاؤں گواہی دے گا کہ وہ رحیم بخش کے گھر میں رہا۔ زندگی میں بھی اور اس کے مرنے کے بعد بھی... جہاں ریشم بھی تھی۔ وہ نہ رشتے دار ہے، نہ اس گاؤں کا... تفتیش کرو ایک رات کہ اس کا کون سا دادا یہاں تھا۔ وہ خود سچ بتادے گا۔ دوسرا کیس بناؤ رحیم بخش کے قتل کا... جو اس نے ریشم کے ساتھ مل کے کیا... یہ دو کیس درج کرنے کے بعد اسے شہر کی پولیس کے حوالے کرو کہ یہ ہے تمہارا مفرور مجرم... لے جاؤ اور لٹکا دو... اب تو ایک اور جرم میں سزائے موت پکی ہے۔"

"یار بس کرو... ڈراؤ مت۔ یہ بتاؤ میں کیا کروں؟"

"آج رات تم غائب ہو جاؤ گے مگر اکیلے نہیں... اکبر علی کے ساتھ۔"

میں اچھل پڑا۔ "اکبر علی کے ساتھ... میرا خیال تھا تم کہو گے ریشم کے ساتھ۔"

"تھانے دار یہ پلان لے کر نیا حملہ کرے گا کل پرسوں کہ جب پھندا پڑے گا تمہارے گلے میں اور ریشم آئے گی قانون کی گرفت میں تو میں زمین پر سات بار ناک سے لکیریں نکال کے سودا کروں گا۔ تین شرائط واضح ہوں گی۔ تم واپس وہیں تہ خانے میں... اکبر کی حکومت بحال... ریشم کا اکبر سے فوری نکاح... اس کے بدلے بری اور تمہاری زندگی کی ضمانت... تم جاؤ جہاں جی چاہے... تم پر کوئی کیس نہ ریشم پر... ورنہ اس حملہ آور کے قتل کا الزام بھی مشکل نہیں... کون ثابت کرے گا کہ وہ جوابی کارروائی میں مارا گیا... یہ ثابت کیا جاسکتا ہے گواہوں کے بیانات سے کہ میں نے اسے درسِ عبرت بنانے کے لیے کسی قصور کے بغیر مارا۔"

"بھائی مجھے کیوں بتارہے ہو یہ سب... یہ بتاؤ کہ اکبر علی کو لے کر میں کہاں جاؤں؟"

"آج رات کو تم اور میں اکبر علی کو خاموشی سے بوری میں پیک کریں گے۔ اسے زنجیر سے آزاد کرنے سے پہلے اس کا منہ بند کریں گے اور ہاتھ پیر باندھیں گے۔ مشکل ہوگی اسے اٹھا کے اوپر لانے میں چنانچہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے اوپر لا کے باندھیں۔ نیچے صرف ہاتھ باندھیں اور منہ بند کریں یا تم اسے اٹھا کے لا سکتے ہو؟"

"شاید یہ کرسکتا ہوں میں... دونوں کام... مگر اس کے بعد؟"

"ایک گاڑی تمہیں پیچھے ملے گی۔ اس میں اکبر علی کو پیچھے ڈالا جائے گا۔ اس کے ساتھ میں بیٹھوں گا اور تم گاڑی چلاؤ گے۔"

"کہاں جائیں گے ہم؟"

"یہ مجھ پر چھوڑو... ایک جگہ ہے میرے پاس بھی... لیکن وہاں بھی تم دو چار دن رہو گے... تھانے دار پوری تیاری کے ساتھ آئے گا خانہ تلاشی کے وارنٹ لے کر... میں اسے تہ خانے کی سیر کرادوں گا۔ وہاں کا نقشہ بدل دینے کی ذمے داری میری۔ ایک حصہ میری لائبریری اور اسٹڈی بن جائے گا، دوسرے میں اجناس بھر دی جائیں گی۔ وہاں چوہے دوڑ رہے ہوں گے۔ نہ مدعی نہ شہادت، الزام نہ میری طرف سے نہ مجھ پر... مہمان کہاں گیا؟ جہاں سے آیا تھا... کہاں سے آیا تھا؟ کراچی سے... لندن سے... جو میں کہوں گا اسے چیلنج کرتے ہو تو جاؤ تلاش کرلو... ریشم کے حق میں گواہی میری... باپ کی موت کے بعد سے وہ حویلی میں ہے... میری حفاظت میں... میرا مہمان اس کے گھر میں کبھی نہیں رہا... وہاں کون مہمان تھا... اس کے باپ کو پتا ہوگا... ریشم سے جو پوچھنا ہے میرے سامنے پوچھ لو... وہ میری اور ماں کی ذمے داری ہے۔"

"یہ سب کرلو گے تم؟"

"ہاں، اگر ایسا ہوا تو ایسے کو تیسا بھی ہوگا۔ تھانے دار کو کس نے بلایا، یہ جاننا میرے لیے ضروری نہیں۔ اس کا شک رفع ہو گیا تو وہ دفع ہو جائے۔"

"اور حویلی میں سے کسی نے تمہارے خلاف بیان دے دیا پھر؟"

"اب کس میں اتنی ہمت ہے؟ خبردار میں پھر کردوں گا کل... لیکن تھانے دار نے کچھ نہ کیا اور میری حکومت کو تسلیم کرلیا تو پھر ظاہر ہے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ دو چار دن میں تم واپس آجاؤ گے اور قیدی پھر قید خانہ آباد کرے گا۔ ورنہ دو چار دن بعد تمہیں وہاں سے بھی شفٹ کردیا جائے گا کسی زیادہ محفوظ مقام پر۔"

"چلو فی الحال اتنا کافی ہے۔ آگے کی بعد میں سوچیں گے۔"

"یعنی تم ریڈی ہو... اب رات کے کھانے کے بعد ہم اور تم سو جائیں گے۔ ایک محافظ تمہارے دروازے پر پہرا دے گا۔ دوسرا میری حفاظت پر مامور ہوگا اور ان دونوں کی وفاداری شبے سے بالاتر ہے۔ وہ انتہائی بزدل ہیں اور میں انہیں بتادوں گا کہ ان کے بیوی بچے صبح نہیں ملیں گے اگر

WWW.PAKSOCIETY.COM

رات کو ان سے ایک لمحے کی کوتاہی ہوئی تو کل ان کی لاشیں بھی وہیں لٹکی ہوں گی جہاں آج ایک نمک حرام کی لٹکائی گئی تھی۔ میرا بندوبست پکا ہے۔ بس اب آدھے گھنٹے بعد ہم کھانے کی میز پر اکٹھے ہوں گے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ظاہر ہے انور کی باتوں نے میرے سکون کو تہ و بالا کر دیا تھا اور وحشت ناک خیالوں کے ایک سانپ کے بطن سے خوف اور اندیشوں کے سو سنپولیے جنم لے رہے تھے۔ میں بے چینی میں کمرے کے اندر باگڑ بلے کی طرح ٹہلتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک ملازم نے دروازے کے پاس آ کے کہا۔ "کھانا لگ گیا ہے سر۔" تو میں اچھل پڑا۔

کھانے کی میز پر حسبِ توقع ہم تین ہی افراد تھے۔ میں، انور اور ریشم... مجھے بتایا گیا کہ انور کے ماں باپ اور بھابی نے کھانا اپنے اپنے کمروں میں کھا لیا ہے۔ ریشم بھی چپ اور سہمی ہوئی سی تھی۔ صرف میں اور انور ماحول کو نارمل رکھنے کی ناکام کوشش کرتے رہے اور فضول باتیں کر کے ہنستے بھی رہے۔ اس کے بعد ریشم تو اٹھ گئی۔ ہم نے اسے بھی کافی کے لیے پوچھا مگر اس نے کہہ دیا کہ وہ کافی نہیں پی سکتی۔ میں انور کے ساتھ اس کے بیڈ روم میں چلا گیا۔

"یہ کمرا پھر ویسا ہی بنا دیا گیا ہے جیسا سال بھر پہلے تھا۔ کچھ چیزیں نئی ہیں مثلاً یہ صوفہ۔"

میں نے کہا۔ "انور! مجھے صحیح بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ کھیل اتنا خطرناک ہو جائے گا۔"

"سیاست یہی ہوتی ہے دوست... تم تو پاکستان کی نصف صدی کی تاریخ کے چشم دید گواہ ہو۔"

"ہاں مگر تماشا دیکھنا اور تماشا بننا یا تماشا کرنا سب الگ الگ باتیں ہیں۔"

"ٹیک اٹ ایزی... نو رسک نو گیم... قسمت پر بھروسا رکھو... غیب کا علم کسی کو بھی نہیں ہو سکتا چنانچہ حال سے نمٹو۔ تم تو خطرات کے چیمپئن بن چکے ہو۔"

"ہاں مگر اپنے ارادے سے نہیں، دوسروں کی مرضی سے... خود مجھ سے پوچھو تو مجھے صرف ایک پُرسکون زندگی کے سوا کچھ نہیں چاہیے... جو تقدیر میں ہوگا کوشش سے ضرور ملے گا۔"

"یہ تو سب چاہتے ہیں مگر تدبیر سے آگے کچھ بھی اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔"

رات دس بجے جب میں سونے کے لیے نکلا تو حویلی پر ہو کا عالم طاری تھا۔ یہاں لوگ نمازِ عشا کے بعد کھانا کھا کے سو جانے کے عادی تھے۔ گاؤں کی طرف سے بھی صرف کتوں کے بھونکنے کی آواز ہی سنائی دے رہی تھی۔ بہت دور گیدڑ بول رہے تھے۔ مجھے یہ ایک آسیب زدہ رات لگی۔ نہ جانے اس کی سحر ہونے تک اور کیا ہوگا جو میرے گمان میں نہیں۔

معلوم نہیں کیا وقت ہوا تھا جب کسی نے میرے دروازے پر انگلی سے دستک دی۔ خوف اور وسوسوں نے مجھے اس طرح اپنے شکنجے میں لیا ہوا تھا کہ مجھے یہ خفیف سی آواز بھی گولیوں کے فائر جیسی لگی اور میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ مجھے اپنی بزدلی پر شرم بھی آئی۔ آخر کیا ہو گیا ہے مجھے... دروازے پر ایک محافظ گن لیے میری حفاظت پر مامور ہے پھر یہ دہشت کیسی؟ اور اندر سے خوف کی بازگشت نے کہا کہ وہی محافظ کیا تمہیں نشانہ نہیں بنا سکتا؟ میں نے اپنا ریوالور نکالا اور دروازے کے قریب جا کے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"یار میں ہوں... کھولو دروازہ۔" انور علی کی آواز آئی۔

میں نے دروازہ کھولا لیکن لائٹ نہیں جلائی۔ "میں جاگ ہی رہا تھا۔ وقت کیا ہوا ہے؟"

"ساڑھے بارہ... کم آن... ہمیں دو گھنٹے میں واپس بھی آنا ہے... تم تیار ہو نا؟"

تیاری کیا کرنی تھی مجھے۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ گارڈ اس وقت بھی کسی بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔

ہم برآمدے کے آخر تک دبے پاؤں گئے۔ پھر اس نے کونے میں نصب دروازے کو کھولا اور میں نے خود کو اس مربع احاطے کے باہر دیکھا جس میں سامنے مہمان خانہ تھا۔ دائیں بائیں فیملی کی رہائش گاہ پھیلی ہوئی تھی اور پیچھے کا حصہ نوکروں کے لیے اور کچن اسٹور وغیرہ پر مشتمل تھا۔ ہم پچھلی طرف کے کمروں کی دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے آخری کونے تک پہنچے۔ میرے بائیں ہاتھ پر ایک باغ کے سایہ دار درخت اور سبزیوں کے پودے تھے۔ آخری کنارے پر ایک اور دروازہ آ گیا۔ انور نے اس کا قفل کھولا۔ وہ بھی زنگ آلود تھا۔ میں نے رات کو دیکھا جو چاند کے بغیر صرف ستاروں سے سجی تھی۔ نیچے لمبی تارکول کی سیاہ سڑک پر ایک قطار میں تین گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ ان میں آخری ایک لکس ویگن تھی۔ اس کے آگے دو کاریں کھڑی تھیں، ایک سیاہ اور ایک سفید نئے ماڈل کی کرولا۔

انور کی آواز نے مجھے چونکایا۔ "یار چلو... کیا دیکھ رہے ہو؟ ذرا سنبھل کے۔"

کوئی جواب دیے بغیر میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹارچ تھی جس کی روشنی کا دائرہ اور

قدموں تک محدود تھا۔ ان راستوں کا چکر میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کیونکہ پہلے میں کسی اور طرف سے نیچے گیا تھا اور اوپر بھی وہیں سے چڑھا تھا۔ چند قدم چل کے انور نے پھر ایک دروازہ کھولا اور ہم ایک اسٹور سے گزرے۔ پھر وہ تہ خانہ آ گیا جس میں مجھے ڈالا گیا تھا۔

انور نے ایک سوئچ دبایا پھر دوسرا۔ "لائٹ نہیں ہے یہاں... پہلے تھی۔"

"اب نہیں ہے، وہ تو دوسری طرف ہے۔"

"راستہ تم بتا چکے تھے۔" اس نے نیچے جھک کے عارضی طور پر فکس کیے جانے والے تختے کو لات مار کے دوسری طرف گرایا۔ اکبر علی کی پُر وحشت آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟" پھر اس نے لائٹ جلا دی۔ "تم؟"

انور علی نے کہا۔ "ہاں چھوٹے بھائی! میں نے سوچا دیکھ لوں تمہیں اس بیڈ روم میں تکلیف تو نہیں ہے کوئی۔"

"اسے بیڈ روم کہتے ہو تم؟" وہ چلّانے لگا۔

"تم کیا کہتے تھے؟" انور نے کہا۔ "میری آخری آرام گاہ؟ تم نے تو کبھی نہیں دیکھا خود آ کے کہ بڑا بھائی کس حال میں ہے مگر دیکھو مجھے فکر تھی تمہارے آرام کی... آدھی رات کو اٹھ کے پوچھنے آیا ہوں۔"

اکبر خوف زدہ ہو گیا۔ "تمہارا ارادہ کچھ اور ہے... تم مجھے مارنے آئے ہو؟"

انور نے ریوالور نکالا۔ "بہت ذہین ہو تم یار... سچ بات یہ ہے کہ تمہاری تکلیف کا جتنا خیال تھا مجھے... اس سے زیادہ اپنی تکلیف کا تھا۔ تمہیں زندہ رکھنا اور قید میں تمہارا خیال بھی رکھنا یہ بہت مشکل تھا... کتنی ذہنی اذیت ہوگی تمہارے لیے زندہ رہنے میں بھی... گزرا ہوا وقت تو خیر سب کو یاد آتا ہے مگر تمہیں زیادہ افسوس ہوگا اس غلطی کا جو تم سے انجانے میں ہو گئی اور تم نے سوچا ہوگا کہ ماں کی قسموں پر تم بلا جذباتی ہوئے... ختم کرتے میرا قصہ تو ماں کیا کرتی، رو دھو لیتی... تمہیں گالیاں کوسنے دیتی مگر پھر صبر کرتی... صبر کے سوا چارہ کیا ہوتا اس کے پاس... وہ تمہیں پولیس کے حوالے بھی نہ کر پاتی... کیونکہ پھر تم اکلوتے ہو جاتے... ایک سال بعد وہ ایک دن برسی کرتی میری اور اس دن پھر روتی مگر اس کے بعد پھر خاموش ہو جاتی۔ نہ تمہارے ضمیر پر کوئی بوجھ ہوتا، نہ اس کے لیے دکھ... اب دیکھو کہ وہ پھر عذاب سے گزر رہی ہے۔ ایکشن ری پلے... اپی سوڈ ٹو..."

اکبر ہکلایا۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"کیوں نہیں کر سکتا؟ آدمی اپنی اور دوسروں کی غلطی سے ہی سیکھتا ہے میرے بھائی۔ میں کیوں یہ روگ پالوں؟ کیوں رسک لوں؟ میں ہوں ذرا غیر جذباتی بندہ... اموشنل بلیک میل نہیں ہو سکتا۔ ماں کے عذاب کو طول دینے سے بہتر ہے کہ ختم کیا جائے... چالیس میں... تمہارے چہلم کے بعد وہ مجبور ہو گی سب بھلا کے مجھے چاہنے پر... بڑا بیٹا ہوں آخر میں... ہاں، کچھ صدمہ اباجی کو ہوگا، زیادہ روئے گی تمہاری بیوہ... وہ ماں بننے والی ہے۔ غالباً دوبارہ شادی بھی نہیں کر سکتی وہ باہر... بالآخر مجھے ہی چادر ڈالنی پڑے گی اس پر... یہ ہماری روایت ہے اور خاندانی رسم... میری ذمے داری... وہ بھی جانتی ہے چنانچہ سال دو سال میں تمہاری جگہ مجھے دینے پر راضی ہو جائے گی... تم بچے کی فکر مت کرنا... وہ میرا بھی تو بھتیجا ہے۔ اپنی اولاد کی طرح پالوں گا میں اسے۔"

"خدا کے لیے مجھے معاف کر دو انور بھائی۔"

"معاف کرنے والا اللہ ہے... تمہیں بھی اور مجھے بھی۔" اس نے نشانہ لے کر ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا۔ "کلمہ پڑھ لو۔"

اکبر کی گھگی بندھ گئی۔ "انور... انور... تجھے اللہ رسولؐ کا واسطہ... مجھ سے لکھوا لے سب اپنے نام۔"

اور اس وقت میں نے دیکھا کہ خوف سے اس کا پیشاب خطا ہو چکا تھا۔ وہ زمین پر گر گیا تھا اور بڑے عجیب طریقے سے رو رہا تھا۔ انور نے میری طرف دیکھا۔ "یار! یہ ایک پریشانی پیدا کر دی ہے میں نے تمہارے لیے۔"

میں نے برہمی سے کہا۔ "آخر اس جان لیوا مذاق کی ضرورت کیا تھی... تم اتنے سفاک کیسے ہو گئے؟"

وہ ہنسا۔ "اکبر پتر! تیرا بڑا بھائی تیری جان لے سکتا ہے بھلا... خود سوچ... میں تو دیکھ رہا تھا کتنا دم خم ہے تجھ میں لیکن تُو تو بالکل ہی... نکلا... چل اٹھ... تجھے ہمارے ساتھ چلنا ہے۔"

اکبر نے بے یقینی سے سر اٹھایا۔ "کہاں چلنا ہے؟"

"بڑے گھر... وہاں زیادہ آرام سے رہے گا تُو... چل اتار دے یہ شلوار... وہاں جا کے پھر پہن لینا۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" اکبر نے کہا۔ "مارنا ہے تو مجھے یہیں مار دو۔"

"چل یار! بہت وقت ضائع ہو گیا۔" انور نے میری طرف دیکھا۔

اکبر کے پیروں کا قفل کھولنے سے پہلے میں نے اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے پھر دونوں پیر... اس کے بعد میں نے زنجیر کھول دی۔ ''یار انور! کیا حرج ہے اگر ہم اسے اٹھانے کے بجائے چلا کے لے جائیں۔ شلوار اتارنا ضروری نہیں۔''

''یہ شور کرے گا مگر منہ بند کیا جا سکتا ہے... یہ بہتر ہے۔''

اکبر نے مزاحمت ضرور کی مگر میں نے اس کے منہ میں تکیے کا غلاف ٹھونس دیا۔ پھر میں نے اسے پیچھے سے دھکیلا۔ ''چلو۔''

اس نے پھر کہا۔ ''میں نہیں جاؤں گا۔'' مگر میرے ایک دھکے سے آگے چل پڑا۔ اسے بار بار پیچھے سے دھکیلنا ایک مجبوری تھی۔ ہم اسی طرح اوپر آئے جیسے پہلے آئے تھے۔ انور نے اوپر والا دروازہ لاک کیا اور ہم اپنے قیدی کے ساتھ آخر میں کھڑی ہائی لکس ویگن کی طرف بڑھتے گئے۔ میرا خیال ہے کہ اکبر کو ہمارے وعدے کا اعتبار نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ہم اسے حویلی سے باہر لے جاکے ماریں گے اور گاڑ دیں گے مگر وہ چلتے رہنے پر مجبور تھا۔ میں نے خود اسے اٹھا کے وین میں ڈالا۔ انور اس کے ساتھ چڑھ گیا۔ اس نے اکبر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور ایک چابی مجھے دی۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور وین کو ریورس میں گیٹ سے باہر نکالا۔ انور مجھے ہدایات دیتا گیا۔ وین اجنبی راستوں پر دوڑتی گئی۔ ہم اب شہر کی طرف جا رہے تھے۔ جی ٹی روڈ تک کا فاصلہ ہم نے دس منٹ میں طے کرلیا۔ پھر گاڑی نے لاہور کی سمت پکڑلی۔

اکبر انتہائی بے بس تھا۔ وہ حلق سے آواز بھی نہیں نکال سکتا تھا اور گاڑی میں بٹھانے کے بعد انور نے میری مدد سے اس کے ہاتھ کھول دیے تھے مگر پاؤں باندھ دیے تھے چنانچہ وہ چلتی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ مارنے کا ایڈونچر بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور بے یقینی تھی اور ایک سوال ٹھہر گیا تھا کہ آخر تم نے میرا انجام کیا طے کیا ہے اور رحم کی اپیل تھی کہ مجھے بھی جینے دو... اور ایک عہد تھا کہ میں تمہاری شرائط پر جی لوں گا لیکن یہ سب بہت بعد از وقت تھا اور وقت بدل گیا تھا۔

صرف آدھ گھنٹے بعد انور علی کی ہدایات کے مطابق گاڑی لاہور کے مضافات میں ملتان روڈ کے ایک نو آباد علاقے کی کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ اردگرد کے بیشتر مکانات میں صرف گیٹ لائٹس روشن تھیں۔ یہاں ابھی سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹس نصب نہیں ہوئی تھیں۔ سڑکوں کی حالت بھی ابتر تھی۔ نئی آبادیاں لاہور میں ہر طرف بن رہی تھیں اور یہاں ترقیاتی کام کی رفتار بھی تعمیرات کے مطابق تھی۔ یہاں ابھی مجھے بہت چھوٹے گھر دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ دس مرلے کے مکان بھی کم تھے۔ زیادہ تر کوٹھیاں ایک، دو اور چار کنال کی تھیں۔ دو گھروں کے باہر گارڈ بھی سونے والوں کی حفاظت کے لیے جاگ رہے تھے۔

جس کوٹھی کے دروازے پر گاڑی رو کی گئی، وہ میرے اندازے کے مطابق ایک کنال پر محیط تھی اور مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ انور نے مجھے پیچھے سے ایک چابی تھمائی اور میں گیٹ کو پورا کھول کے گاڑی کو اندر لے گیا۔ ہیڈ لائٹس آف کرنے سے پہلے میں نے ویران برآمدے کا جائزہ لیا جس میں نہ جانے کب سے چار کرسیاں پڑی تھیں۔ برآمدے میں دو دروازے کھلتے تھے۔ اس کے سامنے سوکھی ہوئی گھاس اور خشک پودے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس گھر کو عرصۂ دراز سے مکین میسر نہیں آئے۔ میں نے برآمدے کے سوئچ بورڈ کا ایک بٹن دبایا تو اوپر ایک گول ٹیوب روشن ہوگئی۔ چابیوں میں سے ایک نے دروازے کا لاک کھول دیا اور میں نے ہیڈ لائٹس کے دھندلے سے اجالے میں سوئچ بورڈ تلاش کیا۔ لائٹ جلاتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ ڈرائنگ روم تھا۔

اب میں نے قیدی کو اندر منتقل کرنے میں انور علی کی مدد کی اور گاڑی کی لائٹس آف کرکے باہر والا گیٹ بھی بند کر دیا۔ انور علی نے بھائی کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھول دی اور اس کے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا ابھی نکال دیا۔ وہ گھونٹ گھونٹ لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا اور بے بسی سے کبھی گردوپیش کو اور کبھی ہماری صورتوں کو دیکھتا رہا۔ ''یہ... کیا جگہ ہے؟'' اس نے بالآخر پوچھا۔

''اب تم یہاں رہو گے۔'' انور نے اسے یوں مطلع کیا جیسے یہ اچھی خبر ہے۔ ''تمہیں تکلیف کوئی نہیں ہوگی یہاں مگر ایک بات تم ابھی سمجھ لو تو زندہ رہ سکتے ہو۔ کبھی فرار کی مت سوچنا اور نہ باہر سے مدد مانگنے کا خیال دل میں لانا... ورنہ مارے جاؤ گے۔''

''کیا میں اپنی فیملی سے بھی نہیں مل سکتا؟'' وہ بے بسی سے بولا۔

''اس کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔ ہم ایک سال بعد فیصلہ کریں گے۔''

''ایک سال بعد۔'' وہ فریادی لہجے میں چلایا۔

''گھر کے لوگوں کو میں سمجھا دوں گا۔ اگر وہ تمہاری

زندگی اور سلامتی چاہتے ہیں تو اس فیصلے کو بھی اسی طرح خاموشی سے قبول کرلیں جیسے انہوں نے میری اسیری کو قبول کیا تھا۔ ماں سے اور اباجی سے یا بیوی سے تمہاری فون پر بات کرا دی جائے گی... مناسب وقت پر... اگر کسی نے میرے خلاف منہ کھولا تو وہ تمہارے ساتھ دشمنی کرے گا۔ میری پوزیشن اتنی ہی محفوظ ہے جتنی تمہاری تھی۔ مجھے اب واپس جانا ہے۔ اب تم اس کے قیدی ہو جو پہلے تمہارا قیدی تھا۔''

انور نے اندر کے تالے کھولے۔ ایک سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے اکبر علی کے پیچھے میں چلتا گیا۔ یہ تین بیڈ روم کی کوٹھی تھی جس میں اسباب آرائش نہ ہونے کے برابر تھا لیکن ضرورت کے مطابق فرنیچر ہر کمرے میں ڈال دیا گیا تھا۔ عرصہ دراز سے صفائی نہ ہونے کے باعث گرد کی تہ ہر چیز پر نظر آ رہی تھی۔ تاہم ایک نظر دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ فرنیچر بیش قیمت ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کسی فیملی کی رہائش گاہ نہیں تھی بلکہ مہمان خانے یا عشرت کدے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس کی تصدیق بہت سی چیزوں سے ہوتی تھی۔ ہر ایش ٹرے میں سگریٹوں کے ٹوٹے بھرے ہوئے تھے۔ ایک ڈبیا سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ ٹوٹے بھی بیش قیمت سگریٹوں کے ہوں گے۔ پھر مجھے ایک ٹیبل پر شراب کی آدھی بوتل اور دو جام نظر آئے۔ دوسرے کمرے میں بیڈ پر کسی خاتون کا لباس پڑا تھا اور قالین پر جوتے جیسے پھینک دیے گئے تھے۔

اکبر کو ہم نے ایک ایسے کمرے میں بند کر دیا جس کا واحد دروازہ دوسرے بیڈ روم میں کھلتا تھا۔ اس کی کھڑکی میں مضبوط گرل تھی اور یہ عقبی حصے کی گیلری میں کھلتی تھی مگر اندر کی جانب۔ ''یہ ہے تمہارا ٹھکانا۔ جیل کی اے کلاس بھی ایسی نہیں ہوتی۔ جہاں تم نے مجھے رکھا تھا وہ تو تم نے مجھے اذیت دینے کے لیے منتخب کی تھی۔ یہ صرف قید ہے، میں تمہیں زہر بھی نہیں دوں گا۔''

اکبر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونے لگا۔ ''تم جلاد ہو؟''

انور نے تلخی سے کہا۔ ''جرم کرنے والے کو سزا ہو تو اسے شکایت نہیں کرنی چاہیے۔''

دروازے کو مقفل کرنے کے بعد انور نے میرے ہاتھ میں کوٹھی کی چابی دیتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے اس میں سب کچھ ہوگا۔ نہ ہو تو لے آنا۔''

''قید تنہائی تو یہ میرے لیے بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ کھیل کا ایک حصہ ہے۔ ریشم کی اور تمہاری سلامتی بھی اسی میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تین چار دن کی آزمائش ہوگی لیکن زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ... ٹی وی ہے یہاں... چھت پر ڈش لگا ہوا ہے۔ کل میں کسی کو صفائی کے لیے بھیج دوں گا۔ تمہارے کچن کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ موقع ملا تو میں بھی چکر لگاؤں گا۔''

میں اسے رخصت کرنے دروازے تک گیا۔

''دیکھو... تم ایک بہت خطرناک کھیل شروع کر چکے ہو... تم اس میں ہار افورڈ نہیں کر سکتے۔''

''مجھے اندازہ ہے لیکن دوست ایسا ہمیشہ نہیں رہے گا۔ یہ اقتدار قائم کرنے کا مرحلہ ہے۔ اس کے لیے مجھے روایتی جاگیردار کا رول بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ میں سنگ دل اور سفاک نہ بنوں تو میری چلے گی نہیں۔ میرے لیے ان رشتوں کو بے توقیر کرنا بھی ایک کٹھن آزمائش ہے۔ ماں کے آنسو مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔ باپ کی غلطی کو معاف نہ کرنا میرے لیے آسان نہیں۔ اور تم کیا سمجھتے ہو اس چھوٹے بھائی کو اسی طرح اپنی راہ سے ہٹا سکتا ہوں جیسے کہ اورنگ زیب نے ہٹایا تھا اور باپ کو شاہجہاں کی طرح قید کرسکتا ہوں؟ اسے سلطنت عزیز ہوگی، اس جاگیر کی محبت میرے دل میں خون کے رشتوں سے زیادہ ہرگز نہیں۔''

''پھر کیوں کر رہے ہو تم یہ سب کچھ؟''

اس نے کہا۔ ''ایک... اپنا باعزت زندگی کا حق حاصل کرنے کے لیے اور دوسرا ان کو احساس دلانے کے لیے کہ دنیا میں ہی مکافات عمل ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ آپ دوسروں کے لیے قبر کھودیں تو خود آپ اس میں دفن کر دیے جائیں... اچھا، خدا حافظ۔''

وہ گاڑی چلا کے باہر لے گیا اور میں نے گیٹ بند کر کے اس کمرے کا رخ کیا جو اب میرا بیڈ روم تھا۔ ساتھ والے کمرے میں اکبر تھا اور اس کے کمرے کا دروازہ میرے کمرے میں کھلتا تھا چنانچہ یہ ناممکن تھا کہ مجھے پتا نہ چلے اور وہ تالا کھول کے یا دروازہ توڑ کے فرار ہو جائے۔ میرے کمرے میں بھی بیڈ پر چادر گرد آلود تھی۔ میں نے اسے جھاڑا تو گرد اڑی۔ تکیہ جھاڑ کے میں لیٹ گیا۔ ابھی نیند آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس کمرے میں فرنیچر نہ ہونے کے برابر تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک صوفہ تھا۔ اس کے سامنے ایک میز اور بس... نیچے قالین بھی صفائی مانگتا تھا لیکن نہ میں یہ کام کرسکتا تھا اور نہ اس کی فوری ضرورت محسوس کرتا تھا۔

چھت کو گھورتے ہوئے میں گردش حالات پر غور کرتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہا۔ وقت جیسے سمندر کی لہر تھا۔ ہر لہر کے ساتھ ریت کے گھروندے بہا لے جاتا تھا۔ نورین سے بچھڑنا ایک حادثہ تھا۔ ریشم کے گھر میں آنکھ کھولنا حادثہ تھا۔ رحیم بخش کی موت... ریشم کے ساتھ میری اسیری اور پھر رہائی... سب جیسے ڈرامائی مناظر تھے اور واقعات کا ٹیمپو اتنا فاسٹ تھا کہ حقیقی سا لگتا تھا۔ کیا آنے والے چند دن میں حالات پھر پلٹا کھا سکتے ہیں؟ مستقبل میرے لیے کیا امکانات رکھتا ہے؟ توقعات میں خطرات بھی تھے اور خوش آئند امیدیں تھیں۔

دیوار پر لگے کلاک میں وقت تھم گیا تھا۔ اس کا سیل نہ جانے کب سے بدلا نہیں گیا تھا۔ انور علی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ کوٹھی کس کی ہے اور کس حد تک محفوظ ہے۔ کیا اور کسی کو اس خفیہ ٹھکانے کا کوئی علم نہیں؟ یہ میں نے بھی نہیں پوچھا تھا۔

شاید اکبر اپنے کمرے میں اسی طرح خاموش لیٹا اپنے مستقبل یا اپنے ماضی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اندر کی خاموشی یہی ظاہر کرتی تھی۔ نیند شاید اس کے اختیار میں بھی نہ تھی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد نیند نے مجھ پر غلبہ حاصل کرلیا۔ یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ مجھے بھی سکون اور آرام کے لیے نیند کی پناہ کی ضرورت تھی۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں چھ گھنٹے بعد جاگا ہوں۔ ڈاکٹر نے مجھے زخم کے علاج کے لیے جو دوائیں دی تھیں، وہ میں ساتھ لایا تھا۔ باہر نکل کے میں نے کچن کی ایک ٹونٹی کو چیک کیا۔ اس میں پانی آرہا تھا مگر اوپر کے ٹینک سے ایک نل لان میں تھا جو ڈائریکٹ لائن سے لگا ہوا تھا۔ اس کے پانی سے دوا کھا کے میں نے منہ دھویا اور پھر کچن کا رخ کیا۔ سارے کیبنٹ کھول کر دیکھنے سے مجھے ضرورت کی ہر چیز نظر آگئی۔ وہاں ایک ماچس بھی تھی۔ اس سے گیس کا چولہا روشن ہوگیا۔ میں نے باہر نکل کے دیکھا تو لوگ زندگی کے معمولات میں مصروف نظر آئے۔ دو گھر زیرِ تعمیر تھے اور وہاں مزدور کام کر رہے تھے۔ سو قدم کے فاصلے پر ایک تندور اور جگی ہوٹل بھی نظر آرہا تھا۔ سامنے سے گزرنے والے ایک مزدور نے مجھے بتایا کہ آگے الٹے ہاتھ پر چند دکانیں ہیں... اکبر کی طرف سے مجھے کوئی خدشہ نہ تھا۔ میں باہر کا گیٹ بند کر کے موڑ تک گیا۔ وہاں ایک جنرل اسٹور تھا اور ایک چھوٹی سی بیکری۔ ناشتے کا سامان لے کر میں واپس آیا اور آدھ گھنٹے بعد میں نے بیچ کا دروازہ کھول کے ناشتا اکبر کے سامنے کی میز پر رکھ دیا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے نفرت اور حقارت سے کہا۔

''تمہاری مرضی... آخر کب تک نہیں کھاؤ گے؟'' میں نے کہا۔

جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اس نے ایک دم مجھ پر حملہ کیا۔ مجھے اس کا اندیشہ ضرور تھا لیکن میں اس کے لیے فوری طور پر تیار نہ تھا۔ وہ میرے اوپر گرا۔ درمیان کی میز الٹ گئی۔ میرے ہاتھ سے چائے کا مگ چھوٹ گیا اور کرسی سمیت میں پیچھے گرا... تو وہ میرے اوپر آیا۔ اس کے بعد میرے جسم کا ریفلیکس ایکشن ہوا اور میں نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ میری جیب سے ریوالور نکال لے۔ وہ انور علی کے مقابلے میں بہت خود غرض اور اس کے لیے یہ بقا یا فنا کی جنگ تھی جو بلی بھی لڑتی ہے تو شیرنی بن جاتی ہے۔ ایک جھٹکے سے میں نے سر اٹھایا اور اس کی پیشانی پر ٹکر ماری۔ پھر میری کہنی نے اس کی پسلی پر وار کیا اور میں نے اسے الٹ دیا۔ یہ مشکل سے پانچ سیکنڈ کا عمل تھا جس نے اسے میری پوزیشن میں پہنچا دیا۔ نیچے آجانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا منہ نوچا اور ٹانگ اٹھا کے گھٹنا میری کمر میں مارا۔ گالیوں کے ساتھ اس کے منہ سے تھوک نکلا جو میرے منہ پر پڑا۔ میرا زخم خوردہ ہاتھ اس وقت متاثر ہوا تھا جب وہ میرے اوپر گرا تھا۔ اس زخم سے خون ابل پڑا لیکن اگلے پانچ سیکنڈ میں میرے ہاتھوں نے اس کا گلا دبوچ کے اس کے سر کو بار بار فرش پر مارا۔ نیچے قالین ہونے کی وجہ سے اس کا سر پھٹا نہیں مگر چوٹ نے اندر سے اس کا دماغ ہلا دیا۔

جب وہ ساکت ہوگیا تو میں اٹھا۔ دروازے کو مقفل کر کے میں اپنے بیڈ روم سے ملحق واش روم میں گیا اور قمیص اتار کے زخم کو دھویا۔ پھر اسی قمیص کو پھاڑ کے ایک ہاتھ سے زخم پر پٹی باندھی۔ اسے کھینچنے کے لیے میں نے ایک ہاتھ کے ساتھ دانتوں کا استعمال کیا۔ قمیص کے نیچے میرا بنیان بھی خون آلود ہوگیا تھا۔ میں نے اسے بھی اتار پھینکا۔ پھر میں اس کمرے میں گیا جس کے بیڈ پر کوئی زنانہ لباس پڑا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید کسی کمرے کی الماری میں کوئی مردانہ کپڑوں کا جوڑا بھی مل جائے۔ میرا خیال ٹھیک تھا۔ اس کمرے کی وارڈ روب میں ایک دھلا ہوا استری شدہ شلوار قمیص کا جوڑا موجود تھا۔ بعد میں مجھے اس کے باتھ روم میں بھی ایک جوڑا ملا جو استعمال شدہ تھا۔

پھر میں واپس گیا اور میں نے فرش پر پڑے ہوئے اکبر علی کو الٹا کر کے اس کے ہاتھ باندھ دیے۔ اس کے لیے میں نے وہی پٹی استعمال کی جو اس کی آنکھوں پر سے کھولی گئی تھی۔ یہ زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ اسے وہ توڑ بھی سکتا تھا۔

پھر میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ میں نے اس کی وہ شلوار اتار دی جو پیشاب سے گیلی ہوئی تھی مگر اب سوکھ چکی تھی۔ اس کا ازار بند نکال کے میں نے اس کے ہاتھوں کو مضبوطی سے باندھا اور اسے سیدھا کر دیا۔ مجھے اس پر غصہ تھا اور میں اسے سزا بھی دینا چاہتا تھا چنانچہ میں نے اس کی قمیص بھی کھینچ کر اتار دی۔ اب وہ فرش پر ننگا پڑا تھا۔ اس کے کپڑے میں اپنے ساتھ لے گیا اور کمرے کو پھر مقفل کر دیا۔ ننگا آدمی اپنی ساری خود اعتمادی کھو دیتا ہے۔ تھانے میں پولیس یہی کرتی ہے۔ ہر مجرم کا استقبال اس کے کپڑے اتار کے کرتی ہے۔ باقی سزا اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ احساسِ ذلت ہر انسان کو بے بس اور کمزور بنا دیتا ہے خواہ وہ مجرم ہی کیوں نہ ہو۔

کچن میں جا کے میں نے اپنے لیے دوبارہ چائے بنائی۔ کھانے کے لیے میں ڈبل روٹی اور مکھن لے آیا تھا۔ دوبارہ کمرے میں جانے سے پہلے میں نے یہ احتیاط برتی کہ دروازہ کھولا تو اکبر کے حملے کے لیے تیار ہو کے مگر وہ اسی طرح فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے کرسی کو اس سے کچھ فاصلے پر رکھا اور چائے پیتا رہا۔ وہ آدھ گھنٹے بعد پوری طرح ہوش میں آیا اور اس نے خود کو بے لباس دیکھا۔ پھر وہ اٹھا اور گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا۔ ''تم چاہو تو پھر کوشش کر سکتے ہو، تمہارا راستہ کھلا ہے۔''

''کیا اب... مجھے ایسے ہی رہنا ہوگا؟''

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''مجبوری ہے لیکن تم اس حالت میں بھی فرار ہونا چاہو تو جا سکتے ہو... میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔''

''لیکن گولی مار دو گے مجھے۔''

''میرا وعدہ ہے کہ ریوالور کا استعمال بالکل نہیں کروں گا۔'' میں نے ریوالور نکال کے میز پر رکھ دیا۔

''خدا کے لیے مجھے میرے کپڑے دے دو۔''

''یہاں کیا ضرورت ہے تمہیں کپڑوں کی۔ اب میں بیچ کا دروازہ بھی کھلا رکھوں گا۔ بس ایک بات یاد رکھنا۔ صرف ایک ہاتھ سے بھی میں تمہاری ہڈیاں توڑ سکتا ہوں۔ میں نے کوئی چیمپئن شپ تو نہیں جیتی، مارشل آرٹ میں کوئی سند بھی نہیں لی لیکن تم جیسے چار میرے قریب نہیں آسکتے۔''

میری گھڑی میں اب دس بج رہے تھے۔ باہر سے کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو میں نے برآمدے تک جا کے دیکھا۔ اور گاڑی کوئی نہیں تھی مگر ایک عورت دروازہ کھول کے اندر آرہی تھی۔ شاید کوئی گاڑی اسے ڈراپ کر کے چلی گئی تھی۔ وہ پچیس تیس سال کی صحت مند، قدرے فربہ بدن دیہاتی عورت تھی۔ اس کے سانولے رنگ میں ایک عجیب سی شادابی اور کشش تھی مگر اس کا گول چہرہ جاذبِ نظر تھا اور اس سے زیادہ اس کا جسم جو چست لباس سے ابل کر باہر آنے کو تیار تھا۔ اس نے کریم کلر کی ریشمی قمیص اور دھاری دار سوتی شلوار پہن رکھی تھی۔ دوپٹا اس کے ایک شانے پر جھول رہا تھا اور براؤن تراشیدہ بال بکھرنے کے لیے آزاد تھے۔ میں نے کہا۔ ''کون ہو تم؟''

وہ مجھے دیکھ کے مسکرائی۔ ''مجھے آپ کی خدمت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ میرا نام سلونی ہے۔'' اس نے شائستہ انگریزی میں کہا۔

حیرت پر قابو پا کے میں نے سر ہلایا۔ ''یہ بھی بتا دو کہ کس نے بھیجا ہے تمہیں؟ اور پلیز اردو میں بات کرو۔ مجھے انگریزی نہیں آتی۔''

اس کا چہرہ بجھ گیا۔ ''چودھری انور صاحب نے۔'' وہ میرے سامنے آکے ٹھہر گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا اور وہ ایک سوٹ کیس گھسیٹ کر لائی تھی۔

''اور تمہیں یہاں کون چھوڑ کے گیا ہے؟''

''انہی کا بندہ تھا۔ میں اسے نہیں جانتی، وہ مجھے نہیں جانتا۔ کیا آپ مجھے یہیں کھڑا رکھو گے؟''

اس کی بے باکی اور شوخ میک اپ سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں صرف کام ہی نہیں کرے گی، میری دل بستگی کا سامان بھی فراہم کرے گی۔ یہ انور نے میری تنہائی دور کرنے کا نسخہ تلاش کیا تھا۔ میں نے اسے راستہ دے دیا۔

''کچن میں نے صاف کرلیا ہے مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے، صرف آٹا ہے اور چاول ہیں۔ ہانڈی پکانے کے لیے کیا کروں؟'' اس نے کچھ دیر بعد آکے سوال کیا۔

میں نے کہا۔ ''وہ میں لا دیتا ہوں لیکن خیال رکھنا... کھانے والے تین ہیں۔''

''تیسرا کون ہے؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا اور پھر انگلش بول گئی۔

''زیادہ سوال جواب کرنے کی ضرورت نہیں۔ خاموشی سے وہ کرو جو میں کہوں۔'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''کھانا پکا لو تو میرا کمرا صاف کرو۔ باقی گھر کو چھوڑو۔ تیسرا کمرا تمہارا ہے۔ تم خود کو کمرے تک محدود رکھو گی جب تک میں آواز دے کر نہ بلاؤں۔''

اس نے دبی ہوئی شوخی برقرار رکھی۔ ''یس سر!

WWW.PAKSOCIETY.COM

خدانخواستہ آپ کی چیخ سنائی دے پھر بھی... یا دھماکا ہو؟"

میں نے اپنی ہنسی کو روک لیا اور خاموشی سے قریب کی مارکیٹ سے مجھے سبزی گوشت وغیرہ مل گیا۔ دوپہر کے کھانے تک میں ٹی وی دیکھتا رہا۔ اس پر دنیا بھر کے چینل آرہے تھے۔ سلونی جب کمرا صاف کررہی تھی تو اکبر نے دروازہ بجانا شروع کیا۔ سلونی نے میری طرف دیکھا مگر میرا سپاٹ چہرہ دیکھ کے خاموش ہوگئی۔ اکبر نے کئی بار دروازہ بجایا مگر میں نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اکڑفوں بھی خالی پیٹ ممکن نہیں... اس نے ناشتا ضائع کیا تھا۔ اب ضروری تھا کہ اسے فاقے کا مزہ چکھایا جائے۔ سلونی کے جانے کے بعد میں نے بیچ کا دروازہ کھولا تو پہلے اسے خبردار کردیا۔ "دروازے سے دس قدم دور چلے جاؤ ورنہ بھگتو گے۔" پھر جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ دس قدم دور ذلت کی تصویر بنا کھڑا تھا۔

"دیکھو... میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔"

"غلطی، گناہ اور جرم میں فرق ہوتا ہے..." میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جو کچھ تم نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ کیا، وہ تینوں میں شمار ہوتا ہے۔ جو ابھی میرے ساتھ کیا تھا، وہ جرم تھا۔ جیل میں کوئی قیدی ایسی بغاوت کرے تو اسے اندر ہی جیلر سزا دیتا ہے۔"

"اور وہ سب جو تم کررہے ہو؟" وہ چلّایا۔

"اس میں بھی پہل تم نے کی تھی۔ لیکن اس وقت تم نے سزا و جزا کے فلسفے کو قابلِ غور ہی نہیں سمجھا تھا۔ اب یہاں فرصت میں حساب کرنا کہ تمہارے جبر و قہر کا نشانہ کتنے لوگ کس کس طرح بنے تھے۔ ریشم... اس کا باپ اور میں تو تمہاری ہوس اور تمہارے ظلم کا ایک شکار تھے۔ اپنی رعایا اور اپنے غلاموں کے ساتھ تم کیا کرتے رہے... کتنوں کی عزت لوٹی اور کتنوں کا خون کیا... یاد کرو گے تو خود قائل ہوجاؤ گے کہ تمہارے عذاب کو کتنا بھی طول دیا جائے، تمہاری سزا ناکافی ہوگی۔ اب میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ یہ شور و غوغا بند کرو ورنہ مجھے تمہیں باندھ کر ڈالنا پڑے گا۔ یہاں میں تمہاری زبان کاٹ دوں یا خود تمہیں... کون ہے مجھے دیکھنے یا پکڑنے والا؟"

وہ بستر پر گر گیا اور دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ میں نے دروازے کو پھر مقفل کیا اور باہر آگیا۔ جو کچھ میں اکبر کے ساتھ کررہا تھا، وہ ایک سفاک مشغلہ تھا۔ اس سے مجھے کوئی تسکین بھی حاصل نہیں ہورہی تھی لیکن اس کے ساتھ رحم دلی اور فیاضی کا برتاؤ بھی میں نہیں کرسکتا تھا۔ میں جب یہ سوچتا تھا کہ ایک اتفاق نے مجھے اس زیرِزمین تہ خانے سے نکلنے کا راستہ نہ دکھایا ہوتا تو وہاں میرا انجام کیا ہوتا اور باہر اکبر کی ہوس پر ریشم کس طرح قربان ہوتی۔ میرے پاس کرنے کو کام کوئی نہیں تھا۔ ٹی وی دیکھنے میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار میرے خیالات کی رو مجھے اپنے ماضی میں لے جاتی تھی۔ گردشِ حالات مجھے کہاں لے آئے تھے اور آگے نہ جانے کہاں لے جائے گی۔ جب میں محسوس کرتا تھا کہ ٹی وی کے سامنے میں اسکرین پر نظریں جمائے ضرور بیٹھا ہوں مگر ٹی وی نہیں دیکھ رہا ہوں تو میرے خیال کی رو نورین پر رکی ہوتی تھی۔ آج سے پہلے اس کے بارے میں سوچنے کے لیے اتنی مہلت کہاں ملی تھی۔

سلونی نے سوٹ کیس میں سے صاف چادریں نکال کے بیڈ پر بچھا دی تھیں اور جھاڑو کے علاوہ جھاڑن سے تمام کمروں کو صاف کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اس جگہ کی صفائی بھی ایک حد تک ہی ممکن تھی۔ اسے چمکایا نہیں جاسکتا تھا۔ وہ پھر بھی مصروف رہی اور میرے باتھ روم کو بھی استعمال کے قابل بنا دیا۔ اس نے میری ہدایت کے مطابق پانی کا اوپر والا ٹینک خالی کیا اور موٹر چلا کے اس میں تازہ پانی بھرا۔ کچن پر اس نے سب سے زیادہ محنت کی۔ اس نے الماری میں سے استعمال کے سارے برتن نکال کے دھوئے اور کچھ اسبابِ ضرورت مثلاً چائے، کافی وغیرہ جو انور علی نے میرے استعمال کے لیے بھیجے تھے، کیبنٹ میں بھر دیے۔ مجھے اس نے ایک بار چائے اور پھر شام کو کافی بھی بنا کے دی۔ اسے کافی بنانا آتی تھی۔

شام کو میں نے کافی لے کر پوچھا۔ "تم حویلی میں کام کرتی ہو؟"

"یس سر! صرف مہمان خانے میں۔" وہ مسکرائی۔ "مہمانوں کی ہر خدمت بجالاتی تھی۔"

"اس بات کا مطلب کیا ہے سلونی... پہلے کبھی اس گھر میں آئی ہو؟ جانتی ہو یہ کس کا گھر ہے؟"

"نہیں سر! بڑے چودھری صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے۔ جب وہ شکار یا سیر و تفریح پر جاتے تھے تو ان کے دوستوں کے آرام اور قیام و طعام کا بندوبست میری ذمے داری ہوتی تھی۔ ہر قسم کی ضرورت میں پوری کرتی تھی۔ دن کی ہو یا رات کی۔ میرے پاس سب کی تفریح کا بندوبست تھا۔ مجھے وہ اپنی ہاؤس کیپر کے طور پر متعارف کراتے تھے۔"

میں نے کہا۔ "زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔

سمجھ گیا۔"

"پھر حکم کریں جناب! آپ البم میں سے انتخاب بھی کرسکتے ہیں۔ سب میری فرینڈز ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے حیرانی اور برہمی سے کہا۔ "تم پیشہ بھی کراتی ہو لڑکیوں سے؟"

"نہیں سر! پیشہ تو وہ خود کرتی ہیں۔ میں تو وسیلہ ہوں۔ بڑے چودھری صاحب تو کہتے تھے سلونی..."

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ تمہارے کتنے گرویدہ تھے اور کیوں؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "چودھری اکبر صاحب نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ اب چودھری انور صاحب نے پھر سے یاد کیا تو مجھے یقین نہیں آیا۔ آپ بھی مجھ پر بھروسا کرسکتے ہیں سر! میں ہر خدمت بجا لاسکتی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "یہاں تمہیں کون چھوڑ کے گیا تھا؟"

"میں ٹیکسی میں آئی تھی۔ رنگیلا میرا مجنوں ہے، آٹھ سال سے۔ دن رات میں اسے جہاں بلاؤں سر کے بل آتا ہے۔ بڑا جی دار بندہ ہے اور بھروسے کے قابل۔ اسے ٹیکسی میں نے لے کر دی تھی۔ اب سوچتی ہوں اس سے شادی کر ہی لوں۔"

"کیا تمہیں بھی اس کی ضرورت ہے؟" میں نے تلخی سے پوچھا۔

"ویسے تو نہیں ہے سر! لیکن وہ چاہتا ہے۔"

"شادی کرلو گی تو اس کا گھر سنبھالو گی، اس کے بچے پالو گی۔ یہ تم جیسی عورت کے لیے ناممکن ہوگا۔"

"مشکل تو ہے سر! لیکن اب اس کی ضرورت مجھے بھی محسوس ہوتی ہے۔ ورنہ وقت نکل جائے گا ہاتھ سے۔ اور وہ کون سا مجھے گھر میں قید کرکے رکھے گا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ نہیں ہوسکتا۔ آپ بتائیں رات کے کھانے میں کیا کھائیں گے؟ میں سب بناسکتی ہوں۔"

دل ہی دل میں نفرت کے ساتھ میں نے اس عورت کے لیے ہمدردی بھی محسوس کی جس کی زندگی اپنے سے زیادہ دوسروں کے لیے وقف تھی۔ وہ ذہین اور ہوشیار تھی اور پراعتماد بھی۔ مجھے اس کی زندگی کی کہانی میں دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ شام کے بعد رات تک میں سخت بیزاری میں پھر ٹی وی کے چینل بدلتا رہا۔ مجھے انور علی کا انتظار تھا۔ ایک کمرے میں فون تھا مگر وہ نہ جانے کب سے ڈیڈ پڑا تھا۔ رات کے کھانے سے پہلے میں نے ایک بار پھر اپنے قیدی کا جائزہ لیا۔ وہ بیڈ پر آڑا اور بےسدھ پڑا تھا اور کراہ رہا تھا۔

اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا اور بولا۔ "دیکھو، میں بہت ظالم اور کمینہ شخص تھا مگر تم تو نہیں ہو۔ مجھے مارنا ہے تو میرا گلا گھونٹ دو یا گولی مار دو مجھے۔"

اس وقت اچانک مجھے خود سے شرم آئی۔ آخر میں یہ کیا کررہا ہوں اور کیوں... اس میں نہ تسکین کا کوئی پہلو ہے نہ خوشی کا تو پھر اس کا فائدہ... چند روز بعد مجھے بہرحال، چلے جانا ہے۔ خود انور علی کا چھوٹے بھائی کے ساتھ ایسا سلوک وقتی ڈراما ہے۔ انتقام لینا ہے تو اسے... مجھے اس حویلی کی سیاست سے کیا لینا دینا۔ میں یہاں ٹھہروں گا تو خود اپنے لیے مسائل اور مشکلات کی دلدل پیدا کروں گا۔ مجھے بہرحال نورین کی تلاش میں جانا ہے۔ میں نے اس کے کپڑے واپس کردیے اور جب وہ پہن چکا تو اس کے ہاتھ ایک ٹیبل لیمپ سے منسلک بجلی کے تار سے باندھ دیے۔ پھر دروازے میں قفل لگا کے میں کچن میں کھانا لانے گیا۔ "میں آپ کا کھانا کمرے میں لاتی ہوں... وہاں میز بھی ہے۔" سلونی نے کہا۔ وہ ٹرے میں کھانا لگارہی تھی۔

"ابھی مجھے نہیں کھانا۔" میں نے درشتی سے کہا۔ "ٹرے مجھے دے دو۔"

اکبر کو کھانا کھلا کے میں نے دوبارہ اس کے ہاتھ باندھے۔ اپنی دانست میں مطمئن ہوجانے کے بعد میں نے دروازے کو باہر سے مقفل کردیا۔ اس سے میرا ندامت اور اذیت کا احساس کچھ کم ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلونی بہت اچھی کک تھی۔ اس عورت کا کردار کیسا بھی تھا لیکن اس میں ایک لگن تھی۔ اپنی وفاداری اور خلوصِ نیت کا یقین دلانے کے لیے وہ ذلت بھی برداشت کررہی تھی مگر اس نے اپنی کوشش ترک نہیں کی تھی اور اس کے اعتماد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ سوشل ایٹی کیٹ اور رکھ رکھاؤ میں دیہاتی نہیں تھی۔ کھانے کے وقت میں نے اسے اپنے ساتھ شریک کرلیا۔

"یہاں بیٹھو۔ مجھے اپنے بارے میں بتاؤ؟" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "اپنے بارے میں خود میں کیا بتاؤں سر! میری زندگی تو ایک کھلی کتاب ہے جو سب پڑھتے رہے ہیں۔"

"لگتا ہے تم نے کچھ تعلیم حاصل کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"معمولی سر! دسویں کا امتحان ضرور دیا تھا۔ کیا ملتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

پڑھ کے سر! ہم کمی کمین لوگ کون سی عزت پا سکتے ہیں۔ میرا باپ ایک میراثی تھا۔ ڈھول بجاتا تھا تقریبات میں۔ ماں وہی کام کرتی تھی جو میں کررہی ہوں۔ آپ شہری بندے ہیں۔ اس غلامی کا مطلب نہیں سمجھتے جو پیدائشی طور پر ہمارا نصیب بن جاتی ہے۔ شہر میں اس کا کوئی تصور نہیں کہ نچلی ذات کا ہر فرد اپنے خاندان سمیت گاؤں کے اونچی ذات والے وڈیرے کا غلام ہو... اس کے گھر کی ہر عورت، ماں، بیٹی، بیوی یا بہن کے لیے عزت آبرو کا کوئی تصور نہ ہو۔ وہ حاکموں کی ملکیت ہو۔"

میں نے کہا۔ "کیا تم نے اس کو قبول نہیں کیا تھا؟"

وہ مسکرائی۔ "یہ کیسے ممکن تھا سر! میں نے وہی کیا جو میری ماں کرتی تھی۔ مجھے کرنا پڑا۔"

"مجھے ہمدردی ہے تم سے۔"

وہ کچھ حیران ہوئی۔ "کیوں سر! آخری بار یہ بات مجھ سے آٹھ سال پہلے ایک اسکول ماسٹر نے کہی تھی۔ وہ اسی گاؤں کے پرائمری اسکول میں تھا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "محبت کرتا تھا تم سے؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ "یہ لفظ میں نے پہلی بار اسی کی زبان سے سنا تھا۔"

"پھر تم نے اس سے شادی کیوں نہیں کرلی؟"

وہ تلخی سے مسکرائی۔ "کیا یہ میرے اختیار میں تھا سر؟"

"کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اس نے ساتھ نہیں دیا تھا، بے وفائی کی تھی تم سے؟"

"ایسی بات نہیں ہے سر! آپ کیوں اس بھولی بسری یاد کو آواز دینے پر مجبور کررہے ہیں مجھے... کیا میری کہانی لکھیں گے آپ؟"

"کہانیاں میں صرف پڑھتا ہوں۔ تم نہ سنانا چاہو تو تمہاری مرضی... زبردستی کوئی نہیں۔"

وہ اداس آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ "جب میں آٹھویں جماعت میں تھی تو مجھے اٹھا لیا گیا تھا۔ اسکول سے نہیں... اسکول سے واپسی پر راستے میں... اپنے چودھری اصغر علی صاحب کے شوق اس وقت بھی جوان تھے... صحت کچھ بہتر تھی... اپنے بارے میں کیا کہوں... گاؤں کے نوجوان نظریں بچھائے راستے دیکھتے تھے اور میں ان کے ولوں کو راستے کے پتھروں کی طرح ٹھکراتی گزر جاتی تھی۔ کسی نے ہمت کی، آہیں بھرنے سے آگے ہاتھ پکڑنے کی تو ایک تھپڑ نے ان پر چودہ طبق روشن کردیے۔ بڑے چودھری صاحب کے آگے میں بہت روئی پیٹی کہ میں تو آپ کی سب سے چھوٹی بیٹی سے بھی چھوٹی ہوں مگر وہ ایسی باتوں کا کیا اثر لیتے۔ کہتے تھے مجھے چوزوں کی یخنی بہت اچھی لگتی ہے۔ اس وقت ان کی نئی شادی کو زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے اور نئی دلہن مجھ سے عمر میں برابر ہی ہوگی۔ ایک وقت میں دو شادیاں انہوں نے نہیں کیں کبھی... پہلی تو خاندانی تھی۔ اس کی جگہ کون لے سکتا تھا۔ دوسری آتی جاتی رہتی تھیں۔"

"پھر تم سے شادی کیوں نہیں کی انہوں نے؟"

وہ ہنس پڑی۔ "آپ تو بہت بھولے ہو سر! میں نے بتایا نا کہ ہم میراثی تھے ذات کے۔ میں مس یونیورس ہوتی تب بھی یہ ممکن نہیں تھا۔ کچھ دن بعد میں نے سیاست کھیلی۔ میں نے چودھری صاحب کے حرم میں رہنا قبول کرلیا، کنیز بن کے اور ان پر ایسا جادو چلایا کہ وہ مجھے اسکول بھیجنے پر راضی ہوگئے۔ میں چاہتی تھی کہ میٹرک کرلوں اور پھر بھاگ جاؤں۔"

"اس ماسٹر کے ساتھ؟"

"وہ تو بعد میں فریفتہ ہوا تھا مجھ پر... پہلے تو میں سولو فلائٹ لینا چاہتی تھی۔"

میں سولو فلائٹ کی اصطلاح پر حیران رہ گیا۔ اس سے پہلے وہ مس یونیورس کا حوالے دے چکی تھی اور گاؤں تو گاؤں، شہر کی میٹرک پاس یا کالج کی لڑکی بھی کم سے کم سولو فلائٹ کا استعمال نہیں کرسکتی۔ وہ کہے گی کہ میں اکیلی نکل جانا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔ "سلونی! یہ الفاظ تم نے کہاں اور کس سے سنے؟"

"چودھری صاحب کے معزز مہمان پڑھے لکھے ہوتے تھے۔ شہری لوگ... سرکاری افسر۔ وہ شکار کھیلنے آتے تھے اور مجھے بھی شکار کی ایک ڈش کے طور پر ان کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا۔ دیہات کا خالص دودھ مکھن... سرسوں کا ساگ اور مکئی... ایسے ہی سلونی۔"

"تم اس ماسٹر کی بات بتاؤ۔ اس سے تمہاری شادی کیوں نہیں ہوئی تھی؟"

اس نے ایک گہری سرد آہ بھری۔ "میں میٹرک میں تھی جب ایک دن اس نے مجھے محبت نامہ لکھا۔ وہ اردو، فارسی پڑھاتا تھا اور بی اے پاس تھا۔ اس نے میری ہوم ورک کی کاپی میں سب لکھ دیا۔ اور یہ بھی لکھ دیا کہ اگر یہ اس کا جرم ہے تو میں معاف کردوں۔ میں استاد ہوں اور مجھے اپنی ہی شاگرد پر بری نظر رکھتے ہوئے شرم آنی چاہیے مگر میں کیا کروں؟ تم میرے سامنے رہتی ہو تو میں اور کہیں جا بھی نہیں سکتا۔ میں شکایت کروں گی تو چودھری صاحب مجھے ننگا کر کے چوک پر مرغا بنادیں گے یا منہ کالا کر کے گدھے پر میرا جلوس گاؤں کی گلیوں میں پھرائیں گے۔ میرے ماں باپ میری اس حرکت پر صدمے سے مرجائیں گے۔ ظاہر ہے اس کے بعد خط میں نے اسے واپس کردیا اور اس کی جسارت کا ذکر کسی سے بھی نہیں کیا لیکن اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ ہوم ورک کی کاپی میں جاری رہا۔ پھر غلطی مجھ سے ہوئی۔ میں کہہ نہیں سکتی کہ یہ کھیل کتنا عرصہ جاری رہتا اور انجام کیا ہوتا۔ وہ جو میں نے سوچا تھا یا اس نے چاہا تھا، عشق اور مشک کے لیے تو مشہور ہے کہ چھپائے نہیں چھپتا۔ ایسا ہی میرا حسن و شباب تھا۔ پھر عشق دل میں کیسے نہ جاگتا۔ درجنوں کو نخوت سے ٹھکرا دیا۔ کسی ایک پر تو بالآخر میرا دل بھی آنا ہی تھا۔ اگر میں ہر روز کے محبت نامے ہر روز پہلے کی طرح تلف کرتی رہتی تو نہ جانے کب تک اس عشق پر بھی پردہ پڑا رہتا۔"

"جو صرف خط و کتابت تک محدود تھا؟ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری زبان صاف ہے اور کتابی ہوگئی ہے۔ جب تم نے جذبات کا رنگ ڈالا ہوگا تو وہ لاجواب ہوں گے۔" مجھے اب اس کی شخصیت میں بہت دلچسپی ہوگئی تھی۔

"آپ کو پتا ہے سر کہ دیہات میں میراثی بڑے چرب زبان اور حاضر جواب سمجھے جاتے ہیں بلکہ ہوتے ہیں۔ ان سے لطیفے بہت منسوب ہیں اور گانے بجانے کے ساتھ ان سے محفل کو ہنسانے کی توقع بھی رکھی جاتی ہے۔ وہ جگت کرتے ہیں۔ جگت سمجھتے ہیں آپ؟"

"بہت اچھی طرح۔"

"وہ جملے باز بھی ہوتے ہیں، مسخرے بھی اور اداکار بھی۔ دو آدمی ہاتھ میں چھتر لے کر... وہی جس سے تھانے میں چھترول کرتے ہیں... ایک دوسرے کو مارتے ہیں اور منہ سے ایسی آواز نکالتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کھال پر لگانے سے آتی ہے۔ وہ ایک حد میں رہ کے حاضرین محفل کو پھبتی کا نشانہ بناتے ہیں اور خوشی کے موقع پر یہ گستاخی شمار نہیں ہوتی۔ یہ ذہانت کا کام ہے سر! شاید وہی صفت مجھ میں آئی۔ ماسٹر کہتا تھا کہ تم اتنی اچھی اردو لکھتی ہو، ادب اور شاعری پڑھو... پھر کہانیاں لکھنا... میں کہتی تھی پاگل... گاؤں سے رسالہ تو کسے لگے گا؟ کتابیں تو لا کے دے گا مجھے؟ پھر آپ نے پوچھا تھا کہ تم بھی ملے؟ تو جواب یہ ہے کہ صرف خوابوں میں... اسکول سے میں سیدھی حویلی آجاتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ محبت کا ذرا بھی عملی مظاہرہ ہوا تو خبر سب کو ہوگی اور چودھری صاحب تک پہنچے گی... چنانچہ ہم نے صبر اختیار کیا۔ بس

میٹرک کا امتحان دے دوں میں... پھر ہم نکل جائیں گے... ساری زندگی پڑی ہے محبت کے لیے۔"

"اس کے دل میں رقابت کے جذبات نہیں بھڑکتے تھے؟"

"جیسے مجبوری روزے میں کھانے پینے سے پرہیز سکھاتی ہے، بھوک پیاس کی خواہش تک پیدا نہیں ہونے دیتی... ایسے میں وہ میری مجبوری کو سمجھتا تھا۔ یہی کمال تھا اس کی محبت کا اور شاید محبت ایسی ہی ہونی چاہیے۔ میں اس کی نظر میں پاکیزہ اور کنواری ہی رہی۔"

میں تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ "کیا مثال دی ہے تم نے؟"

"اس کے بعد سارا قصور میرا تھا۔ میں جذبات میں اندھی ہوگئی۔ تعریف میں ایک دن اس نے کہا کہ کاش میں تمہارے محبت نامے سنبھال کے رکھ سکتا مگر تم نے اپنی قسم دے رکھی ہے۔ میں نے پوچھا کہ پھر کیا ہوتا... وہ بولا کہ شاید ان کو میں شائع کراتا۔ بس اس بات نے میرا دماغ خراب کیا۔ میں نے کہا کہ میں ایک کاپی الگ رکھتی ہوں۔ سب کاپیوں کے درمیان۔ اس میں جو لکھوں گی پھاڑ کے ضائع نہیں کروں گی۔ اس نے کہا کہ دیکھ لو یہ بہت خطرناک کام ہے مگر میں نے اسے یقین دلایا کہ میں لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری کو بحفاظت رکھ سکتی ہوں۔ چودھری صاحب کی نئی بیوی کو مجھ سے بیر تھا۔ وہ چودھری صاحب کی ہم رتبہ بہت خوب صورت اور نو عمر تھی لیکن جاہل تھی اور چودھری کی مجھ میں دلچسپی اسے ناگوار گزرتی تھی۔ ایک دن اس نے میری عدم موجودگی میں میرا بیگ دیکھا کہ آخر کتنا پڑھ رہی ہے اور ایسی باتیں کیسے سیکھ لی ہیں... وہ ایسے ہی چار چھ جماعت گھر پر پڑھ چکی تھی۔ اس نے وہ کاپی دیکھ لی اور اس کے ہاتھ تو جیسے ایٹم بم آگیا۔ اس نے سیدھا چودھری صاحب کے سامنے جاکے وہ کاپی ان کے سامنے رکھ دی۔ بس کہانی ختم۔ اس دن کے بعد میں نے نہ اسکول کی شکل دیکھی اور نہ ماسٹر کی... وہ غائب ہوگیا ایسے جیسے دنیا میں اپنا وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔"

"غائب ہوگیا... یعنی بھاگ گیا؟"

اس نے مجھے بڑی دکھی نظروں سے دیکھا۔ "وہ ایسا نہیں تھا۔ اب یہ لوگ کسی کو غائب کرتے ہیں تو پھر وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ کسی کو نہیں ملتا اور نہ کوئی اس کے بارے میں بتانے والا ہوتا ہے۔ کچھ پتا نہیں میدان حشر میں وہ مٹی سے نکلے گا یا پانی سے... سنا ہے اس کے گھر والے بھی آئے تھے۔ ماں

WWW.PAKSOCIETY.COM

باپ اور ایک بہن... لیکن انہیں کون بتاتا... سب لاعلمی میں سر ہلاتے رہے۔ ہاں ماسٹر تھا تو سہی... پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ اب صبر کریں... پولیس کے پاس جائیں گے تو واپس کیسے جائیں گے... اسے آنا ہوگا تو خود ہی آجائے گا۔''

''چودھری صاحب نے کیا کہا تم سے؟''

''مجھ سے... کچھ نہیں... اپنی نئی نویلی بیوی کے سامنے گرجے برسے کہ سارے خاندان کو زندہ دفن کرادوں گا۔ اسے کہا کہ میں نے بندوبست کر دیا ہے۔ کل سے یہ اسکول نہیں جائے گی لیکن تو فکر کیوں کرتی ہے۔ میری کون سی منکوحہ ہے... تیرا اس کا کیا مقابلہ... مطلب یہ کہ بہتے دریا میں گدھے گھوڑے پانی پیتے ہیں، کوئی کتا بھی منہ مار گیا تو ہم نے کتے کو ماردیا۔ اب بہتا پانی تو پاک ہوتا ہے۔ آگے کون ہے، پانی پینے والا۔''

''واہ... کیا فلسفہ ہے۔ ان کی منکوحہ کیا ہوتی ہے، گھر کا کنواں؟ اس میں کتا مرجائے تو وہ کتنے ڈول پانی نکال کے کنوئیں کو پاک قرار دے دیں گے؟''

وہ ہنسی۔ ''گھر کے کنوئیں تک کتے کی رسائی کہاں... ویسے کسی کا پردہ فاش کرنے سے مجھے کیا ملے گا۔ کوئی ہوا منہ مارنے والا تو حشر کے میدان میں خود ہی سامنے آجائے گا۔''

''تم نے پھر شادی ہی نہیں کی؟''

''ہو جاتی ان کی رسم کے مطابق... اگر میں چاہتی لیکن میرا دماغ الٹ گیا۔ الٹی سمت میں چل پڑا۔ میں نے ان سب کو خصم مان لیا۔''

''ان کی رسم کیا ہے؟''

''یہ گھر کے ملا کو بلا کے کسی سے دو بول پڑھوا دیتے ہیں اگر اسے گھر میں ڈالنا ہو تو... اور پھر خلیفہ دو گواہوں کی موجودگی میں ان کو بیوی کیا کسی بھی عورت کے لیے نا قابل بنا دیتا ہے۔ رسم کے مطابق یہ کارِ خیر وہی خلیفہ کرتا ہے جو بچپن میں مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے۔''

''او مائی گاڈ...'' میں نے سر پکڑ لیا۔ ''یہ وقعت ہے انسان کی یہاں۔''

''یہاں وہاں کیا۔ یہ جو ہم جیسے کی کمین ہیں، یہ انسان سمجھے ہی کب جاتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جیسے دنبے، بکرے کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے، میرے شوہر کی بھی بڑھ جاتی۔ اسے پھر زنان خانے میں بلاخوف وخطر رکھا جا سکتا ہے۔ بہو، بیٹیوں کے لیے اس کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ کیا بادشاہوں کے محلوں میں خواجہ سرا نہیں رکھے جاتے تھے؟''

''اور جب سے تم چودھری صاحب کے لیے ہاؤس بیگ ہو اور ان کے مہمانوں کی دل بستگی کا سامان۔''

وہ کچھ تذبذب کے ساتھ مجھے دیکھتی رہی۔ ''میں پہلے ہی زیادہ بول گئی ہوں... شاید... دراصل اس طرح پہلے کسی نے مجھ سے بات نہیں کی تھی۔''

''تمہیں خطرہ ہے کہ یہ سب میں چھوٹے بڑے کسی چودھری کے سامنے دہرا نہ دوں۔ تو اعتماد رکھو مجھ پر۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ چند روز بعد میں چلا جاؤں گا۔ یہ ایک حادثہ تھا کہ میں حویلی میں پہنچ گیا تھا۔ اب تم اکیلی ہو، میرا مطلب تھا کہ تمہارے ماں باپ؟''

''باپ مر گیا۔ ماں ہے۔ چودھری اصغر علی کے بڑے بھائی کے گھر میں ملازم ہے۔ ایک بھائی چودہ پندرہ سال کا تھا کہ بھاگ گیا تھا گھر سے... اچھا کیا... یہاں کیا ملتا اسے غلامی کی ذلت کے سوا... سنا ہے دبئی چلا گیا تھا۔''

''اور تم اپنی باقی زندگی ایسے ہی گزار دو گی؟''

''جینا مرنا کیا میرے اختیار میں ہے؟ جو تھوڑی بہت عقل اور تعلیم تھی، اسے میں نے بڑے چودھری کے لیے وقف کر دیا۔ خود کے علاوہ... میں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا جو اور کہیں نہ ہوتا۔ اس نے ایک مربع زمین میرے نام کر دی۔ چوری چھپے زیور بھی بنوا کر دیا۔ اب اس کی تفصیل میں کیا جانا کہ اس کے بدلے میں نے اسے کیا دیا۔ میں نے اسے وہ دیا جو کوئی بیوی نہ دے سکتی تھی۔ پرانے نواب کیوں جاتے تھے طوائفوں کے پاس آخر؟ انہیں کوٹھے کی عورت سے وہ ذہنی تسکین ملتی تھی جو گھر کی عورت دینا ہی نہیں جانتی تھی۔ لیکن جب بڑے چودھری صاحب باہر سے پڑھ لکھ کر آئے تو حویلی میں جیسے صدیوں کے خاندانی نظام کی بنیادیں ہل گئیں۔ انجام آپ جانتے ہیں۔ چھوٹے چودھری نے زمین جائداد کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ بڑے چودھری صاحب پھر دنیا کی سیر کو نکل گئے۔ سب کہتے تھے کہ زیادہ پڑھنے سے بوجھ پڑا تو ان کا دماغ چل گیا ہے۔''

''کیا تمہیں بھی ایسا لگتا ہے... اب ان کے واپس آنے کے بعد؟''

''ہاں، میرا بھی تو دماغ چل گیا تھا۔ میرے چھوٹے دماغ پر وہ بوجھ بھی زیادہ تھا۔ عورت ذات ناقص العقل ہوتی ہے نا... اسے بس تھوڑی بہت دینی تعلیم کافی ہے یا امورِ خانہ داری کی... انہوں نے ہی مجھے کل یاد کیا... رنگیلا نے مجھے ان کا پیغام دیا۔''

''تم کہاں تھیں؟''

''چودھری اکبر نے معاملات سنبھالے تو پہلے میری چھٹی کی تھی۔''

''اسے کیا دشمنی تھی تم سے... کوئی سلونی اس کی بھی ہو گی یا شادی کوئی؟''

''یہ بات شاید سب سمجھتے ہیں، کہتا کوئی نہیں۔ چودھری اکبر کی بھی نظر تھی مجھ پر... گاؤں میں رسم سی بن گئی ہے، لڑکی اس وقت تک جوان نہیں ہوتی جب تک چودھری اکبر اسے سرٹیفکیٹ نہ دیں۔ شادی نہیں ہو سکتی اس کی... کوئی کرلے تو دلہن شبِ عروسی حویلی میں گزارتی ہے۔''

''کوئی اس وحشیانہ رسم کے خلاف بولتا نہیں؟''

وہ ہنسنے لگی۔ ''آپ بھی بھولے بادشاہ ہو۔ بول سکتا ہے کوئی یہاں؟ جو پہلے برائی تھی، اب دستور بن گئی تھی۔ میرے معاملے میں وہ باپ سے مات کھا گیا۔ اسے کیا اندازہ تھا کہ اس عمر میں بھی اباجی کا دل اس سے زیادہ جوان ہے۔ بس وہ پیچ و تاب کھا کے رہ گیا کیونکہ وہ اس وقت بھی تیس کا تھا۔ ایک شادی کر چکا تھا۔''

''اس کی ایک ہی بیوی ہے؟''

''ہاں جی، اب ایک ہی ہے۔'' وہ بولی۔ ''ایک اور تھی۔ وہ بھاگ گئی تھی۔ جب بڑے چودھری صاحب نے حویلی کے معاملات اس کے سپرد کیے، تب بھی میں محفوظ رہی۔ کچھ چودھری اصغر صاحب کی وجہ سے... کچھ اپنے دوسرے تعلقات کی وجہ سے... پانچ سال میں نے بڑے بڑے لوگوں کو خوش کیا ہے اور کیا ہے کہ میں شہر چلی گئی تھی۔ یہاں کیا تھا میرے لیے... ایک کچا کوٹھا... زمین... اور بوڑھی ماں... تینوں بیکار... وہاں رنگیلا مل گیا... دراصل مجھے بہت ناز تھا اپنے حسن پر... میں نے سوچا کہ پہلے فلموں میں کوشش کرلوں... میں بھی چلی جاؤں گی... فلمی تجربات کی کہانی میں کچھ بھی نہیں... یہ رنگیلا، وہاں روز دھکے کھاتا تھا۔ کامیڈین بننا چاہتا تھا اور رنگیلا کی ایسی نقل اتارتا تھا کہ خود رنگیلا نے اسے ایک سو روپے انعام دیا تھا۔''

''صرف ایک سو روپے؟''

''اور کیا ایک لاکھ دیتا سر! یا کہتا کہ اچھا اب میں آرام کرتا ہوں، تم میری جگہ کام کرو ٹھیکے پر... آدھے پیسے میرے آدھے تمہارے... وہ تو ایسا ہوا کہ شہر تھا ورنہ مارا جاتا۔ ڈپلی کیٹ کا رسک کون لیتا ہے۔ کسی عقلمند نے اسے مشورہ دیا کہ اب تم رنگیلا کی نظر میں آگئے ہو اپنی حماقت سے۔ فوراً فرار ہو جاؤ۔ وہ ایک تھیٹر کمپنی میں چلا گیا جو میلوں ٹھیلوں

پاکستان کے فوجی اعزازات

پوری دنیا میں مسلح افواج میں بہادری دکھانے والوں کو ان کے ملک کی طرف سے مختلف اعزازات سے نوازا جاتا ہے، برطانوی فوج میں ''وکٹوریہ کراس'' جرمن افواج میں ''آئرن کراس'' اور ہمارے روایتی حریف بھارت کا سب سے بڑا اعزاز ''مہاویر چکر'' قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح وطنِ عزیز پاکستان میں بھی وطن کی خاطر جان قربان کرنے والوں اور غازی بن جانے والوں کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے مختلف اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔ فوجی، سول اور پولیس کو دیے جانے والے اعزازات کی تعداد چھتیس ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ پاکستان کے اعلیٰ ترین سات اعزازات کا ذکر ہے جن میں سرفہرست نشانِ حیدر ہے۔

شیرِ خدا حضرت علیؓ (خلیفہ چہارم) کی نسبت کی وجہ سے اسے **نشانِ حیدر** کہا جاتا ہے۔ یہ پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز ہے، نشانِ حیدر ''وکٹوریہ کراس'' کے برابر ہے۔ اب تک مسلح افواج کے دس جوانوں کو یہ اعزاز مل چکا ہے۔ ان میں سے نو کا تعلق بری فوج سے تھا اور ایک پاک فضائیہ سے تھا جسے دنیا راشد منہاس کے نام سے جانتی ہے۔ نشانِ حیدر سب سے پہلے کیپٹن راجہ سرور شہید کو ملا جو 27 جولائی 1948ء کو اڑی سیکٹر (کشمیر) میں شہید ہوئے۔ ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ نشانِ حیدر آج تک کسی زندہ شخصیت کو نہیں ملا۔ نشانِ حیدر پانے والا اپنے نام کے ساتھ این ایچ لکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ زندہ ہو۔

ہلالِ جرأت صرف پاک فوج کے افسران کو دیا جاتا ہے۔ یہ اعزاز ان افسران کو دیا جاتا ہے جو میدانِ جنگ میں جرأت، شجاعت، دلیری، بہادری اور فرض شناسی سے لڑیں۔ یہ اعزاز بری، بحری اور فضائی تینوں فوجوں کے افسران کے لیے ہوتا ہے۔ اس نشان کو حاصل کرنے والا اپنے نام کے ساتھ ایچ جے بھی لکھ سکتا ہے۔

ستارۂ جرأت بھی مسلح افواج کے تینوں شعبوں یعنی بری، بحری اور فضائیہ کے افسروں، وارنٹ افسروں اور جونیئر کمیشنڈ افسروں کو جنگ میں بہادری، شجاعت اور دلیری دکھانے والوں کو دیا جاتا ہے۔ ستارۂ جرأت برطانوی فوجی اعزاز ملٹری کراس کے برابر ہوتا ہے اور یہ اعزاز حاصل کرنے والا اپنے نام کے ساتھ ایس جے لکھ سکتا ہے۔

تمغۂ جرأت پاک فوج کے افسروں اور جوانوں کو یکساں طور پر دیا جاتا ہے، وہ افسران یا جوان جو کہ جنگ میں شجاعت اور دلیری کے ساتھ کارنامے انجام دیں، ان کے لیے تمغۂ جرأت ہوتا ہے، اس اعزاز کا حامل اپنے نام کے ساتھ ٹی جے لکھ سکتا ہے۔

ستارۂ بسالت فوج کے ان جوانوں کو دیا جاتا ہے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیں اور ملک و ملت کے لیے جان پر کھیل جائیں اس اعزاز کا حامل اپنے نام کے ساتھ ایس بی ٹی لکھ سکتا ہے۔

تمغۂ بسالت ''ستارۂ بسالت'' کی طرح ان نوجوانوں کو ملتا ہے جو تینوں افواج میں بہادری سے لڑیں۔ اس اعزاز کا حامل اپنے نام کے ساتھ ٹی بی ٹی لکھتا ہے۔

تمغۂ دفاعِ پاکستان میں جنگی خدمات کے اعتراف میں، بحری، بری اور فضائیہ کے ان افراد کو دیا جاتا ہے جو فوجی کارروائی کے لیے طے کردہ علاقوں میں مختلف تاریخوں کو چھوٹے دستوں کے ساتھ مہمات میں حصہ لیتے ہیں۔ اس اعزاز کا حامل اپنے نام کے ساتھ ٹی ڈی لکھ سکتا ہے۔

(محسن مصطفیٰ کی تحقیق)

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں گاؤں گاؤں گھومتی تھی۔ وہاں اس کے پھکڑ پن پر دیہاتی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے اور وہ روانی میں ایسی باتیں کر جاتا تھا کہ عورتیں منہ میں پلو ٹھونس کے لال ہو جاتی تھیں۔ اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ میں صرف ایک بار گئی پھر کان پکڑے۔ تھیٹر کمپنی کے مالک سے لے کر شوقین تماش بینوں تک کی لائن لگ گئی۔ میں بھاگ آئی تو رنگیلا مشکل میں پڑ گیا کہ تُو ہی لایا تھا اسے۔ بتا کہاں گئی وہ... اس نے جوتے کھا کے وعدہ کیا کہ مجھے مہلت دو۔ میں لاتا ہوں اسے... اس وقت ہم ملتان میں تھے پھر لاہور آ گئے اور یہاں میں نے پرانے تعلقات بحال کیے۔ رنگیلا کی مدد سے میرا ایک اچھا سلسلہ بن گیا۔ لاہور کی انڈر گراؤنڈ ریلوے میں بہت سے دھندوں کی ٹرین چلتی ہے اور مسافر بھی بہت۔ منشیات فروشی، شراب سے نقلی دوائیں تک سب بنانے والے... ریکروٹنگ ایجنٹ... توسر باز... عامل۔"

"مائی گڈنس... کتنا مشاہدہ ہے تمہارا۔"

"رنگیلا کو میں نے ٹیکسی خرید دی تھی۔ اس نے بڑے چودھری صاحب کو میرا پیغام پہنچایا تھا کہ سلونی ملنا چاہتی ہے، آپ تشریف لائیں۔ وہ تشریف لائے چوری چھپے... میں نے درخواست کی کہ زمین کا سودا کرا دیں۔ نہ میں کاشت کر سکتی ہوں نہ فروخت... یہ کام انہوں نے کر دیا۔ میں نے ایک پانچ مرلے کا گھر خرید لیا سمن آباد میں۔ پھر اچانک ان کے فرزند کا ...... چودھری انور علی کا پیغام ملا کہ فوراً آ جاؤ... تمہاری ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے حویلی کے اندر کی ذمے داریاں دی جائیں گی۔ میں ہاؤس کیپر بن سکتی ہوں۔ میں نے فوری جواب نہیں دیا کہ میں پھر اس کنوئیں میں گرنا پسند کروں گی یا نہیں... انہوں نے مجھے یہاں بھیجا اور میں رنگیلا کے ساتھ آ گئی۔ آگے کا کچھ پتا نہیں... کیسی لگی یہ کہانی آپ کو؟"

"کیا کہانی ختم ہو گئی؟ یا ابھی اسی انداز سے چلو گی؟ تم اپنی زندگی کے اس چلن سے مطمئن ہو... یہی کامیابی ہے؟"

"ابھی تو مجھے اس کے آگے کچھ نظر آتا نہیں۔" وہ بولی۔

خاموشی کا ایک وقفہ آیا جس میں وہ فرش کو دیکھتی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔ "ایک البم ہے تمہارے پاس۔"

"جی، آپ دیکھنا چاہتے ہیں؟" اس نے کچھ حیران ہو کے پوچھا۔

"کیا اس میں تمہاری تصویر بھی ہے؟" میں نے کہا۔ "یا وہ کسی اور کی البم میں ملے گی؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اٹھ کر گئی اور دس بائی آٹھ انچ کا ایک ہارڈ کور البم لا کے میرے سامنے رکھ دیا۔ مجھے خوب اندازہ تھا کہ اس میں کس قسم کی تصاویر ہوں گی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میں نے اسے کھول لیا۔ وہی عورت جو کچھ دیر پہلے مجھے دعوتِ نظارہ دے چکی تھی، اب مجوب سی بیٹھی تھی۔

میں نے البم سرسری نظر سے دیکھا۔ "کون ہیں تمہاری یہ سہیلیاں... اسی بازار کی مخلوق؟"

"آپ یقین کریں گے، یہ میرے جیسی شریف عورتیں ہیں۔ مسکرایئے نہیں... لیبل یہی ہے مجھ پر بھی... ان میں زیادہ تر کالج کی لڑکیاں ہیں۔ ایک ٹیچر کی بیوہ ہے جسے شوہر کی موت کے بعد اس کی حقیر سی پنشن کے واجبات وصول کرنے کے لیے دو سال خوار ہونا پڑا اور وہاں جب اس سے رشوت مانگی گئی تو اس کے پاس اپنے آپ کو پیش کرنے کے سوا کچھ نہ تھا اور پھر جو پنشن ملی، اس میں بھی اس کا گزارہ ناممکن تھا۔ اس کے دو بچے بھی تھے۔ کرائے کا مکان تھا۔ ایک شوہر کی ٹھکرائی ہوئی عورت ہے۔ اس نے پچاس ہزار کے حقِ مہر کے لیے کیس کیا تھا۔ پچاس ہزار تو ملے نہیں، خود رشوت بن گئی اور پھر یہ زیادہ آسان لگا۔ مجبوری کا عذر تو جائز ہے سر! یہ جو کالج کی لڑکیاں ہیں... ان کے شوق ان کی مجبوری بن گئے ہیں۔ یہ ڈراموں اور فلموں میں رومانس کی عیاشی دیکھ کر کمائی میں لگ گئی ہیں۔ رومانس ہوتے ہیں لگژری کاروں میں... فائیو اسٹار ہوٹلوں میں... بیچ ہاؤس میں... اور باہر لندن پیرس میں بھی... ان کے ماں باپ انہیں بڑی لگن اور تنگ دستی میں زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہے ہیں۔ کتنا اچھا لگتا ہے زیور کہنا... انہیں شوقین مزاج ہیرو مل گئے۔ اندھی کمائی تھی اور ماں باپ اس سے بھی زیادہ اندھے... انہیں لاڈ پیار میں عیاشی کے سب سامان فراہم کر دیے۔ کالج، یونیورسٹی جانے کے لیے بہترین کار... بے حساب پاکٹ منی... ہیرو خود کسی ہیروئن کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ طالب و مطلوب کے ملنے کے اسباب ہوں تو وہ مل جاتے ہیں۔ اکثر لڑکیاں خواب دیکھنے لگتی ہیں اور جب خواب ٹوٹتے ہیں تو سزا بھی بھگتتی ہیں۔ کبھی خودکشی یا قتل کا کیس ہو جاتا ہے۔ زیادہ تر تو کسی میٹرنٹی ہوم میں ختم ہوتے ہیں۔ لڑکی پھر پاک صاف کنواری کی سند کے ساتھ کالج سے ... ہے تو اس کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ باقی عمر کسی گھر کو ... گھر میری جنت" مانتے ہوئے کسی مجازی خدا کے لیے ...

بچے اور امورِ خانہ داری انجام دینے میں گزار دیتی ہے۔ یہ کہانی نہیں ہے سر!"

"تم نے اس لائن پر چلنا منظور نہیں کیا؟ تم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ تم چلنے والی نہیں، چلانے والی بن گئیں۔ تمہارے لیے یہ کامیابی کافی ہے؟ اس سے تم مطمئن ہو؟"

"مطمئن کون ہے سر؟"

"مطمئن آدمی کا ضمیر ہوتا ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ کامیابی میں خوشی بھی ہے، ندامت نہیں ہے۔"

اس نے ایک آہ بھری۔ "چھوڑیں سر! آپ سے پہلے کسی نے پوچھا نہیں کہ سلونی تو کون ہے؟ بس یہ دیکھا کہ سلونی کیسی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آپ ان میں سے نہیں۔ ان چودھریوں میں شامل نہیں... آپ نے کہا تھا کہ آپ یہاں مسافر ہیں۔"

"کچھ ایسا ہی ہے۔ حادثاتی طور پر اس کھیل میں شریک ہو گیا۔"

"کیسے سر! اب آپ کی باری ہے۔ آپ کی زندگی کی کہانی کیسی ہے؟"

میں نے کہا۔ "کوئی خاص نہیں۔ ابھی تو مجھے نیند آ رہی ہے۔ میرے سر میں درد ہے۔ پتا نہیں کیوں۔"

"کافی بنا کے لاؤں سر؟" وہ اٹھی۔

"تم واقعی مہمان نوازی جانتی ہو۔" میں نے کہا۔

میں آنکھوں پر ہاتھ رکھے اپنے بیڈ پر لیٹا تھا جب اس نے پکارا۔ "کافی سر! یہ سر درد کی گولیاں بھی ہیں۔"

"تھینک یو سلونی! مجھے دونوں چیزوں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔"

وہ اپنی کافی لے کر میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ "پیدا میں اس گاؤں میں ہوئی تھی مگر میں نے اچھے لوگوں کی مہمان داری کی اور بہت کچھ سیکھ لیا۔ سگریٹ بھی پینے لگی تھی شوق میں... پھر چھوڑ دی۔"

"اور شراب؟"

"کسی نے زبردستی پلا دی وہ اور بات ہے۔ مہمان داری میں بہت کچھ مرضی کے خلاف بھی کرنا پڑتا ہے۔ آپ لیٹ جائیں۔ میں آپ کا سر دبا دیتی ہوں، نیند آ جائے گی۔"

نیند مجھے کیا آتی۔ مجھے سکون ملا اور اس کے ساتھ ہی سلونی کے نرم ہاتھوں کے لمس نے میرے جذبات میں اس آگ کو ہوا دی جو البم دیکھنے سے بھڑکی تھی۔ شاید مجھے اس البم کو دیکھنے سے گریز کرنا چاہیے تھا۔ میرے خیالات نے ایک غلط سمت اختیار کر لی۔ چودھری انور علی نے مجھے اس ویران کوٹھی میں بھیجا تھا تو پھر اس عورت کو کیوں بھیجا اور یہ عورت کون سی شریف زادی اور پاکباز خاتون ہے۔ اس کا تو کام ہی ورغلانا ہے۔ میں کیا دعویٰ کروں پارسائی کا... مجھے اپنی خودی بلند رکھنا تھی تو کیا ضرورت تھی اس میں دلچسپی لینے کی؟ اسے نوکرانی ہی سمجھتا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو مجھے یوں لگا جیسے میں نے ایک نئی دنیا میں جنم لیا ہے۔ میرے اردگرد سب کچھ وہی تھا لیکن بدلا ہوا لگتا تھا۔ یہ ایسی ہی تبدیلی کا احساس تھا جیسے کوئی پرانے محلے، پرانی گلی اور پرانے شہر کے پرانے کرائے کے مکان سے نئی آبادی میں اپنی جدید کوٹھی میں منتقل ہو جائے۔ یہ احساس بے سبب تھا کیونکہ بدلا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ شاید میرے اندر کا آدمی وہ نہیں رہا تھا۔ میرا احساس، اعتماد، زندگی پر یقین اور مستقبل پر بھروسا نیا تھا۔ میں بازو کی تکلیف کے باوجود اٹھا تو میرے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور غسل کے دوران میں اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں گا رہا ہوں اور ایک عجیب گانا جو میری عمر سے کہیں زیادہ پرانا تھا۔ گائے چلا جا چلا جا۔ ایک دن تیرا بھی زمانہ آئے گا۔ حد ہو گئی تھی۔ میں نے خود سے کہا۔

جب میں باہر نکلا تو اجلے سفید لباس میں صبح کی نکھری دھوپ جیسی مسکراہٹ کے ساتھ سلونی نے میرا استقبال کیا۔ اس کے میک اپ سے عاری چہرے پر ایسی قدرتی معصومیت تھی جو اس کے ماضی و حال کے روز و شب اور اس کے معمولات سے ذرا میل نہیں کھاتی تھی۔ اس نے بڑی بُردباری، متانت مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "گڈ مارننگ سر! آپ بیڈ ٹی لیں گے یا ناشتا کریں گے؟ دس بج رہے ہیں۔"

"دس بج رہے ہیں؟" میں نے بے یقینی سے کہا اور تکیے کے نیچے سے اپنی رسٹ واچ نکال کے پہنی۔ دیوار پر لگے کلاک کی سوئیاں تو وقت کو ایک ہی جگہ روک کے کھڑی تھیں اور نہ جانے یہ وقت کتنے دن، کتنے ہفتے یا مہینے پرانا تھا۔ "میرا خیال ہے ناشتا لے آؤ۔"

اس کے پلٹتے ہی مجھے اپنے قیدی کا خیال آیا۔ میں سلونی کے پیچھے کچن میں گیا۔ وہ کچھ حیران ہوئی۔ "یس سر!"

"مجھے ایک ٹرے میں چائے اور سلائس دے دو... چار سلائس۔"

"یس سر! سلائس گرم کروں یا ان پر مکھن لگاؤں؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

میں نے سوچ کے جواب دیا۔ "نہیں... اچھا لگا

WWW.PAKSOCIETY.COM

دو۔"

اس نے کوئی سوال کیے بغیر ٹرے مجھے تھما دی۔ میں نے اکبر کے کمرے کا دروازہ کھولا اور ٹرے نیچے رکھ کے ایک دم دھکا دیا۔ اگر میں نے دفاعی انداز میں غوطہ نہ لگایا ہوتا تو اڑ کے آنے والی کوئی چیز میرے سر میں لگتی۔ وہ چیز جو ایک ٹیبل لیمپ تھی، کھلے دروازے سے باہر جا کے میرے کمرے میں گری۔ میں نے اکبر کو سامنے سے ریچھ کی طرح حملہ آور ہوتے دیکھا۔ میں محتاط نہ ہوتا تو وہ مجھے ناک آؤٹ کر کے میرے اوپر سے گزر جاتا۔ یہ میرے جسم کے دفاعی نظام کا خودکار عمل تھا کہ میرا ہاتھ خودبخود حرکت میں آیا اور ایک بھرپور پنچ اس کے منہ پر لگا۔ وہ الٹ کے گرا تو میں نے اس کو ٹھوکروں میں رکھ لیا۔ وہ بُری طرح بلبلایا۔ میرے منہ سے گالیوں کے سوا اس وقت کیا نکلتا۔

"شکر کرو کہ اس وقت میرے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا ورنہ مجھ سے گولی چل جاتی۔ لیکن یہ آخری موقع تھا۔ اب تمہارے لیے کوئی رعایت نہیں۔" میں نے طے کر لیا تھا کہ اب شام تک یا کل تک اس کو پھر فاقہ کشی کی سزا دوں گا۔ جب میں دروازے کو قفل لگا کے نکلنے کے لیے پلٹا تو میں نے سلونی کو دیکھا۔ وہ ہاتھ میں ٹرے اٹھائے کھڑی تھی۔ "یہ واپس لے جاؤ۔" میں نے دہاڑ کے کہا۔ "اور مجھے ایک مضبوط رسی لا کے دو... پھانسی دینی ہے اسے۔"

سلونی نے ایک نظر چودھری اکبر کو دیکھا اور خاموشی سے پلٹ گئی۔ ریوالور اب میرے ہاتھ میں تھا۔ چودھری اکبر بلبلانے لگا۔ "خدا کے لیے میری یہ آخری غلطی معاف کر دو۔"

"زندگی کا آخری موقع تم نے ضائع کر دیا۔" میں نے اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری لاش اب اسی کمرے میں پڑی رہے گی اور ہڈیوں کا ڈھانچا بن جائے گی۔"

اس کی فریاد و فغاں، گالیوں اور بددعاؤں کو نظرانداز کرتے ہوئے میں دروازہ لاک کر کے باہر آگیا۔ کچھ دیر پہلے کی مسرت اور راحت کا احساس غائب ہو گیا تھا۔ جب میں ناشتا کرنے بیٹھا تو میری بھوک تک مر چکی تھی لیکن سلونی کے ناشتا میز پر لگانے تک میں نے خود پر قابو پا لیا۔ آخر مجھے یہ کیا ہو گیا ہے۔ یہ جیل میں گزارے ہوئے وقت کا اثر تھا یا اس کے بعد شروع ہونے والے مسلسل پُرخوف فرار اور بعد کے حادثات کا... میرے اعصاب حد درجہ کشیدہ ہو چکے تھے اور میری قوتِ برداشت ختم ہو رہی تھی۔ مجھے یوں مشتعل نہیں ہونا چاہیے۔ اکبر کا ردِعمل ایک قیدی کا ردِعمل تھا اور وہ کوئی عام قیدی نہیں تھا۔ اس نے اپنی آزادی ہی نہیں اپنی حکومت، اپنی عزت، اپنا خاندان سب کچھ گنوایا تھا۔ مجھے اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ ذہنی، جسمانی اور اعصابی دباؤ میں ہے۔

سلونی نے ناشتا لگایا ہی تھا کہ میں نے کہا۔ "سلونی پلیز! وہ ٹرے مجھے لا دو جو تم لے گئی تھیں۔"

"یس سر!" اس نے سکون سے کہا اور ٹرے لے آئی۔ سوال نہ اس کی زبان پر تھا، نہ اس کی آنکھوں میں۔ ایک بار پھر میں قیدی کے پاس گیا اور ناشتا سامنے رکھ کے اسے آزاد کیا۔ "میں تمہیں ایک آخری موقع اور دے رہا ہوں، کسی کی سفارش پر... تم نے پھر بغاوت کی تو خود سمجھ لو کیا ہو گا۔ چلو جلدی سے ناشتا ختم کرو۔"

اس نے تعمیل کی اور پھر باندھے جانے پر کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ میں دس منٹ بعد پھر ناشتے کی تعمیل پر پہنچا تو سلونی نے دوبارہ میرے لیے بڑے سلیقے سے ناشتا سرو کیا۔ اس میں ہر چیز فریش اور گرم تھی۔ میں نے کہا۔ "بیٹھو تم بھی... اگر تم پہلے ہی ناشتا نہیں کر چکی ہو۔"

"تھینک یو سر۔" وہ کہہ کے بیٹھ گئی۔ "آپ کے لیے اطلاع ہے۔ ایک تو فون ٹھیک ہو گیا ہے۔ ابھی رِنگ آئی تھی جب آپ باتھ روم میں تھے۔"

"گڈ... دوسری کیا بات ہے؟"

"دوپہر کے کھانے پر بڑے چودھری صاحب بھی ہوں گے۔ انہوں نے فون پر ہی مجھے بتایا تھا۔"

ہم نے خاموشی سے ناشتا ختم کیا۔ سلونی کا چہرہ اور رویّہ ویسا ہی رہا جیسا گزشتہ شب یا آج صبح تھا۔ خود میں نے ہی یہ موضوع چھیڑا۔ "سلونی! تم نے اکبر کو دیکھا... اس کے بارے میں کچھ پوچھو گی نہیں؟"

"آپ ضروری سمجھیں گے تو خود ہی بتا دیں گے۔ مالکوں کے معاملات میں دخل اندازی میرا شیوہ نہیں۔ میں اپنے کام سے کام رکھتی ہوں سر۔" سلونی نے شائستگی سے مسکرا کے جواب دیا۔

"میں مختصراً بتا دیتا ہوں۔ حویلی اور جاگیر کے معاملات اب چودھری انور علی نے سنبھال لیے ہیں۔ جو ان کا حق تھا۔ دونوں بھائیوں کے درمیان کیا وجہِ دشمنی ہے اس سے مجھے سروکار نہیں۔ انور نے اسے میرے حوالے کیا ہے کیونکہ وہ مجھ پر بھروسا کرتا ہے۔ تم مجھے اس کا دوست سمجھ سکتی ہو۔ یہاں میں مہمان ہوں، شاید کچھ دن رہوں۔"

اس نے نظر اٹھا کے کہا۔ "دوپہر کے کھانے میں کیا ہو گا؟"

"یہ شاید تم مجھ سے بہتر جانتی ہو کہ کیا ہونا چاہیے... مگر بازار سے کیا مل سکتا ہے؟"

"یہ میں دیکھ لوں گی۔ آپ بتا دیں بازار کتنی دور ہے سر؟"

"تم خود جاؤ گی؟ سارا سامان خود اٹھا کے لاؤ گی؟ بازار تو قریب ہے آگے بائیں ہاتھ پر۔"

"پھر مجھے دیر نہیں کرنی چاہیے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں سب کر لوں گی۔"

"اچھا یہ پیسے لے جاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ جاتے جاتے پلٹی۔ "لے لوں گی سر! جب ضرورت ہو گی۔" اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عورت کا کردار کیسا بھی تھا، اپنے رویّے سے اس نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ واپس آئی اور کچن میں مصروف ہو گئی۔ اس کا پُرسکون انداز ایک ہی پیغام دیتا تھا۔ میرا کام خدمت ہے اور صرف خدمت... خواہ وہ کچھ بھی ہو اور کیسی بھی ہو۔ اگر اس نے بڑے چودھری صاحب کا اتنا اعتماد حاصل کر لیا تھا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ وہ عورت دل جیتنا جانتی تھی۔

مجھے اب بے چینی سے انور علی کی آمد کا انتظار تھا۔ فون یقیناً اس نے بحال کرایا تھا لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ مجھے حویلی کا کوئی فون نمبر معلوم نہیں تھا۔ پھر مجھے سلونی کا خیال آیا۔ اس نے اپنے بیگ میں سے ایک نوٹ بک نکالی۔ یہ ٹیلی فون انڈیکس تھی۔ "اس میں سب کے فون نمبرز ہیں۔" اس نے نوٹ بک میرے حوالے کر دی۔ انور علی کا فون نمبر تو مل گیا لیکن مجھے پتا چلا کہ وہ حویلی سے گاڑی لے کر کہیں گئے ہیں۔ وہ شاید کہیں راستے میں تھا۔ میں نوٹ بک کے دوسرے نمبر دیکھتا رہا۔ عام حالات میں یہ معیوب ہوتا مگر خود سلونی نے اس کو بھی پرائیویٹ نہیں سمجھا تھا۔ اس میں درجنوں فون نمبرز تھے اور نام تھے۔ ان سے میں کیا جان سکتا تھا۔

انور علی نے ساڑھے بارہ بجے ہارن دیا تو میں نے دروازہ کھولا۔ مسلح گن مین اور ڈرائیور نے اس کے لیے کار کا دروازہ کھولا تو وہ مسکراتا ہوا اندر آگیا۔ وہ پینٹ شرٹ میں تھا جو بہت جچتی اور نئے تھے اور ضرور لاہور سے ریڈی میڈ منگوائے گئے تھے۔

میں نے اس کی تعریف کی۔ "تم بہت پُراعتماد خوش اور صحت مند لگ رہے ہو۔"

اس نے ہنستے ہوئے ہاتھ ملایا۔ "یہ جملہ مجھے کہنا تھا۔ خیر، سمجھو کہہ دیا... صورتِ حال کیسی ہے؟"

"جیسی ہونی چاہیے... نارمل۔" میں نے کہا۔

"اور تمہاری خدمت کیسی کی کنیزِ خاص نے؟"

"تمہارا انتخاب غلط ہو سکتا ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔ "اب یہ بتا دو کہ یہاں اور کتنے دن قیدِ تنہائی میں رہوں گا؟"

"اب کیسی تنہائی... چُن کے رفیقِ تنہائی بھیجا تھا تمہارے لیے۔"

"وہ بڑی اچھی ہاؤس کیپر ہے۔" میں نے پھر سلونی کی ذات اور کردار پر تبصرے سے گریز کیا۔ "وہاں سب ٹھیک رہا؟"

"اگر میں بروقت قدم نہ اٹھاتا تو سب چوپٹ ہو جاتا۔" وہ میز پر پیر پھیلا کے بیٹھ گیا۔ "یار! میں نے ناشتا دیر سے کیا تھا۔ ابھی بھوک نہیں ہے۔ کھانا دیر سے کھاؤں گا۔"

"میرا حال بھی مختلف نہیں۔ ایسا کرتے ہیں کافی پیتے ہیں۔"

سلونی جیسے جملہ ختم ہونے کے انتظار میں تھی۔ اس نے اندر آ کے انور علی کو سلام کیا۔ "کیسے ہیں آپ چودھری صاحب؟"

"جیسا تمہیں نظر آ رہا ہوں۔" انور علی نے کہا۔ "کھانا ٹھہر کے کھائیں گے۔ تم کافی بنانا بھولی تو نہیں ہو؟"

وہ مسکرائی۔ "یہ آپ کے دوست بتائیں گے۔"

"آج صبح وہ خبیث تھانے دار پھر نمودار ہو گیا۔ پہلے بہت معافی مانگتا رہا۔ اپنی مجبوری بتاتا رہا کہ افسرانِ بالا کا حکم ٹالا نہیں جا سکتا... معلوم نہیں آپ کے کس بدخواہ نے آگے یہ رپورٹ پہنچائی ہے۔ میں نے کہا کہ تمہید مت باندھو، مطلب پر آؤ۔ اس نے کہا کہ ایک اطلاع یہ دی گئی ہے کہ آپ نے اپنے چھوٹے بھائی اکبر علی کو تہ خانے میں قید کر دیا ہے جہاں سال بھر آپ کو رکھا گیا تھا اور تمام معاملات آپ نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ کل جو قتل ہوا تھا، اس کی رپورٹ بھی مانگی گئی ہے اور یہ خانہ تلاشی کے وارنٹ ملے ہیں۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ بڑے چودھری صاحب کا بھی بیان لوں اور حویلی کے ملازمین کا بھی۔ میں نے کہا اور تم یہ سب کرو گے؟ ضرور کرو... چلو پہلے تہ خانے میں چودھری اکبر علی کو دیکھ لیتے ہیں۔ وہ میرے ساتھ گیا اور وہاں کا منظر دیکھ کے اس کی تو سِٹّی گم ہو گئی۔ وہاں اجناس کے ذخیرے پر چوہے دوڑ رہے تھے۔ جب وہ نیچے

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرے ساتھ تھا تو اوپر گل چاچا نے ایک ایک کو خبردار کر دیا تھا، کوئی یہ نہ بھولے کہ تھانے دار آج ہے... کل نہیں ہو گا... تھانے دار نے اوپر آ کے مجھ سے عرض کی کہ جناب اپنا بیان بھی لکھوا دیں کہ آپ کو کبھی تہ خانے میں اسیر نہیں رکھا گیا۔ میں نے لکھ دیا کہ جس نے بھی ایسی بے سروپا رپورٹ دی ہے، وہ میرا دشمن ہی نہیں پاگل بھی ہے۔ میں قید میں ہوتا تو رہائی کے بعد رپورٹ نہ کرتا؟ اور میرے اپنے باپ اور بھائی کے خلاف جس نے بھی ایسا بے سروپا الزام عائد کیا ہے اسے تو پھانسی ہونی چاہیے۔ تھانے دار بڑا پریشان ہوا۔ حویلی کے ملازم باری باری یہی بیان دے گئے کہ سب خیریت ہے۔ اکبر علی صاحب شکار کے لیے گئے ہوئے ہیں دوستوں کے ساتھ۔ حویلی میں قتل کا کیا سوال... گزشتہ چھ ماہ میں کسی کی طبعی موت بھی نہیں ہوئی۔ اس ایک دن کی بیوہ کو سامنے لایا ہی نہیں گیا۔ تھانے دار کو کیا معلوم کہ حویلی میں کل ملازم کتنے تھے اور آج کتنے ہیں۔ اباجی کو پل پل کی خبر مل رہی تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کس نے کیا بیان دیا ہے۔ اس کے بعد وہ کیا کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ میرے اور سب کے بیانات کی تائید کریں۔ تھانے دار نے سکھ کا سانس لیا اور دو گھنٹے میں ساری قانونی کارروائی مکمل کر کے بھاگ گیا۔ میں نے اشاروں میں واضح کر دیا کہ اگر میرا وفادار رہے گا تو نوکری چلتی رہے گی جیسے پہلے چل رہی تھی، ورنہ دوسرا تھانے دار آ جائے گا تمہارے انتقال کے بعد... اس کی حالت انتقال کا لفظ سن کے بگڑ گئی تھی۔ میں نے کہا کہ اردو میں ٹرانسفر کو کہتے ہیں جیسے کہ انتقالِ اراضی...'' وہ ہنس پڑا۔

سلونی نے کافی درمیان میں رکھی اور لوٹ گئی۔ انور اسے تعریفی نظروں سے دیکھتا رہا۔

میں نے کہا۔ ''گویا صورتِ حال پوری طرح تمہارے قابو میں ہے اب؟''

''ہاں لیکن بہت سے معاملات تصفیہ طلب ہیں۔ ان میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہو گی۔ چنانچہ آج رات ہم اس کا الٹا عمل کریں گے۔ ایکشن ری وائنڈ۔ کل سین پھر وہی ہو گا جو پہلے تھا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے... کیا اس کے بعد مجھے اجازت ہو گی؟''

''اجازت... کیسی اجازت؟ بھائی میں کہہ رہا ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو گے ابھی... اور یہ عورت ہمارے ساتھ جائے گی۔ میں اس کی انتظامی صلاحیت کا قائل ہوں۔ یہ بہت کارآمد چیز ہے، ملٹی پرپز... ایک پرسنل سیکریٹری سے بھی زیادہ... کیا تم مان چکے ہو؟''

''میں مان چکا ہوں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''ریشم کیسی ہے؟''

''جیسا اسے ہونا چاہیے۔ اس کی مدد کے جرم میں ملازمہ ماری گئی تھی، وہ ہاؤس کیپر ہی تھی ایک طرح سے۔ ماں کی کنیز خاص تھی۔ ریشم کو نہ ماں کی سپورٹ حاصل ہو گی نہ بھائی کی... لیکن میں اس پر بھروسا کر سکتا ہوں۔''

میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ''اور آپ کے والد بزرگوار۔''

وہ ہنسا۔ ''اب ان کے اللہ اللہ کرنے کے دن ہیں۔ میرا خیال ہے انہیں اور اماں کو حج کی سعادت حاصل کرنے بھیج دوں۔''

''انہوں نے پوچھا نہیں کہ اکبر کہاں ہے؟''

''میں نے سمجھا دیا کہ بالکل خیریت سے ہے۔ کل ان کی ملاقات کرا دی جائے گی۔ ماں بالکل گم صم ہے۔ نہ روتی ہے نہ بولتی ہے۔ نہ کھاتی ہے اور نہ سوتی ہے۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ میں نے شہر سے ڈاکٹر کو بلایا ہے۔ اچھا اب کھانا بھی کھا ہی لیں۔ مجھے واپس جانا ہو گا۔ رات کو پھر آؤں گا، تیار رہنا۔''

''اپنے مجرم بھائی سے مل تو لو... مجھ سے کچھ زیادتی ہو گئی تھی... اس نے حملہ کیا تھا مجھ پر۔''

''ساری عمر وہ سب کے ساتھ زیادتی ہی کرتا رہا ہے۔ چلو جتنی دیر میں سلونی کھانا لگائے گی، میں اس سے مل لوں۔ اسے کچھ تسلی دوں کہ اس کے ساتھ میں وہ سلوک نہیں کروں گا جو اس نے میرے ساتھ روا رکھا ایک سال تک... کل اس کی بیوی سے بھی ملوا دوں گا بشرطیکہ وہ ہنگامہ نہ کرے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں انور کے ساتھ اندر گیا اور درمیانی کمرے کا دروازہ کھولا۔ اب اس کا امکان نہیں تھا مگر میں اکبر کے غیر متوقع حملے کے لیے تیار تھا۔ ایک دم دروازہ کھول کے اندر جانے کے لیے میں نے دروازے کو لات ماری تو کمرے کا پورا منظر میرے سامنے آ گیا۔

کچھ دیر انور بھی میرے ساتھ ساکت کھڑا دیکھتا رہا۔

''کہاں ہے اکبر؟''

اکبر واقعی نہیں تھا۔ کمرے میں کہیں بھی نہیں تھا۔

ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

آخری قہقہہ

بابر نعیم

اُس منچلی کے خواب... دولت کی آسانیوں اور زندگی کی راحتوں سے آراستہ تھے مگر سامنے کھڑی تھی... غربت جسے شکست دینا اس کا مقصدِ اولین تھا۔ خوابوں کی تعبیر کے لیے کاروبارِ زیست میں سرگرداں اس حسینہ کا مقدر بنا سفر در سفر۔ ایک سے دوسرے شہر، ایک پڑاؤ سے دوسرے ٹھکانے لیکن منزل ہنوز دور تھی... وہ بھی ایک پڑاؤ ہی تھا لیکن اسے علم نہ تھا کہ یہ اس کا آخری پڑاؤ بھی بن سکتا ہے۔ مغرب کی شاطر مزاجی اور عیار طبیعت کا ایک اور چشم کشا پہلو...

غنچہ دہن، سیمی بدن دوشیزہ کے کمالِ ہنر کی پُرفریب کرامات...

یہ کیسا ناقابلِ یقین لطیفہ تھا۔ موت میرے سر پر کھڑی تھی اور میں ہنس رہا تھا۔

شاید چند منٹ باقی تھے اور میں اذیت کو بھول کر بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہو گیا۔

ایلا (Ella) خاصی خوب صورت اور جوان عورت تھی۔ گداز، نرم و ملائم ایلا نے مجھ جیسے عمر رسیدہ شخص کو دیوانہ کر دیا تھا۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں رہا تھا۔ اس نے میرے ساتھ گھر کو بھی سنبھال لیا تھا۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے؟ وہ دوسرا دن تھا شاید...

ایملی کے بعد ایلا کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔ وہ خوشبودار سگریٹ نوشی سے اکثر لطف اندوز ہوتی۔ وہ اچانک ہی میری زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ میں حیران تھا... ایلا کسی ایرانی بلی کی طرح گول مٹول اور ریشم کی طرح نرم و ملائم تھی۔

اس کی وجہ سے میرا ایک کام رکا ہوا تھا... میرا دھیان بار بار ایملی کی جانب چلا جاتا تھا... لیکن ایلا کی مہکتی رفاقت کے باعث آخری کام ٹلتا جا رہا تھا۔ میں زیادہ تاخیر کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ موسم بہت سرد تھا۔

میرا اور ایلا کا آپس میں کوئی جوڑ ملاپ نہیں تھا۔ میرے تو بال بھی سفید ہو چکے تھے۔ آپ کو شاید پتا نہ ہو کہ ایلا جیسی عورتیں، ایسے چھوٹے قصبوں میں اکثر اس طرح ڈولتی پھرتی تھیں جیسے ہوا کے دوش پر پھولوں کے بیچ... اِدھر سے اُدھر یا اُدھر سے اِدھر اڑتی تتلیاں...

بہرحال میں نازاں تھا اور لطف اٹھا رہا تھا۔ شراب کی ضرورت کم ہو گئی تھی۔ وہ خود آتشیں سیال سے بھری بوتل تھی۔ یہ خیال بھی ذہن سے گزرتا رہتا کہ کاش ایلا، پانچ سات برس قبل زندگی میں آئی ہوتی تو...

میں اکثر راتوں میں اس کے بارے میں سوچتا رہتا۔ وہ ہارکنسن بورڈنگ ہاؤس کی بڑی بی کے ہاں مقیم تھی۔ میں حیران تھا کہ یہاں "اورن ول" میں کیا رکھا ہے۔ کون سی ٹریول بک یا رنگین پوسٹ کارڈ اسے یہاں کھینچ لایا۔ قصبہ کیا، یہ تو درحقیقت گاؤں ہی تھا۔

اب مرتے وقت تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ یہاں کیوں آئی تھی؟ تاہم ابتدا میں، میں اسے اپنی خوش قسمتی پر ہی محمول کرتا رہا جو دراصل میری حماقت تھی۔ اس کے خوب صورت خال و خط اور ناز و انداز نے مجھے منطقی انداز میں تجزیہ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ دوسرے میں پہلے ہی طویل عرصے سے ایملی جیسی بدزبان اور سازشی عورت سے بیزار ہو چکا تھا۔ ایملی کا رنگ روپ وقت نے ختم کر ڈالا تھا اور اس کے مرنے کا بھی فی الحال کوئی ارادہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں کیا، گاؤں کے بیشتر لوگ اس کی بدتمیزی اور کانٹے دار زبان سے تنگ تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب اچانک اس کے جانے کی خبر پھیلی تو سب اندر ہی اندر خوش تھے اور کسی نے بھی مجھے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا۔ وہ بلور جنکشن پر ٹرین پکڑ کر مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی... ویسے بھی وہ اکثر مجھے چھوڑ کر جانے کی دھمکیاں دیتی رہتی تھی۔

گاؤں کے مکین مجھے پسند کرتے تھے... ایملی کے جانے کی خوشی انہیں مجھ سے زیادہ تھی۔ ایملی کی زبان، افواہوں، چغلیوں نے کئی گھر برباد کیے تھے۔ اس کے جانے کا سن کر سب ہی نے سکون کا سانس لیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے نہیں معلوم کہ تم نے اسے اتنے عرصے کیوں برداشت کیا؟" ٹام نے ایک بار مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

"بس دوست کیا کہوں، خود ہی دھمکیاں دیتی رہتی تھی... میں نے سوچا کہ چلی جائے گی۔ دیر سے ہی سہی، خس کم جہاں پاک۔"

"بورڈنگ ہاؤس کی بلی کی تم پر نظر ہے۔" ٹام کا اشارہ ایلا کی طرف تھا۔ ٹام نے مجھے آنکھ ماری۔

"ہونہہ... میں نہیں سمجھتا کہ میں دوسری شادی کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"مت کرو، شادی۔" ٹام معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "تم اسے ہاؤس کیپر رکھ سکتے ہو۔"

جواباً میں بھی مسکرا دیا۔ میں اس کی ذومعنی باتیں سمجھ رہا تھا۔ ایلا کو میں کئی روز قبل دیکھ چکا تھا اور سچی بات ہے کہ جب ہی سے میرے دل میں گدگدی ہو رہی تھی۔

مختصر یہ کہ ایلا اسٹون میرے گھر آ گئی۔ پڑوسی خوش تھے اور مزے بھی لے رہے تھے۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ ایلا جیسی گل بدن نے مجھ میں کیا دیکھا۔ ایک بار مجھے خیال آیا کہ شاید اسے لیوٹ براؤن کی پس انداز رقم کا پتا ہے اور وہ اس کے پیچھے آئی ہے۔ تاہم اس حشر بداماں، چالاک عورت نے مجھے زیادہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا اور میں مدہوش ہوتا چلا گیا۔

میرا بس ایک کام باقی رہ گیا تھا جو ایلا کی وجہ سے نمٹانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

اس کی سنہری زلفوں نے میرے اردگرد مکڑی کا جالا بُن دیا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا تھا یا گزرنے والا تھا۔ جاڑے کا زور ٹوٹ نہیں رہا تھا اور پہلی مرتبہ سردی کی شدت مجھے لگ رہی تھی بلکہ لذت انگیز تھی۔ موسم کی یہ دل لگی بھی ایلا کی رنگین قربت کی وجہ سے دلکش لگ رہی تھی۔

ایک صبح ناشتے کے بعد مجھے کافی کا ذائقہ کچھ بدلا محسوس ہوا۔ ایلا میرے قریب بیٹھی میرے سفید ہوئے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی۔

میری توجہ کافی کی خوشبو سے ہٹ کر اس کے بدن سے پھوٹنے والی مہک کی طرف چلی گئی۔

میں نے عجلت میں کافی ختم کی اور ایلا کو بانہوں میں اٹھا لیا۔ ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ پیٹ میں اذیت ناک ٹیس اٹھی۔ میں نے لڑکھڑا کر ایلا کو آزاد کر دیا۔

"کیا بات ہے ڈارلنگ؟" ایلا اٹھلائی۔

تکلیف غائب ہو گئی تھی۔ میں نے آدھ منٹ انتظار کیا پھر اس کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔ قبل اس کے کہ میں اس کی جانب پیش قدمی کرتا، درد کی لہر دوسری بار اٹھی۔ اس میں پہلے سے زیادہ شدت تھی۔ میں بے اختیار اپنے گھٹنوں پر آ گیا۔ میرے چہرے کے تاثرات اذیت سے بگڑتے چلے گئے۔ درد کی لہر واپس نہیں گئی تھی... بلکہ تکلیف میں اضافہ ہو رہا تھا۔

میں بمشکل قریبی کاؤچ پر ڈھیر ہو گیا۔

"ہنی! کیا ہوا؟ بہت درد ہے؟" اس نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ "میں مساج کرتی ہوں... شاید مساج سے ٹھیک ہو جائے..."

اذیت سے میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ میں نے اس کا لوچ دار ہاتھ اپنے جسم سے ہٹا دیا۔

"مجھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے، ایلا! جاؤ کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔" میں نے مشکل سے بات مکمل کی۔

وہ باہر چلی گئی۔ منٹ گزرنے لگے۔ میں تڑپ رہا تھا۔ خود کو گھسیٹتا ہوا میں کھڑکی تک گیا کہ وہ ڈاکٹر کو لے کر آ رہی ہو گی لیکن میں کھڑکی تک پہنچنے سے قبل ہی گر کر دہرا ہو گیا۔ کسی طرح میں نے پھر ہمت کی اور کھڑکی تک پہنچا۔ چند لمحے تک میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ ایک تناور درخت کے نیچے بیٹھی سگریٹ نوشی میں مشغول تھی۔

☆☆☆

میں کھڑکی سے نیچے پھسل گیا۔ گھٹنے پیٹ سے لگ گئے۔ میں سمجھ گیا تھا، سب سمجھ گیا تھا... اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ کئی کام رہ گئے تھے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

میری سمجھ میں آ گیا کہ وہ یہاں کیوں آئی اور پھر مجھ تک کیسے پہنچی... اس نے شاید مجھے کھڑکی میں دیکھ لیا تھا۔ میں نے اندر آتی اس کے قدموں کی چاپ سنی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے مردہ حالت میں چھوڑ جائے گی یا مجھے غائب کرے گی لیکن کیسے غائب کرے گی؟

میں نے اسے اپنے قریب دیکھا۔ وہ مطمئن انداز میں گنگنا رہی تھی۔ سگریٹ نیچے پھینک کر اس نے سینڈل سے

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ
ماہنامہ سرگزشت
شمارہ نومبر 2013ء کی جھلکیاں
زیرِ لب
ایک معروف و مقبول شاعر کا زندگی نامہ
عقوبت سے گراں
ٹارچر سیل میں تڑپتے انسانوں کی کتھا
شاہی سوتن
مغرب سے درآمد ایک شہزادی کا احوال
انتظار
وہ آج بھی منتظر ہے، ایک دردبھری سچ بیانی
اس کے علاوہ
سفرنامہ، شکار کتھا، فلمی دنیا کی کہی ان کہی داستانیں، اور لہو کی گردش تیز کر دینے والی روداد "سراب"
20 سے زائد سچے واقعات، سچ بیانیاں اور سچے قصے
وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں آپ کو پڑھنا چاہیے
آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرا لیں
خاص شمارہ... ہر شمارہ، خاص شمارہ... ہر شمارہ، خاص شمارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

مداخلت

تنویر ریاض

ٹھہرے ہوئے پُرسکوت پانی میں اچانک ہی پتھر اُچھال دیا جائے تو ہر طرف ارتعاش کی لہریں سر اٹھانے لگتی ہیں... اسی طرح بعض افراد کی پُرسکون و سُبک زندگی میں مداخلتِ بے جا تغیر بپا کر دیتی ہے... پُرشکوہ و پُرتعیش زندگی گزارنے والے میاں بیوی کی دنیا میں ہلچل مچادینے والی ہستی کے اسرار و رموز...

جرم در جرم... کڑی در کڑی... متواتر دراز ہونے والا جرم کا سنگین سلسلہ...

اتوار کی ایک خوشگوار صبح وہ ہماری زندگی میں بڑے ہی دھماکا خیز انداز میں داخل ہوئی اور اس نے ہمارا سکون غارت کر دیا۔ میں اور الزبتھ حسبِ معمول بستر میں ہی ناشتا کر رہے تھے۔ یہ عیاشی ہمیں صرف اتوار والے دن ہی میسر آتی تھی جب صبح سویرے تیار ہو کر کچن ٹیبل پر جانے کا تکلف نہیں کرنا پڑتا تھا۔ الزبتھ نے میری پسند کا ناشتا بنایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ چھٹی والے دن میں کیا پسند کرتا ہوں۔ مکھن اور جیلی لگے ہوئے توس اور اس کے ساتھ چائے کا ایک کپ۔

مسل ڈالی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا... نہ اپنے لیے، نہ اس کے لیے۔ یہ وہ بھی جانتی تھی، نیز جانتی تھی کہ میں بھی اس امر سے آگاہ ہوں... میں جانتا تھا کہ وہ میری بے بسی سے واقف ہے۔

"کیسا لگ رہا ہے، لیوٹ؟" وہ قطعی پُرسکون تھی۔ اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس قسم کی وارداتوں کی عادی ہے کہ کسی عمر رسیدہ آدمی کو تاڑے، اس کو ورغلائے پھر اس سے چھٹکارا حاصل کرلے اور جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، لے جائے۔ میں اس کے طریقۂ واردات کو سمجھ گیا تھا لیکن وقت میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

وہ سینٹر ٹیبل کے کنارے بیٹھ کر اطمینان سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ ہم دونوں وقت گزاری کر رہے ہیں۔ "اورن وِل" سے پچاس میل دور ایک نسبتاً ویران جگہ پر اس کا فارم تھا۔ وہی اس کی اصل رہائش گاہ تھی۔ یعنی وہ مجھے یوں چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی۔ تو پھر وہ کیا کرے گی؟ میں مسلسل سوچ رہا تھا۔ حالانکہ اب سوچنے کے لیے کچھ بچا نہیں تھا۔ ہر گزرتے منٹ کے ساتھ میں موت سے قریب تر ہوتا جارہا تھا۔

اچانک اس نے کہنا شروع کیا۔ "میں اکتا گئی تھی۔ غربت ناقابلِ برداشت ہے... بعض اوقات مناسب کپڑوں کا حصول بھی دشوار ہو جاتا تھا۔ یہ سب مجھے قبول نہیں تھا۔ مجھے آسائش چاہیے تھی۔ اس کے لیے میں کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھی پھر میں نے حل ڈھونڈ لیا۔ تم تیسرے بوڑھے گدھ ہو... میرا تیسرا شکار... یہ میرا کاروبار ہے۔ یہاں میں بزنس ٹرپ پر تھی۔ ایک، دو کاروباری دورے اور کروں گی۔ پھر مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔" وہ ہنسنے لگی۔ "میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں، لیوٹ۔"

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ ہم دونوں غائب ہو جائیں گے اور گاؤں والے قیاس آرائیاں کرتے رہ جائیں گے۔" اس نے چٹخارے لیتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

"میں احمق نہیں ہوں، میں پوری منصوبہ بندی کرتی ہوں۔" وہ اپنی ہوشیاری پر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ "میں تمہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتی۔ ہم دونوں ساتھ جائیں گے تو لوگ زیادہ سوچ بچار نہیں کریں گے۔"

"لل... لیکن... کک... کیسے؟" میں نے بدقت تمام سوال کیا۔ مجھے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔

میری قوتِ ارادی نے اب تک مجھے سنبھالا ہوا تھا۔ میں اس کی پوری کہانی سننا چاہتا تھا۔ حالانکہ اذیت سے میری رگ رگ ٹوٹ رہی تھی۔ آہ... نرم گرم ایلا ایک پیشہ ور قاتل تھی۔

"دفناؤ گی؟" میرا سوال تھا۔ اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔

"ڈونٹ بی سلی۔ یہ میں کیسے کر سکتی ہوں۔ کر بھی دوں تو کسی وقت بات کھل جائے گی۔ دفنانے کے لیے اس سے بہتر مقام موجود ہیں جہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا۔" اس کی مسکراہٹ، ہنسی میں بدل گئی۔

میرے خیال میں یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ کیسے مجھے لے جائے گی؟ میں نے سوال کرنا چاہا لیکن وہ خود ہی بول پڑی۔

"بیک یارڈ میں ایک آہنی کنگ سائز ٹرنک پڑا ہے... پہلے ہی دیکھ چکی ہوں۔ مجھے ٹرنک خریدنا نہیں پڑے گا۔ تمہیں اس بھاری بھرکم ٹرنک میں منتقل کرنا پڑے گا۔ مجھے تھوڑی محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن ایک بات بتاؤ... تمہیں اتنے بڑے ٹرنک کی کیا ضرورت تھی؟ اناج جمع کرتے تھے اس میں؟"

میں خاموش رہا تاہم میرے پھیپھڑوں میں کسی چیز نے مچلنا شروع کر دیا۔ وہ پھر بولی۔

"ٹام نے مجھ سے وعدہ کرلیا ہے کہ وہ مجھے بلور جنکشن تک پہنچا دے گا۔ میرے ساتھ ٹرنک کے سوا کوئی سامان نہیں ہوگا۔ شک کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہم دونوں خوش ہیں اور سب کی طرح مجھے بھی معلوم ہے کہ آج کی رات تم "اورن وِل" سے دور اکیلے گزارتے ہو۔ لہٰذا ٹام کو تم سے ملنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" اس نے اپنی کہانی ختم کی۔

ادھر میرے پھیپھڑوں کی گدگدی زوردار ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔

مجھے ہنستا دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اذیت پس منظر میں چلی گئی۔ کیا خوب شگوفہ کھلنے والا تھا۔ حیرت انگیز مذاق...

مجھے خود پر اختیار نہ رہا۔ میں ہنستے ہوئے مر رہا تھا۔ آپ نہیں جانتے کہ ایلا مجھے ٹرنک میں منتقل نہیں کر سکے گی۔ یہ بات صرف میں جانتا ہوں کہ ٹرنک میں اناج کے بجائے ایملی کی لاش ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ناشتا ختم ہو گیا تو میں نے خالی برتنوں کی ٹرے اٹھائی اور نیچے چلا گیا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے باہر کا رخ کیا اور مرکزی شاہراہ پر واقع نیوز ایجنٹ کی دکان کی جانب چل دیا۔ ہر اتوار کی صبح اخبار لے کر آنا گویا میری عادت بن گئی تھی لیکن مجھے اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

سڑک پر سناٹا تھا لیکن میری ملاقات پڑوسیوں سے ہو گئی اور انہوں نے مجھے ہیلو کہا تو مجھے بھی اخلاقاً ہیلو کہنا پڑ گیا۔ ہماری ان سے بہت کم بات چیت ہوتی تھی اور اگر کبھی اتفاقاً آمنا سامنا ہو جاتا تو گفتگو کا دائرہ موسم تک ہی محدود رہتا تھا لیکن اس روز ایک غیر معمولی بات ہوئی۔ انہوں نے مجھے روک کر ایک اور چوری کے بارے میں بتایا۔ ان دنوں ہمارے علاقے میں چوری کی وارداتیں بڑھ گئی تھیں۔ اس لیے یہ خبر سن کر مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ میں نے خوش اخلاقی سے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے ہمیشہ سے ہی پڑوسیوں کو نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بے تکلف ہوں اور انہیں ہمارے گھر میں تاک جھانک کا موقع ملے۔

میں اخبار لے کر گھر آیا اور الزبتھ کے حوالے کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دن کا آغاز کرنے سے پہلے اخبار کی سرخیوں پر ضرور نظر ڈالتی ہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں کچن میں چلا گیا تاکہ ناشتے کی خالی پلیٹوں کو ڈش واشر میں ڈال دوں۔ عین اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی تو میں چونک گیا۔ اس وقت کسی مہمان کے آنے کی توقع نہیں تھی۔ چنانچہ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ اتوار کے دن ساڑھے گیارہ بجے ہمیں پریشان کرنے والا ضرور کوئی سیلز مین یا سیلز گرل ہوگی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھا۔ مجھے انتہائی نرمی اور شائستگی سے اس سے نمٹنا تھا کیونکہ سختی سے بات کرنے کی صورت میں یہ لوگ بحث پر اتر آتے ہیں اور خوامخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔

میں نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور متوقع سیلز مین یا سیلز گرل سے معذرت کرنے کے لیے مناسب الفاظ سوچنے لگا لیکن اس وقت مجھے بہت حیرت ہوئی جب میرے کانوں سے ایک زنانہ آواز ٹکرائی جو پوچھ رہی تھی کہ کیا میں ہی مسٹر تھامسن ہوں۔ یہ سننے کے بعد میں نے دروازہ تھوڑا سا اور کھول دیا۔ میرے سامنے ایک پُرکشش عورت کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے نظر آنے والی لکیروں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ عمر میں اس سے کہیں زیادہ بڑی ہے جتنا کہ نظر آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے اپنے لمبے بالوں کو [illegible] ہوا تھا اور دھوپ میں جھلسی ہوئی جلد سے لگ رہا تھا کہ [illegible] میرے علاقے شمالی لندن کی رہنے والی نہیں ہے۔ اس [illegible] کھلے گلے کا انتہائی مختصر اسکرٹ پہن رکھا تھا اور پاؤں میں [illegible] اونچی ایڑی کے سینڈل تھے۔ اس کی تیاری اور اہتمام [illegible] کہا جا سکتا تھا کہ وہ سودا بیچنے والی عورت نہیں بلکہ کوئی مہمان [illegible] ہے۔ میں نے رسماً اور اخلاقاً پوچھا کہ اس کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ اجنبیوں کے ساتھ میں ہمیشہ فاصلہ رکھ کر اسی انداز میں بات کرتا تھا۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور بولی۔ ”میرا نام سوزانے ہے اور میں جیف کی بیوی ہوں۔ اس نے [illegible] تمہیں اپنی شادی کے بارے میں بتایا ہوگا۔“

حیرت سے میرا منہ کھل گیا اور میں اس کی شکل دیکھنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹوں۔ ایک اجنبی عورت میرے دروازے پر کھڑے ہو کر میرے بھائی کی بیوی ہونے کا دعویٰ کر رہی تھی جس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا چنانچہ یہی بات میں نے اس سے کہہ دی لیکن اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے ایک قدم مزید آگے بڑھایا اور کسی ڈھیٹ سیلز گرل کی طرح بولی کہ کیا میں اسے اندر آنے کے لیے نہیں کہوں گا۔

میں اس سے کوئی بہانہ بنا کر کہہ سکتا تھا کہ یہ مناسب نہیں لیکن اگر کوئی عورت یہ دعویٰ کرے کہ وہ میرے بھائی کی بیوہ ہے تو اخلاقیات کا تقاضا یہی ہے کہ میں اسے دروازے پر کھڑا نہ رہنے دوں۔ اس نے میرے تاثرات پڑھ لیے اور جواب کا انتظار کیے بغیر میرے پاس سے گزرتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا، وہ ہال کے وسط تک پہنچ گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کے چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جیسے ظاہر کر رہی ہو کہ جو کچھ اسے معلوم ہے، وہ میں نہیں جانتا۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شمال کی رہنے والی ہے۔ میں حیرت زدہ تھا کہ میرا بھائی کس طرح اس عورت کے جال میں پھنس گیا۔ وہ کئی برس سے جنوبی فرانس میں رہ رہا تھا لیکن اس عورت میں ایسی کوئی کشش نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ اس کی جانب مائل ہو سکتا۔

اس عورت کے پاس ایک چھوٹا سا گلابی رنگ کا سوٹ کیس بھی تھا جسے وہ کسی پالتو کتے کی طرح کھینچتی ہوئی اپنے ساتھ اندر لے آئی۔ اس سوٹ کیس کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے اس عورت کے عزائم ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ وہ شاید ہمارے یہاں دیر تک قیام کرنے کے ارادے سے آئی تھی۔

میں اس بارے میں اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن اس مرحلے پر ایسی بات کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ میں سوچ رہا ہوں، وہ ٹھیک نہ ہو اور وہ عورت اپنا مدعا بیان کرنے کے بعد چلی جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ سوٹ کیس ہال میں چھوڑ دے اور ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھے۔

مجھے یاد ہے کہ اس نے کسی اسکول گرل کی طرح بدتمیزی سے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ڈرائنگ روم... تم مجھے اس وقت ایک فرماں بردار بٹلر معلوم ہو رہے ہو۔“ پھر وہ راہداری میں رک گئی اور اس کے چہرے کی مسکراہٹ بھی اچانک ہی غائب ہو گئی۔ وہ سنجیدہ صورت بناتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ جیف کا انتقال کب ہوا؟ اس کی کیا وجہ ہے؟“

اس کے براہِ راست گفتگو کرنے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ان جاہل عورتوں میں سے ہے جنہیں اپنے گنوارپن پر ناز ہوتا ہے۔ میں اور الزبتھ ہمیشہ سے ایسے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں اور اب ان میں سے ایک میرے ڈرائنگ روم میں موجود تھی اور حریصانہ نظروں سے وہاں رکھے ہوئے فرنیچر اور دیگر آرائشی اشیا کا جائزہ لے رہی تھی جیسے کوئی نیلام کرنے والا ان کی قیمت کا اندازہ لگا رہا ہو۔

”میں اور جیف بہت زیادہ قریب نہیں تھے۔“ میں نے کہا۔ ”اور میری بیوی الزبتھ ہوائی جہاز سے سفر نہیں کرتی۔ وہ ہوائی سفر سے خوف زدہ رہتی ہے۔“

”تم کار کے ذریعے بھی آ سکتے تھے؟“

جب میں نے اسے بتایا کہ میں کار کے ذریعے اتنا طویل سفر نہیں کر سکتا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ مجھ سے میری عمر پوچھنے لگی جو میں نے اسے بتا دی۔

”ترپن سال۔“ وہ دہراتے ہوئے بولی۔ ”گویا جیف تمہارا چھوٹا بھائی تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ تمہیں اس کی موت کی خبر سن کر زیادہ صدمہ ہوا ہوگا۔“

”میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ہم آپس میں زیادہ قریب نہیں تھے۔ ہمارا سال میں بمشکل ایک مرتبہ رابطہ ہوتا تھا۔“ میں نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

مجھے اس کا انداز پسند نہیں آیا۔ وہ ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی حساب کتاب کر رہی ہو پھر وہ بولی۔

”جیف نے بتایا تھا کہ تم نے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی۔“

”ہاں، میں نے اپنا کاروبار فروخت کر دیا تھا۔“

اس نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے ایک آرائشی کھلونا اٹھا لیا اور اس کا معائنہ کرنے لگی۔ میں الزبتھ کو بلانا چاہ رہا تھا لیکن اسے کمرے میں تنہا چھوڑنا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ مجھے ایسی عورت لگ رہی تھی جو موقع ملتے ہی کوئی بھی چیز چرا سکتی تھی اور اس کمرے میں ایسی کئی چیزیں موجود تھیں۔ چند لمحوں بعد میں نے اس عورت پر نظریں جماتے ہوئے ہال کے کونے پر جا کر الزبتھ کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ ”ڈارلنگ... نیچے آ جاؤ۔ جیف کی بیوی ہماری مہمان ہے جو فرانس سے ملنے آئی ہے۔“

میں نے الزبتھ کا جواب سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور کمرے میں واپس آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے گھر میں گھس آنے والی اس اجنبی عورت کو کچھ چرانے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”الزبتھ آ جائے تو ہم کافی پئیں گے۔“ اس نے اس طرح ہونٹ ہلائے جیسے کہہ رہی ہو کہ اس کا حلق خشک ہو رہا ہے۔

میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ آرام سے صوفے میں دھنس گئی۔ اس نے کشن سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنی ایک ٹانگ دوسری پر رکھ لی اور میرے لیے بہت مشکل ہو گیا کہ اس کی ٹانگوں پر سے اپنی نظر ہٹا سکوں۔ اسے یہ خیال بھی نہ تھا کہ الزبتھ اس حالت میں دیکھ کر کیا سوچے گی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اس مکان میں رہتے ہوئے ہمیں کتنا عرصہ ہو گیا ہے تو میں نے اسے بتا دیا کہ اس سال موسم بہار میں پانچ سال ہو جائیں گے۔ یہ جگہ اس لیے بھی پسند ہے کہ سڑک پر ٹریفک کا شور بالکل نہیں ہوتا اور ہمیں اپنی تنہائی بہت عزیز ہے۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اسے ہمارے گھر کا پتا کس طرح معلوم ہوا تو اس نے بتایا۔

”میں نے جیف کے مرنے کے بعد اس کے سامان کی تلاشی لی تو اس میں سے تمہارا پتا مل گیا۔“ پھر وہ آگے کی طرف جھک گئی اور میرے لیے اس نظارے کی تاب لانا مشکل ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر نظریں دوسری جانب پھیر لیں۔

”وہ اکثر تمہارے بارے میں باتیں کیا کرتا تھا۔“ اس نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا پھر اپنے گھٹنے پر ایک کشن رکھتے ہوئے بولی۔ ”اچھی جگہ ہے۔ سب سے الگ تھلگ اور ان درختوں کی وجہ سے بہت زیادہ پرائیویٹ ہو گئی ہے۔ اس کی اچھی خاصی قیمت ہوگی۔“

”پچھلے کچھ دنوں سے مکانوں کی قیمتیں ایک جگہ رک گئی ہیں۔“ شاید وہ سوچ رہی ہوگی کہ ہم پیسے والے لوگ ہیں اور وہ بھی جائداد میں اپنا حصہ لینے آ گئی ہو۔

الزبتھ راہداری میں نمودار ہوئی تو اسے دیکھ کر مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

خاصا سکون ملا۔ اس نے بگی نما اسکرٹ اور پھول دار بلاؤز پہن رکھا تھا اور سر کے دونوں جانب بالوں میں کلپ لگا رکھے تھے۔ وہ دونوں بازو سینے پر باندھ کر مہمان کو دیکھنے لگی اور طنز آمیز انداز میں بولی۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ تم جیف کی بیوی ہو۔ اس کے وکیل نے ہمیں موت کی اطلاع ضرور دی تھی لیکن اس نے کسی بیوی کا ذکر نہیں کیا۔“

سوزانے اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور دونوں بازو پھیلا کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں سوزانے ہوں۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ بہت جلد ہم آپس میں گھل مل جائیں گے۔ بہرحال، ہمارا ایک ہی خاندان ہے۔“

وہ مسکرا رہی تھی لیکن مجھے اس کی آنکھوں میں بے یقینی کی جھلک نظر آئی جو میرے لیے حیران کن نہیں تھی کیونکہ الزبتھ بدستور اپنے ہاتھ باندھے کھڑی رہی اور اس نے سرد مہری سے کہا۔ ”ہم کس طرح یقین کرلیں کہ تم جیف کی بیوی ہو؟“

یہ سن کر سوزانے برہم ہوگئی اور قسمیں کھانے لگی۔ الزبتھ نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ وہ اس قسم کی زبان پسند نہیں کرتی تھی اور نہ ہی مجھے اس طرح کا انداز اچھا لگتا تھا۔

”پاسپورٹ پر میرا اصلی نام لکھا ہوا ہے کیونکہ مجھے اسے تبدیل کروانے کا موقع ہی نہیں ملا اور شادی کے کاغذات فرانس میں ہی ہیں۔ اس لیے تمہیں میری بات پر بھروسا کرنا ہوگا۔“ پھر اچانک اس کی آنکھوں میں چمک ابھری جیسے کوئی اچھوتا خیال ذہن میں آگیا ہو۔ وہ بولی۔ ”تم مجھ سے جیف کے بارے میں کچھ بھی پوچھ سکتی ہو۔ اس سے متعلق کوئی بھی بات۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ الزبتھ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تم اس سے ملتی رہی ہو اور ان ملاقاتوں کے دوران اس کے بارے میں معلومات اکٹھی کرلی ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تو وہ شراب کا شوقین تھا اور نشے کی حالت میں کسی بھی شخص سے بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال، تم یہاں کیوں آئی ہو اور کیا چاہتی ہو؟“

سوزانے نے اس کی بات کو نظر انداز کردیا اور میری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ”جیف نے کہا تھا کہ اگر اسے کچھ ہوجائے تو میں تمہارے پاس چلی جاؤں۔ اسی لیے یہاں آئی ہوں اور منتظر ہوں کہ تم کب مجھے کافی پلاتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں کافی بنانے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔“

اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ گیا لیکن کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے اسے کہتے ہوئے سنا۔ ”میرے پاس یہاں رات گزارنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں میرے یہاں ٹھہرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں دوں گی۔“

کچھ لوگوں سے پیچھا چھڑانا بہت مشکل ہوتا ہے اور سوزانے بھی انہی میں سے ایک تھی۔ بجائے اس کے کہ ہم اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیتے، وہ ہم سے چپک کر رہ گئی تھی۔ میں کبھی کسی ایسی عورت سے نہیں ملا تھا جو الزبتھ کی طرح پُرعزم ہو لیکن سوزانے کو دیکھ کر مجھے شک ہونے لگا کہ وہ الزبتھ کی ٹکر کی ہے۔

سہ پہر میں وہ یہ کہہ کر چلی گئی کہ اسے وسطی لندن میں کچھ خریداری کرنی ہے۔ اس کے جانے سے وقتی طور پر ہمیں سکون مل گیا لیکن چھ بجے کے قریب وہ خالی ہاتھ واپس آگئی۔ اس کے پاس کوئی شاپنگ بیگ نہیں تھا۔ ہم نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا کیونکہ اسے غیر ضروری اہمیت دینا نہیں چاہ رہے تھے۔ پھر اس نے ہمیں یہ کہہ کر حیران کردیا کہ وہ کھانے کے لیے ویلٹن اینڈ پارسنز جارہی ہے اسے توقع ہے کہ ہم بھی ساتھ جائیں گے لیکن الزبتھ کو پب کا ماحول پسند نہیں تھا۔ حالانکہ میں نے سن رکھا تھا کہ وہ جگہ کافی پُرسکون ہے اور وہاں زیادہ تر شرفا ہی آتے ہیں۔

سوزانے کی غیر حاضری سے ہمیں موقع مل گیا کہ آنے والے وقت کے لیے ضروری انتظامات کرسکیں کیونکہ وہ عورت یہاں رات گزارنے کا ارادہ رکھتی تھی اس لیے الزبتھ نے گھر کے فالتو کمرے میں اس کے لیے بستر لگا دیا۔ میرا خیال ہے کہ تھوڑی بہت مہمان نوازی کا مظاہرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ مہمان بلائے جاں نہ بن جائے۔

جب وہ واپس آئی تو اس کے گال سرخ ہورہے تھے اور چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ جب اس نے کہا کہ وہ بہت تھک چکی ہے اور بستر پر جا کر آرام کرنا چاہتی ہے تو ہم نے سکون کا سانس لیا۔ الزبتھ اپنے کمرے میں جا چکی تھی اس لیے مجھے ہی سوزانے کی راہنمائی کا فریضہ انجام دینا پڑا۔ میں نے اس کا سوٹ کیس اٹھایا اور اس کے پیچھے چل دیا۔ مجھے یہ اعتراف کرلینا چاہیے کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں اس کی پشت پر سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ میں ایک شادی شدہ شخص ہوں اور میں نے کبھی اپنے ذہن میں ایسے خیالات کو جگہ نہیں دی لیکن سوزانے ایک پُرکشش عورت تھی اور اس حال میں دیکھ کر کسی بھی شخص کا دل ڈول سکتا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر ان خیالات سے پیچھا چھڑایا اور سوزانے کو

اس کے کمرے میں چھوڑ کر واپس چلا آیا۔

اس رات مجھے ٹھیک سے نیند نہ آسکی۔ ڈھائی بجے کے قریب میں نے سوزانے کے قدموں کی آہٹ سنی۔ شاید وہ باتھ روم جارہی تھی۔ میرے دماغ میں جیف کے وکیل سے ہونے والی گفتگو گونجنے لگی۔ اس نے بتایا تھا کہ جیف ایک پارٹی میں شرکت کرنے گیا تھا اور واپس نہیں آیا۔ اسے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی نہ ہوسکی۔ فرانسیسی پولیس کو یقین تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوگیا ہے۔

سوزانے اگلے روز صبح دس بجے کچھ بتائے بغیر گھر سے چلی گئی لیکن اس کا سامان کمرے میں موجود تھا۔ گویا وہ کم از کم مزید ایک رات ٹھہرنے کے موڈ میں تھی۔ الزبتھ نے مشورہ دیا کہ مجھے جیف کے فرانسیسی وکیل کو فون کرکے اس عورت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیے جو جیف کی بیوی ہونے کا دعویٰ کررہی تھی۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جاننا چاہ رہا تھا کہ جیف کی موت کے سلسلے میں پولیس کی تحقیقات کہاں تک پہنچی۔

میں نے اس سے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کی مادری زبان کا حلیہ بگاڑ دوں چنانچہ اس نے انگریزی میں گفتگو کرنے کو ترجیح دی۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ”گزشتہ ہفتے میری تم سے بات ہوئی تھی۔ اس کے بعد میرے پاس ایک عورت آئی۔ اس کے پاس کچھ کاغذات تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیف نے مرنے سے دو ماہ قبل اس عورت سے شادی کرلی تھی۔ اس کا نام سوزانے ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ وہ قانونی طور پر اب بھی اس کی بیوی ہے۔“

”گویا وہ اس کی جائداد کی وارث ہوسکتی ہے؟“

”مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ جیف کرائے کے مکان میں رہتا تھا اور وہ کئی لوگوں کا مقروض بھی ہے۔ میرے علم کے مطابق اس نے ترکے میں ایسا کچھ نہیں چھوڑا جس کی وراثت کا دعویٰ کیا جاسکے۔ تم کہہ رہے ہو کہ وہ عورت تمہارے پاس آئی ہے۔“

”ہاں لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا چاہ رہی ہے۔“

”ممکن ہے کہ وہ اپنی رقم واپس لینا چاہ رہی ہو۔ اس کا کہنا ہے کہ تمہارے بھائی نے اس سے سب کچھ لے لیا تھا۔ اسے پچھلے سال ایک دولت مند شوہر سے طلاق کے نتیجے میں ایک بڑی رقم ملی تھی جو اس نے تمہارے بھائی کے کاروبار میں لگا دی۔ اس عورت کے بقول اس میں گھاٹا ہوا اور وہ ساری رقم ڈوب گئی۔ وہ عورت بہت غصے میں تھی اور انتقام لینے کی بات کررہی تھی تاہم ایک وکیل کی حیثیت سے میں نے اسے قانونی راستہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔“

میں چند لمحے خاموش کھڑا رہا جیسے اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کررہا ہوں پھر بڑے محتاط انداز میں کہا۔ ”تم سمجھتے ہو کہ وہ ہماری فیملی سے کسی قسم کا انتقام لینے آئی ہے؟“

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس عورت سے معاملہ کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیتا۔ وہ انتہائی چالاک عورت ہے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پولیس کی تحقیقات کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جواب دیا۔ ”میں نے انہیں سوزانے کی آمد کے بارے میں بتادیا تھا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔“

”کیا وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس نے جیف کو قتل کیا ہے؟“

”وہ خود اپنے آپ کو غلط عورت سمجھتی ہے اور ایسی عورتیں کچھ بھی کرسکتی ہیں اور میں نہیں جانتا کہ وہ پیسوں کے بارے میں سچ بول رہی ہے۔ میں اس پر بھروسا نہیں کرتا اور میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“

میں نے ریسیور رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ وکیل نے جو کچھ بتایا ہے، الزبتھ کو بھی اس سے آگاہ کردوں۔ میں اسے بتانا چاہ رہا تھا کہ جب تک یہ عورت ہمارے گھر میں ہے، وکیل کے خیال میں ہم خطرے میں ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ زبردستی کیے بغیر آپ کسی ناپسندیدہ مہمان سے کس طرح چھٹکارا حاصل کرسکتے ہیں۔ بظاہر تو اس کا ایک ہی حل تھا کہ اس سے فالتو کمرا نہ ہونے کا عذر کیا جائے یا پھر کسی دوسرے شہر جانے کا بہانہ بنایا جائے لیکن سوزانے بہت تیز عورت تھی اور شاید ہی ہماری کسی بات پر یقین کرتی۔

صورتِ حال اس وقت مزید خراب ہوگئی جب سوزانے پیر کی دوپہر واپس آئی اور اس نے پورے گھر میں تاک جھانک شروع کردی۔ یوں لگتا تھا جیسے جیف کی بیوی بن کر اسے ہمارے گھر کی تلاشی لینے کا حق مل گیا ہے۔ الزبتھ خاموشی سے یہ تماشا دیکھتی رہی لیکن جب سوزانے نے اینکسی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو الزبتھ نے اسے جتادیا کہ وہ اپنی حد سے تجاوز کررہی ہے۔ ساتھ ہی اس نے اخلاقی مدد کے لیے مجھے بھی بلالیا۔

الزبتھ کے لہجے کی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے سوزانے نے دفاعی انداز اختیار کیا اور بولی کہ اب وہ ہمارے خاندان کی ایک فرد ہے اور خاندان کے لوگ ایک دوسرے کی مدد

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرتے ہیں۔ اس نے باغ میں جاکر انیکسی کا عقبی حصہ دیکھا تھا اور سمجھتی تھی کہ یہ جگہ اس کی رہائش کے لیے بالکل موزوں ہے۔ جیف نے اس کی ساری دولت کسی ہوشیار جادوگر کی طرح ہتھیالی تھی لہٰذا اب ہمیں ہی اس کا خیال رکھنا تھا۔

الزبتھ نے کسی وکیل کی طرح مدلل انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں جس سے ظاہر ہوسکے کہ جیف نے کوئی غلط کام کیا ہے۔“ پھر وہ اپنا چہرہ اس کے منہ کے قریب لے جاتے ہوئے بولی۔ ”ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ تم اس سے شادی کرنے کے بارے میں جھوٹ بول رہی ہو۔ ہمیں یہ کیسے معلوم ہوگا کہ تمہارے پاس اتنی دولت تھی۔ مجھے تو یہ من گھڑت کہانی لگتی ہے اور ہوسکتا ہے کہ تم نے ہی اسے قتل کیا ہو۔“

سوزانے کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور وہ چلاتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا کرتا پھر رہا تھا۔ کیا تم اس کی نگرانی کررہی تھیں؟“

میں اس کے لفظوں میں چھپی ہوئی دھمکی پر غور کرنے لگا کیونکہ وہ دھمکیاں دینے کی عادی تھی اور اب بھی ہمیں نقصان پہنچانے کے لیے کوئی حرکت کرسکتی تھی۔

”میں چاہتی ہوں کہ تم اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے چلتی پھرتی نظر آؤ۔“ الزبتھ نے غصے سے کہا۔

”میں خالی ہاتھ نہیں جاسکتی جبکہ تمہارے بھائی نے میرے سارے پیسے لے لیے۔“

”تم کہیں بھی جاسکتی ہو مثلاً کسی رشتے دار کے پاس۔“ میں نے کہا۔

”سب اپنی اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ میرا کسی سے کوئی رابطہ نہیں۔“ وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔ اس کا جارحانہ انداز التجا میں تبدیل ہوچکا تھا۔ ”میں بہت جلد اپنے قدموں پر کھڑی ہوجاؤں گی لیکن مجھے فی الحال کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ جیف کے مرنے کے بعد میری دنیا تاریک ہوگئی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ تم لوگ میری مدد کروگے۔“

میں نے اس سے پہلے کسی عورت کو اتنے دردناک انداز میں گفتگو کرتے نہیں دیکھا تھا اس لیے میرا متاثر ہونا فطری عمل تھا۔ ویسے بھی عورت کے آنسو بڑے سے بڑے سنگدل مرد کو موم کردیتے ہیں۔ الزبتھ پر بھی اس کی فریاد کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی۔ ”انیکسی تو کاٹھ کباڑ سے بھری ہوئی ہے۔ اس لیے وہاں تمہارے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ تم اسی فالتو کمرے میں صرف آج کی رات رہ سکتی ہو۔“

سوزانے مسکرائی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں کامیابی کی جھلک دیکھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی حساب کتاب کررہی ہے۔ میں اس پر بھروسا نہیں کرسکتا تھا اور جب تک وہ ہماری زندگی سے ہمیشہ کے لیے نہ چلی جاتی، مجھے سکون نصیب نہ ہوتا۔

میری نیند بہت کچی ہے اور ذرا سی آہٹ پر آنکھ کھل جاتی ہے۔ ایسا ہی اس رات بھی ہوا۔ الزبتھ کے خراٹوں اور دور فاصلے پر پولیس کار کے سائرن کے علاوہ بھی میں نے ایک آواز سنی۔ یوں لگا جیسے کوئی بیرونی دروازے کے باہر چل رہا ہے۔ مجھے فرانسیسی وکیل کے الفاظ یاد آگئے۔ اس نے کہا تھا کہ سوزانے ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بات ہو کہ اگر ہمیں کچھ ہوگیا تو میرے بھائی کی بیوہ ہونے کے ناتے وہ ہماری جائداد پر اپنا حق جتا سکتی ہے۔

میں بستر سے اٹھا، اپنا ڈریسنگ گاؤن پہنا اور کچھ دیر خاموش کھڑا کان لگائے باہر کی آوازوں کو سنتا رہا پھر میں نے ایک چرچراہٹ سنی جیسے کوئی دروازے کا ہینڈل گھما رہا ہو۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کیے اور کمرے کے دروازے کے پیچھے چھپ گیا جو آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ میں نے ایک سائے کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا پھر وہ کمرے کے وسط میں کھڑا ہوگیا اور جیسے ہی وہ بستر کی جانب بڑھا تو الزبتھ کی آنکھ کھل گئی اور اسے دیکھتے ہی وہ حیرت زدہ انداز میں چلائی پھر خاموشی چھا گئی۔

میں نے بستر کے سرہانے لگی ہوئی لائٹ جلائی۔ الزبتھ تھوڑی سی گھبرائی ہوئی تھی۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ دل میں خوش ہورہی ہوگی گوکہ وہ ایک تربیت یافتہ اداکارہ تھی اور اس نے اپنا رول بہت اچھی طرح نبھایا تھا لیکن وہ ایسے مواقع پر ہمیشہ تناؤ کا شکار ہوجاتی تھی۔

لیکن میرے بھائی کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس نے اطمینان سے کہا۔ ”ترکیب کامیاب رہی۔ وہ کمرے سے باہر آگئی ہے اور اپنی موت کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ یہاں آجائے، ہمیں اسے اس کی منزل تک پہنچا دینا چاہیے۔“ اس نے کہا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ فرانسیسی وکیل برن تمہاری کہانی کو ہضم کرلے گا؟“

”بالکل۔“ میں نے کہا۔ ”وہ سمجھتا ہے کہ سوزانے انتہائی خطرناک عورت ہے بلکہ وہ تو اس پر تمہارے قتل کا شبہ بھی ظاہر کررہا ہے۔“

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”میں لافانی ہوں۔ ہمیں اپنا کام مکمل کرلینا چاہیے۔“

جیف ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ پہلی بار اسے بہت پریشانی ہوئی تھی جبکہ سوزانے اس کا تیسرا شکار تھی۔ وہ اپنی خوب صورتی اور مردانہ وجاہت کے سبب بڑی آسانی سے دولت مند اور تنہا عورتوں کو پھانس لیتا تھا اور جب وہ غائب ہوجاتا تو وہ عورتیں اسے مردہ تصور کرلیتیں اور وہی کرتیں جیسا کہ اس نے انہیں بتایا تھا کہ اگر اسے کچھ ہوجائے تو وہ لندن میں مقیم اس کے بھائی کے پاس چلی جائیں جو ان کا پوری طرح خیال رکھے گا۔ ہماری طرف سے ان عورتوں کو پناہ دینے میں ہچکچاہٹ کا اظہار محض مصنوعی ہوتا تھا تاکہ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ نظر آئے۔

وہ انہیں محتاط رہنے اور خاموش رہنے کی ہدایت بھی کرتا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ قرض خواہ اس کے معصوم بھائی کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ ایسے قرض خواہوں کا کوئی وجود نہ تھا کیونکہ ان عورتوں کی ساری رقم تو وہ خود سرمایہ کاری کے نام پر ہڑپ کرچکا تھا۔ یہ رقم بڑی ہوشیاری سے مجھے اور الزبتھ کو بھیج دی جاتی اور جیف ایسے طریقے جانتا تھا جن کے ذریعے رقم کی منتقلی کا سراغ نہ لگایا جاسکے۔ جیف یا جان ہر بار ایک نئی شناخت اور نئی جگہ کا انتخاب کرتا۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ فرانسیسی پولیس ان کیسز کو کسی ایک شخص سے جوڑتی۔ عورتوں کا انتخاب کرنے میں بھی خاصی احتیاط برتی جاتی اور اس معاملے میں میرا بھائی کافی مہارت رکھتا تھا۔ ہم ایک ٹیم کی طرح کام کرتے تھے اور وہ روپوش ہونے یا مردہ تصور کیے جانے کے بعد جعلی پاسپورٹ پر لندن آجاتا اور اپنی بیوہ کے آنے تک ہماری انیکسی میں روپوش رہتا۔

ہمارے پڑوسی نہیں جانتے تھے کہ ہم ایک دُہری زندگی گزار رہے ہیں اور جان کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مختلف نام اختیار کرلیتے ہیں۔ نہ ہی کسی کو ہمارے گھر میں تہ خانے کی موجودگی کا علم تھا۔ اسی جگہ پر سوزانے کے ڈرامے کا آخری ایکٹ ہونا تھا۔ الزبتھ نے سونے سے پہلے شراب پیش کی تو وہ اس کا دوستانہ رویہ دیکھ کر حیران رہ گئی اور اس نے بہ خوشی گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ شراب میں شامل دوا نے تیزی سے اپنا اثر دکھایا۔ وہ کوئی بہت زیادہ طاقتور دوا نہیں تھی جس سے اسے کوئی نقصان پہنچتا، البتہ وہ تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش ضرور ہوجاتی تاکہ ہماری کارروائی کے دوران میں غیر ضروری شور شرابا نہ کرسکے۔

میرے بھائی نے تمام انتظامات مکمل کرلیے تھے۔

بیوی اور ایک گرل فرینڈ میں معمولی سا فرق ہوتا ہے..... وزن میں چالیس پاؤنڈ!

میں، سوزانے کو لے کر تہ خانے میں آیا اور تہ خانے کے عقبی دروازے پر لگا ہوا پردہ اٹھا دیا۔ میرے بھائی نے وہ خفیہ دروازہ کھولا جس کے ذریعے ایک اور ٹائل لگے ہوئے کمرے میں جاسکتے تھے۔ ٹائلوں کی وجہ سے اس کمرے کو صاف کرنا اور تیزاب کے اثرات سے محفوظ رکھنا آسان تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بھائی بالکل بھی پریشان نہیں تھا جبکہ میں خاصا ذود رنج واقع ہوا ہوں کہ سوزانے کو بھی دوسری عورتوں کی طرح اس کمرے میں جانا ہے اور بعد میں اس کا کوئی نام و نشان نہیں ملے گا۔

ٹینک میں تیزاب پہلے سے موجود تھا اور ماسک کے بغیر اس کی تیز بو ہمارے پھیپھڑوں کو گلا سکتی تھی۔ سوزانے دونوں بازو پھیلائے میرے سامنے فرش پر لیٹی ہوئی تھی، جان اپنا کام ختم کرلیتا تو ہم سوزانے کو ٹینک میں ڈال دیتے اور دو دن بعد اس کی باقیات کا بھی پتا نہ چلتا۔ پھر ہم اس کی تمام چیزوں کو جلا کر ضائع کردیتے اور ایک ہفتے بعد میں اور الزبتھ فرانس جاکر جیف کا مکان خالی کرکے اس کے تمام معاملات نمٹا دیتے۔ اگر اس کا وکیل سوزانے کے بارے میں پوچھتا تو ہم یہی کہتے کہ وہ دو راتیں قیام کرنے کے بعد کہیں چلی گئی تھی اور اس نے ہمیں اپنے نئے پتے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

میں نے اوپر کی منزل پر ایک زوردار آواز سنی لیکن کوئی توجہ نہیں دی۔ ممکن ہے کہ الزبتھ نے کوئی چیز اپنی جگہ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہٹائی ہو۔ اس نے کبھی بھی یہ آخری منظر دیکھنا پسند نہیں کیا اور اس کے لیے میں اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ اچانک ہی میں نے کسی کے کراہنے کی آواز سنی۔ میری نظر فرش پر لیٹی ہوئی عورت پر گئی جو اپنے بازو کو زور زور سے جھٹک رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر گھبرا گیا کیونکہ یہ ہمارے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔

"یہ ہوش میں آرہی ہے۔" میں نے کہا۔ "شاید الزبتھ نے دوا کی مقدار کم رکھی تھی۔"

"گرجھا کہاں ہے؟"

"وہ تو اوپر ہی رہ گیا۔"

جان نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں اسے ناکام بنانا چاہ رہا ہوں۔ وہ غصے سے بولا۔

"جلدی سے لے کر آؤ۔"

میں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس کے بعد کی ذمے داری جان کی تھی کیونکہ اس کھیل میں شامل ہونے کے باوجود میں نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا تھا جبکہ میرا بھائی اس کام کا ماہر تھا۔ جان نے آہستہ سے اس کے جسم کو اپنے پیروں سے چھوا اور میں نے دیکھا کہ سوزانے نے اپنی انگلیاں اس طرح بھینچ لیں جیسے کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کررہی ہو۔ میں جانتا تھا کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اس لیے تیزی سے تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آگیا۔

میرا خیال تھا کہ الزبتھ ہال میں انتظار کررہی ہوگی کیونکہ وہ کھیل ختم ہونے تک بے چین رہتی تھی لیکن جب میں نے تہ خانے کا دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہال تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے الزبتھ کا نام لے کر پکارا لیکن کوئی جواب نہیں آیا البتہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی اوپر موجود ہے جو درازیں کھول کر ان میں رکھی ہوئی چیزیں باہر پھینک رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ شاید یہ الزبتھ ہے جو سوزانے کے سامان کی تلاشی لے رہی ہے اس لیے مجھے کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔

پھر میں نے بیرونی دروازے پر زوردار دستک کی آواز سنی اور میرے ذہن میں پڑوسی کے جملے گونجنے لگے جو اس نے علاقے میں ہونے والی چوریوں کے بارے میں کہے تھے۔ ممکن ہے کہ کوئی چور گھر میں گھس آیا ہو اور ہماری چیزوں کی تلاشی لے رہا ہو۔ دروازے پر لگنے والی ضرب کی آواز مسلسل آرہی تھی اور مجھے اسے روکنا تھا کیونکہ اس وقت ہم کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ اوپر سے آنے والی آوازوں کا شور تھم چکا تھا اور مجھے لگا کہ کوئی سیڑھیوں کی جانب آرہا ہے گو کہ اندھیرے کی وجہ سے یہ نہیں دیکھ سکا کہ وہ کون تھا۔ میں نے ایک بار پھر الزبتھ کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ لہٰذا میں نے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھایا اور اوپر کی طرف دیکھنے لگا۔ اسی وقت کسی نے ٹارچ روشن کی اور اس کا رخ اوپر کی جانب کردیا۔ چور ہمارے بیڈروم کے دروازے کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس پہنے ہوئے تھا اور اس نے اپنے چہرے کو نقاب سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے اندر آنے کے لیے بڑے غلط وقت کا انتخاب کیا تھا۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہونے لگی جسے سن کر میں پریشان ہوگیا۔ چور میری نظروں کے سامنے تھا پھر دروازہ پیٹنے والا کون ہے؟ مجھے فوراً ہی اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ جب رات کے سناٹے میں ایک مردانہ آواز فضا میں گونجی۔ "پولیس... دروازہ کھولو۔"

میں نے پیچھے مڑ کر تہ خانے کے دروازے کی جانب دیکھا۔ یہ توقع نہیں تھی کہ شور و غل سن کر جان اوپر آجائے گا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا جان، سوزانے کو مارنے کے لیے اس کا گلا گھونٹ سکتا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اس معاملے میں بے حد محتاط ہے اور کوئی ایسی غلطی نہیں کرے گا جس کی بدولت قانون کے ہاتھ اس تک پہنچ سکیں لیکن غیر معمولی حالات میں غیر معمولی فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ نازک صورتِ حال نہیں ہوسکتی تھی کہ ایک طرف چور ہماری سیڑھیوں پر کھڑا ہو اور دوسری جانب پولیس ہمارے دروازے پر دستک دے رہی ہو۔

چور اب سیڑھیاں اترتے ہوئے کسی روبوٹ کی طرح میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میری آنکھوں پر ڈالی۔ میں گھبرا کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا اور عین اسی وقت میں نے اپنے سر کے عقبی حصے پر ضرب محسوس کی اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

"جب پولیس دروازہ توڑ کر اندر آئی تو چور کا کہیں پتا نہیں تھا۔ یقیناً وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ البتہ اس نے تھوڑی بہت تباہی ضرور مچائی لیکن تمہاری بیوی کا کہنا ہے کہ وہ کچھ نہیں لے جاسکا۔ یقیناً تمہیں یہ سن کر حیرت ہوئی ہوگی کیونکہ تمہارے سر پر لگنے والی چوٹ کافی شدید ہے لیکن اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوسکتی تھی۔ شکر کرو کہ اندھیرے کی وجہ سے اس کا وار اوچھا پڑا اور تمہاری بچت ہوگئی۔ بہرحال، اب تم خطرے سے باہر ہو اور تمہیں بہت جلد اسپتال سے فارغ کردیا جائے گا۔" سراغ رساں سارجنٹ بیلی نے معذرت خواہانہ اور قدرے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ وہ تیس بتیس سال کی خاصی پُرکشش عورت تھی اور اگر وہ اپنا تعارف نہ کرواتی تو میں اسے کوئی ایکٹریس یا ماڈل سمجھتا۔ پولیس میں ایسی عورتوں کو بھرتی کرنے کا مقصد یہی ہوسکتا ہے کہ وہ ملزمان سے نرمی اور پیار کے ساتھ تفتیش کرسکیں۔

میں نے جواب میں خاموشی اختیار کیے رکھی۔ البتہ یہ اطمینان ہوگیا کہ الزبتھ خیریت سے تھی اور پولیس تہ خانے کے قریب نہیں گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ میرا بھائی جان اپنے شکار کے ساتھ محفوظ تھا۔ اگر پولیس تہ خانے تک پہنچ جاتی تو سارجنٹ بیلی اس طرح میرے پاس اسپتال میں بیٹھ کر ہمدردی اور خیرخواہی کے جذبات کا اظہار نہ کررہی ہوتی۔

"تمہاری بیوی دوسرے کمرے میں ہے۔" سارجنٹ نے مجھے بتایا۔ "شاید اسے ایک رات کے لیے اسپتال میں رہنا پڑے۔ اس نے بڑی مقدار میں کوئی خواب آور دوا لے لی تھی اس لیے بہکی بہکی باتیں کررہی ہے لیکن ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ وہ صبح تک ٹھیک ہوجائے گی۔ ہم اس کیس کو ترجیحی بنیاد پر دیکھ رہے ہیں۔ اگر وہ چور ہاتھ نہ آیا تو کل کسی اور گھر میں بھی اس نوعیت کی واردات ہوسکتی ہے۔ فارنسک ٹیم کو تاحال کوئی سراغ نہیں ملا لیکن تمہاری بیوی کا کہنا ہے کہ چور نے جراحی کے دوران استعمال ہونے والے دستانے پہن رکھے تھے اس لیے ہمیں بہت زیادہ امید نہیں لیکن تم فکر مت کرو۔ ہم اسے پکڑنے کی پوری کوشش کررہے ہیں۔"

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ سارجنٹ نے کہا۔ "شاید تمہاری بیوی آگئی۔ میں کچھ دیر کے لیے تم دونوں کو تنہا چھوڑ دیتی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے اٹھی تو اس کے خوب صورت دانتوں کی چمک دیکھ کر مجھے ٹی وی پر چلنے والے اشتہار یاد آگئے۔ اگر وہ ان اشتہاروں کے لیے ماڈلنگ کرنے لگے تو لاکھوں کما سکتی ہے۔ کمال ہے، حسین عورت سامنے ہو تو اسے دیکھ کر آدمی پریشانی کے عالم میں بھی اس کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ ایسی ہی کچھ کیفیت میری حالت تھی لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اصل پریشانی تو اب شروع ہونے والی ہے۔

وہ باہر جانے سے قبل کمرے کا دروازہ پکڑے کھڑی رہی تاکہ وارڈ بوائے الزبتھ کی وہیل چیئر لے کر اندر آسکے۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ لہٰذا فوری طور پر اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ البتہ اسے اندر آتا دیکھ کر میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش ضرور کی کیونکہ ہمیں بہت ساری باتیں کرنا تھیں لیکن جب وارڈ بوائے نے وہیل چیئر میری طرف گھمائی تو میں اس عورت کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بالکل ٹھیک لگ رہی تھی۔ وارڈ بوائے کے باہر جانے تک اس نے اپنی نگاہیں میرے چہرے پر جمائے رکھیں۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور مجھے کچھ کہنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

مجھ سے پہلے سوزانے بول پڑی۔ "مجھے دیکھ کر تمہیں یقیناً حیرت ہورہی ہوگی۔" وہ اپنی وہیل چیئر میرے بستر کے بالکل قریب لے آئی لیکن میں کچھ نہیں بولا۔

میرے ذہن میں بہت سے سوالات گھوم رہے تھے اور سوزانے کو اپنے سامنے زندہ سلامت دیکھ کر میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوگیا تھا پھر بھی میں نے ہمت کرکے پوچھ ہی لیا۔ "الزبتھ کہاں ہے؟"

سوزانے کے چہرے پر ایک عجیب سی پُراسرار مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولی۔ "اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"اور جان... میرا مطلب ہے جیف؟"

وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا۔" اس کے چہرے پر وہی پُراسرار مسکراہٹ موجود تھی۔ اس نے اپنے لہجے کو گمبھیر بناتے ہوئے کہا۔ "وہ اور الزبتھ... ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں ایک ساتھ ہی تالاب میں غسل کررہے تھے۔"

میرے پورے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ یوں لگا جیسے دل کی حرکت بند ہوجائے گی اگر اس کا مطلب وہی تھا جو میں سمجھا تھا تو... اس سے آگے سوچنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ میں نے انتہائی کرب کے عالم میں پوچھا۔ "مگر کیسے؟"

"میں نے تم پر یہی ظاہر کیا کہ میں تنہا ہوں اور یہ نہیں بتایا کہ اپنے ایک سابق دوست سے بھی رابطے میں ہوں۔ فرینک حال ہی میں جیل سے رہا ہوکر آیا ہے اور میں نے اس سے جیف کے مرنے کے بعد رابطہ کیا تھا۔ اسے مسلح ڈکیتی کے الزام میں دس سال کی سزا ہوئی تھی اور اسے کسی نیک مقصد کے حصول کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کرنے پر کوئی شرمندگی نہیں ہوتی۔ میں خریداری کا بہانہ کرکے اسی سے ملنے گئی تھی اور وہ تمہیں سبق سکھانے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ تم اس سے مل چکے ہو کیونکہ وہی چور کا روپ دھار کر تمہارے گھر میں داخل ہوا تھا لیکن شاید دوبارہ دیکھ کر نہ پہچان سکو گے۔ تم لوگوں نے مجھے اپنے بھائی کی بیوی ماننے سے انکار کردیا لیکن میں خالی ہاتھ جانے کے لیے نہیں آئی تھی۔ اس لیے میں نے فرینک کے ساتھ مل کر ڈکیتی کا منصوبہ بنایا۔ ہمارا پروگرام تھا کہ تمہارے گھر سے سب کچھ لوٹ کر فرار ہوجائیں گے لیکن فرینک کو آنے میں دیر ہوگئی اور اس سے پہلے تم لوگ مجھے تہ خانے میں لے گئے۔ اگر جیف سستی کا مظاہرہ نہ کرتا تو میں دوسری دنیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں پہنچ چکی ہوتی اور فرینک ناکام ہو کر واپس لوٹ جاتا۔ جیف ہمیشہ کی طرح نشے کی حالت میں تھا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ الزبتھ نے شراب میں خواب آور دوا کی مقدار کم رکھی اور میں وقت سے پہلے ہوش میں آگئی۔ جونہی جیف مجھ پر جھکا، میں نے پوری طاقت سے اسے دھکا دیا اور اس کا سر فرش سے جا ٹکرایا۔ ادھر فرینک کا سامنا تم سے ہو گیا اور اس نے تمہارے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کر دیا پھر اس نے الزبتھ کو قابو کیا اور اسے گھسیٹتا ہوا تہ خانے تک لے آیا۔ اس کے بعد میں نے بیرونی دروازہ کھول کر پولیس کو اندر آنے دیا۔"

"تم نے پولیس کو اندر بلایا تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، میں چاہتی تھی کہ سب کچھ معمول کے مطابق نظر آئے۔ ہم نے تہ خانے کو جانے والے دروازے پر پڑا ہوا پردہ برابر کیا کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ان دونوں کی رخصتی سے پہلے کوئی وہاں جائے۔"

"تم نے میرے بارے میں پولیس کو کیا بتایا؟"

"ہمارا خیال تھا کہ تمہیں اپنا محبوب شوہر ظاہر کرنا بہتر ہوگا جو ایک چور کے ہاتھوں زخمی ہو گیا۔ میں نے خود اسے باغ کے راستے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ پولیس والوں نے میری بات پر یقین کرتے ہوئے مکان کی تلاشی لینے کی زحمت بھی نہیں کی۔"

"اب تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں چاہتی ہوں کہ جیف نے مجھ سے جو رقم لی تھی، وہ تم مجھے واپس کر دو اور اس کے علاوہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ بھی مجھے ملنا چاہیے کیونکہ یہی میری زبان بند رکھنے کی قیمت ہے۔ ویسے بھی تم مجھے پسند آ گئے ہو۔ میں چاہوں گی کہ ساری عمر ایک زر خرید غلام کی طرح میرے وفادار اور اطاعت گزار شوہر بن کر رہو اور اگر تم نے پولیس کو کچھ بتانے کے بارے میں سوچا تو مجھے یقین ہے کہ وہ تہ خانے میں واقع تالاب کے بارے میں ضرور جاننا چاہیں گے اور ان جعلی پاسپورٹوں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکیں گے جو جیف نے ایکسی میں رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی فرینک نے کچھ کاغذات دیکھے ہیں جن سے تم دونوں بھائیوں کی جعلسازی ظاہر ہوتی ہے اور اگر تم نے میرے لیے کوئی مشکل پیدا کرنے کی کوشش کی تو..."

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ میں نے پوری طرح صورتِ حال واضح کر دی ہے۔"

"ہاں، بالکل آئینے کی طرح۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

☆☆☆

سراغ رساں سارجنٹ بیلی نے میری طرف دیکھ کر ٹیپ ریکارڈر آف کرتے ہوئے بولی۔ "تم نے ان سب باتوں کا اعتراف کیوں کیا جبکہ ہم صرف اس چوری والے معاملے کو دیکھ رہے تھے اور ہمیں ان جرائم کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا جو جان نے تمہاری اور الزبتھ کی مدد سے کیے تھے۔"

میں نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ پہلے سوچا کہ اس کے کسی سوال کا جواب نہ دوں۔ سوزا نے اپنے اعترافی بیان میں سب کچھ بتا دیا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں اپنے فیصلے پر قائم نہ رہ سکا اور گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "سوزا نے سے مستقل طور پر چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اپنے جرائم کا اعتراف کر لوں۔ اس نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر میرے بھائی اور بیوی کو تیزاب کے تالاب میں دھکیل دیا۔ گویا ہم نے جو گڑھا اس کے لیے کھودا تھا، اس میں خود ہی گر گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے مقابلے میں میرا جرم بہت معمولی ہے۔ میں نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا، کوئی جعلسازی یا بے ایمانی نہیں کی البتہ جیف کے جرائم میں اس کی معاونت کرتا رہا جس کی مجھے بہت کم سزا ملے گی لیکن خاموش رہنے کی صورت میں سوزا نے ساری عمر کے لیے میرے سر پر مسلط ہو جاتی۔ وہ جب سے میرے گھر میں آئی ہے، سب کچھ بدل کر رہ گیا ہے۔ وہ مجھ سے نوکروں جیسا سلوک کرتی ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ اس نے مجھے قابو کر رکھا ہے پھر اس کا وہ خوفناک سابق دوست ہے جس سے وہ مجھے آئے دن ڈراتی رہتی ہے اور بار بار یہی دھمکی دیتی ہے کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو فرینک مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔ عام حالات میں شاید اسے اپنے گناہوں کی سزا یا قدرت کا عذاب سمجھ کر برداشت کر لیتا لیکن فرینک کا نام سننا بھی مجھے گوارا نہیں لیکن میں صرف اس وجہ سے یہ اعتراف کرنے پر مجبور نہیں ہوا بلکہ..."

سراغ رساں سارجنٹ بیلی میری طرف جھکی اور بولی۔ "لیکن کیا؟"

"بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اپنی زندگی اور اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہوگی۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنا سر کرسی کی پشت سے لگا لیا۔ یہ اعتراف کرنے کے بعد میرے ذہن اور ضمیر پر سے بوجھ ہٹ گیا اور اب میں ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار تھا۔

شعبدہ گر

امجد رئیس

وقت کا ایک ستم یہ بھی ہے کہ دوست بھی کبھی حریف بن جاتے ہیں۔ دوستی جیسے بندھن کو توڑنے والے سبھی دور ہو جانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی تقدیر کی ستم ظریفی انہیں ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کر دیتی ہے۔ ان کے درمیان بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ وقت کے پل کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا مگر تلخ یادیں اور شاید انتقام... دونوں تر و تازہ تھے۔

گزرے وقت کے خساروں کا حساب، خراج کے ساتھ وصول کرنے کے متمنی کا قصہ...

اطلاعی گھنٹی کی کرخت آواز نے کارل منڈن کو بیدار کر دیا۔ پسینے سے بھیگے بستر پر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر سیدھا بیٹھ گیا۔ ہتھیلی کا چھجا بنا کر اس نے سورج کی روشنی سے آنکھوں کو بچایا... روشنی کھڑکی کے شیشوں سے آ رہی تھی۔ وہ چند ساعت عمودی حالت میں بیٹھا رہا پھر گھڑی کی طرف نگاہ کی... تین بج کر دس منٹ۔

وہ بستر سے اٹھ کر ڈریسنگ تک آیا اور گھڑی کے عقب سے کنگھا اٹھا کر اپنے باریک ہوتے ہوئے بالوں میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

..... پھیرنے لگا۔ پتلا گاؤن اٹھا کر شانوں پر ڈالا اور آہستگی سے مڑا۔ وہ ہچکچاہٹ کے ساتھ چلتا ہوا بوسیدہ اپارٹمنٹ کے لیونگ روم میں آیا۔

اطلاعی گھنٹی، پھر چیخی۔

کارل کا ہاتھ دھیرے سے دروازے کے بولٹ پر گیا۔ اسی دوران میں کچھ پرانی یادیں اس کے ذہن میں در آئیں۔ جن کو اس نے فوراً جھٹک دیا۔

اسے مڈل ٹن کا خیال آیا... لیکن وہ ہوتا تو فون کرتا تو کیا یہ عمارت کا مالک ہے؟ کارل اسے کہہ چکا تھا کہ چند روز میں وہ کرایہ ادا کردے گا۔

تو پھر کون ہوسکتا ہے۔ یادداشت نے پھر سر اُبھارا۔ کیا یہ بیریٹ ہے؟ بیریٹ سے متعلق اذیت ناک یاد کو کھرچنے کی کوشش کرتے ہوئے کارل نے لرزتے ہاتھ سے دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا۔ یادیں یلغار کررہی تھیں... جو بیریٹ، سنہری بُدھا اور اس عورت کے جسم سے متعلق تھیں جو کب کا بحرالکاہل میں تہ نشین ہوچکا تھا۔

نہیں یہ بیریٹ نہیں ہوسکتا۔ اسے تو ہونولولو میں ہونا چاہیے۔ کارل کی پیشانی پر نمی تھی۔ اس نے محتاط انداز میں دروازہ کھول دیا۔

وہ بیریٹ تھا۔

کارل کی ریڑھ کی ہڈی سنسنانے لگی۔ اس نے جُھرجُھری لی۔ جسم پسٹل کی گولیاں وصول کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ لیکن کوئی بھی خوفناک واقعہ رونما نہیں ہوا۔ عجیب حیرت انگیز صورتِ حال تھی۔ بیریٹ دہلیز پر کھڑا شائستگی سے مسکرا رہا تھا۔ اس کے چھ فٹ ایک انچ دراز قامت پر بیش قیمت سوٹ جچ رہا تھا۔ پہلو کے ساتھ بازو کے نیچے ایک دھاتی بکس دبا ہوا تھا۔

''اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے؟'' وہ بولا۔

کارل بُری طرح اُلجھ گیا۔ یہ سب کچھ اس کی توقعات کے برخلاف تھا۔ تاہم اس نے جلدی سے قدم پیچھے ہٹائے۔

''ہاں، ہاں... کیوں نہیں۔ کافی وقت بیت گیا، بیریٹ۔''

''اتنا بھی نہیں۔'' بیریٹ نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ''بس، ایک سال۔''

بیریٹ نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کارل نے گاؤن مضبوطی سے جسم کے گرد لپیٹا اور خود کو کوسنے لگا۔ کمرے کا حال ابتر تھا... بوسیدہ فرنیچر۔ گندہ فرش اور آلودہ ایش ٹریز...

کارل نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ''مم... مجھے تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی... تم اچھے لگ رہے ہو۔''

''شکریہ۔'' بیریٹ نے جواب دیا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ کارل نے ہاتھ ملایا پھر جلدی سے بیریٹ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اب تک خود کو سنبھال نہیں پایا تھا۔ دوسرے ہاتھ ملاتے وقت بازو تک اس کا ہاتھ جھنجھناتا تھا۔

بیریٹ نے قہقہہ لگایا اور ہتھیلی دکھائی جس پر ایک ننھا سا گجیٹ (gadedt) رکھا تھا۔

''تم ڈر گئے؟'' وہ بولا۔

کارل سرخ ہوگیا... ''تمہاری بچوں والی حرکتیں کبھی نہیں جائیں گی۔'' اس نے شکایتاً کہا۔ ''ڈرنک لو گے؟''

''یقیناً پرانے وقت کی یاد میں۔''

دیوار کے ساتھ ایک کیبنٹ ایستادہ تھا۔ کارل نے اسے کھول کر کئی بوتلیں برآمد کیں۔ ہر بوتل خالی تھی۔

''کیا آج کل تم نے بلانوشی شروع کردی ہے؟'' بیریٹ نے سوال کیا۔ کارل نے اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔

''خواب گاہ میں ایک بوتل ہے، میں لاتا ہوں۔''

کارل خواب گاہ میں آیا۔ احتیاط سے ڈریسر کی دراز باہر نکالی اور اعشاریہ تین دو بور کا ریوالور نکال کر گاؤن کی جیب میں منتقل کیا۔ اس کے اوپر، جیب میں ایک رومال ٹھونس لیا۔ فوراً ہی سخت تناؤ کی جگہ طمانیت نے لے لی۔

وہ بوتل اٹھا کر واپس لیونگ روم میں آگیا۔ ''تم کب سے اس علاقے میں ہو؟'' اس نے پیمانہ بھرتے ہوئے سوال کیا۔

''تین ہفتے قبل... میں چند دوستوں کے ساتھ اسٹائمن کلفس کے نزدیک ٹھہرا ہوا تھا۔ اچھی جگہ ہے۔ میں روزانہ پہاڑی نما چٹانوں کی سیر کو جاتا تھا جہاں بحرالکاہل کا پانی ٹکراتا ہے۔''

''تم مجھ تک کیسے پہنچے؟'' کارل نے گلاس اٹھایا۔ بیریٹ نے دانت نکالے۔ ''ملڈرڈ نے بتایا تھا... تم کہو گے کہ میں تمہیں ختم کرنے آیا ہوں... کیوں؟''

کارل کے چہرے پر سفیدی غالب آنے لگی۔ اس نے گلاس نیچے رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ گاؤن کی جیب کی طرف جانے لگا۔

بیریٹ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''مجھے تم کو ختم کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آئی۔ حالانکہ سال بھر پہلے جب ہونولولو میں تم نے اپنا اسٹور مجھے فروخت کیا تھا۔ تو معاہدے کے تحت میں نے 5000 ڈالرز دیے تھے۔ باقی 5000 ڈالرز مجھے ایک سال میں ادا کرنے تھے۔

''بہرحال جب تم وہاں سے رخصت ہوئے تو رقم کے ساتھ تم میری بیوی کو بھی لے کر چل دیے۔''

''میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔'' کارل نے وضاحت کی۔ ''مجھے بعدازاں شپ پر معلوم ہوا کہ وہ میرے پیچھے چلی آئی تھی۔ جب اچانک جائے پر میری اس سے مڈبھیڑ ہوئی تو میں نے اسے سمجھایا کہ وہ ایک بھیانک غلطی کی مرتکب ہورہی ہے۔ اسے واپس چلے جانا چاہیے۔ میں اس غلط فہمی میں رہا کہ وہ میری بات سمجھ گئی ہے۔ کیونکہ وہ اچانک ہی غائب ہوگئی تھی۔'' کارل نے پھر گلاس اٹھایا۔ ''بعدازاں شپ لاگ سے معلوم ہوا کہ اس نے سمندر میں کود کے خودکشی کرلی تھی۔''

''جھوٹ۔'' بیریٹ نے کارل کی کہانی مسترد کردی۔ ''تم نے اسے مارا تھا۔ جیسے مجھے تم کو ماردینا چاہیے۔''

''یہ خودکشی تھی۔'' کارل نے کہا۔ ''اور تم نے اسے اس حال کو پہنچایا تھا کہ وہ اپنی زندگی ختم کرلے۔ وہ تمہارے توہین آمیز عملی مذاق کی عادت سے پریشان تھی... تم ہمیشہ اسے اور اس کی ہمسایوں کو ندامت سے دوچار کرتے تھے۔ تم سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ کسی کے ساتھ بھی جاسکتی تھی۔''

بیریٹ نے شانے اچکائے۔ ''زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ماضی میں اُلجھنے سے ہم دونوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ میں یہاں تمہاری بقیہ رقم کی ادائیگی کے لیے آیا ہوں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تمہارے اوپر جو 5000 ڈالرز واجب الادا ہیں تم وہ مجھے دینے آئے ہو؟''

''میں دیگر معاملات میں اُلجھ کر اسٹور پر توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اور فیل ہوگیا۔ ایک ہی قابلِ قدر چیز باقی رہ گئی تھی۔ جسے تم نے کئی بار مجھ سے حاصل کرنے کی کوشش کی اور یہ 5000 ڈالرز سے زیادہ قیمتی ہے۔'' بیریٹ نے باکس کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ ازخود تمہارے پاس آگیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ''گولڈن بُدھا؟''

''میرے جانے کے بعد تم اسے کھول کر دیکھ لینا۔''

''گولڈن بُدھا؟'' کارل کی آواز میں حرص کی جھلک نمایاں تھی۔ یہ قیمتی مجسمہ اس کی زندگی پھر سے بدل سکتا تھا۔ تاہم وہ بیریٹ کے رویے پر حیران تھا۔ اس کی ابتر حالت اور بُدھا کے مجسمے کے لالچ نے اس کے غوروفکر کی صلاحیت سلب کرلی تھی۔

''میں نہیں کہتا، اس میں کیا ہے۔'' بیریٹ نے جواب دیا۔ ''یہ تمہارے لیے ہے۔ تم خود دریافت کرو۔''

مزاج آشنا

موسم ابر آلود تھا۔ وہ اپنی جھگڑالو بیوی کی تدفین کے بعد لوگوں کے ساتھ قبرستان سے لوٹ رہا تھا کہ بوندا باندی شروع ہوگئی پھر بادل زور سے گرجے اور زبردست کڑاکے کے ساتھ بجلی چمکی۔

مغموم شوہر آسمان کی طرف سر اٹھا کر بڑبڑایا... ''پتا چل گیا... تو اوپر پہنچ گئی ہے۔''

ڈر

ڈاکٹروں نے عورت کو مردہ قرار دے دیا۔ گھر لاکر میت کو غسل دیا جارہا تھا تو عورت کے سانس لوٹ آئے۔ ہیجان کا عالم تھا۔ کوئی خوف زدہ تھا اور کوئی خوش!

بعد میں عورت نے اپنے شوہر کو بتایا کہ غسل کا پانی اتنا گرم تھا کہ اس کی نازک کھال جھلس گئی اور وہی تکلیف اس کی حیاتِ نو کا سبب بن گئی ورنہ تدفین کے بعد قبر میں سانس آتا تو وہ واقعی مرگئی ہوتی۔

چند برس بعد خاتون کا واقعی انتقال ہوگیا مگر اس کا شوہر خوف زدہ اور پریشان تھا۔

غسل کے وقت اس نے بے ساختہ غسال عورت سے کہا۔ ''بہن جی! نہلانے سے پہلے ہاتھ ڈال کر دیکھ لینا، پانی زیادہ گرم نہ ہو۔''

☆☆☆

میاں بیوی میں ذرا سی تُوتُو میں میں بڑھتے بڑھتے اچھے خاصے فساد میں تبدیل ہوگئی۔ دونوں سخت طیش میں آگئے۔ بیوی نے غصے سے کہا۔ ''میں روز کے اس جھگڑے سے تنگ آگئی ہوں... اب یہاں رہے میری جوتی... میں جارہی ہوں اپنے میکے۔''

شوہر نے برہم ہوکر کہا۔ ''خدا کے لیے میری جان چھوڑو۔''

بیوی جاتے جاتے ایک دم لوٹ آئی اور یکایک والہانہ لہجے میں بولی۔ ''ہائے... خدا کے لیے، میری جان چھوڑو۔ آپ مجھے میری جان کہہ کر خدا کا واسطہ دے رہے ہیں۔ آپ کے یہی الفاظ میرے پیروں کی زنجیر بن جاتے ہیں... چلیں، آپ کے کہنے سے میں نے چھوڑ دیا، بھلا دیا ساری کڑوی کسیلی باتوں کو۔ اب میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔''

(کورنگی سے حمیرا اقبال کی مسرت)

WWW.PAKSOCIETY.COM

"عجیب احمقانہ بات ہے۔" کارل نے چھوٹا سا باکس جھپٹ لیا اور اسے کھولنا شروع کیا۔

"رک جاؤ۔" بیریٹ چلّایا۔

ایک سیکنڈ کے لیے کارل مفلوج ہوگیا۔ اس نے باکس کو مشکوک انداز میں ایک طرف رکھ دیا اور بیریٹ کو دیکھا جو کھڑا ہو چکا تھا اور اس کا رخ دروازے کی جانب تھا۔

"کیا ہے، اس باکس میں؟" کارل نے ریوالور نکال لیا۔ "بتاؤ مجھے؟"

بیریٹ نے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھا۔ "تم مجھے گولی نہیں مار سکتے۔" اس نے سکون سے کہا۔ تمہارا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ تم نے گولی چلا بھی دی تو مجھے نہیں لگے گی۔ ویسے بھی تم اتنے دلیر نہیں ہو۔"

"لعنت ہے، بیریٹ! مجھے بتاؤ اس میں کیا ہے؟"

کارل نشانہ باندھتا ہی رہ گیا اور بیریٹ دروازہ کھول کر باہر غائب ہوگیا۔ کارل کا گن والا ہاتھ نیچے گر گیا۔ آہستگی سے اس نے سر موڑا۔ اس کی مشکوک نظریں بیریٹ کے چھوڑے ہوئے باکس پر جم گئیں۔

اگر وہ بیریٹ سے اچھی طرح واقف نہ ہوتا تو باکس کھول چکا ہوتا۔ بیریٹ ایک مکار اور شعبدہ باز آدمی تھا۔ اس سے کوئی بعید نہیں تھا کہ اس مرتبہ اس کا مذاق سنگین نوعیت کا ہو...

باکس میں بم بھی ہو سکتا تھا یا کوئی اور مہلک چیز جو کارل کے خاتمے کا باعث بن جاتی۔

وہ اتنا شریف نہیں تھا کہ لمبا سفر طے کر کے اپنے بدترین حریف کو "گولڈن بدھا" کا تحفہ دینے چلا آئے۔

کارل جتنا سوچتا، اس کا یقین اتنا ہی بڑھتا جاتا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

اس نے احتیاط سے چھوٹا لیکن وزنی باکس اٹھایا اور باتھ روم میں آگیا۔ نل کھول کر اس نے ٹب بھرنا شروع کیا۔ ٹب بھرنے پر وہ باکس کو تہ میں رکھ دیتا۔ اگر اس میں بم ہوا تو خطرے کا امکان معدوم ہو جائے گا اور اگر اس میں بدھا کا سنہرا مجسمہ ہوا تو معمولی پانی لگنے سے اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

پانی کی دھار تیزی سے ٹب کو بھر رہی تھی۔ اچانک ایک نیا خیال کارل کے ذہن میں آیا... اگر بیریٹ نے کوئی دوسری چال چلی ہے تو ممکن ہے کہ باکس گیلا ہوتے ہی دھماکا ہو جائے... شاید بیریٹ کو یقین تھا کہ کارل اتنی آسانی سے باکس نہیں کھولے گا... اس کے عملی مذاق عموماً چونکا دینے والے ہوتے تھے... اور یہاں تو صورتِ حال قطعی پیچیدہ تھی۔

کارل، باکس کو لے کر واپس لیونگ روم میں آگیا۔ وہ نل بند کرنا نہیں بھولا تھا۔ اسے بے بسی کا احساس ہوا۔ پھر اس کی نگاہ کھڑکی پر پڑی۔ کیوں نہ وہ اس مشکوک باکس سے جان چھڑا لے۔ اسے کھڑکی سے باہر اچھال دے۔

وہ کھڑکی کی طرف چل دیا۔ باکس کو اس نے دونوں ہاتھوں سے سنبھالا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کھڑکی سے باہر پہنچتے ہی فٹ پاتھ پر دھماکا ہوگا۔

اگر ایسا ہوا تو اس کے لیے خطرات پیدا ہو جائیں گے اور وہ پولیس کی تحقیقات میں پھنس جائے گا۔ اگر کوئی راہ گیر مارا گیا تو پھر کارل کی خیر نہیں... وہ کھڑکی کے قریب پہنچ کے تھم گیا۔

شدید ذہنی الجھن اور تناؤ سے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ ہو سکتا ہے یہ اس کے محض مفروضے ہوں... کارل نے سوچا لیکن اسے یقین کر لینا چاہیے۔ لیکن کیسے...؟

دفعتاً فون کی گھنٹی چیخی اور وہ اچھل پڑا۔ اس کا دل بری طرح دھڑکا تھا۔ اس نے احتیاط سے باکس نیچے رکھا اور ریسیور اٹھایا۔

"یس؟"

"تم ہو، کارل؟" بیریٹ کی آواز تھی۔

"ہاں، تم کہاں ہو؟"

"میں چند بلاک کے فاصلے پر ایک بار میں ہوں۔" وہ ہنسا پھر گویا ہوا۔ "تم نے ابھی تک باکس نہیں کھولا؟"

کارل کے کان کھڑے ہوئے۔ "نہیں، لیکن تمہیں کیونکر پتا چلا؟"

"وقت لو، جتنا لے سکتے ہو... سوچو، احتیاط سے سوچو... بلکہ ہر چیز کے بارے میں سوچو... ماضی کے بارے میں بھی..."

"کیا مطلب ہے؟ بیریٹ! تمہیں بتانا ہوگا... بیریٹ... بیریٹ..." لیکن فون بند ہو چکا تھا۔

قریبی بار بلیک کیٹ تھا۔ کارل نے جلدی سے فون ڈائریکٹری اٹھائی اور بار کا نمبر ڈھونڈا۔

"بلیک کیٹ، بارٹینڈر اسپیکنگ۔"

"یہاں ایک آدمی ہے، جس نے ابھی ابھی تمہارا فون استعمال کیا ہے وہ کہاں ہے؟" کارل نے پوچھا۔

"سوری، وہ تو فوراً ہی نکل گیا تھا۔"

"کیا تم اسے بلا سکتے ہو؟ یہ بہت اہم ہے۔" کارل نے استدعا کی۔

"دیکھو، مسٹر یہ میرا کام نہیں ہے۔ میں یہاں سے ہل نہیں سکتا۔" بارٹینڈر نے ٹکا سا جواب دیا۔

"کیا اس نے بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟" کارل نے نیا سوال کیا۔

"نوگی، مجھے کیوں بتائیں گے کہ وہ کیا کرتے پھر رہے ہیں؟" بارٹینڈر کی آواز میں بیزاری تھی۔

کارل نے ٹھنڈی سانس بھر کر فون بند کر دیا۔ کہاں گیا ہوگا وہ۔ کہاں... کہاں...؟ اسٹائنن کلفس کارل کو یاد آیا کہ اس نے بتایا تھا کہ وہ وہاں دوستوں کے ساتھ ٹھہرا ہے۔

کیا اس نے یہ اطلاع عمداً اسے فراہم کی تھی۔ شاید یہ بھی کوئی ٹریپ ہو؟ بیریٹ چاہتا ہو کہ کارل وہاں آئے اور وہ بآسانی اس کا قصہ پاک کر سکے۔ ڈبا نہ کھولنے کی صورت میں یقیناً یہ اس کا دوسرا پلان ہوگا، پلان بی۔

کارل ذہنی خلجان کا شکار ہو گیا۔ یقیناً وہ دھماکے کا انتظار کر رہا تھا... جب ہی اسے پتا چل گیا کہ میں نے اب تک ڈبا نہیں کھولا ہے۔

بالآخر، کارل نے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا۔ وہ وہاں جائے گا اور اسے مجبور کرے گا کہ وہ ڈبے کے بارے میں بتائے۔ اگر بات نہیں بنی تو وہ ڈبا سمندر برد کر دے گا۔ اس کام کے لیے وہ بہترین جگہ ہے۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد وہ اسٹائنن کلف پر تھا۔ اپنی نیلی کار وہ چٹانوں کے کنارے تک لے گیا۔ یہ ایک ویران جگہ تھی۔ چٹانوں کا طویل نشیب سمندر کی گہرائی میں روپوش ہو رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ تین سو گز دور ہائی وے پر کاریں دوڑ رہی تھیں۔ وہ یہاں تنہا تھا۔ اس نے سیٹ کے نیچے سے ڈبا سنبھال کر نکالا اور چٹانوں کے کنارے پر پہنچ کر نیچے جھانکا۔ دو سو فٹ نیچے دیوار تقریباً عمودی حالت میں سمندر تک چلی گئی تھی۔ بپھری ہوئی موجیں چٹانی سلسلے سے ٹکرا کر جھاگ اڑا رہی تھیں۔ خاصی گہرائی تھی۔

اس نے ڈبا سمندر میں اچھالا اور پیچھے کی جانب ہٹ گیا۔ حاتی ڈبا کے کئی جگہ ٹکرانے کی آواز آئی... تاہم کوئی دھماکا نہیں ہوا۔

کارل کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ واپس چٹانوں کی جانب گیا اور محتاط انداز میں نیچے جھانکا۔ اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں... ڈبا غائب تھا اور بدھا کا سنہرا مجسمہ ایک چٹانی لنگر پر اٹکا ہوا تھا۔ اس کا مجسمہ، اس کی دولت، اس کی اگلی زندگی... اس کا سب کچھ کہاں پھنسا ہوا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

تاہم جلد ہی وہ حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا۔ وہ شدید اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا۔ اسے اپنی حماقت اور بیریٹ کی مکاری پر غصہ آ رہا تھا۔ سنہرے بدھا کی چمک نے اسے اندھا کر دیا۔ وہ بلا سوچے سمجھے، لیکن احتیاط سے نیچے اترنے لگا۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ ڈھلوان پر نہیں بلکہ تقریباً عمودی ٹھوس دیوار پر ہے... جہاں لنگر اور رخنے بہت کم تھے۔ جلد ہی اس کی ہتھیلیوں نے پسینا اگلنا شروع کر دیا

وہ زیادہ نیچے نہیں اتر پایا تھا اور ایسی جگہ اٹک گیا تھا جہاں سے وہ اوپر جا سکتا تھا۔ نہ نیچے... اس پر دہشت طاری ہونے لگی۔

معاً اس نے کار کے انجن کی آواز سنی اور مدد کے لیے چلّانے لگا۔ ذرا دیر بعد چٹان کے کنارے پر ایک مضحکہ خیز چہرہ نمودار ہوا۔

وہ بیریٹ تھا۔

"میری مدد کرو، پلیز۔" کارل گڑگڑایا۔

"لیکن کیوں؟" بیریٹ کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"میں اعتراف کرتا ہوں۔" کارل بولا۔ "میں نے تمہاری بیوی کو سمندر میں پھینکا تھا۔ وہ تم سے محبت کرتی تھی اور پہلا موقع ملتے ہی، واپس جانے والی تھی... وہ عجیب عورت تھی... پلیز مجھے بچاؤ... گولڈن بدھا بھی تم رکھ لو۔"

بیریٹ سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے گھورتا رہا۔

"یہ مذاق ہے نا؟" کارل نے بے قراری سے کہا۔ "تمہارے دوسرے ڈراموں کی طرح یہ بھی ایک ڈراما ہے... تم نے ڈبے کے بارے میں میرے شبہات کو ابھارا۔ تم جانتے تھے کہ میں ڈبے سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ تمہارا مذاق پورا ہو گیا... واقعی یہ تمہارا سب سے بہترین ڈراما تھا۔" کارل نے آخر میں خوشامدانہ انداز اختیار کیا۔ "اب مجھے یہاں سے نکالو، میں گرنے والا ہوں۔" وہ چلّا اٹھا۔ "کچھ کرو۔"

"میں تو کر چکا ہوں۔" بیریٹ نے جواب دیا۔ "تم اسی پانی میں غرقاب ہونے والے ہو جہاں تم نے میری بیوی کو پہنچایا تھا۔"

"نہیں... نہیں... مت کرو ایسا۔" کارل رو پڑا۔

"آخری بات، مسٹر کارل... وہ مجسمہ اصلی نہیں ہے... ایک ارزاں لیکن خوب صورت نقل۔" بیریٹ چلا گیا۔

کارل کی گرفت کمزور پڑ رہی تھی۔ کمزور... مزید کمزور... اور... اور... پھر...

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسما قادری

قسط :53

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے - پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو - محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے ، یہ تو بس ہو جاتی ہے - دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے - زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے - بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے - جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

...خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر نگیں ضلع کے سب سے ...پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت ...آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو ...دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا ...جن کا نام ایوا ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر ...ہے۔ شہر یار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو ...یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہر یار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد مانگتی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہر یار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ ادھر ماریا کی ماں سنتھیا جوزف ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہریار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی گاڑی بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہریار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی۔ شہریار اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ شہریار انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیو یارک چلے جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی ہے۔ ادھر شہریار کے کہنے پر ذیشان سی الیف پی کے نوجوان کو خواجہ سرا کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔ جاوید علی نامی سی الیف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں میں شامل ہو کر کراچی نوازش علی نامی شخص کی کوٹھی میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں تمام ملازم خواجہ سرا تھے۔ وہاں جاوید علی کو پتا چلتا ہے کہ شاتلی کسی چکر میں ملوث ہے۔ ادھر جاوید علی شاز مین سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ نوازش علی کی کوٹھی پر آپریشن کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہاں موجود انتہا پسند کوٹھی کو بارودی مواد سے اڑا دیتے ہیں۔ جاوید علی شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے جبکہ نوازش علی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں البتہ شاز مین اور اس کی دونوں والدہ محفوظ رہتی ہیں۔ ادھر شہریار، ورما کے ٹھکانے پر پہنچ کر اسے قابو کرلیتا ہے۔ شاز مین دارالامان پہنچ جاتی ہے۔ وہ جاوید علی سے ملنے کے لیے اسپتال جاتی ہے۔ را والے شاز مین کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں اور اسپتال سے واپسی میں اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ سنتھیا، شاز مین سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کسی واضح صورت حال سے آگاہ نہ کرنے پر اس پر جنسی تشدد کا حربہ آزماتی ہے۔ بعد ازاں اس کو ایک مردہ سمجھ کر سنسان جگہ پھنکوا دیا جاتا ہے تاہم شاز مین بچ جاتی ہے اور اسپتال میں طبی امداد کے بعد اس کی حالت بہتر ہو جاتی ہے مگر شاز مین اچانک خودکشی کرلیتی ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر بلاتا ہے۔ وہاں اچانک واپسی پر اس کا کشور سے سامنا ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے مگر مراد شاہ، کشور کو چودھری سے بچاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں اور انہیں مارنے کی نیت سے آنے والے لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ شہریار کو بھارت ایک اہم مشن پر بھیجنے کا فیصلہ ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر فرحان نامی شخص کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ سلو کو سی الیف پی والے جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ سلو کو شہریار کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ اسمگلروں کے ایک قافلے کے ساتھ غیر قانونی سرحد عبور کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ سلو اور شہریار دہلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ان کے مددگاران کے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے ہیں۔ انہیں اب اپنی دستاویزات بنوانی تھیں۔ جاوید علی، رائے چند نامی ہندو کے خلاف کارروائی کرتا ہے جو مینہ را کا ایجنٹ ہوتا ہے۔ ادھر سلو اور شہریار ایک ہوٹل میں کھانا کھانے جاتے ہیں۔ وہاں ایک لڑکی کی عزت بچانے میں ان کا جھگڑا اندر نامی بدمعاش سے ہو جاتا ہے۔ وہ وہاں سے نکل کر اپنے مددگاروں کے ذریعے ایک سرائے میں ٹھہر جاتے ہیں۔ جاوید علی، رائے چند سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ایک مساج سینٹر میں پہنچتا ہے۔ وہاں اسے عالیہ نامی عورت ملتی ہے جو مبینہ را کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ جاوید علی کے ساتھی وہاں آپریشن کرتے ہیں اور اس عورت کو اٹھا لاتے ہیں۔ ادھر سلو اور شہریار کو گرفتار کر لیا جاتا ہے اور انہیں را کے ایک ٹھکانے پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ تاہم جب پوچھ گچھ کا وقت آتا ہے تو سلو اور شہریار اندو اور اس کے اہلکاروں پر قابو پا لیتے ہیں اور انہیں مار کر وہاں سے نکلتے ہیں۔ وہاں متعدد افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ را کے ٹھکانے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ پھر شہریار اور سلو پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالتے ہیں اور اسے اغوا کر لیتے ہیں لیکن ان کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے اور انہیں پریم ناتھ کو گاڑی میں چھوڑنا پڑ جاتا ہے۔ ادھر ماہ بانو چیک اپ کے لیے اسپتال جاتی ہے مگر واپس گھر نہیں پہنچتی۔ اسلم اپنے طور پر ماہ بانو کی تلاش کا کام کرتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ ماہ بانو اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ گئی ہے۔ ادھر شہریار، سلو کو بھائی جی کے آدمی گھیر لیتے ہیں تاہم عبدل سے واقفیت کی بنا پر انہیں رعایت دی جاتی ہے اور انہیں بھائی جی کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ بھائی جی ان کی مدد کرنے کا وعدہ کرتا ہے تاہم وہ چاہتا ہے کہ وہ لوگ اشوک کو قتل کر دیں۔ اسلم، ماہ بانو کا سراغ لگاتے لگاتے اس بات کا پتا لگا لیتا ہے کہ ماہ بانو کو جنگل میں کہیں رکھا گیا ہے۔ وہ جنگل میں نکل پڑتا ہے۔ ادھر شہریار اور سلو ڈاکٹر فرحان کو را کے شکنجے سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تاہم انہیں عارضی طور پر عائشہ نامی عورت کے گھر پناہ لینی پڑتی ہے۔ ادھر اسلم، ماہ بانو کو قید کرنے والوں کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ بھی ماہ بانو کے ساتھ قید کر لیا جاتا ہے۔ شہریار، سلو اور ڈاکٹر فرحان عائشہ کے ہمراہ عبدالرحمن کے آدمی کے پاس پہنچتے ہیں۔ انہیں وہاں سے نکلنے کے لیے مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مال بردار ٹرک میں چھپ کر سفر کرتے ہیں تاہم راستے میں ہونے والی چیکنگ میں ٹرک کی تلاشی لی جاتی ہے۔ اسی دوران ان کا سامنا انسپکٹر پریم ناتھ سے ہوتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

پریم ناتھ وہ شخص تھا جس نے ڈاکٹر فرحان کے لالچی رشتے داروں سے رشوت وصول کر کے ان بے چاروں کو جھوٹے الزام میں گرفتار کر لیا تھا اور پھر را کے چنگل میں پھنسا کر برسوں اسیری کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس شخص نے اپنے اس کارنامے کے صلے میں ترقی اور دولت دونوں ہی چیزیں پائی تھیں۔ شہریار اور سلو، کلام کی مدد سے اسے اغوا کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے لیکن اپنی خوش قسمتی سے وہ ان کی گرفت سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا اور عزم رکھتا تھا کہ خود کو اغوا کرنے والوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرے گا۔ شاید اسی لیے وہ ان .... کی بھن گن ملنے پر ممبئی سے خود یہاں چلا آیا تھا اور ان کے گرد دائرہ تنگ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس شخص کے لیے شہریار کے دل میں بہت نفرت تھی اور یہ نفرت آنکھوں سے چھلک بھی سکتی تھی چنانچہ اس نے دھیرے سے اپنی نظریں پریم ناتھ پر سے ہٹا لیں۔ یوں بھی یہ بات پریم ناتھ جیسے افسر کی شان کے خلاف ہوتی کہ ایک عام سا کلینر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی گستاخی کرے۔ یہ گستاخی کر کے وہ اس کی افسرانہ شان کو للکارنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا کہ صورتِ حال بہت ہی نازک تھی۔ خوش قسمتی سے پریم ناتھ نے بھی اسے قابلِ توجہ نہ گردانا اور خود بھی نظروں کا رخ پھیر کر اپنے ساتھ کھڑے پولیس افسر سے ہاتھ ملانے کے بعد اس پولیس کار میں سوار ہو گیا جس کا دروازہ ایک باادب ڈرائیور نے اس کے انتظار میں کھول رکھا تھا۔ اس کے سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے دروازہ بند کیا اور خود گھوم کر پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اسی وقت شہریار کو اپنے پیچھے کا ہوش آیا اور وہ یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ سنتری کے ہاتھ اب ایک ایسے کارٹن کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کے ہٹتے ہی یہ حقیقت کھل جاتی کہ بظاہر دودھ کے کارٹنز سے لبالب بھرے ٹرک میں کارٹنز کے درمیان ہی ایک ایسا خلا رکھا گیا ہے جہاں دو افراد چھپ کر سفر کر رہے ہیں۔ اس نے بے ساختہ ہی سنتری کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے کارٹن ہٹانے سے روکا۔ جواب میں سنتری نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تمہارے افسر صاحب چلے گئے ہیں۔ اب چھوڑو یہ بیکار کی محنت اور ہمارا اور اپنا وقت ضائع ہونے سے بچاؤ۔“

اس نے بڑے پُرخلوص لہجے میں سپاہی کو مشورہ دیا۔ مشقت سے بیزار سپاہی نے ایک نظر دور ہوتی کار پر ڈالی اور پھر شانے جھٹک کر ٹرک کے خارجی راستے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ تمہیں اوکے کر دیتا ہوں۔ تم اپنا سامان دوبارہ لوڈ کرنا شروع کر دو۔“ اس جواب کو سن کر شہریار نے سکون کا سانس لیا اور سنتری کے اترتے ہی اپنے ساتھی ڈرائیور کے ساتھ دوبارہ کارٹنز لوڈ کرنے لگا۔ یہ ایک خاصا مشقت اور وقت طلب کام تھا لیکن وہ اس وقت جتنی بڑی مصیبت سے بچے تھے، اس کے مقابلے میں یہ مشقت کچھ بھی نہیں تھی۔ اس نے کارٹنز اتارنے میں جتنی سستی سے کام لیا تھا، دوبارہ لوڈ کرنے میں اس سے دہری پھرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا کیونکہ جلد از جلد اس مقام سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے اس کام کو پوری دلجمعی سے انجام دیتے ہوئے قطعی یاد نہیں تھا کہ وہ، وہ شہریار عادل تھا جو افسر شاہی کا ایک پرزہ تھا اور جس نے دنیا میں آنکھ کھولنے سے لے کر جوانی تک اپنے آگے پیچھے ملازمین کی فوج دیکھی تھی۔ اس وقت تو وہ بس محض وطن کا ایک سپاہی اور مجاہد تھا جسے اپنے ”لوڈر“ کی حیثیت سے کام کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

☆☆☆

”شش... اٹھو...“ اسلم سونا نہیں چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے لیٹنے سے گریز کرتے ہوئے محض دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھنے پر ہی اکتفا کیا تھا لیکن کہتے ہیں نا کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے، سو اسے بھی بلا ارادہ ہی اونگھ آگئی تھی اور اب کسی کے شانہ پکڑ کر دھیمے سے پکارنے پر اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو سامنے ایڈی کو پایا۔ سنہری بالوں اور داڑھی والا وہ مرد نما بچہ جانے کیسے اس تک پہنچا تھا۔ اس نے آنکھیں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا تو ایڈی اور اپنے قفس کے دروازے کھلے نظر آئے۔

”اب اٹھ بھی جاؤ۔ اگر کوئی یہاں آگیا تو پھر پکڑے جاؤ گے۔“ اسے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے پا کر ایڈی نے جھنجلا کر کہا۔

”تم یہاں کیسے آئے... لاک کیسے کھولا تم نے؟“ اسلم نے اس سے پوچھا۔

”مارک مجھے میڈیسن کھلانے کے لیے آیا تھا، میں نے اس کی جیب سے چابی اڑا لی۔“ ایڈی نے مسکراتے ہوئے بڑے فخر سے بتایا پھر ذرا ڈپٹنے والے انداز میں بولا۔ ”اب یہاں بیٹھے بیٹھے وقت ضائع کرتے رہو گے یا کچھ کرو گے بھی؟ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تمہاری بیوی کس مشکل میں ہے۔ اگر ابھی تم کچھ نہیں کر سکے تو یاد رکھنا کہ میرے ساتھ تمہارا بچہ بھی ان سلاخوں کے پیچھے ہی کہیں بند ہوگا اور دیکھنے والی نظریں اسے اسی حیرت اور تحقیر سے دیکھیں گی جن سے مجھے اور میرے ساتھ یہاں موجود ساتھیوں کو دیکھا جاتا ہے۔“ ایڈی کے لہجے میں کرب تھا۔ اسلم اس سے اس کے مکمل حالات جاننا چاہتا تھا لیکن موقع نہیں تھا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ وہ سب سے پہلے یہاں سے نجات کی کوشش کرتا چنانچہ ایڈی کے شانے کو تھپکتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”یہاں سے دوسرا کمرا مارک کا ہے۔ اس کے کمرے میں ہی وہ کمپیوٹر نصب ہے جس کی مدد سے لیب اور اس کے داخلی راستے کی نگرانی کی جاتی ہے۔ داخلی راستہ کھلنے اور بند ہونے پر مارک کے کمرے میں گھنٹی بجتی ہے اس لیے وہ جاگ رہا ہو یا سو رہا ہو، دونوں صورتوں میں خبردار ہو جاتا ہے۔ البتہ باقی عمارت کی نگرانی صرف اسی وقت کر سکتا ہے جب جاگ رہا ہو اور کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو۔ یہ لوگ اس جگہ کو اپنے لیے بالکل محفوظ سمجھتے ہیں اور یہاں وہی لوگ رہتے ہیں جو ان کے خیال کے مطابق ان کے لیے بے ضرر ہیں۔ اس لیے اندرونی

WWW.PAKSOCIETY.COM

نگرانی کی زیادہ ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ میں اپنی پیدائش سے یہیں ہوں اس لیے اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ مارک کے سونے کا وقت ہے اور اگر تم کچھ کر سکو تو اس وقت کر سکتے ہو۔ یہاں عملہ بہت کم ہے اس لیے اگر تم ہوشیاری سے کام لو تو حالات کو اپنے قابو میں کر سکتے ہو۔ تمہاری بیوی اسی کوریڈور میں مارک کے کمرے سے آگے والے کمرے میں موجود ہے۔ وہ بہت پیاری خاتون ہے اور میری خواہش ہے کہ اسے کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔" ایڈی کسی جوان و مدبر آدمی کی طرح اسے مشورے دے رہا تھا۔

"تم بھی میرے ساتھ چلو۔" اسلم وہاں سے نکلنے لگا تھا کہ خیال آنے پر بولا۔

"نہیں، میں نہیں آسکتا۔ میری ٹانگ زخمی ہے اور میں اس زخمی ٹانگ کے ساتھ زیادہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں۔" ایڈی نے یاسیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ انکار کیا تو اسلم کو یاد آگیا کہ یہاں سے فرار کی کوشش میں ایڈی کو مارک کی چلائی ہوئی گولی نے زخمی کر دیا تھا۔ وہ تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں یہاں لایا گیا تھا لیکن صرف چند گھنٹوں بعد ہی نہ صرف وہ پوری طرح ہوش میں تھا بلکہ مارک کی جیب سے چابی اڑا کر اس کی بیرک تک بھی آپہنچا تھا۔ زخمی حالت میں یہ سب کر گزرنا اتنا آسان نہیں تھا لیکن وہ اپنی مختصر قد و قامت کے ساتھ یہ کارنامہ انجام دے کر ثابت کر چکا تھا کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔

"بس اب دیر مت کرو اور فوراً یہاں سے جاؤ۔" ایڈی نے خود ہی اسے ٹوکا تو وہ تیزی سے باہر نکلا۔ ہتھیار کے نام پر اس کے پاس کچھ بھی موجود نہیں تھا اور اسے صرف اپنے زورِ بازو پر ہی مارک پر قابو پانا تھا۔ یہ اس کے لیے زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ وہ لڑائی بھڑائی کے فن میں ماہر تھا اور زندگی میں کئی بار خالی ہاتھوں سے بھی اپنے مقابل کو پچھاڑ چکا تھا۔ یہاں تو مارک کے بارے میں شنید تھی کہ وہ سویا ہوا ملے گا۔ اس کے باوجود باہر نکل کر دوسرے کمرے کے دروازے کا ہینڈل دباتے ہوئے اس نے پوری احتیاط برتی اور آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ خاصے کشادہ اس کمرے میں سب سے پہلے متوجہ کرنے والی چیز مانیٹر کی اسکرین ہی تھی جس پر ٹکڑوں میں مختلف مناظر نظر آرہے تھے۔ وہ ایڈی کو بھی دیکھ سکتا تھا جو اس کی بیرک کی ایک دیوار سے ٹیک لگائے نڈھال سا بیٹھا تھا۔ وہ اسکرین پر سے نظر ہٹانے ہی لگا تھا کہ ماہ بانو کے چہرے پر نظر پڑ گئی۔ وہ ایک نیم روشن کمرے میں سینے تک چادر تانے سوئی ہوئی تھی لیکن سوتے میں بھی سوجے ہوئے نظر آنے والے اس کے پپوٹے گواہی دے رہے تھے کہ وہ سونے سے قبل روتی رہی ہے۔ ماہ بانو کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے دل پر گھونسا سا پڑا اور وہ یہ بھول کر کہ خود اس وقت مارک کے کمرے میں ہے اسے پکار بیٹھا۔ "ماہی..." یہ آواز ماہ بانو تک تو ظاہر ہے نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن آرام دہ وسیع بیڈ پر سویا ہوا مارک ضرور بیدار ہو گیا اور اس نے اسلم کو اپنے کمرے میں دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ اس نے لپک کر بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ یہی وہ وقت تھا جب اسلم کو اپنی حماقت کا احساس ہوا اور اس نے اسکرین پر سے نظریں ہٹا کر اپنا رخ بدلا۔ رخ بدلتے ہی مارک اس کی نظر میں آگیا اور اس نے بلا تاخیر اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس چھلانگ کے نتیجے میں مارک اور وہ دونوں اس طرح بستر پر گرے کہ مارک اس کے نیچے تھا۔ مارک نے بھی جواباً پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دونوں گھٹنے سمیٹ کر اس کے پیٹ پر مارے لیکن نیچے دبے ہوئے ہونے کی وجہ سے وہ پوری شدت سے ضرب نہیں لگا سکا۔ اسلم نے وقت ضائع کیے بغیر اس کے چہرے پر اپنے سر کی ضرب ماری۔ اس ضرب نے مارک کی ناک کو زخمی کیا اور اس سے خون جاری ہو گیا۔

اس نے بلبلا کر اسلم کو مکا رسید کیا جو اس کے کان پر جا کر لگا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کا کان سُن ہو گیا ہو۔ حقیقتاً یہ مکا اس کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوا تھا اور وہ مارک پر پہلے جیسی گرفت قائم رکھنے میں کامیاب نہیں رہا.... مارک نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور اسے اپنے اوپر سے دھکیل دینے میں کامیاب ہو گیا۔ دھکیلے جانے پر اسلم کا توازن بگڑا ضرور لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور خود کو فرش پر گرنے سے بچا کر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران میں مارک بھی کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے حملے میں پہل کی لیکن اسلم نے نہایت پھرتی سے ایک طرف ہو کر خود کو بچا لیا۔ مارک اپنی ہی جھونک میں آگے نکل گیا۔ پیچھے سے اسلم نے اس کی پیٹھ پر زوردار لات رسید کی جس سے وہ بُری طرح لڑکھڑا گیا۔ اسلم نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور پیچھے سے اس کی گردن کے دائیں بائیں بیک وقت دونوں ہتھیلیوں کی کھڑی ضرب لگائی۔ اس ضرب نے مارک کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے اور وہ لہراتا ہوا فرش پر گرا۔ اسلم نے پیر سے اس کے سر پر زوردار ٹھوکر لگائی اور مارک نے کراہتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسلم نے تصدیق سے پہلے اس کی کنپٹی پر ایک ٹھوکر اور لگائی۔ اس بار وہ کراہا بھی نہیں۔ اسلم نے اسے ٹانگوں سے پکڑا اور گھسیٹا

ہوا ملحقہ باتھ روم میں لے گیا۔ اسے باتھ روم میں منتقل کر کے باہر سے دروازہ بند کرنے کے بعد وہ مانیٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ ماہ بانو ہنوز گہری نیند سو رہی تھی۔ ایڈی بھی پہلے ہی کی طرح دیوار سے پشت لگائے بیٹھا تھا اور اس کے چہرے سے نقاہت جھلک رہی تھی۔

اسلم جلدی جلدی چیک کرنے لگا کہ اس زیرِ زمین تجربہ گاہ میں مزید کتنے افراد موجود ہیں اور اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ وہاں زیادہ لوگ موجود نہیں تھے۔ اس نے ایک کمرے میں دو افراد کو سوئے ہوئے دیکھا جبکہ ایک آدمی بستر پر نیم دراز کسی کتاب کا مطالعہ کرتا دکھائی دیا۔ ایک شخص کو اس نے تجربہ گاہ کے انداز میں سجے کمرے میں مصروف پایا۔ وہ چند ٹیسٹ ٹیوبس میں سرخ رنگ کا محلول لیے معلوم نہیں کس تحقیق میں مصروف تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ سرخ رنگ کا یہ محلول دراصل انسانی خون ہے جس کے مختلف ٹیسٹ کرتے ہوئے وہ رپورٹ مرتب کرنے میں مصروف ہے۔ اس شخص کے سامنے رکھے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر رحمِ مادر میں پرورش پاتے بچے کی تصویر متحرک تھی اور وہ رپورٹ لکھتے ہوئے گاہے بگاہے اسکرین پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ اسلم نہیں جانتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے لیکن اتنا اندازہ ضرور لگا چکا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ خلافِ انسانیت ہے۔ دنیا میں کسی بھی جگہ انسانوں پر مہلک تجربے کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی شاید اسی لیے دنیا میں انسانیت کا سب سے بڑا علمبردار امریکا اس گھنے جنگل میں زیرِ زمین چھپ کر یہ تجربے کروا رہا تھا۔ یہ بات تو بالکل ہی واضح تھی کہ یہ تجربات حاملہ خواتین اور نومولود بچوں پر کیے جا رہے ہیں اور ان کے نتیجے میں وہ مخلوق پیدا ہو رہی ہے جسے اس نے ایڈی اور اس کے ساتھی کی صورت میں جانوروں کی طرح سلاخوں کے پیچھے رہتا دیکھا ہے۔

اچھی طرح چیک کر لینے کے باوجود اسے مارک اور ان چار کے علاوہ ان کا کوئی ساتھی وہاں نظر نہیں آیا۔ شاید اس جگہ کو خفیہ رکھنے کے لیے وہاں کم سے کم افراد کو ہی رکھا گیا تھا۔ جو سہولیات وہاں دکھائی دے رہی تھیں، ان کے ہوتے ہوئے روزمرہ کے امور کے لیے بھی زیادہ افراد کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایک سے دو افراد نہایت آسانی سے یہاں کا انتظام و انصرام سنبھال سکتے تھے۔ مائیکرو ویو، ڈش واشر، برتن اور کپڑے دھونے کی جدید مشینوں سمیت وہاں وہ سب کچھ موجود تھا جو کام کو برق رفتار اور آسان بنا سکے۔ وہاں موجود افراد کی تعداد جان لینے کے بعد اسے بس یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ان افراد کا انجام کیا ہونا چاہیے۔ اس کی نظر میں تو یہ سب مجرم تھے جو ایک غیر انسانی و غیر اخلاقی عمل میں ملوث تھے اور اس حساب سے انہیں سزا بھی ملنی چاہیے تھی۔ اسے یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر ان میں سے کسی کو اس نے سلامت چھوڑ دیا تو وہ ماہ بانو کو یہاں سے نکال کر لے جانے کے عمل میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے۔ اپنے ان اندیشوں کے ساتھ اس نے مارک کے کمرے کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ بیڈ کے ساتھ رکھی چھوٹی میز کی دراز سے اسے ایک پسٹل مل گیا۔ یہ پسٹل مارک نے ہنگامی حالات کے لیے اپنے قریب رکھا ہوگا لیکن استعمال کا موقع نہ مل سکا۔ ایک الماری سے اسے اپنا بیگ اور کچھ دوسرا اسلحہ بھی مل گیا۔ وہیں چند ڈائنامائٹ اسٹکس بھی رکھی تھیں۔ اس نے اپنے بیگ کے علاوہ جدید ساخت کی ایک گن اٹھانے پر اکتفا کیا اور دل کی خواہش کو نظرانداز کرتے ہوئے ماہ بانو کے کمرے کی طرف جانے کے بجائے اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں اس نے دو افراد کو سوتے ہوئے دیکھا تھا۔

وہ دونوں اب بھی بے خبر سو رہے تھے۔ ان کے سنگل بیڈز ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر بچھے تھے۔ دھاری دار نائٹ سوٹ میں سوئے ہوئے ان دونوں افراد کو دیکھ کر وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ وہاں سہولیات فراہم کرنے والے خدمت گار ہیں یا اس تجربہ گاہ میں جاری شیطانی تحقیق میں حصہ لینے والے سائنس داں۔ اس کے لیے تو دونوں ہی برابر تھے۔ چنانچہ ہونٹ بھینچے ہوئے پہلے دائیں جانب کے بستر پر سوئے ہوئے شخص کی طرف بڑھا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی زور سے گن کے دستے سے اس کے سر پر ضرب لگائی کہ واضح طور پر کھوپڑی چٹخنے کی آواز سنائی دی اور وہ شخص منہ سے کراہ بھی نہیں نکال سکا۔ دوسرے بیڈ پر سویا ہوا شخص اس لمحے ذرا سا کسمسایا لیکن پھر رخ بدل کر دوبارہ سو گیا۔ اسلم دبے قدموں اس کے سر پر پہنچا اور پہلے والی ترکیب استعمال کرتے ہوئے اس کے منہ پر بھی ہاتھ رکھ دیا لیکن وہ دوسرے آدمی کی طرح بے خبر سوتا نہیں رہا اور چونک کر آنکھ کھول دی۔ آنکھ کھولتے ہی اس نے اسلم کو اپنے سر پر سوار دیکھا تو اضطراری ردِعمل کے طور پر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسلم نے اس کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا اور گن سے ایک زوردار ضرب اس کے سر پر لگانے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش اس لیے کامیاب نہیں رہی کہ اس شخص نے عین موقع پر اپنا سر ہٹا لیا۔ گن کا وار اس کے شانے پر لگا اور اس نے بلبلا کر چیخنا چاہا لیکن اسلم کے مضبوطی سے منہ پر جمے ہوئے ہاتھ کی وجہ سے بس ذرا سی گھٹی گھٹی آواز ہی نکل سکی۔ اسلم نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

فوراً ہی دوسرا وار بھی کر دیا۔ اس نے اس بار بھی بچنے کی کوشش کی لیکن صرف جزوی طور پر ہی کامیاب ہو سکا اور کھوپڑی کے ایک جانب اسے یہ وار برداشت کرنا پڑا۔

اسلم نے جو اس کی کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا تھا اور اسے اٹھنے کا موقع نہیں دے رہا تھا، تیسرا اور فیصلہ کن وار کیا۔ اس بار وار کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ کر اندر گھس گئی اور اسلم کو اپنے چہرے پر خون کے چھینٹے برداشت کرنے پڑے۔ وہ آستین سے خون صاف کرتا ہوا اس کی چھاتی سے اٹھ گیا۔ احتیاط کے پیشِ نظر وہ اپنے ہتھیاروں کو استعمال کرنے سے گریز کر رہا تھا کہ کہیں گولی چلنے کی آواز دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر کے ہوشیار نہ کر دے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی احساس ہو گیا کہ گن کی دہشت اپنی جگہ لیکن ان حالات میں خنجر زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ گن رکھ کر اس نے اپنے بیگ سے خنجر نکال لیا۔ خنجر لے کر وہ اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں اس نے ایک آدمی کو مطالعے میں مصروف دیکھا تھا۔ اس کمرے میں بیڈ دروازے کے عین مقابل تھا اور وہ شخص بیڈ پر نیم دراز ہو کر مطالعے میں مصروف تھا، چنانچہ دروازہ کھلتے ہی متوجہ ہو گیا اور اپنے سامنے ایک اجنبی کو پا کر اس کی آنکھوں میں حیرت اُتر آئی۔ اسلم نے اسے حیرت کے بعد کے ردِعمل کا مظاہرہ کرنے کا موقع نہیں دیا اور وہیں کھڑے کھڑے یوں تاک کر خنجر پھینکا کہ وہ سیدھا اس شخص کے دل میں جا اُترا۔ یہ عمل اتنی سرعت سے ہوا تھا کہ اس شخص کو اپنے بچاؤ کے لیے ملنے کا بھی موقع نہیں ملا اور وہ آنکھوں میں حیرت و دہشت کے رنگ لیے دنیا سے سدھار گیا۔ خنجر دل میں کھب جانے کی وجہ سے اسے تڑپنے اور چیخنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور وہ بہت خاموشی سے اپنی جان دے بیٹھا تھا۔ اسلم نے قریب جا کر اس کی موت کی تصدیق کی اور اس کے سینے میں کھبا ہوا خنجر کھینچ کر باہر نکالا۔ خنجر نکلتے ہی تیزی سے خون کا اخراج ہونے لگا جس کی پروا کیے بغیر وہ مقتول کے کپڑوں سے ہی خنجر کو صاف کرنے لگا۔ خنجر سے خون صاف کرتے ہوئے اس کی نظر اس کتاب پر پڑی جو مرنے والا اپنی موت سے قبل پڑھ رہا تھا۔ وہ طب سے متعلق کوئی تحقیقاتی کتاب تھی۔ اسلم سمجھ گیا کہ یہ شخص ڈاکٹر ہے اور اسی نے ایڈی کی ٹانگ کا آپریشن کر کے اس میں سے گولی نکالی ہو گی لیکن اب وہ دنیا کے سب سے بھیانک مرض موت کا شکار ہو کر خود لاعلاج ہو گیا تھا۔ اس شخص کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اب اس کے سامنے صرف ایک فرد رہ گیا تھا اور وہ تھا تجربہ گاہ میں مصروف عمل آدمی۔ اسکرین پر اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اس کے لیے اس جگہ کا نقشہ سمجھنا بالکل بھی مشکل نہیں رہا تھا، چنانچہ وہ سیدھا لیب تک پہنچ گیا لیکن لیب کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ مجبوراً اسے دستک دینی پڑی۔

''کون؟'' اندر سے جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مارک۔'' اس نے کوشش کی کہ مارک جیسی آواز نکال سکے۔

''کیوں آئے ہو؟ جانتے ہو میں مصروف ہوں اور ڈسٹرب ہونا پسند نہیں کرتا۔'' اس کی جھنجلاہٹ میں تلخی شامل ہو گئی۔

''سوری سر! لیکن میں مجبور ہوں۔ اس لیڈی کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' وہ کوشش کر رہا تھا کہ مارک کا لب و لہجہ برقرار رکھ سکے لیکن اسے دشواری پیش آ رہی تھی اور اسے اندازہ تھا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پا رہا ہے لیکن اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اندر موجود شخص نے اس کی آواز یا لب و لہجے سے زیادہ اس اطلاع کو اہمیت دی جو اس نے سنائی تھی، چنانچہ دروازہ اتنی تیزی سے کھلا کہ اسلم خود بھی ہڑبڑا سا گیا۔ دروازہ کھولنے والا اپنے ہاتھ میں شیشے کا ایک کونیکل فلاسک اٹھائے دروازے تک آیا تھا۔ اس نے مارک کی جگہ کسی اور کو اپنے سامنے پایا تو اضطراری ردِعمل کے طور پر اسے وہ فلاسک ہی کھینچ مارا۔ شیشے کا فلاسک عین اسلم کی پیشانی سے جا کر ٹکرایا اور کرچیوں میں تبدیل ہوتے ہوئے اس کے ماتھے کو زخمی کر ڈالا۔ زخم سے جاری ہونے والے خون سے قبل فلاسک میں موجود محلول نے اسلم کے چہرے کو بھگو دیا۔ محلول بے حد بدبودار تھا۔ اسلم کو ابکائی سی آ گئی۔ دوسری طرف اس کے مقابل نے موقع کا فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر دروازہ بند کر دیا.... اسلم نے بازو اٹھا کر آستین سے چہرہ صاف کرنے کی کوشش کی اور بلاتکلف گن نکال لی۔ اس کے حساب سے یہ یہاں موجود افراد میں سے آخری فرد تھا چنانچہ اب کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ گن نکال کر اس نے لاک والے حصے کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ فائر کی آواز بہت زور سے گونجی، ساتھ ہی لاک بھی ٹوٹ گیا۔ اس نے لات مار کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی اس پر تجربہ گاہ میں استعمال ہونے والی شیشے کی مختلف اشیا کی بوچھار سی ہو گئی جس کی وجہ سے اسے کئی چوٹیں تو آئیں لیکن یہ اطمینان ہو گیا کہ اندر موجود شخص کے پاس کوئی ہتھیار موجود نہیں ہے ورنہ وہ اس کا استعمال کرتا۔ اس اطمینان کے بعد وہ دندناتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور گن اس پر تان کر غرایا۔ ''بس اب سکون سے کھڑے ہو جاؤ ورنہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی

طرح جان سے جاؤ گے۔''

''کک.... کک.... کیا؟ تم نے سب کو مار ڈالا؟'' وہ شخص جو پہلے ہی خوف زدہ نظر آ رہا تھا، مزید دہشت زدہ ہو گیا۔

''ہاں، میں ایسے کسی شخص کو برداشت نہیں کر سکتا جو میرے لیے مشکل پیدا کرے۔'' اس نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ مزید خوف ناک کر لیا۔

''میں ایسا نہیں ہوں۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں۔ تم جو بھی ہو، مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہارے لیے کوئی مشکل کھڑی کروں گا۔'' جلدی جلدی بولتے ہوئے اس نے اسلم کو یقین دہانی کروائی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اسلم نے اس پر گن تانے تانے سوال کیا۔

''ولسن۔'' اس کی طرف سے فوراً جواب آیا۔

''تم یہاں کیا کرتے ہو؟''

''میں ڈاکٹر اسمتھ کو اسسٹ کرتا ہوں۔'' اس بار بھی اس نے بلاتاخیر جواب دیا۔

''ڈاکٹر اسمتھ کہاں ہے؟''

''وہ کسی کام سے نیویارک گیا ہوا ہے اور امکان ہے کہ کل سے پہلے کسی وقت یہاں پہنچ جائے گا۔'' اس نے ذرا وضاحت سے جواب دیا۔

''یہ خفیہ تجربہ گاہ کس مقصد کے لیے قائم کی گئی ہے اور ڈاکٹر اسمتھ یہاں کیا تجربہ کر رہا ہے؟'' اس نے ولسن کی آنکھوں میں براہِ راست جھانکتے ہوئے یہ سوال کیا تو وہ نظریں چرا گیا اور باقی سوالوں کی طرح اس سوال کا فوری جواب نہیں دیا۔

''اوکے، اگر تم نہیں بتانا چاہتے ہو تو میں تم.... اصرار نہیں کروں گا کیونکہ میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔'' اس نے گن سے عین ولسن کی پیشانی کا نشانہ لیا اور ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالا۔

''رکو، میں بتاتا ہوں لیکن اس سے پہلے تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھے گولی نہیں مارو گے اور زندہ چھوڑ دو گے۔'' ولسن کے ماتھے سے پسینا پھوٹ پڑا تھا اور مدافعانہ انداز میں دونوں ہاتھ آگے کرتے ہوئے اس نے سچ بتانے کی مشروط رضامندی دے دی....

''ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں گولی نہیں ماروں گا اور زندہ یہاں چھوڑ جاؤں گا لیکن ایسا اسی صورت میں ہو گا کہ تم مجھے میرے ہر سوال کا بالکل ٹھیک جواب دو گے۔ اگر میں نے محسوس کر لیا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو تو تمہاری ہڈی پسلی سلامت رہنے کی کوئی ضمانت نہیں ہو گی۔'' اسلم نے اپنے لہجے کی سختی کو برقرار رکھا۔

''ڈاکٹر اسمتھ ماہرِ جینیات ہے اور یہاں وہ ایک اہم ریسرچ کر رہا ہے۔ میں اس کا سب سے خاص اور ذہین شاگرد ہوں اس لیے اس نے اپنے اسسٹنٹ کے طور پر میرا انتخاب کیا ہے۔ یہاں آنے سے قبل اس نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ امریکی حکومت کی خواہش اور تعاون پر اسے ایک خفیہ تجربہ گاہ میں خاص قسم کی تحقیق کرنی ہے اور اس ریسرچ میں اس نے مجھے اس کے معاون کا کردار ادا کرنا ہو گا۔ میرے لیے یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ میں ڈاکٹر اسمتھ جیسے قابل آدمی کے ساتھ حکومتی سرپرستی میں کسی اہم ریسرچ میں حصہ لوں اس لیے تفصیلات جانے بغیر میں نے فوراً ہی ہامی بھر لی لیکن جب یہاں آ کر کام شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ جو کام ہو رہا ہے، وہ کسی طور بھی انسانی اخلاقیات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ میں نے ڈاکٹر اسمتھ کے سامنے اس سلسلے میں احتجاج کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ اب میرے پاس اس کا ساتھ دینے کے سوا دوسرا کوئی آپشن نہیں ہے۔ میں یا تو یہاں رہ کر اس کی مدد کر سکتا ہوں یا مارک کے ہاتھوں اپنی جان گنوا کر کسی گمنام قبر میں اتر سکتا ہوں۔ ساتھ دینے کی صورت میں ہر ماہ میرے اکاؤنٹ میں ایک بڑی رقم منتقل کر دی جاتی۔ یہ رقم اتنی زیادہ تھی کہ میرے بیوی بچوں کے اخراجات پورے ہونے کے بعد بھی اتنا بچ جاتا کہ جب میں یہاں سے فارغ کیا جاتا تو خاصا عرصہ آرام سے بیٹھ کر کھا سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی پیشکش کی گئی کہ اس خدمت سے فارغ ہونے کے بعد مجھے میری خواہش پر مزید اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کیے جانے کے علاوہ کسی تحقیقی ادارے میں پُرکشش ملازمت بھی مہیا کی جائے گی۔ تم اندازہ کر سکتے ہو کہ ان حالات میں میرے پاس ہامی بھر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اپنی اس رضامندی کے بعد میں پورے بارہ سال سے یہاں ہوں اور مجھے سورج کی روشنی تک دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ بیوی بچوں سے ملنے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فون یا انٹرنیٹ پر بھی مجھے کسی سے رابطے کی اجازت نہیں ہے اور میں صرف خطوط کے ذریعے انہیں اپنی خیریت سے آگاہ کر سکتا ہوں۔ جواب میں وہ بھی مجھے خط لکھتے ہیں اور خطوط کا یہ سلسلہ اس طرح جاری ہے کہ مجھے یا میری بیوی کو ایک دوسرے کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے کہ ہم کہاں موجود ہیں۔ ان لوگوں نے میری بیوی اور بچوں کو سابقہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہائش سے کہیں اور منتقل کر کے مجھ پر یہ واضح کر دیا ہے کہ اگر میں کسی طرح یہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو ان تک رسائی حاصل نہیں کر سکوں گا اس لیے بہتر ہے کہ میں تعاون جاری رکھوں اور اجازت ملنے پر ہی یہاں سے باعزت طریقے سے روانہ ہوں۔ لیکن واپسی کا دن، مہینا اور سال طے نہیں ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں کھلی فضا میں سانس لیے بغیر کسی دن یہیں مر جاؤں گا اور میرے گھر والوں کو پتا بھی نہیں چلے گا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

''تم نے یہ نہیں بتایا کہ یہاں کس قسم کی ریسرچ ہو رہی ہے؟'' اسلم نے اپنے لہجے سے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا کہ اسے اس کے آنسوؤں نے متاثر کیا ہے اور وہ ان سے متاثر ہو کر اس کے لیے کسی نرم سلوک کا سوچ رہا ہے۔

''ڈاکٹر اسمتھ نومولود بچوں پر تجربہ کر کے انہیں ایک ایسی مخلوق میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کی جسمانی عمر تو کم نظر آئے لیکن ذہنی طور پر وہ کسی بالغ شخص سے بھی زیادہ سمجھ دار اور ذہین ہو۔ اس مقصد کے لیے پہلے تو مختلف اداروں سے وہ بچے حاصل کیے گئے جن کا کوئی وارث نہیں ہوتا اور ان کے غائب ہونے پر انتظامیہ کو کسی قسم کی جواب دہی نہیں کرنی پڑتی۔ یہاں لائے جانے والے ان بچوں کی عمر دو چار دن سے زیادہ نہیں ہوتی تھی اور ڈاکٹر ان پر مختلف ادویات کے تجربے کرتا رہتا تھا لیکن بدقسمتی سے اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور زیرِ تجربہ بچے مرتے رہے۔ اس ناکامی کے بعد ڈاکٹر نے فیصلہ کیا کہ وہ بچوں پر ان کی پیدائش سے قبل شکمِ مادر میں ہی تجربے کا آغاز کرے گا۔ نومولود بچوں کے مقابلے میں حاملہ خاتون کا حصول زیادہ مشکل تھا لیکن ڈاکٹر کسی نہ کسی طرح اس مقصد میں بھی کامیاب ہو گیا مگر پھر بھی اس کا تجربہ جزوی طور پر ہی کامیاب ہو سکا اور جو بچے پیدا ہوئے، وہ بے شک ذہین تو تھے لیکن ان میں یہ کمی تھی کہ وہ مکمل طور پر بچے نظر نہیں آتے تھے۔ ہارمونز کی گڑبڑ سے ان کی وقت سے پہلے داڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں اور وہ جنسی طور پر بھی بالغ مرد جیسے جذبات رکھتے تھے۔ کچھ کی قامت بھی اپنی اصل عمر کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان میں سے کوئی بھی تین چار سال سے زیادہ نہیں جی سکا اور ڈاکٹر کی دیوانگی کا سلسلہ جاری رہا۔ اب بھی یہاں تین ایسے بچے موجود ہیں۔ ان میں ایڈی سب سے بہتر ہے اور اسی حساب سے ڈاکٹر کا چہیتا بھی ہے۔ اس میں سیکھنے اور عمل کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔ اس کے علاوہ وہ

چہرے سے بھی معصوم نظر آتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کی داڑھی مونچھیں بہت تیزی سے بڑھتی ہیں اور وہ جنسی طور پر بھی سب سے زیادہ بے چین ہے۔ یہاں لائی جانے والی کسی بھی عورت کو دیکھ کر وہ بے قرار ہو جاتا ہے اور اس کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' وہ بہت تفصیل سے اس کے سوالات کے جواب دے رہا تھا۔

''یہاں جو عورت موجود ہے، اسے بھی اسی مقصد کے لیے لایا گیا ہے؟'' اسلم نے پھنکارنے کے انداز میں پوچھا تو ولسن کانپ سا گیا اور زبان کے بجائے محض سر کی اثباتی جنبش میں ہی جواب دے سکا۔

''بچوں کی پیدائش کے بعد ان کی ماؤں کا کیا کیا جاتا ہے؟'' خود پر بے حد ضبط کرتے ہوئے اس نے ولسن سے سوال کیا تو اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا جس سے اندازہ ہو گیا کہ معاملات بہت خراب ہیں۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟'' اسلم غرایا۔

''ان میں سے کچھ تو زچگی کے مرحلے سے گزر کر خود ہی جان سے چلی گئیں اور کچھ کو مارک لے گیا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ اس نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا لیکن شک ہے کہ وہ یہاں سے زندہ نہیں لوٹ سکی ہوں گی۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بمشکل جواب دیا۔

''اور تم... تم محض اپنی جان بچانے کے لیے اس گھناؤنے کام میں پوری طرح شامل رہے؟'' اسلم کے ذہن میں اسکرین پر دیکھا ہوا وہ منظر زندہ تھا جب اس نے ولسن کو تجربہ گاہ میں پوری دلجمعی سے مصروف پایا تھا۔

''میں مجبور تھا۔'' اس نے اپنی صفائی پیش کی۔

''اپنی جان بچانے کے لیے بے گناہوں کے قتل میں شامل رہنا کسی طور قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔'' اسلم بڑبڑایا تو ولسن کے چہرے پر خوف کی زردی چھا گئی۔

''تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے...'' عالمِ خوف میں اس نے اسلم کو یاد دلانے کی کوشش کی۔

''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں تمہیں ہرگز بھی گولی نہیں ماروں گا اور یہاں زندہ چھوڑ کر جاؤں گا۔'' اس کی بات کاٹتے ہوئے اسلم نے ایک بار پھر اپنے وعدے کی توثیق کی تو وہ ذرا مطمئن ہو گیا۔

''اس قسم کے بچے تیار کرنے کا کیا مقصد ہے؟'' اس نے وہ سب سے اہم سوال کیا جو اس سارے فسانے کی اصل وجہ کو کھول دیتا۔

''ایک تو ڈاکٹر کی اپنی ذاتی ذہنی تسکین کہ وہ وہ کر رہا

ہے جو دوسروں نے ابھی تک نہیں کیا، دوسرے امریکا اور اسرائیل کا مشترکہ مفاد۔ یہاں تجربے کے لیے زیادہ تر ایسی عورتوں اور ان کے بچوں کو استعمال کیا جاتا ہے جن کا تعلق مشرقی ممالک یا ایسے ممالک سے ہو جو امریکا اور اسرائیل کے حریف ہیں۔ ان بچوں کی برین واشنگ کر کے انہیں انہی کے وطن کی جاسوسی کے لیے استعمال کرنے کا پروگرام ہے۔ ... پالک یا کسی بھی شکل میں ان بچوں کو اہم عہدوں پر فائز افراد تک پہنچا کر ان کی مدد سے اہم ملکی راز حاصل کیے جا سکتے ہیں اور امید کی جا رہی ہے کہ یہ جاسوسی کے جدید آلات اور دوسرے ذرائع کے مقابلے میں کہیں زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔'' ولسن نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ امریکا اور اس کے طفیلیے اسرائیل کا دنیا پر شوقِ حکمرانی انہیں انسانیت کے درجے سے بہت نیچے لے گیا تھا اور کہنے کو تو وہ سپر پاور تھے لیکن حقیقت میں خنزیر سے بھی زیادہ بدفطرت اور کم تر کہ جس کی اخلاقیات اتنی پست ہوں، اسے تمام تر مادی ترقی کے باوجود کسی طور بھی مہذب اور ترقی یافتہ نہیں گردانا جا سکتا۔

''میں نے تمہیں ہر بات سچ بتا دی ہے۔ اب تو تم مجھے کچھ نہیں کہو گے نا؟'' ولسن بھی اسی قوم کا ایک فرد تھا جسے اپنے مفاد کے آگے کچھ نظر نہیں آتا تھا چنانچہ اس وقت بھی وہ ... اپنی زندگی کی بھیک مانگنے میں مصروف تھا اور اسے ... بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ کتنے گھناؤنے جرم میں شریک رہا ہے۔ انسانوں کو چوہوں اور حشرات الارض کی ... کی بھینٹ چڑھانے کے باوجود وہ اپنے لیے زندگی کا خواہاں تھا۔

''میں تمہیں یہاں باندھ کر چھوڑ جاؤں گا۔ آگے تمہاری قسمت کہ تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔'' آخرکار اسلم نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور اس فیصلے پر عمل کرتے ہوئے اسے ... تار سے باندھ کر باہر نکل گیا۔ اب اس کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جس میں ماہ بانو محوِ خواب تھی۔ وہ ... کمرے میں داخل ہوا تو اسے اسی پوزیشن میں سوتا ہوا پایا جس میں اسکرین پر دیکھا تھا اور یہ تشویشناک بات تھی۔ کم ... ہونے والی فائرنگ کے ردِعمل میں تو اسے اٹھ جانا چاہیے تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں اس کی طرف بڑھا اور اس کی سانس چیک کیں جس کے بعد یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ زندہ ہے لیکن بے حد گہری نیند سو رہی ہے۔ ایسی گہری نیند ... زیادہ ... کسی دوا کا اثر لگتی تھی۔ اپنے شک کی تصدیق کے لیے اس نے اسے آوازیں دیتے ہوئے

دھیرے سے ہلایا لیکن وہ ذرا سا کسمسا کر دوبارہ سو گئی۔ اب اس کے پاس اسے زبردستی جگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ روم ریفریجریٹر تک گیا اور اس میں سے یخ بستہ پانی کی بوتل نکال کر اس پر انڈیل دی۔ پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ بالآخر اسے جھرجھری لے کر اٹھنا ہی پڑا۔ چند سیکنڈوں تک تو وہ بے تاثر آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتی رہی لیکن پھر اس کے ذہن نے پہچان کے مراحل طے کر لیے اور وہ ''اسلم'' پکارتی ہوئی تیزی سے اس کے ساتھ چمٹ گئی۔ وہ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر دلاسا دیتا رہا کیونکہ اسے یوں اچانک سامنے پا کر وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پا رہی تھی اور مسلسل ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

''ہمت سے کام لو ماہ بانو! یہ جذبات سے زیادہ ہوش سے کام لینے کا وقت ہے۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہو گا۔ میں نے فی الحال یہاں موجود افراد کو قابو میں کر لیا ہے لیکن معلوم ہوا ہے کہ ان کے مزید ساتھی یہاں آنے والے ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔ تم خود کو سنبھال کر یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔ میں ذرا اس شیطانی تجربہ گاہ کو تباہ کرنے کا بندوبست کرتا ہوں۔'' ماہ بانو کا تھوڑا سا غبار نکل گیا تو اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ سمجھ دار اور بہادر لڑکی تھی جس نے اپنی چھوٹی سی عمر میں ہی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ لیے تھے اور ہر طرح کے حالات سے بہادری سے نمٹتی بھی رہی تھی، چنانچہ اس بار بھی تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔ اتنی زیادہ جذباتیت کی بھی شاید یہ وجہ تھی کہ ایک ماں کی حیثیت سے وہ اتنے دنوں تک شدید خوف کے حصار میں رہی تھی.... اسے یہ سوچیں کھاتی رہی تھیں کہ ان لوگوں کی وجہ سے اس کے ہونے والے بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ بچے کے باپ کو سامنے پایا تو یہ ساری ٹینشن اور غبار آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ کو جو کرنا ہے کریں۔ اتنی دیر میں، میں اپنے یہ کپڑے تبدیل کر کے تیار ہوتی ہوں۔'' سنبھلنے کے بعد وہ مضبوط لہجے میں اسلم سے بولی اور فوراً ہی بستر چھوڑ دیا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر اسلم کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ تیزی سے اپنا لباس تبدیل کرنے لگی۔ لباس کی یہ تبدیلی اس کے لیے ضروری تھی کہ اسلم کی ٹھنڈا پانی ڈال کر جگانے کی کوشش نے اس کے لباس کو گیلا کر دیا تھا اور وہ رات کے اس آخری پہر گیلے لباس کے ساتھ جنگل میں نکل کر خود کو بیمار کرنے کا خطرہ نہیں مول لے سکتی تھی۔ نائٹ سوٹ تبدیل کر کے اس نے جو لباس پہنا، وہ ٹراؤزر اور ڈھیلی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈھالی ٹی شرٹ پر مشتمل تھا۔ اس قسم کے ملبوسات اسے انہی لوگوں نے فراہم کیے تھے اور وہ عادی نہ ہونے کے باوجود پہننے پر مجبور تھی۔ ہاں، اس لباس پر بھی وہ اپنا وہ واحد دوپٹا ضرور اوڑھتی تھی جو یہاں آتے وقت اس کے جسم سے لپٹا تھا۔ اس وقت بھی اس نے وہی بڑا سا دوپٹا اپنے گرد لپیٹا اور اپنی سمجھ کے حساب سے چند ایسی چھوٹی موٹی چیزیں ایک چھوٹے سے بیگ میں جمع کرنے لگی جو اس کے حساب سے سفر کے دوران کارآمد ہو سکتی تھیں اور جن کا بوجھ بھی وہ خود بہ آسانی اٹھا سکتی تھی۔

ادھر اسلم، مارک کے کمرے میں مصروف تھا۔ اس نے اس کی الماری میں رکھی ڈائنامائٹ اسٹکس نکال لی تھیں اور اب بھرپور توجہ کے ساتھ انہیں نصب کرنے کے طریقۂ کار پر غور کر رہا تھا۔ ڈاکوؤں کے ساتھ گزارے ہوئے اپنی زندگی کے کئی سالوں میں اس نے بے پناہ تجربات حاصل کیے تھے۔ اسلحہ اس کے لیے کھلونا بن گیا تھا اور تباہی کے مناظر ٹی وی اسکرین پر چلتے کسی فلمی سین سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ دو تین ڈاکوؤں میں ایسا بھی ہوا تھا کہ انہوں نے کسی اونچی دیواروں والی مضبوط حویلی کے اندر گھسنے کے لیے ڈائنامائٹ کا استعمال کر کے اپنے لیے راستہ بنایا تھا۔ ایک ضدی سیٹھ کی نمبروں والی تجوری کا نمبر اس سے نہ اگلوا پانے کی صورت میں بھی تجوری کا دروازہ اڑانے کے لیے ڈائنامائٹ ہی کام آیا تھا چنانچہ وہ اس کے استعمال سے واقف تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اسے اس وقت استعمال کیے گئے ڈائنامائٹ کے مقابلے میں یہ موجودہ اسٹکس زیادہ جدید اور طاقتور محسوس ہو رہی تھیں۔ ان کو تجربہ گاہ کے ہر حصے میں پھیلاتا ہوا وہ اس کمرے تک پہنچ گیا جہاں ایڈی اور اس کے دو ساتھی جانوروں کی طرح پنجرے نما بیرکوں میں موجود تھے۔ وہ اس سارے قصے کے سب سے مظلوم کردار تھے اور وہ ہرگز بھی انہیں کچھ دیر بعد ہونے والی تباہی کا حصہ نہیں بنا سکتا تھا چنانچہ بلند آواز میں انہیں ہونے والی کارروائی سے آگاہ کرتے ہوئے ان کے بیرکوں کے لاک کھول دیے اور یہ مژدہ سنایا کہ آج سے وہ آزاد ہیں اور جہاں چاہے جا سکتے ہیں۔ باقی دو نے تو یہ خبر بہت خوش ہو کر سنی لیکن ایڈی کے چہرے پر محض ایک افسردہ سی مسکراہٹ ہی آ سکی۔

”کیا بات ہے ایڈی! کیا تم یہاں سے نہیں جانا چاہتے؟“ اسلم نے تیز لہجے میں اس سے پوچھا۔

”جانا چاہتا ہوں لیکن کیسے جا سکتا ہوں؟“ اس نے اپنی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا تو اسلم کو اس کا مسئلہ یاد آیا۔

مارک نے اس کی ٹانگ میں گولی ماری تھی۔ بعد میں گولی تو آپریشن کر کے نکال لی گئی تھی لیکن بہرحال ایڈی اس لائق نہیں تھا کہ اپنی زخمی ٹانگ کے ساتھ بھاگ دوڑ کر سکے۔ اس نے تو اسے آزاد کروانے کے لیے اپنی بیرک سے اس کی بیرک تک کا فاصلہ بھی نہ جانے کتنی دقتوں سے طے کیا تھا۔ اس کی اس مشکل کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ وہ دوبارہ اس جگہ سے ہلا نہیں تھا اور نڈھال سا اب تک وہیں ایک دیوار سے پشت لگائے بیٹھا تھا۔ دیکھا جائے تو موجودہ حالات میں وہی اسلم کا سب سے بڑا محسن تھا۔ اس کی یہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش نے اسلم کو زیرِ زمین تجربہ گاہ کی موجودگی سے باخبر کیا تھا اور وہی تھا جس نے مارک کی جیب سے چابیاں پار کر کے اس کی رہائی کا انتظام کیا تھا۔ اپنے اس محسن کو وہ بھلا کیسے نظرانداز کر سکتا تھا چنانچہ بنا کچھ بولے اسے اپنے کندھے پر اٹھایا اور اس کمرے تک چھوڑ آیا جہاں ماہ بانو موجود تھی۔ باقی دو تو پہلے ہی اچھلتے کودتے باہر نکل چکے تھے۔

”تم دونوں تھوڑی دیر میرا انتظار کرو۔ میں اپنا کام مکمل کر کے ابھی واپس آتا ہوں۔“ انہیں ہدایت دے کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ ماہ بانو جو اپنے طور پر یہاں سے نکلنے کی تیاری کر چکی تھی، ایڈی کو دیکھنے لگی۔ اس کا تروتازہ نظر آنے والا چہرہ خاصا خون بہہ جانے کے باعث کچھ زرد پڑ گیا تھا لیکن بہرحال وہ ویسا ہی معصوم اور پُرکشش لگ رہا تھا جیسا اس نے اسے پہلی بار دیکھنے پر پایا تھا۔ ایڈی سے اپنی پہلی ملاقات یاد آنے پر اس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں اور یاد آ گیا کہ ایڈی کے لمس نے اس کے اندر کیا احساس جگایا تھا۔ وہ اپنے عجیب و غریب حلیے کے ساتھ مرد نما بچہ یا بچے نما مرد تھا جس سے ایک عورت کی حیثیت سے اسے کچھ خائف سی ہو رہی تھی۔ مسلسل نظریں جھکا کر بیٹھے ایڈی نے شاید اس کی یہ کیفیت بھانپ لی چنانچہ نظریں اٹھائے بغیر ہی دھیرے سے بولنے لگا۔

”آئی ایم سو سوری میڈم! میری وجہ سے اس رات آپ کو یقیناً کافی کوفت اٹھانی پڑی تھی لیکن یقین کریں کہ مجھے بہت شرمندہ ہوں اور آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے مجھے معاف کر دیں گی کیونکہ میری ماں بھی بالکل آپ ہی کی طرح ایک معصوم عورت تھی جو ان لوگوں کی قید میں رہ کر میرے جیسے غیر بچے کو جنم دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ میں جو ہوں اور جیسا ہوں، اس میں قدرت سے زیادہ ان انسانی ہاتھوں کی چھیڑ چھاڑ کا قصور ہے جو اپنے نہ جانے کن مقاصد کے حصول کے لیے

کئی تجربات کر رہے ہیں۔“ ایڈی جوں جوں بولتا جا رہا تھا، ماہ بانو کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات کے ساتھ ساتھ بے پناہ خوف کی کیفیت بھی پیدا ہو رہی تھی۔ یہ خوف اپنے ہونے والے بچے کے لیے تھا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ کیا اس کا بچہ بھی ایک ایب نارمل بچہ ہوگا؟

”چلو بھئی، اب رکنے کا وقت نہیں ہے۔ اس جگہ کو تباہ ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“ اس سے قبل کہ وہ مزید کچھ سوچتی، اسلم عجلت بھرے انداز میں وہاں آ کر بولا اور ایڈی کو اپنے شانے پر اٹھا لیا۔ ماہ بانو دیکھ رہی تھی کہ اسلم خود بھی زخمی ہے۔ خصوصاً اس کے چہرے پر کئی چھوٹے بڑے زخم تھے جو ولسن کے تجربہ گاہ کا سامان پھینک پھینک کر مارنے سے آئے تھے۔ ان زخموں میں پیشانی کا زخم ذرا زیادہ گہرا تھا جس سے خون نکل کر جم گیا تھا لیکن ان کے پاس موقع نہیں تھا کہ وہ مرہم پٹی کے جھنجٹ میں پڑ سکتے۔ ناچار ماہ بانو کو اپنے دل پر جبر کرنا پڑا اور وہ اسلم کے پیچھے اس قید خانے سے باہر کی دنیا کی طرف جانے لگی جہاں اسے ڈاکٹر طارق کے دھوکے نے پہنچا دیا تھا۔

☆☆☆

گاندھی نگر سے ممبئی تک کا سفر پُل صراط کا سفر تھا جو شہریار نے بظاہر پُرسکون رہتے ہوئے اندیشوں سے بری طرح دھڑکتے دل کے ساتھ طے کیا تھا۔ شروع میں اس کا ارادہ تھا کہ ٹرک کو احمد آباد لے جائے گا جہاں کلام کے ساتھی حسبِ وعدہ مدد کے لیے موجود بھی تھے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر ڈاکٹر فرحان کو احمد آباد تک لے آیا جائے تو وہ وہاں سے ان کے پاکستان جانے کا بندوبست کر سکتے ہیں لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے شہریار کو یہ مناسب نہیں لگا۔ احمد آباد اور گاندھی نگر کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور یہ بالکل سامنے کی بات تھی کہ گاندھی نگر سے نکلنے والے سب سے پہلے وہیں کا رخ کیا گے اس لیے خدشہ تھا کہ را کے کتے وہاں ان کی بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ بھارتی ایجنسیاں انہیں گاندھی نگر میں نہ پا کر خاموش نہیں بیٹھ جائیں گی۔ وہ گاندھی نگر سے لے کر مشرقی پنجاب کے ہر گاؤں تک اپنے جاسوسوں کا جال بچھا دیں گے جس کی سرحد پاکستان سے ملتی ہوگی کیونکہ اس حقیقت سے وہ بھی واقف تھے کہ بھارت و پاکستان کے درمیان انسانوں سے لے کر ہر جنس کی اسمگلنگ کے لیے سب سے زیادہ یہی بارڈر استعمال کیا جاتا تھا۔ ان علاقوں میں پاکستانی اور بھارتی دونوں ایجنسیوں کے روابط تھے اور جس کا داؤ چل جائے، وہ وہاں کامیابی حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن موجودہ حالات میں بہرحال بھارتی ایجنسیوں کو برتری حاصل تھی۔ ڈاکٹر فرحان کو ان کی سرحدی حدود سے نکال کر لے جانے کی کوشش کی جاتی تو وہ اپنے اختیارات کا پورا پورا استعمال کر سکتے تھے جبکہ پاکستان والوں کو بہرحال سب کچھ چھپ چھپا کر کرنا تھا۔ اسے ایک ڈر یہ بھی تھا کہ گاندھی نگر سے ممبئی کے لیے نکلنے والا ڈیری کمپنی کا ٹرک اگر احمد آباد میں رکتا تو بہت سوں کے کان کھڑے ہو جاتے اور فوری طور پر ان کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کی جاتی اس لیے بہتر تھا کہ ٹرک جس روٹ پر نکلا ہے، اسے اسی پر سفر کرنے دیا جائے تاکہ شک کے مواقع پیدا نہ ہوں۔ ڈاکٹر فرحان کو ایک بار بہ حفاظت ممبئی پہنچانے کے بعد وہ ان کی بھارت سے واپسی کا کچھ نہ کچھ بندوبست کر ہی لیتے۔ فی الحال تو موجودہ حالات سے نکلنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ خوش قسمتی سے ان کا یہ سفر بخیر و خوبی انجام کو پہنچا۔ راستے میں کچھ مقامات پر معمول کی چیکنگ ضرور ہوئی لیکن ٹرک کی اس انداز میں تلاشی لینے کی کوشش نہیں کی گئی کہ جگہ جگہ پورے ٹرک کے کارٹنز اتروائے اور رکھوائے جاتے۔ طویل سفر طے کر کے وہ ممبئی کی حدود میں داخل ہوئے تو شہریار کو تھوڑا سکون محسوس ہوا اور اس نے عبدالرحمن سے رابطہ کر کے اسے اپنی موجودگی سے باخبر کیا۔

”ٹرک جس جگہ لے جایا جا رہا ہے، وہیں جانے دو۔ اپن ابھی وہاں سے تمہارے اور دوسروں کے نکلنے کا بندوبست کرتا ہے۔“ اطلاع سن کر عبدالرحمن نے اپنے مخصوص انداز میں تسلی دی چنانچہ وہ اطمینان سے اس جگہ پہنچ گئے جہاں ٹرک کو ان لوڈ کیا جانا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے ایک حد تک تو وہاں موجود لوڈرز کی مدد لی لیکن جب سلو اور ڈاکٹر صاحب کے نمودار ہونے کی حد آئی تو وہاں موجود دونوں لوڈرز کو بہانے سے ہٹا دیا۔

”شکر ہے اس قید سے نجات تو ملی... ٹانگیں اکڑ گئی تھیں ایک پوزیشن میں پڑے پڑے۔“ کارٹنز ہٹتے ہی نمودار ہونے والے سلو نے کلمۂ شکر ادا کیا۔ حقیقتاً ٹرک کے ائرکنڈیشنڈ ہونے کے باوجود بھی اس تنگ سی جگہ میں بیٹھ کر سفر کرنا ان دونوں کے لیے خاصا تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ زادِ راہ کے طور پر رکھی گئی پانی کی بوتل سے انہوں نے پانی بھی بے حد قلیل مقدار میں پیا تھا کہ زیادہ پانی پینے کی صورت میں اس کے اخراج کا مسئلہ پیش آ جاتا۔ اٹھائی جانے والی اس صعوبت نے سلو سے زیادہ ڈاکٹر فرحان پر اثر ڈالا تھا۔ وہ سلو کی نسبت عمر میں کافی زیادہ تھے اور سب سے بڑھ کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

انہوں نے اپنی زندگی کے کئی سال ان درندوں کی تحویل میں گزارے تھے جنہوں نے ان کے جسم سے تمام تر توانائیاں نچوڑنے کی پوری کوشش کر ڈالی تھی اور پانچ سال کے اس عرصے میں ان کی جسمانی صحت اپنی طبعی عمر سے تین گناہ زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ، وہ جوان آدمی نہیں رہے تھے جو ملک وقوم کے مفاد کے لیے اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ کام کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ ان کا تو وہ حال کر دیا گیا تھا کہ دوبارہ کام کے لائق ہونے کے لیے انہیں ایک عرصہ چاہیے تھا۔ شہر یار نے بڑی محبت اور احترام سے سہارا دے کر انہیں نیچے اتارا اور اس کمرے کی طرف لے گیا جہاں اس عمارت کے منیجر کی تختی لگی ہوئی تھی اور عبدالرحمن کی ہدایت کے مطابق اس کی طرف سے کوئی اشارہ ملنے تک انہیں اسی کمرے میں رہ کر انتظار کرنا تھا۔ اس کمرے تک خود کو منیجر کہنے والے شخص نے ہی ان کی راہنمائی کی تھی اور شہر یار کو یقین واثق تھا کہ یہ شخص عام سا کاروباری منیجر نہیں ہوگا بلکہ ان سارے دھندوں میں بھی حصہ لیتا ہوگا جو بھائی جی کا حقیقی ”کاروبار“ تھے۔

منیجر کے کمرے میں اٹیچڈ باتھ کی سہولت بھی موجود تھی۔ ان تینوں نے باری باری اس سہولت سے فائدہ اٹھایا۔ ان کے فریش ہو کر واپس آ بیٹھنے تک منیجر ان کے لیے ناشتے کا بندوبست کر چکا تھا۔ وہ سمجھ دار آدمی تھا جو ان کے ہر ممکن آرام کا تو خیال رکھ رہا تھا لیکن کسی قسم کے سوال جواب کی زحمت میں نہیں ڈالا تھا۔ ابھی وہ لوگ ناشتے کے آخری مراحل میں ہی تھے کہ اطلاع ملی، ان کے لیے گاڑی پہنچ چکی ہے۔ ان تینوں نے بہ عجلت ناشتا ختم کیا اور منیجر کی راہنمائی میں ہی سیاہ شیشوں والی اس گاڑی تک پہنچے جو ایک گن مین اور ڈرائیور کے ساتھ انہیں لے جانے کے لیے آئی تھی۔ منیجر سے مصافحہ کر کے وہ تینوں گاڑی کی پچھلی آرام دہ نشست پر براجمان ہو گئے۔ نئے ماڈل کی قیمتی گاڑی سبک رفتاری سے سڑکوں پر رواں دواں ہو گئی۔ ممبئی جیسے اہم اور بڑے شہر میں جہاں پولیس کی ایک بڑی نفری سڑکوں اور شاہراہوں پر ڈیوٹی دیتی ہے، وہ تین نہایت مطلوب افراد صرف اس لیے مزے سے سفر کرتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ گئے کہ وہ جس گاڑی میں سفر کر رہے تھے، وہ ممبئی کے ایک ایسے غنڈے کی ملکیت تھی جس کا راج انڈر ورلڈ میں تسلیم کیا جاتا تھا۔

”واہ میرے شیر جوانو...! تمہیں دیکھ کر اپنے کو بڑی خوشی ہوئی۔ اپن پہلے ہی جانتا تھا کہ تم اپنا کام مکمل کر کے ہی واپس لوٹے گا۔“ کوٹھی کی پورٹیکو میں عبدل نے کھلی بانہوں سے اس طرح ان کا استقبال کیا جیسے وہ اس کے دیرینہ ساتھی ہوں۔ یہ وہ کوٹھی نہیں تھی جہاں اب تک انہیں رکھا گیا تھا۔ یہ دوسری جگہ تھی۔

”کلام کا کیا حال ہے؟“ اس سے معانقہ کرنے کے بعد شہر یار نے سب سے پہلا سوال اپنے ساتھی کے بارے میں کیا۔ ٹانگ میں لگنے والی گولی کے باعث وہ اسے یہاں چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے تھے لیکن اس کا دھیان بہرحال رہا تھا۔

”وہ ایک دم فرسٹ کلاس ہے۔ ابھی اندر چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔“ عبدالرحمن نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر یقین دلایا اور اپنے ساتھ ہی لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

”پہلے ڈاکٹر صاحب کے آرام کا انتظام کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ یہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔“ عبدالرحمن ان لوگوں کو لے کر لاؤنج میں آیا تو شہر یار نے مطالبہ کیا پھر سلو سے بولا۔ ”اگر تم چاہو تو تم بھی آرام کر سکتے ہو۔“

”نہیں، میں سیٹ ہوں۔“ اس نے پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ جو تھکن ہوئی تھی، وہ مختصر جگہ پر سمٹ کر بیٹھے رہنے کے باعث ہوئی تھی۔ بعد میں چلنے پھرنے اور ہاتھ پیر کھولنے کا موقع ملا تو وہ خود کو فٹ محسوس کرنے لگا۔ شہر یار بھی اس کی فطرت سے واقف تھا چنانچہ انکار سننے کے بعد دوبارہ آرام کے لیے اصرار نہیں کیا البتہ ڈاکٹر فرحان کو ایک ملازم کے ساتھ خواب گاہ میں بھیج دیا گیا۔

”تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے۔“ ڈاکٹر فرحان کے وہاں سے جانے کے بعد عبدالرحمن نے سنجیدہ تاثرات کے ساتھ انہیں اطلاع دی۔ شہر یار منہ سے کوئی سوال کیے بغیر اس بُری خبر کو سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

”تم لوگ جس لڑکی عائشہ کے مکان میں پناہ لیے ہوئے تھے، وہاں ایک حادثہ پیش آ گیا۔ یہ نہیں پتا چل سکا کہ حادثہ کیسے ہوا بس چوکیدار نے مکان سے آگ کے شعلے اٹھتے دیکھے تو شور مچایا اور ہاؤسنگ اسکیم کے مکینوں کو جمع کر لیا۔ لوگوں نے اپنے طور پر بھی کوشش کی اور فائر بریگیڈ کو بھی بلوایا لیکن آگ بجھانے میں اتنی دیر ہو گئی کہ وہاں موجود عائشہ کا بچی زندہ نہ بچ سکا۔ لوگوں نے کوشش کی کہ عائشہ کو فون کر کے حادثے کی اطلاع دیں لیکن اس کا موبائل آف تھا۔ حالات نے عائشہ کا کردار خود ہی مشکوک کر دیا۔ وہ چوکیدار کے سامنے اپنے بچی کو ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال لے گئی تھی لیکن اس کے گھر سے اس کے بچی کی جلی ہوئی لاش ملی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

پولیس نے اسپتالوں سے پوچھ گچھ کی تو کہیں کسی اسپتال سے عائشہ کا پتا نہیں ملا۔ گاندھی نگر میں تم لوگوں کی وجہ سے جو حالات پیدا ہو گئے تھے، اس کے بعد یہ ایک چونکا دینے والا واقعہ تھا۔ چنانچہ پولیس پوری شدومد سے عائشہ کو تلاش کرنے لگی۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ عائشہ کے ڈیری فارم سے نکل کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہونے سے پہلے ہی حادثے کی خبر ٹیلی ویژن پر آ گئی اور میرے آدمیوں نے صورتِ حال واضح ہونے سے پہلے اسے جانے سے روک لیا۔ حالات پتا چلنے کے بعد تو اسے جانے دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اب تک وہ وہیں ہے اور بہت پریشان ہے۔ وہ اپنے پتی کے جنازے میں شرکت کے لیے جانا چاہتی ہے لیکن ہم اسے روکنے پر مجبور ہیں۔ اگر وہ گئی تو لازمی اریسٹ کر لی جائے گی اور اس کے بعد پولیس کے لیے یہ جاننا بالکل بھی مشکل نہیں ہوگا کہ تم لوگوں کو گاندھی نگر سے نکالنے میں ہم لوگوں کا ہاتھ ہے۔ بھائی جی بہت طاقتور ڈان ہیں لیکن کبھی اس طرح کے معاملات میں ان کا پولیس اور ایجنسیوں سے کوئی لفڑا نہیں ہوا ہے اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ ان کا نام کسی طور سامنے نہ آئے۔ اپنے پاس اس مسئلے کا ایک سادہ سا حل تو یہ تھا کہ لڑکی کو مار کر اس کی لاش کہیں پھینک دیں تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری لیکن اپن نے ایسا کوئی آرڈر صرف اس لیے نہیں دیا کہ تم کو شاید یہ اچھا نہ لگے۔''

''تم نے اچھا کیا کہ ایسا نہیں کیا۔ عائشہ ہماری محسن ہے اور ہم اپنی محسن کو نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ تم بس اتنا کرو کہ جب تک ممکن ہو، اسے پولیس کی پہنچ سے دور رکھو۔ مجھے امید ہے کہ تھوڑے دنوں میں اس کیس کی دھول بیٹھ جائے گی تو ہم عائشہ کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ابھی تو انسپکٹر پریم ناتھ بھی وہیں ہے اور اس نے بہت ہنگامہ ڈال رکھا ہوگا۔ وہ واپس آ جائے تو عائشہ کو وہاں سے نکالنے کی سوچنا۔''

اس نے عبدالرحمن کی پوری بات نہایت اطمینان سے سنی اور مشوروں سے نوازا۔ حقیقتاً اسے عبدالرحمن کی عائشہ کو قتل کروا دینے کی تدبیر سن کر بہت غصہ آیا تھا لیکن وہ محض اس لیے ضبط کر گیا تھا کہ ایک تو جانتا تھا کہ جرائم کی دنیا کے قواعد و ضوابط کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہاں لوگوں سے کام نکال لینے کے بعد انہیں ناکارہ تصور کیا جاتا ہے اور عائشہ تو ایک ایسا کردار تھا جس کی وجہ سے خود انہیں نقصان پہنچنے کا احتمال تھا اس لیے اگر عبدل نے اس کے قتل کی بات سوچ لی تھی تو کچھ انوکھا نہیں کیا تھا۔

''ٹھیک ہے، جیسا تم لوگ چاہو۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس لڑکی کا مسئلہ حل ہو جائے لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم نے بھائی جی کے مسئلے کا کیا حل سوچا ہے؟ ان کا دشمن اشوک روز بروز ترقی کر رہا ہے اور بھائی جی چاہتے ہیں کہ اب اس کا سر کچل دیا جائے ورنہ آگے چل کر وہ ان کے لیے بڑی پریشانی کھڑی کر سکتا ہے۔''

''اب ہمیں اسی مسئلے پر توجہ دینی ہے۔ ہمیں اپنا وعدہ بہت اچھی طرح یاد ہے لیکن تم خود سوچو کہ جب تک ڈاکٹر صاحب کے بھارت سے نکلنے کا انتظام نہیں ہو جاتا، ہم خود کو کسی دوسرے مسئلے میں کیسے پھنسا سکتے ہیں؟ اس طرح تو ان کے لیے حالات اور بھی خراب ہو جائیں گے، پہلے ہی بڑی مشکل ہے۔ حالات کا رخ دیکھتے ہوئے ہی ہم نے انہیں مشرقی پنجاب کے راستے سے نکالنے کی کوشش نہیں کی اور ممبئی جیسے بھرے پرے شہر میں لے کر آ گئے ہیں۔''

''وہ بندوبست بھی میں کر دوں گا لیکن یہ ہمارے اگریمنٹ میں شامل نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کام کا تمہیں بھائی جی کو معاوضہ دینا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ ارجن اگروال کے لاکر سے ہم جو کچھ لے کر آئے تھے، وہ تم لوگ رکھ لینا۔'' وہ عبدل کی بات کا مطلب فوراً ہی سمجھ گیا تھا۔ را کے اہم ایجنٹ ارجن اگروال کے گھر کارروائی کرتے ہوئے وہ لوگ اس کی تجوری سے بہت بڑی رقم اور ہیرے جواہرات بھی ساتھ لے آئے تھے۔ یہ سارا مال عبدل اور بھائی جی کے پاس ہی بطور امانت رکھا ہوا تھا اور ظاہر ہے اتنی دولت دیکھ کر ان لوگوں کی نیت خراب ہو رہی تھی اس لیے موقع پاتے ہی اس دولت کو اپنے قبضے میں کرنے کی تدبیر بھی سوچ لی گئی تھی۔ شہریار کے لیے لوٹ کے اس مال کی کوئی اہمیت نہیں تھی اس لیے فوراً ہی اس سے دستبردار ہونے کو تیار ہو گیا تھا۔ اس کے نزدیک تو سب سے قیمتی اثاثہ بس ڈاکٹر فرحان تھے جنہیں وہ ہر حال میں یہاں سے زندہ سلامت لے جانا چاہتا تھا۔

''میں بھائی جی کو تمہاری اس آفر کے بارے میں بتاؤں گا۔ انہیں دولت کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن جن لوگوں کے ذریعے یہ کام کروایا جائے گا، انہیں بہت بھاری رقم دینی پڑے گی تب ہی وہ کام پر راضی ہوں گے۔'' عبدل کو اس کے جواب نے خوش کر دیا تھا لیکن وہ اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لیے ایسی وضاحتیں دے رہا تھا۔ شہریار کو اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا چنانچہ کسی بھی ردعمل کا اظہار کیے بغیر ایک بار پھر کلام سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر عبدل نے اپنے ایک آدمی کو بلا کر انہیں کلام تک پہنچانے کی ہدایت کی اور خود واپسی کی اجازت لینے لگا۔

''ایک اور اہم خبر دینا تو اپن بھول ہی گیا۔'' ہاتھ ملا کر رخصت ہوتے ہوئے اسے اچانک کچھ یاد آیا تو سر پر ہاتھ مارتے ہوئے ان کی طرف پلٹا۔

''کیسی خبر؟'' شہریار کے ہونٹ سرسرائے۔

''اشوک صاحب کے پاس سے اسلحے کا کنٹینر پاکستان کے لیے روانہ ہو گیا ہے۔ سنا ہے اس کا مہمان چودھری بھی دو چار دن بعد واپس جانے والا ہے۔'' اس نے واقعی بہت اہم اطلاع دی تھی۔ شہریار فوراً ہی اس سے دیگر تفصیلات پوچھنے لگا کہ اسلحہ کس راستے سے لے جایا جا رہا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے کیا انتظامات ہیں۔ عبدل اس سلسلے میں اسے چند ادھوری معلومات ہی فراہم کر سکا لیکن یہ بھی بہرحال اس کے لیے اہم تھیں جن کی بنیاد پر وہ آئندہ کوئی نہ کوئی لائحہ عمل طے کر ہی لیتا۔ البتہ یہ طے تھا کہ اس سلسلے میں وہ خود اپنے طور پر کچھ نہیں چلا سکے گا اور پاکستان میں بیٹھے اس کے ساتھیوں کو ہی کچھ کرنا پڑے گا۔

''آپ کو کامیاب و کامران اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' عبدل کو رخصت کر کے وہ لوگ کلام سے ملنے پہنچے تو اس نے کھلی بانہوں اور جگمگاتی آنکھوں سے ان کا استقبال کیا۔

''خوشی تو تمہیں دیکھ کر بھی ہو رہی ہے۔ تم پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہو۔'' شہریار نے فوراً ہی محبت سے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ کلام پہلے کی نسبت واقعی بہت بہتر ہو گیا تھا اور اس کے چہرے سے وہ زردی غائب ہو گئی تھی جو خون بہت زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ اتنی جلدی اس کے اندر در آنے والی تبدیلی کا مطلب تھا کہ اس کا یہاں بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ خود کلام نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ یہاں اسے بہترین سہولیات فراہم کی جا رہی تھیں۔

''یہ بہت اچھی بات ہے۔ تم ذہنی طور پر بھی خود کو تیار کر لو۔ اب تمہیں جلد ہمارے ساتھ یہاں سے نکلنا ہوگا۔ یہاں کے چند معاملات ہیں، وہ نمٹ جائیں تو میں عبدالرحمن بھائی جی سے جلد از جلد یہاں سے واپسی کا مطالبہ کروں گا۔'' اس نے کلام کو تسلی دی۔

''یہ لالچی لوگ ہیں۔ ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے رقم تو آپ انہیں دے چکے ہیں، اس کے علاوہ اور بھی منہ کھولیں گے۔'' اب تک خاموشی سے سب کچھ دیکھتے اور سنتے سلو نے لب کشائی کرتے ہوئے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''انہیں منہ کھولنے دو۔ ضرورت پڑنے پر کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا۔'' شہریار نے اسے تسلی دی لیکن حقیقتاً ان جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں میں کھیلنا خود اسے بھی کھل رہا تھا۔

☆☆☆

ایڈی کا وزن زیادہ نہیں تھا لیکن اسلم نے اس کے ساتھ ہی اپنا بیگ بھی اٹھایا ہوا تھا۔ پھر بہت دنوں کی بے آرامی اور آوارہ گردی بھی تھی جس نے جسم کے ہر حصے میں تھکن بھر دی تھی چنانچہ اس کے جسم کو ایڈی کا بوجھ اچھا خاصا محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ اسے نیچے نہیں اتار سکتا تھا۔ ایڈی اپنی زخمی ٹانگ کی وجہ سے چلنے کے قابل نہیں تھا اور ان کے سامنے طویل و دشوار مسافت تھی۔ یہ ایڈی ہی تھا جس کی وجہ سے وہ ماہ بانو سمیت زیرِ زمین تجربہ گاہ سے نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے اس لیے ایڈی کو بے یار و مددگار چھوڑ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے ماہ بانو کی طرف سے بھی فکر لاحق تھی۔ وہ جس حالت میں تھی، اس کے لیے یہ مشقت بہت کڑی تھی۔ جنگل کا یہ سفر کسی سیدھی سادی شاہراہ پر چلنے جیسا نہیں تھا۔ یہاں قدم قدم پر رکاوٹیں اور دشواریاں تھیں۔ کہیں راستہ ناہموار تھا تو کہیں زمین اس حد تک نرم کہ پاؤں دھنس جائیں۔ زمین پر بچھی جنگلی بیلیں پھندے کی طرح پیروں سے لپٹ کر قدموں کو جکڑ لیتی تھیں تو پتوں کی سرسراہٹ کے ساتھ ہی قریب سے کسی خطرناک سانپ یا جانور کے گزر جانے کا گمان ہوتا تھا۔ اس سب کے باوجود ماہ بانو بہت ہمت اور بلند حوصلے سے آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک ہی بری طرح لڑکھڑا کر گری۔ اس سے دو قدم پیچھے چلتے اسلم نے فوراً ایڈی کو نیچے اتارا اور ماہ بانو کی طرف لپکا۔ وہ زمین پر گری ہوئی ہولے سے کراہ رہی تھی۔ اسلم نے دیکھا کہ اس کا دایاں پاؤں ایک بیل میں الجھ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ گر گئی تھی۔ اس نے اپنا خنجر نکال کر بیل کو کاٹا اور پھر ماہ بانو کے اس گھٹنے کی طرف دیکھا جسے وہ پکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ گرنے کی وجہ سے اس کا گھٹنا چھل گیا تھا اور گھٹنے پر سے پھٹ جانے والے ٹراؤزر میں سے خون کی سرخی نظر آ رہی تھی۔ اس کا خون بہتے دیکھ کر اسلم کے دل کو دھچکا لگا۔ ماہ بانو وہ عورت تھی جسے وہ ہمیشہ پھولوں کی سیج پر بٹھائے رکھنا چاہتا تھا۔۔۔ جس نے اس کے اندر دوبارہ زندگی جینے کی چاہت پیدا کی تھی اور جس کی خاطر وہ اپنی تمام نفرتیں اور دشمنیاں فراموش کر بیٹھا تھا لیکن عجب بے بسی تھی کہ اپنی تمام تر خواہش

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے باوجود وہ اسے ایسی زندگی دینے سے قاصر تھا جس میں سکون اور شانتی ہو۔ یہ ان دونوں میں سے جانے کس کی قسمت کا الٹ پھیر تھا کہ زندگی چند دن سے زیادہ سیدھی شاہراہ پر سے گزرتی تھی اور پھر پٹڑی سے نیچے اتر آتی تھی۔ پٹڑی سے اُتری ہوئی زندگی کو چلانا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ قدم قدم پر اپنی بے بسی کا احساس ہوتا تھا اور پھر حوصلوں کو یکجا کر کے چلنے کی جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔

''کیا ہوا... بہت درد ہو رہا ہے کیا؟'' اس نے ماہ بانو کی آنکھوں میں اترتی نمی کو دیکھ کر استفسار کیا اور اسے سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ بس اچانک ہی پیر الجھ گیا تھا اس لیے خود کو سنبھال نہ سکی۔'' اس کے سہارے سے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اپنی اعلیٰ ہمتی کا مظاہرہ کیا۔

''تم چل تو سکو گی نا؟'' اسلم کی تشویش اپنی جگہ برقرار تھی۔

''آپ فکر مت کریں، مجھے بس معمولی سی چوٹ لگی ہے۔'' ماہ بانو نے مسکرا کر اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ حالانکہ سچ یہ تھا کہ وہ اچھی خاصی تکلیف محسوس کر رہی تھی لیکن اس پر صرف اس لیے ظاہر نہیں کر رہی تھی کہ وہ اس کی وجہ سے کسی امتحان میں نہ پڑ جائے۔ ایڈی کی حالت اس کے بھی سامنے تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اسلم نے اسے نہ اٹھایا تو وہ اس جنگل میں اپنے بل بوتے پر زیادہ سفر نہیں کر سکے گا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، آگے بڑھتے ہیں۔ ابھی ہم خطرے کی حد سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ ہم جتنا زیادہ فاصلہ طے کر سکیں، اتنا ہی بہتر ہے۔'' مطمئن اسلم بھی نہیں تھا لیکن حالات نے اسے ماہ بانو کی بات پر یقین کر لینے پر مجبور کر دیا اور وہ ایک بار پھر ایڈی کو اپنے شانے پر لاد کر چل پڑا۔ ماہ بانو اب اس کے بالکل ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور اس نے سہارے کے لیے اسلم کا بایاں بازو تھام رکھا تھا۔ ایڈی کے ساتھ ہی اسلم نے اسی جیسے اس کے دونوں ساتھیوں کو بھی آزادی دلائی تھی۔ وہ دونوں کچھ فاصلے تک انہیں اپنے آس پاس دکھائی بھی دیے تھے لیکن پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ان کے پاس ان دونوں کے لیے غور و فکر کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ اسلم تجربہ گاہ میں جو ڈائنامائٹ لگا کر آیا تھا، ان کے بارے میں اس کا اندازہ تھا کہ وہ آدھ گھنٹے بعد پھٹنا شروع ہو جائیں گے۔ ڈائنامائٹ کے پھٹنے کے لیے اس مہلت کا بندوبست اس نے خود ہی کیا تھا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ دھماکوں سے پہلے وہ لوگ محفوظ فاصلے پر پہنچ جائیں۔ اسے ان دھماکوں کے دیگر نتائج کا بھی اندازہ تھا۔ دھماکے ہوتے تو آگ بھی بھڑکتی اور جنگل میں بھڑکنے والی آگ کیسی خطرناک اور تباہ کن ہوتی ہے، یہ کوئی عام فرد بھی سمجھ سکتا تھا۔ اس نے تو خیر اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ جنگل میں گزارا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ ہر ممکن پھرتی کے ساتھ جلد از جلد خطرے کی حد سے باہر نکل جائیں۔

خطرے کے ادراک کی وجہ سے ہی وہ ماہ بانو کو بھی مشقت میں ڈالے اپنے ساتھ جلدی جلدی چلنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس اعصاب شکن صورتِ حال میں اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ شاید اس نے تجربہ گاہ کی تباہی کا انتظام کر کے کوئی غلطی کر دی ہے۔ اگر وہ یہ انتظام نہ کرتا تو کم از کم فوری خطرہ ان کے سروں پر نہ منڈلا رہا ہوتا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود ہی اپنے فیصلے کو درست قرار دے دیا۔ اس تجربہ گاہ میں جو شیطانی تجربات کیے جا رہے ہیں، ان سے دیگر انسانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے تجربہ گاہ کی تباہی ٹھیک تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ایسی تجربہ گاہیں بنانے کے لیے بہت کثیر سرمایہ اور وقت صرف ہوتا ہے اور ان کا دوبارہ قیام اتنی آسانی سے ممکن نہیں ہوتا اس لیے دیکھا جائے تو تجربہ گاہ کی تباہی انسانیت دشمن امریکیوں اور اسرائیلیوں کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ ثابت ہوتی۔ اگر وہ تجربہ گاہ کی تباہی کا بندوبست کر کے نہ آتا تو بعد میں وہ لوگ محض تھوڑے سے افرادی نقصان کے ساتھ دوبارہ اپنی سرگرمیاں شروع کر دیتے لیکن اب یہ سب آسان ثابت نہیں ہوتا۔ تجربہ گاہ کے ساتھ وہاں موجود تحقیقی مواد اور قیمتی آلات و کیمیکلز وغیرہ بھی ضائع ہو جاتا۔ اس شیطانی تحقیق میں ڈاکٹر اسمتھ کے دستِ راست ولسن کو بھی ان دھماکوں میں ختم ہو جانا تھا۔ اسلم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے گولی نہیں مارے گا اور وہاں زندہ چھوڑ کر جائے گا۔ اس نے اپنا وعدہ نبھایا تھا اور ولسن کو وہاں زندہ حالت میں چھوڑ کر آیا تھا۔ بعد میں وہ دھماکوں کے نتیجے میں مارا جاتا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ اگرچہ ولسن نے خود کو مجبور اور بے بس ظاہر کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن اسلم اس کے مؤقف سے قائل نہیں ہو سکا تھا۔ صرف اپنے اور اپنے خاندان کی زندگی بچانے کے لیے بہت سوں کی زندگیاں تباہ اور ختم کر دینے کے عمل میں شریک ہو جانے کا اخلاقی جواز نہیں بنتا ہے، وہ بھی اس صورت میں کہ آپ اپنی ان غیر اخلاقی خدمات کے عوض خطیر معاوضہ وصول کر رہے ہوں اور آپ کا خاندان بھرپور عیش و عشرت کی زندگی گزارنے میں مصروف ہو۔

''اب اور کتنا چلنا ہے؟'' ماہ بانو شاید تھکنے لگی تھی جو اس نے ہانپتے ہوئے اسلم سے دریافت کیا۔ اسلم نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''بس تھوڑی ہمت اور کرو پھر ہم اس راستے تک پہنچ جائیں گے جو سیدھا جنگل سے باہر جاتا ہے۔''

حقیقت میں ایسا کوئی راستہ فی الحال ان کے سامنے تھا ہی نہیں۔ وہ خود اس جنگل کی وسعتوں میں کئی دن بھٹکنے کے بعد تجربہ گاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ واپسی میں کتنا وقت لگ جائے گا۔ اس کے بیگ میں نقشہ اور کمپاس موجود تھا لیکن ان سے مدد بھی وہ محفوظ فاصلے پر پہنچنے کے بعد لینا چاہتا تھا۔ ابھی تو بس یہی فکر دامن گیر تھی کہ دھماکوں سے قبل جتنا فاصلہ طے کیا جا سکتا ہے کر لے پھر آگے کی بعد میں دیکھی جاتی۔ اس کی یہ خواہش خاصی حد تک پوری ہوئی اور جب پہلے دھماکے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اتنی مدھم تھی کہ ماہ بانو اور ایڈی سمجھ بھی نہیں سکے کہ کیا ہوا ہے۔

''لیٹ جاؤ... زمین پر لیٹ جاؤ۔'' اس نے چیخ کر ماہ بانو سے کہا اور خود بھی ایڈی سمیت نیچے لیٹ گیا۔ ان کے لیٹتے ہی پے در پے کئی دھماکے ہوئے اور زمین لرزتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''یا اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اسلم کی کارروائی سے ناواقف ماہ بانو نے لرزتی... آواز میں کہا۔

''تجربہ گاہ کی تباہی۔'' اسلم نے اسے مختصراً آگاہ کیا، جواب میں اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور چپ چاپ نیچے پڑی رہی۔ شوخ مزاج ایڈی بھی اس وقت خاموش تھا۔ اس کی ٹانگ کا زخم تکلیف دے رہا تھا لیکن وہ اپنی مضبوط قوتِ ارادی سے کام لیتے ہوئے اس تکلیف کو ظاہر کرنے سے گریزاں تھا۔ آخر کار مسلسل جاری دھماکوں کا سلسلہ تھما تو وہ لوگ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھے اور پہلی بار پانی کے چند گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اتارے۔ پانی پینے کے بعد اسلم اپنے بیگ سے نقشہ اور کمپاس نکالا اور راستے کا تعین کرنے لگا۔ ایڈی بھی اس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ اپنی عمر سے قطع نظر ذہنی طور پر وہ بہت پختہ تھا اور کسی بالغ فرد کی طرح مفید مشورے دینے کا اہل بھی۔ اس لیے اسلم کو اس کی شمولیت پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔ ان کی اس مصروفیت کے دوران ماہ بانو کچھ دیر تو بیٹھی رہی پھر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ کھڑے ہو کر اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظر دور موجود ایک سرخ بگولے جیسی شے پر پڑی۔

''یا میرے اللہ! وہ کیا ہے؟'' وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بہت زور سے بولی تو اسلم اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا اور اس سمت دیکھنے لگا جہاں وہ ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھی۔

''جنگل میں دھماکوں کی وجہ سے آگ لگ گئی ہے۔'' بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے ماہ بانو کو آگاہ کیا تو وہ سراسیمہ ہو گئی۔

''آگ... جنگل میں آگ۔'' لفظ سرسراتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے نکلے۔

''ہاں، جنگل میں آگ لگ گئی ہے لیکن یہ ابھی بہت دور ہے... اگر ہم نے ہمت اور مستقل مزاجی سے کام لیا تو انشاء اللہ کسی مصیبت میں پڑے بغیر یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' اس نے بڑے یقین سے ماہ بانو کو حوصلہ دیا لیکن اپنی طرف لپکتی آگ کے شعلوں کو سامنے دیکھ کر حوصلہ پکڑنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی اور زیرِ لب بڑبڑائی۔

''اے میرے اللہ! اور کتنے امتحان باقی ہیں میری زندگی کے؟ میں کبھی مصیبتوں کے اس گرداب سے نکل بھی پاؤں گی یا نہیں؟''

☆☆☆

''آؤ جاوید! کہو تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟''

''سو سو سر! گو وندا سے ہم نے بہت کچھ اگلوا لیا تھا اور ان معلومات کی روشنی میں خاصی سرگرمی بھی دکھائی لیکن آپ جانتے ہیں کہ چند چھوٹی مچھلیوں اور اسلحے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔'' جاوید علی جو سمجھ رہا تھا کہ ذیشان نے اسے خاص طور پر بلوا کر جو قصہ چھیڑا ہے، وہ اصل بات کے لیے محض تمہید ہی ہے ورنہ انچارج کی حیثیت سے ذیشان کو ہر بات کی اچھی طرح خبر ہے۔

''یہ بھی کم نہیں ہے۔ غیر قانونی اسلحے اور اس کے ان چھوٹے چھوٹے ڈیلروں نے حقیقت میں بڑی تباہی مچا رکھی ہے۔ اسلحہ اتنا عام ہونے کی وجہ سے آج حالات اس نہج پر پہنچ گئے ہیں کہ لوگ پچاس کے ایک نوٹ کے پیچھے بھی بے دریغ ایک دوسرے پر گولیاں چلا دیتے ہیں۔'' ذیشان نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو وہ اس سے اختلاف نہیں کر سکا۔ یہ تو واقعی وہ خود بھی دیکھ رہا تھا کہ اسکول جانے کی عمر کے بچوں کے پاس بھی ہتھیار نظر آنے لگے تھے۔ وہ ان ہتھیاروں کی تباہی کو سمجھے بغیر خود کو طاقتور محسوس کرتے ہوئے ہیرو سمجھتے تھے۔ ان بچوں کے ہاتھوں میں کتاب اور قلم کی جگہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہتھیاروں کا ہونا اتنا بڑا المیہ تھا کہ پوری قوم کو اس پر ماتم کی ضرورت تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہاری طبیعت کی بے چینی کو چھوٹی چھوٹی کامیابیوں سے سکون نہیں ملتا اس لیے خود بھی تمہارے لیے ایسے ٹاسک تلاش کرتا رہتا ہوں جن سے تمہاری افتادِ طبع کی تسکین ہو سکے۔" ذیشان نے بولنا شروع کیا تو جاوید علی الرٹ ہو کر بیٹھ گیا اور اس کی بات غور سے سننے لگا کیونکہ اس بات سے ظاہر تھا کہ اس کے لیے کوئی کام نکل آیا ہے۔

"کچھ دیر پہلے ہی مجھے اطلاع ملی ہے کہ بھارت سے جدید اسلحے سے بھرا ایک کنٹینر پاکستان لایا جا رہا ہے۔ یہ اسلحہ اتنا جدید اور ہلاکت خیز ہے کہ اس کا منڈی میں پہنچنا ان دہشت گرد گروہوں کی چاندی کر دے گا جس کا مقصد ہی پاکستان میں تباہی و بربادی پھیلانا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس اسلحے کو پاکستان کے مختلف شہروں میں پھیلنے سے قبل ہی سرحد پر روک لو۔"

"میں حاضر ہوں سر۔" ذیشان کی بات سن کر اس نے کسی فوجی کی سی مستعدی و فرمانبرداری سے جواب دیا۔

"بارڈر پر اس سلسلے میں اطلاعات بھجوا دی گئی ہیں اور وہ لوگ اپنے طور پر ہوشیار بھی رہیں گے لیکن یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ کسی بھی قسم کی اسمگلنگ کرنے والے ایسے درجنوں چور راستوں سے واقف ہوتے ہیں جن پر قانون اور فوج کی نظر نہیں ہوتی۔ میرا اندازہ ہے کہ اسلحے سے بھرا وہ کنٹینر بھی ایسے ہی کسی راستے سے پاکستان لایا جائے گا اور تمہیں ہر حال میں اسے پکڑنا ہوگا۔" ذیشان نے اس پر زور دیا۔

"آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ سر۔" جواب میں جاوید علی نے اسے یقین دہانی کروائی اور اس معاملے میں اپنی پوری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ "کیا اس سلسلے میں آپ کے پاس کوئی کلیو ہے سر؟"

"کچھ خاص نہیں۔ بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ اسلحہ جس کنٹینر سے لایا جا رہا ہے، وہ بھارت کے ایک ایسے فروٹ فارم کا ہے جس کا مالک ممبئی کا ایک بہت بڑا غنڈا اشوک بتایا جاتا ہے۔ اس کنٹینر میں بظاہر فروٹ ہی ہوں گے لیکن خفیہ خانوں میں اسلحہ چھپایا گیا ہوگا۔ اس اسلحے کے لیے بھارت جا کر چودھری افتخار عالم نے اشوک سے ڈیل کی ہے۔ وہ خود تو فی الحال ممبئی میں ہی ہے لیکن یہاں ظاہر ہے کہ اس کے آدمیوں میں سے ہی کوئی اس معاملے کو دیکھے گا۔ تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں نے ایک بڑے ہیلی کاپٹر کا انتظام کر دیا ہے جو تمہیں لے کر کسی قریبی سرحدی گاؤں تک پہنچا دے گا۔ اس کام کے لیے تم اپنی ٹیم کا انتخاب خود کر سکتے ہو اور اس کے علاوہ بھی جس چیز کی ضرورت ہو بتا سکتے ہو۔" ذیشان نے ..... سنجیدگی کے ساتھ اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"تھینک یو سر! باقی سب کچھ تو میں خود ہی دیکھ لوں گا لیکن ہو سکے تو آپ میرے لیے ایک ایسے بندے کا انتظام کر دیں جو بھارت اور پاکستان کے درمیان ہونے والی اسمگلنگ سے منسلک ہو..... کیونکہ میرا خیال ہے کہ چور راستوں تک رسائی کے لیے ایک اسمگلر سے بڑھ کر کوئی راہنمائی نہیں کر سکے گا۔" اس نے اپنی خواہش بیان کی تو ذیشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ویری نائس..... تم نے بالکل ٹھیک سوچا۔ ایسے آدمی کا بندوبست ہو جائے گا لیکن ظاہر ہے وہ آدمی تمہیں اسی وقت ملے گا جب تم سرحد کے قریب پہنچو گے کیونکہ وہ وہیں کا کوئی مقامی بندہ ہوگا۔" جاوید علی کو سراہتے ہوئے اس نے اسے جواب دیا۔

"میں براہِ راست کسی سرحدی گاؤں تک ہیلی کاپٹر سے جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ اچانک گاؤں میں ہیلی کاپٹر اترنے سے لوگ چوکنے ہو جائیں گے اور ہماری کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہماری آمد زیادہ سے زیادہ خفیہ رہے۔"

"اس کے لیے تم فکر نہ کرو۔ تم لوگ سامان بردار ہیلی کاپٹر میں جاؤ گے۔ پاک فوج کا ایک ہیلی کاپٹر اکثر سپاہیوں کی ضرورت کا سامان لے کر وہاں جاتا رہتا ہے اس لیے کسی کو شک بھی نہیں ہوگا کہ ہیلی کاپٹر میں کون لوگ سوار ہیں۔" سینئر ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے وہ خود ہر پہلو سے معاملے کا جائزہ لے چکا تھا چنانچہ اسے تسلی دی اور بولا۔ "اور کوئی سوال؟"

"نو سر۔" جاوید علی نے جواب دیا۔

"بس تو پھر تیاری کر لو۔ آدھ گھنٹے بعد تمہاری روانگی ہے۔" اس نے گویا جاوید علی کو ملاقات کے اختتام کا اشارہ دیا۔ جاوید علی اٹھا اور اسے سیلیوٹ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اپنی ٹیم میں وہ تین افراد کو شامل کر سکتا تھا۔ ان تین کے علاوہ اگر اسے مزید افرادی قوت کی ضرورت پڑتی تو وہ سرحد پر تعینات فوج کے جوانوں میں سے کسی سے رابطہ کر سکتے تھے لیکن ایسا انتہائی صورت میں ہی کیا جاتا کیونکہ سی ایف پی ایک انتہائی خفیہ ادارہ تھا جس کے بارے میں وفاقی حکومت تک کو معلوم نہیں تھا اور بس فوج کے ہی چند خاص ذمے داران کو اس کے بارے میں آگاہی تھی۔ سی ایف پی کے

...کو خاص مواقع کے لیے ایک کارڈ ضرور جاری کیا ...جس پر لگی ہوئی مہروں اور دستخطوں سے ثابت ہوتا تھا ...کے ایک ایسے ادارے سے منسلک ہیں جو ملک ...کے لیے بہت سے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے ...دار ہیں لیکن اس کارڈ کا استعمال انتہائی حالات میں ...کرنے کی اجازت تھی اور سی ایف پی کا کوئی نوجوان اسے ...رعب و دبدبہ دکھانے کے لیے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

ٹیم کا انتخاب کرنے میں جاوید علی کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ان میں سے ایک تو مسلمان ہی تھا۔ باقی دو بھی وہ ...جو بہت پھرتیلے اور پُرجوش سمجھے جاتے تھے۔ ان کی ضرورت کا اسلحہ اور دیگر سامان پہلے ہی ذیشان کے حکم کے مطابق تیار کروا دیا گیا تھا۔ جاوید علی نے بس ایک نظر اس ...سامان کو دیکھا اور اوکے کر دیا کہ اس میں ان کی ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ منزل تک پہنچنے تک ان چاروں نے ...اپنا سارا وقت ان نقشوں کو دیکھنے اور ان پر بحث کرتے ...گزارا جو پاکستان اور بھارت کی سرحدی پٹی کو واضح کرتے تھے۔ ان نقشوں کو دیکھ کر انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ان ...چار افراد کے لیے یہ مشن بہت مشکل ثابت ہوتا۔ وہ ...کہاں کہاں نظر رکھ سکتے تھے لیکن بہرحال ان کے پاس ...کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ انہیں اپنی بہترین صلاحیتوں ...کار لاتے ہوئے یہ ثابت کرنا تھا کہ ان کا سی ایف ...کے لیے انتخاب بلاوجہ نہیں تھا بلکہ وہ اس کے حق دار تھے ...جب وہ سامان بردار ہیلی کاپٹر سے ایک سرحدی چوکی ...ہیلی پیڈ پر اترے تو یہ بھول چکے تھے کہ ان کا کام کتنا ...تھا..... بس ان کے دل میں یہ عزم تھا کہ انہیں ہر حال ...مشن مکمل کرنا ہے۔ چوکی پر تعینات پاک فوج کے ...دار نے پُروقار انداز میں ان کا استقبال کیا۔

"کوئی اہم خبر؟" جاوید علی نے اس سے مصافحہ کرتے ...دریافت کیا۔

"ابھی تک کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی ہے۔ ہاں، ...مطابق اشوک فروٹ فارم کا ایک کنٹینر ضرور آیا ...میرے آدمیوں کو اس کی بھرپور تلاشی لینے کے ...کچھ نہیں ملا ہے۔ میں نے پھر بھی احتیاطاً کنٹینر کو روک ...کیونکہ مجھے اطلاع مل گئی تھی کہ آپ لوگ یہاں آنے ...تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ایک بار آپ کو بھی اس ...لینے کا موقع دے دیا جائے تو ممکن ہے کہ وفاقی ...وہ ڈھونڈ نکالیں جو ہمیں دکھائی نہیں دے

سکا ہے۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ شاید اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ بارڈر سے اسمگلنگ کے معاملے کو دیکھنے کے لیے مرکز سے لوگ بھیجے گئے تھے۔ یہ ایک طرح سے انہیں نااہل سمجھے جانے کے مترادف تھا۔

"ٹھیک ہے، ہم اسے چیک کر لیں گے۔ آپ یہ بتائیں کہ ہمارا مطلوبہ آدمی یہاں پہنچ گیا ہے یا نہیں؟" میجر اسد کا بیج سینے پر لگائے چوکی کے انچارج کا لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنے مطلب کی بات کی۔

"جی ہاں، وہ موجود ہے۔ نذر محمد..... ملک کو لے کر آؤ۔" میجر اسد نے اسے جواب دینے کے ساتھ ہی اپنے ماتحت کو حکم دیا۔ فوراً ہی ان کے سامنے تقریباً چالیس سال کا ایک لمبا تڑنگا اور گورا چٹا آدمی پیش کر دیا گیا۔ یہ ملک سبحان تھا جو اپنی گھنی مونچھوں اور داڑھی کے باوجود خاصا وجیہہ لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے شانوں تک آتے گھنگرالے بال بھی اس پر بُرے نہیں لگ رہے تھے۔ اس نے کلف لگے سفید شلوار قمیص پر سرمئی رنگ کی چادر خاص انداز سے اوڑھ رکھی تھی اور پیروں میں چمڑے کی قیمتی سینڈل تھی۔ اس کی انگلیوں میں موجود انگوٹھیوں میں جڑے نگینے بھی خاصے بیش قیمت معلوم ہوتے تھے۔ مجموعی طور پر وہ شاندار شخصیت کا مالک تھا اور کسی اسمگلر سے زیادہ زمیندار یا سردار محسوس ہوتا تھا۔

"السلام علیکم..... فرمائیے کیسے خادم کو یاد کیا؟" میجر اسد کے تعارف کروانے پر اس نے جاوید علی سے پُرتپاک انداز میں مصافحہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہم تم سے ان راستوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جو غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے والوں کے استعمال میں رہتے ہیں۔" وہ سیدھا مطلب کی بات پر آ گیا جسے سن کر ملک سبحان ہنس پڑا۔

"بڑی عجیب بات ہے، قانون کے رکھوالے ایک مجرم سے اپنے مقصد کے لیے مدد مانگ رہے ہیں۔"

"صرف یہ سوچ کر کہ ملک سبحان بے شک ایک اسمگلر ہے لیکن ہے تو پاکستانی جو پاکستان کو مالی نقصان تو پہنچا سکتا ہے لیکن اسے تباہ ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔" اس نے ملک سبحان کے طنز کے جواب میں ایک جذباتی وار کیا جس کا اثر اس کی آنکھوں کے بدلتے تاثرات کی صورت محسوس ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ ملک سبحان اپنے وطن کی حفاظت کے لیے تمہاری مدد کرے گا۔ آپ بتاؤ کہ آپ کیوں ایسے راستوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟" اس نے گویا اپنے تعاون کا عندیہ دے دیا۔ اس وقت وہ دونوں ایک خیمے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

قائم دفتر میں تنہا موجود تھے۔ سلمان اور اپنے باقی دونوں ساتھیوں کو اس نے میجر اسد کے ساتھ اس کنٹینر کا جائزہ لینے کے لیے بھیج دیا تھا جس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ کچھ دیر قبل اشوک فروٹ فارم کے پھل لے کر آیا ہے۔ ملک کی آمادگی پاکر اس نے اسے وجہ سے آگاہ کردیا۔

"نہیں، یہ ممکن نہیں۔" اس کی بات سن کر ملک نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں ممکن نہیں؟ ہمارے پاس پکی خبر ہے۔" اس کے انکار پر جاوید علی نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

"دیکھو سر جی! میں اسی علاقے میں پیدا ہوا ہوں اور یہاں کے ہر راستے کو اپنے ہاتھوں کی لکیروں کی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایسی بہت سی جگہیں ہیں جہاں سے دونوں طرف کی فوجوں کی نظر میں آئے بغیر سرحد پار کی جاسکتی ہے لیکن یہ کوئی باقاعدہ راستے نہیں ہیں۔ ان راستوں پر سفر کرنا بھی کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ بڑی مہارت اور جی داری کی ضرورت ہوتی ہے اور ذرا سی غفلت سے بندہ اپنی جان سے جاتا ہے۔ یہ راستے ایسے نہیں ہیں کہ ان سے کوئی کنٹینر یا بڑی گاڑی آرام سے گزر جائے اور کسی کی نظر میں نہ آسکے۔ ہم اور ہمارے جو لوگ ان راستوں پر سے گزرتے ہیں، وہ زیادہ تر گھوڑے اور خچر استعمال کرتے ہیں یا پھر کبھی کبھی سیٹنگ ہوجانے پر جیپ استعمال ہوجاتی ہے لیکن کسی کنٹینر کا آنا ممکن ہی نہیں۔" ملک سبحان نے اپنی بات کی وضاحت پیش کی تو جاوید علی سوچ میں پڑ گیا۔ یہ شخص ایسا دعویٰ کررہا تھا تو پھر حقیقت کیا تھی؟ کیا انہیں ملنے والی اطلاع غلط تھی؟ لیکن اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہی تھا۔ کسی کچی اطلاع پر میجر ذیشان ہرگز اسے اور اس کے ساتھیوں کو اتنی دور نہیں دوڑا سکتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس معاملے میں صرف سرحدی محافظوں پر تکیہ کرنے کے بجائے انہیں کیوں بھیجا گیا تھا۔ اسلحے کی اس ڈیل میں چودھری بھی ملوث تھا اور اگر وہ اسے پکڑنے میں کامیاب ہوجاتے تو چودھری جیسے ملک دشمن کے خلاف ایک اہم ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے۔

"میری بات کا یقین کریں سر! اگر مال کسی کنٹینر میں آرہا ہے تو پھر وہ یہیں سے گزرے گا۔" اسے خاموش دیکھ کر ملک سبحان نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیسے؟ یہاں یہ اتنی بڑی حفاظتی چوکی قائم ہے۔ یہاں اتنا بڑا اسلحے سے بھرا کنٹینر پہنچے گا تو کیا پکڑا نہیں جائے گا؟" اسے یقین کرنے میں تامل تھا۔

"کبھی کبھی انہونی بھی ہوجاتی ہے سر جی۔" ملک سبحان نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں کہا تو وہ چونک گیا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب صاف ہے۔ اتنی بڑی ڈیل میں کوئی چھوٹی موٹی رقم تو نہیں لگی ہوگی اور جو لوگ بڑی رقوم خرچ کرتے ہیں، وہ ان کو بچانے کا پورا بندوبست بھی رکھتے ہیں۔ کروڑوں کا مال بچانے کے لیے اگر چند لاکھ اوپر سے خرچ کرنے پڑ جائیں تو یہ کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کہلائے گا۔" اس کی معنی خیز باتیں جاوید علی کو پل پل چونکا رہی تھیں۔

"تمہارا مطلب ہے کہ اس ڈیل میں سرحدی چوکی کے محافظ بھی..." وہ اپنا جملہ مکمل نہ کرسکا۔

"میرا یہی مطلب ہے کیونکہ بہرحال وہ بھی ہیں تو انسان ہی نا۔ ان کے ساتھ بھی خاندان اور خاندان کی ہزاروں ضرورتیں لگی ہوتی ہیں۔ کبھی کسی ضرورت کے بدلے میں فرض کا سودا ہوجائے یہ ناممکن نہیں ہوتا۔" ملک کی بات ایسی تھی جس پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن اس کی حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسی وقت سلمان وہاں آگیا۔

"کیا رہا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کنٹینر میں کچھ نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ فروٹس کے سوا کچھ نہیں ہے۔" اس نے وہی اطلاع دی جس کی امید تھی کیونکہ میجر اسد پہلے ہی بتا چکا تھا کہ کنٹینر کلیئر ہے۔ لیکن اسے سلمان کے تاثرات سے محسوس ہورہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔

"تم یہاں بیٹھو ملک... میں دوبارہ آکر تم سے بات کرتا ہوں۔" وہ سمجھ گیا کہ سلمان کے پاس جو بھی خبر ہے اسے ملک کے سامنے ظاہر کرنے سے گریزاں ہے اسی لیے ملک کو وہیں چھوڑ کر خود سلمان کے ساتھ باہر نکل گیا اور دونوں چلتے ہوئے ایک نسبتاً الگ گوشے میں پہنچ گئے۔

"ہاں اب کہو، کیا بات ہے؟"

"کنٹینر کی تلاشی کے دوران تین ایسی باتیں میرے علم میں آئی ہیں جو میرے نزدیک مشکوک ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"پہلی بات یہ کہ کنٹینر میں کئی خفیہ خانے بنائے گئے ہیں جو فی الحال خالی ہیں۔ ان خانوں کے بارے میں ڈرائیور کا موقف ہے کہ بعض اوقات اشوک صاحب کی پارٹی سے قیمتی ساز و سامان جیسے زیورات وغیرہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا کنٹریکٹ کرلیتے ہیں تو اس وقت یہ خانے کام آتے ہیں اور کسی کو اندازہ بھی نہیں ہو پاتا کہ پھلوں سے بھرے کنٹینر میں اور بھی کچھ جارہا ہے، اس طرح مال بحفاظت اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔"

"اپنی اس بات سے وہ خبیث اپنے اسمگلر ہونے کا اعتراف کررہا ہے۔ اسے اسی الزام میں گرفتار کرلو اور اتنی پھینٹی لگاؤ کہ وہ باقی کا سچ بھی اگل دے۔" سلمان کی بات سن کر اس نے دانت کچکچاتے ہوئے جوش سے کہا۔

"نہیں کرسکتے۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اور زبانی بات سے وہ آرام سے مکر سکتا ہے۔ اگر ان لوگوں کو گرفتار کرنا اتنا آسان ہوتا تو ملک سبحان جو اتنا نامی گرامی اسمگلر ہے، اتنے آرام سے ہم سے مذاکرات کے لیے آکر بیٹھا ہوتا کیا؟ سب جانتے ہیں کہ وہ اسمگلر ہے لیکن کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اس پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں۔" سلمان نے حقیقت کی تیز چٹکی لے کر اس کے جوش کے غبارے میں سے ہوا نکال دی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مزید آگے بتاؤ۔" وہ ڈھیلا پڑ گیا۔

"تمہیں معلوم ہوگا کہ مشہور فروٹ فارمز سے نکلنے والے فروٹس پر باقاعدہ اس فارم کے نام کے اسٹیکر چپکائے جاتے ہیں۔ اس کنٹینر میں جو فروٹس لائے گئے ہیں، ان میں سے بھی بہت سوں پر اشوک فروٹ فارم کے اسٹیکر چسپاں ہیں لیکن تقریباً اتنے ہی پھل ایسے بھی ہیں جن پر کوئی اسٹیکر نہیں لگا ہوا اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ بڑے فارمز اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں اور یہاں صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ میں اناسوں کے ایک باکس میں سے ایسا اناس تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں جس پر اشوک کے بجائے آنند فروٹ فارم کا اسٹیکر چپکا ہوا ہے۔" سلمان کا یہ انکشاف خاصا سنسنی خیز تھا۔ ساتھ ہی اس نے تیسری مشکوک بات بھی بتادی۔

"تم جانتے ہو کہ میری سونگھنے کی حس کتنی تیز ہے۔ اس کنٹینر میں بھی جہاں ہر طرف پھل ہی پھل بھرے ہوئے ہیں اور پھلوں کی خوشبو کے سوا کچھ محسوس نہیں ہورہا ہے، میں نے بارود کی معمولی سی بو محسوس کی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اس کنٹینر میں پہلے پھلوں کے ساتھ اسلحہ اور گولہ بارود بھی موجود تھا لیکن کسی طرح انہیں اطلاع ہوگئی کہ اس ڈیل کی خبر پاکستان پہنچ چکی ہے اور یہاں پہنچتے ہی کنٹینر پکڑا جائے گا اس لیے ایمرجنسی میں کنٹینر سے اسلحہ اتار کر اس کی جگہ کسی دوسرے فروٹ فارم سے پھل لادے گئے اور اب اسلحہ کسی اور ذریعے سے یہاں پہنچ رہا ہوگا۔" ان دو اہم اطلاعات کو سن کر اس نے تیزی سے نتیجہ اخذ کرلیا۔

"بالکل، ایسا بالکل ممکن ہے۔" سلمان نے اس کی تائید کی۔

"میرے خیال میں اس سلسلے میں ملک ہماری مدد کرسکتا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔" وہ سلمان کو لیے ہوئے واپس اس خیمے کی طرف چلا گیا جہاں ملک سبحان اس کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔

"ملک! یہ بتاؤ کہ تم بارڈر کے اس طرف کسی آنند فروٹ فارم کے بارے میں جانتے ہو؟" اس نے خیمے کے اندر جاتے ہی ملک سے سوال کیا۔

"بالکل جناب! یہ ادھر اس طرف ہی تو ہے۔ سرحد سے سب سے قریب آنند فروٹ فارم ہی پڑتا ہے۔" ملک نے ان کے خیال کی تصدیق کردی اور یہ واضح ہوگیا کہ کسی نہ کسی طور مخبری ہوجانے کی وجہ سے آنند فروٹ فارم پر کنٹینر روک کر اس میں سے اسلحہ اتارا گیا اور اس کی جگہ پھل لوڈ کیے گئے۔

"اچھا، یہ بتاؤ کہ اگر آنند فروٹ فارم پر اسلحہ اتار لیا گیا ہو تو وہاں سے اسے کسی اور ذریعے سے لانا ممکن ہوسکے گا؟"

"کیوں نہیں، وہاں سے یہاں تک کا فاصلہ ہے ہی کتنا جو کوئی مشکل ہو۔ یہاں کسی کے ملوث ہونے کی صورت میں ذرا ٹھہر کر کسی دوسری بڑی گاڑی میں بھی سپلائی کی جاسکتی ہے ورنہ عام روایتی طریقہ تو موجود ہے ہی۔ خچر، گدھے، گھوڑے سب اس کام کے لیے استعمال ہوسکتے ہیں۔ آنند فروٹ فارم سے یہاں تک کا فاصلہ بوجھ کے ساتھ طے کرلینا ان جانوروں کے لیے بالکل بھی مشکل نہیں ہے۔" ملک کے جوابات ان کے خیال کی تصدیق کرتے جارہے تھے اور انہیں آگے بھی بہت کچھ سوچنے کا موقع مل رہا تھا۔

"یہاں اس علاقے میں کون ہوسکتا ہے جو آنے والی سپلائی کو وصول کرلے۔ ظاہر ہے یہاں تک مال آنے کے بعد سیدھا تو شہروں میں نہیں پھیل جائے گا۔ یہاں آنے کے بعد مال کی آگے سپلائی کے لیے کسی مقامی بندے کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔" وہ بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے تھے۔

"یہاں صرف دو بندے ہیں جو اسلحے وغیرہ کی اسمگلنگ میں انوالو ہیں اور چاہے جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے، آگے مال کی سپلائی کے لیے ان دو میں سے کسی ایک سے معاملہ طے کیا گیا ہوگا۔" ملک سبحان نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

"ان دونوں بندوں کے نام پتے بتاؤ۔" جاوید علی نے فوراً مطالبہ کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ان میں سے ایک تو افراسیاب خان ہے جو یہ ساتھ والے گاؤں میں ہی رہتا ہے۔ دوسرا ملک توقیر ہے لیکن اس کا گاؤں یہاں سے ذرا دور پڑتا ہے لیکن ہے سرحدی پٹی کے ساتھ ہی۔" وہ ان لوگوں سے پورا تعاون کر رہا تھا۔

"ایک اور اہم سوال... یہ جو فروٹ بھارت سے آیا ہے، اس کی سپلائی یہاں کس نے منگوائی ہے؟ ظاہر ہے اسلحے کے اسمگلر خود تو ڈائریکٹ پھل وغیرہ منگوانے سے رہے۔ اس قسم کی چیزوں کے بیوپار کے لیے الگ مہارت اور سہولیات کی ضرورت ہوتی ہے جو ظاہر ہے کوئی اسلحے کا ڈیلر تو فراہم کرنے سے رہا۔ لازماً کوئی کاشت کاری و باغبانی سے متعلق بندہ ہی یہ کام کر سکتا ہے۔" جاوید علی نے خاصا مدلل سوال کیا۔ اب تک ان کا سارا زور اسمگل ہو کر آنے والے اسلحے کی بازیابی پر ہی رہا تھا اور وہ اس بات پر غور کرنے کی زحمت نہیں کر رہے تھے کہ اتنی بڑی مقدار میں آنے والے پھل یہاں کون وصول کرے گا؟

"میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس طرح کے کام یہاں بہت لوگ کرتے ہیں۔ کپڑا، نقلی زیور، ڈیکوریشن پیسز سے لے کر فریش فروٹ، سبزیاں اور ڈرائی فروٹ تک جس چیز پر بھی پرافٹ ملنے کی امید ہو، اس کی اسمگلنگ دونوں طرف سے ہی ہوتی رہتی ہے۔ پھلوں اور سبزیوں کی اسٹوریج اور انہیں محفوظ طریقے سے آگے پہنچانے کے لیے یہاں دو چار بندے ایسے ہیں جن کے پاس سارا انتظام ہے۔ یہ لوگ خود بھی ڈائریکٹ اس بیوپار میں حصہ لیتے ہیں اور دوسرے بیوپاریوں کو بھی معاوضہ لے کر یہ سہولیات فراہم کرتے ہیں۔ تم اپنے مطلب کے بندے کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو سیدھے سیدھے کنٹینر کے ڈرائیور سے پوچھو کہ وہ فروٹ کی یہ سپلائی لے کر کس کے پاس پہنچے گا۔" ملک سبحان نے ذرا تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"وہ میں معلوم کر چکا ہوں۔ اس کا نام اسحاق علی ہے۔" سلمان نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے بتایا تو ملک سبحان کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"اسحاق علی تو اچھا خاصا بڑا زمیندار ہے اور ہم میں سے کئی کی سرپرستی بھی کرتا ہے۔ میرے خود بھی اس سے اچھے تعلقات ہیں لیکن یہ تعلقات کاروباری نہیں ہیں۔ میں کسی کی سرپرستی کے بجائے آزاد رہ کر اپنے زورِ بازو پر کام کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ البتہ تمہیں یہ بتاتا چلوں کہ اسحاق علی کے افراسیاب اور توقیر دونوں ہی سے بہت اچھے تعلقات ہیں اور ان میں سے کسی دو یا تینوں ہی کی ملی بھگت سے یہ کھیپ آ رہی ہوگی۔" ملک سبحان ان کے لیے خاصا کام کا بندہ ثابت ہوا تھا اور اس نے انہیں ان کی تمام مطلوبہ معلومات بغیر لاگ لپیٹ کے فراہم کر دی تھیں۔ اتنی مدد تو شاید میجر اسد بھی (جس کا اپنا کردار فی الحال مشکوک ہو چکا تھا) نہیں کر سکتا تھا۔

"تھینک یو ملک۔ تم نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا۔ ہمیں آگے بھی تمہارے تعاون کی ضرورت رہے گی۔ تم فی الحال ایک کام کرو۔ اپنے... کام کرنے والے بندوں کے ذمے لگا دو کہ وہ ان راستوں کی نگرانی کریں جہاں سے باربردار جانوروں کے ذریعے مال آتا ہے۔ ان سے جیسے ہی کوئی اطلاع ملے، تم مجھے بتا دینا پھر باقی معاملات میں اور میرے ساتھی دیکھ لیں گے۔"

جاوید علی نے فوراً ہی حکمتِ عملی ترتیب دے دی۔ اس کے اور ملک کے درمیان رابطے کا طریقۂ کار طے ہوا اور پھر ملک مصافحہ کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اسے رخصت کرتے ہوئے جاوید علی نے دو اور اہم باتیں طے کی تھیں۔ اول یہ کہ یہاں طے پانے والے معاملات کی میجر اسد سمیت کسی بھی دوسرے شخص کو خبر نہیں ہونی چاہیے اور دوم یہ کہ ملک سبحان اور اس کے ساتھیوں کو ان خدمات کے بدلے معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ معاوضہ طے کرنا ضروری تھا۔ اسمگلنگ جیسے خطرناک ذریعے سے دولت کمانے والوں کے لیے روپے پیسے کی کتنی اہمیت ہے، یہ ان کے عمل سے ہی ظاہر تھا۔ اس لیے ان سے بلامعاوضہ صرف ملک و قوم کے نام پر کام لینا مشکل تھا۔ دوسرے معاوضہ لینے کے بعد وہ پوری طرح پابند ہو جاتے کہ اپنی ذمے داری بھرپور طریقے سے انجام دیں۔ وہ قانون کی نظر میں مجرم سہی لیکن ان کا اپنا یہ قانون ضرور ہوتا ہے کہ جس کام کا وعدہ کر لیں اسے ہر صورت انجام تک ضرور پہنچاتے ہیں۔

ملک کو رخصت کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر میجر اسد سے ملا۔ اس کا موڈ کچھ خراب لگ رہا تھا اور اس خراب موڈ کو قابو میں رکھنے کے لیے اسے خاصی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔

"کنٹینر آگے چلا گیا یا نہیں؟" اس نے میجر سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"آپ کے ساتھیوں نے اسے کلیئر قرار دے دیا تھا اس لیے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ پہلے ہی ہم اسے کافی زیادہ وقت کے لیے روک چکے تھے۔ اس میں ایپل جیسے نازک پھل بھی موجود تھے جو زیادہ وقت گزرنے کی صورت میں خراب ہو جاتے تو منگوانے والے کو خاصا نقصان اٹھانا پڑتا اور اپنے لوگوں کا نقصان کرنا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔" اس نے ایک طرح سے جتایا کہ وہ کتنا محبِ وطن ہے اور اسے اپنے ہم وطنوں کا کتنا خیال ہے۔ "مجبوری تھی۔ اگر ہم اسے نہ روکتے تو پھلوں کی آڑ میں اسلحہ نکل جانے کا ڈر تھا۔"

"کیا اسلحہ...؟" میجر کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ آئی اور معدوم ہو گئی۔ "اس طرح کسی چوکی پر سے اسلحہ نکال کر لے جانا ایک ناممکن سی بات ہے۔ ہمارے جوان ایسے کاموں کی روک تھام کے لیے ہر وقت چوکس رہتے ہیں۔"

"ہمارے پاس بہت پکی خبر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم خود بھی اس طرح دوڑے ہوئے یہاں نہ چلے آتے۔ ابھی تو پورا دن پڑا ہے۔ ہو سکتا ہے پھلوں سے لدا کنٹینر پہلے صرف یہ چیک کرنے کے لیے بھیجا گیا ہو کہ یہاں کیا صورتِ حال ہے اور اصل مال بعد میں بھیجا جائے۔" اس کی نظر میں میجر اسد مشکوک ہو چکا تھا لیکن وہ بدستور اس سے نرم لہجے میں بات کر رہا تھا تاکہ اسے اس کے شک کا اندازہ نہ ہو۔

"آپ کو اتنا یقین ہے تو انتظار کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ ہم بھی دیکھیں گے کہ فیڈرل ایجنسی کے لوگ ایک اسمگلر کی مدد سے جو کہ خود بھی مجرم ہے، کیسے اس جرم کا سراغ لگاتے ہیں۔" میجر اسد نے موقع پاتے ہی طنز کا تیر چلایا۔

"ہمارے آپ کے طریقۂ کار میں تھوڑا فرق ہے اس لیے آپ الجھن محسوس کر رہے ہیں لیکن جب ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے تو آپ خود قائل ہو جائیں گے کہ ہمارا کام کرنے کا طریقہ مختلف محسوس ہونے کے باوجود موثر ہے۔" وہ مستقل اسے ڈھیل دے رہا تھا۔ منہ توڑ جواب دے یا شک ظاہر کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں خود کو بچانے کے لیے وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر گزرے اور بہرحال وہ اس غدارِ وطن کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔

"چلیں، یہ بھی آزما لیں گے۔ فی الحال یہ بتائیں کہ میں آپ لوگوں کی کیا خاطر تواضع کروں اور اس کے علاوہ یہ کہ بتا دیں کہ اس معاملے میں آپ کو مجھ سے کیا خدمات درکار ہیں؟" اس کی طرف سے مسلسل نرمی دکھائے جانے پر میجر ڈھیلا پڑ گیا اور قدرے بے تکلفی سے پوچھنے لگا۔

"خاطر تواضع کا کوئی موقع نہیں ہے اور خدمت آپ کو صرف یہ انجام دینی ہے کہ یہاں رہ کر ہر طرف اور ہر معاملے پر کڑی نظر رکھیں۔ اور ہاں اگر ہمارے لیے کسی سواری کا بندوبست ہو جائے تو یہ بہت اچھا ہوگا۔ ہم ذرا اپنی نظروں سے بھی اس علاقے کو دیکھ لیں گے۔" اس نے حلیم کے ساتھ کہا تو میجر اسد پانچ منٹ میں گاڑی تیار کروانے کا کہتا ہوا وہاں سے باہر چلا گیا۔ اس کے کہے پانچ منٹ سچ مچ صرف پانچ منٹ ہی ثابت ہوئے اور انہیں ایک جیپ ڈرائیور سمیت بالکل ریڈی مل گئی۔

"ڈرائیور کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی اسے چلا سکتا ہے۔" اس نے فوراً ہی ڈرائیور کو غیر ضروری قرار دے دیا۔

"آپ اسے ساتھ لے جاتے تو آپ کو سہولت رہتی۔ یہ یہاں کے راستوں سے اچھی طرح واقف ہے اور آپ کو کسی خطرے میں ڈالے بغیر آسانی سے ہر جگہ لے جا سکتا ہے۔" میجر اسد نے اس سے ڈرائیور کو ساتھ لے جانے پر اصرار کیا۔

"راستوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس نقشہ موجود ہے۔ ہم اس کی مدد سے آرام سے سفر کر سکتے ہیں۔" جاوید علی نے اس کی پیشکش قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور ذرا دیر میں وہ چاروں جیپ میں سوار اڑے جا رہے تھے۔ اسٹیئرنگ سلمان کے ہاتھ میں تھا جبکہ وہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا ذیشان کو سارے حالات سے آگاہ کر رہا تھا۔ میجر اسد کے بارے میں اس کا شبہ سن کر وہ بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ دور دراز سرحدی علاقے میں اس نے فوج کے جوانوں کی مدد کے آسرے پر ہی صرف چار رکنی ٹیم کو اس مشن پر بھیج دیا تھا لیکن اگر وہ لوگ گڑبڑ کرتے تو وہ چاروں واقعی مشکل میں پڑ سکتے تھے۔

"تم میں سے ایک سائے کی طرح میجر کے ساتھ رہے اور جب دیکھے کہ وہ کوئی گڑبڑ کرنے والا ہے تو اسے منظر سے غائب کر دے۔ اس کے بعد جوانوں کو ہر حال میں تمہارا ہی حکم ماننا ہوگا۔" آخر تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد اس نے مشورہ دیا جو جاوید علی کے دل کو لگا اور اس نے جلد کوئی اچھی خبر سنانے کی امید ظاہر کرتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس عرصے میں وہ چوکی سے کافی آگے نکل آئے تھے اس لیے کسی کو میجر اسد کی نگرانی کے لیے چھوڑنے کے لیے فوری طور پر پلٹنا مناسب معلوم نہیں ہوا اور سفر جاری رکھتے ہوئے اس نے ملک سبحان سے رابطہ کر لیا۔ اس نے خوش خبری سنائی کہ وہ فوری طور پر اپنے آدمیوں کو روانہ کر چکا ہے۔ جاوید علی نے اس کی کارکردگی کو سراہا اور پھر اس سے اسحاق علی کے اس کولڈ اسٹوریج کے بارے میں پوچھنے لگا جہاں آنے والے پھلوں کو محفوظ کیا جا سکتا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کافی دور ہے اور اس بات کا امکان نہیں کہ کنٹینر کو سیدھے راستے سے لے جانے والا ڈرائیور اپنی منزل پر پہنچ گیا ہو۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کیا تم ہمیں ایک تیز رفتار سواری اور ایسا کوئی آدمی مہیا نہیں کر سکتے جو کسی شارٹ کٹ سے ہمیں کنٹینر کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں پہنچا دے؟"

"کیوں نہیں، معقول معاوضہ ملے تو ملک سبحان ہر کام کر سکتا ہے۔" یہ ملک کا جواب تھا۔

"معاوضے کی تم فکر نہ کرو، بس فوری طور پر گاڑی اور بندہ پہنچاؤ۔" اس نے ملک کو آگاہ کیا کہ وہ لوگ اس کے آدمی کو کس جگہ ملیں گے۔

"تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟" سلمان جو مستقل اس کی باتیں سُن رہا تھا، ذرا تعجب سے پوچھنے لگا۔

"ہم کنٹینر کے منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں ڈرائیور اور کلینر کو اغوا کرلیں گے اور پھر ان سے اگلوائیں گے کہ حقیقت کیا ہے۔" اس نے اپنا پروگرام بتایا۔

"یہ کام تو انہیں چوکی پر روک کر بھی کیا جا سکتا تھا۔ انہیں جانے کی اجازت دینے کی کیا ضرورت تھی؟" سلمان اس سے بحث ضرور کر رہا تھا لیکن اس نے جیپ کا رخ اس طرف کر لیا تھا جہاں جاوید علی نے ملک کے آدمی کو گاڑی سمیت بلوایا تھا۔ وہ جس علاقے میں سفر کر رہے تھے، وہاں ابھی تک انہیں آبادی نظر نہیں آئی تھی البتہ کافی فاصلے پر ایک گاؤں کے آثار تھے جس کے بارے میں ان کے پاس موجود معلومات کے مطابق یہاں آبادی تین سو سے بھی کم تھی۔

"چوکی پر روکتے تو ان کی گرفتاری قانونی ہوتی جس کے لیے ظاہر ہے ہمارے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔ اب ہم غیر رسمی کارروائی کرنے کے لیے پوری طرح آزاد ہیں اور کسی کو ان بندوں کے سلسلے میں جواب دینے کے لیے پابند بھی نہیں۔" اس نے اپنے فیصلے کی وجہ بتائی اور مزید وضاحت دیتے ہوئے بولا۔ "ویسے بھی یہ خیال میرے ذہن میں بعد میں ہی آیا ہے۔ ملک کے ذمے خفیہ راستوں کی نگرانی کا کام لگانے کے بعد میں تھوڑی فرصت محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ خفیہ راستے سے اسلحہ آنے میں ابھی وقت لگے گا۔ آنند فروٹ فارم پر ہنگامی طور پر کنٹینر کو اسلحے سے خالی کرنے کے بعد اس میں فروٹ رکھوانے میں ان لوگوں کا خاصا وقت صرف ہوا ہوگا اور آگے کے انتظام کے لیے بھی انہیں تھوڑی مہلت چاہیے ہوگی اس لیے وہ اتنی جلدی سپلائی نہیں کر سکیں گے۔ اس دوران فارغ بیٹھنے سے بہتر نہیں ہے کہ ہم کچھ کارکردگی دکھا دیں؟"

"ٹھیک ہے باس... جیسا تم بولو۔" سلمان نے اس کی تائید کر دی۔ پیچھے بیٹھے سعید اور خیری تو ویسے بھی زیادہ مداخلت کرنے والے بندے نہیں تھے۔ انہیں جو حکم ملے اسے پوری توجہ سے بجا لانے کے علاوہ کسی بات سے غرض نہیں ہوتی تھی۔

"تم دونوں یہ جیپ لے کر واپس چوکی پر چلے جاؤ۔ سعید میجر پر نظر رکھے گا اور خیری! تم وہاں موجود دوسرے لوگوں کو ٹٹولنے کی کوشش کرنا کہ ان کی میجر اسد کے بارے میں کیا رائے ہے اور ان میں سے کتنے ایسے ہو سکتے ہیں جو اس کے ساتھی ہیں۔ ضرورت پڑنے پر سعید بھی تمہاری مدد کر سکتا ہے لیکن اسے اپنی زیادہ توجہ میجر کی طرف ہی رکھنی ہو گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حالت بگڑتے دیکھ کر میجر فرار کی کوشش کرے۔ اسے کسی صورت بھی بھاگنے نہیں دینا ہے۔" سلمان کو مطمئن کرنے کے بعد وہ پیچھے بیٹھے اپنے دونوں ساتھیوں کو ہدایت دینے لگا۔ اس دوران میں وہ لوگ اس مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں انہیں ملک کے بندے سے ملاقات کرنی تھی۔ یہ قریب قریب واقع دو ایسے ٹیلے سے تھے جس کے درمیان ایک تنگ سی راہ گزر موجود تھی۔ ٹیلے تقریباً خشک اور بنجر ہی تھے اور ان پر نباتات کے نام پر چند ایک کانٹے دار جھاڑیاں ہی نظر آرہی تھیں۔ حالانکہ ارد گرد کا علاقہ بہت سرسبز و شاداب تھا اور وہ راستے میں دیکھتے ہوئے آئے تھے کہ کھیتوں میں موجود فصلیں بڑی شان سے لہلہا رہی ہیں۔ ٹیلے کے پاس پہنچ کر وہ اور سلمان نیچے اتر گئے جبکہ سعید نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر جیپ کو واپسی کے لیے موڑ لیا۔

وہ دونوں خود کو کسی کی نظر میں آنے سے بچانے کے لیے دونوں ٹیلوں کی درمیانی گزرگاہ تک چلے گئے اور وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ انتظار کے ان لمحات میں بھی بیکار بیٹھنے کے بجائے جاوید علی اپنے پاس موجود اس علاقے کی تفصیلات کا مطالعہ کرنے لگا۔ یہ معلومات انہیں ذیشان کی طرف سے ہی فراہم کی گئی تھیں اور راستے بھر بھی وہ نقشوں اور ان معلومات پر ہی غور و فکر کرتے ہوئے آئے تھے اور اس کے نتیجے میں پہلی بار یہاں آنے کے باوجود اس علاقے کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے۔ البتہ ان ٹیلوں کا علم انہیں اپنے مطالعے کے بجائے مشاہدے کے باعث ہوا تھا اور انہیں، انہوں نے ہیلی کاپٹر کی نیچی پرواز کے دوران دیکھا تھا۔ انتظار کے لمحات زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئے اور ایک اٹھارہ انیس سال کا لڑکا طاقتور انجن والی سیاہ پراڈو میں سوار ان تک آپہنچا۔ لڑکا کم عمر تھا لیکن جب اس نے ناہموار، تنگ اور اونچے نیچے راستوں پر بنا رفتار کم کیے ایک جتنی مہارت سے گاڑی دوڑائی تو انہیں قائل ہونا پڑا کہ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ تجربہ کار ہے۔ وہ ایسے ایسے راستوں سے گزر رہا تھا اور اتنی تیزی سے موڑ کاٹ رہا تھا کہ چاہنے کے باوجود وہ دونوں راستہ ذہن نشین کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے۔ خود لڑکے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اسے ڈرائیونگ کرتے ہوئے بے پناہ توجہ دینی پڑ رہی ہے۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے اور اس نے ٹیلے کے پاس پہنچ کر اپنے ملک سبحان کے آدمی کی حیثیت سے تعارف کروانے کے سوا دوبارہ کوئی بات نہیں کی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ لوگ ایک کچی پکی سڑک تک پہنچ گئے اور لڑکے نے گاڑی ایک سائڈ پر کر کے روک لی۔

"بابا نے کہا تھا کہ آپ لوگوں کو یہاں تک پہنچا دوں۔ یہاں پر رک کر آپ آنے والے کنٹینر کا آرام سے انتظار کر سکتے ہیں۔" گاڑی روکنے کے بعد لڑکے نے اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اپنے لب وا کیے تو ان دونوں نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔

"تم ملک سبحان کے بیٹے ہو؟" بابا کا لفظ ایسا تھا کہ وہ چونک گئے تھے اور لڑکے کے چہرے پر انہیں ملک سبحان کی مشابہت بھی نظر آنے لگی تھی۔ وہ خوب صورت تھا لیکن بہرحال اس میں ملک جیسا کروفر اور وقار نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی ملک کی طرح لمبی زلفیں اور داڑھی بھی نہیں تھی۔

"جی ہاں، میں ان کا بیٹا ملک عرفان ہوں۔ مجھے آپ کو یہاں لانے اور واپس لے جانے کی ذمے داری سونپی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ کرنا ہوا، آپ لوگ خود کریں گے۔ میں گاڑی سمیت ادھر آپ کا انتظار کروں گا۔" اس نے انگلی کے اشارے سے جگہ کے بارے میں بتاتے ہوئے ایک طرح سے انہیں گاڑی سے اترنے کی تاکید کی۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ کنٹینر ہمارے آنے سے پہلے ہی یہاں سے گزر چکا ہو اور ہم خوامخواہ یہاں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جائیں۔" سلمان نے اندیشہ ظاہر کیا جس کے جواب میں وہ یوں مسکرایا جیسے بڑے کسی بچے کی احمقانہ بات پر مسکراتے ہیں۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بابا نے مجھے یہاں پہنچنے کے لیے پینتیس سے چالیس منٹ کا وقت دیا تھا اور میں نے صرف تیس منٹ میں تمہیں یہاں پہنچا دیا ہے۔ اس لیے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم لیٹ ہو گئے ہوں۔ کنٹینر کو سڑک کے لمبے راستے سے گزر کر یہاں پہنچنا ہے اور میری پراڈو نے جانے کہاں کہاں سے گزر کر آپ کو گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے کروا دیا ہے۔"

وہ تینوں گاڑی سے نیچے اتر آئے تھے اور وہ اپنی سیاہ پراڈو پر یوں محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے فخریہ بول رہا تھا جیسے وہ گاڑی نہیں اس کی محبوبہ ہو۔

"او کے پھر ٹھیک ہے۔ تم انتظار کرو، ہم اپنا کام کرتے ہیں۔" جاوید علی نے مسکرا کر اس سے کہا تو وہ دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے واپس پیچھے اسی کچے راستے کی طرف لے گیا جہاں سے وہ سڑک پر چڑھے تھے۔ اس سڑک کی حالت بہت اچھی نہیں تھی لیکن ظاہر تھا کہ اس پر گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ سڑک کے دونوں اطراف میں فاصلے فاصلے سے خاصے درخت بھی موجود تھے۔ وہ دونوں ایک چوڑے تنے والے درخت کے پیچھے جا کھڑے ہوئے تاکہ اگر کوئی گاڑی سڑک پر سے گزرے تو وہ فوری طور پر نظروں میں نہ آسکیں۔ بس اب انہیں یہ طے کرنا تھا کہ عنقریب وہاں پہنچنے والے کنٹینر کو رکوانے کے لیے انہیں کیا حکمتِ عملی اختیار کرنی ہے۔ گاڑی تو ان کے پاس تھی نہیں کہ اسے سڑک پر کھڑا کر کے کنٹینر کا راستہ روک دیتے۔ چھوٹے ملک عرفان کے رویے سے بھی یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ وہ اپنی گاڑی یا خود کو سامنے لانے کے لیے راضی نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے اسے اور اس کے باپ کو یہیں رہ کر اپنا "کاروبار" کرنا تھا اور وہ ایک بااثر زمین دار اسحاق علی سے براہِ راست دشمنی کا خطرہ نہیں مول لے سکتے تھے چنانچہ انہیں جو کچھ کرنا تھا، اپنے بل بوتے پر ہی کرنا تھا۔

اپنا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے وہ دونوں ہی تیزی سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ وہ جس سڑک کے کنارے موجود تھے اس کی چوڑائی زیادہ نہیں تھی اور سڑک کی حالت کی وجہ سے یہ بات یقینی تھی کہ یہاں سے گاڑیاں زیادہ رفتار سے نہیں گزر سکتی ہوں گی۔

"یہ درخت دیکھ رہے ہو جاوید؟" اچانک ہی سلمان نے اسے مخاطب کرتے ہوئے سڑک کے اطراف میں لگے مختلف درختوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خاصا پرانا اور گھنا درخت تھا جس کا پھیلاؤ اتنا زیادہ تھا کہ شاخیں سڑک تک چلی گئی تھیں۔ بلندی کے اعتبار سے بھی وہ وہاں موجود دوسرے درختوں کے مقابلے میں زیادہ بلند تھا۔

"اگر ہم اس درخت پر چڑھ جائیں تو کنٹینر کے اس کے نیچے سے گزرتے ہوئے آسانی سے اس کے اوپر چھلانگ لگا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ڈرائیور اور کلینر کو قابو کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔" یہ مشورہ دیتے ہوئے سلمان خاصا پُرجوش تھا۔ جاوید علی کو اس کی ترکیب مناسب لگی لیکن ساتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہی یہ اندیشہ بھی تھا کہ ممکن ہے وہ لوگ کامیاب نہ ہوسکیں اور ٹائمنگ کی ذرا سی گڑبڑ انہیں ناکام کردے۔

''درخت پر میں جاتا ہوں۔ تم وہاں آگے جاکر چھپ جاؤ۔ اگر میں کامیاب نہ ہوسکوں تو تم وہاں سے انہیں روکنے کی کوشش کرنا۔'' بہت تیزی سے غور کرنے کے بعد اس نے سلمان کو مشورہ دیا جو اس نے فوراً قبول کرلیا اور اپنے ہتھیار سمیت دوڑتا ہوا وہاں سے خاصا آگے چلا گیا۔ جاوید علی اس دوران میں درخت پر چڑھ چکا تھا اور اس نے اپنے لیے اس شاخ کا بھی انتخاب کرلیا تھا جس پر سے وہ سڑک پر سے گزرتے کنٹینر پر چھلانگ لگا سکتا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے جان بوجھ کر اپنا انتخاب کیا تھا۔ کسی چلتی ہوئی گاڑی پر چھلانگ لگانا خاصا رسکی عمل ہوتا ہے اور کچھ بھروسا نہیں ہوتا کہ بندہ کامیاب ہونے کے بجائے پھسل کر نیچے ہی جاگرے اور گاڑی کے پہیوں کے نیچے آکر کچلا جائے۔ یہاں تو معاملہ بھی کنٹینر کا تھا۔ ایسی دیوہیکل وہیکل کے سامنے تو انسانی جان کی کوئی اوقات ہی نہیں ہوتی اس لیے اس نے سلمان کے بجائے خود کو اس ذمے داری کے لیے منتخب کرلیا تھا۔ ویسے اسے اللہ کی ذات اور اپنی عمدہ تربیت پر بھروسا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے گا۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے وہ سڑک کا دور تک جائزہ لینے کی پوزیشن میں تھا اور اس کی نظریں مسلسل اس راستے پر ہی لگی ہوئی تھیں جہاں سے کنٹینر کو آنا تھا۔

ملک عرفان کی ماہرانہ اور تیز رفتار ڈرائیونگ نے انہیں وقت سے پہلے وہاں پہنچا کر اتنی مہلت دے دی تھی کہ وہ اپنا لائحہ عمل طے کرکے اس پر عمل پیرا ہونے کے لائق ہو گئے تھے۔ آخرکار چند منٹ کے انتظار کے بعد اسے کنٹینر آتا ہوا نظر آگیا۔ اس کے اعصاب ایک دم تن گئے اور اس کا دماغ خودکار طریقے پر تیزی سے حساب کتاب کرنے لگا کہ اسے کس لمحے چھلانگ لگانی ہے۔ ٹائمنگ کی ذرا سی گڑبڑ سے شدید نقصان ہوسکتا تھا۔ اسے اپنی جان کی فکر نہیں تھی لیکن یہ سمجھتا تھا کہ اس وقت اس کی کامیابی ملک وقوم کے مفاد کے لیے کتنی ضروری ہے۔ آخرکار کنٹینر سبک خرامی سے چلتا عین اس درخت کے نیچے آگیا جس پر وہ موجود تھا۔ اس نے اللہ کا نام لیا اور چھلانگ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے اس کے قدم کنٹینر کی چھت سے ٹکرائے لیکن پھر وہ بری طرح ڈگمگا گیا۔ کسی چلتی ہوئی گاڑی پر اس طرح اچانک کود کر اپنے جسم کو توازن میں رکھنا آسان نہیں تھا لیکن بہرحال انسان کو دی جانے والی تسخیر کی صلاحیت وخواہش دنیا میں عجیب عجیب مناظر دکھاتی ہی

رہتی ہے، یہ تو پھر اس کے مقابلے میں ایک معمولی عمل تھا۔ جاوید علی نے بھی بالآخر اپنے ڈگمگاتے...... قدموں کو سنبھال لیا۔ اس دوران نیچے بھی ہلچل مچ چکی تھی۔ ڈرائیور اور کلینر یہ تو نہیں دیکھ سکے تھے کہ چھلانگ لگانے والا کون ہے لیکن اس کے کودنے سے پیدا ہونے والی ''دھپ'' کی آواز تو انہوں نے بھی سن لی تھی۔

''اوپر کون ہے اوئے؟'' ڈرائیور بلند آواز میں چیخا لیکن بہرحال اس نے کنٹینر روکا نہیں۔

''میں دیکھتا ہوں استاد۔'' کلینر نے تیزی سے کہا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر چلتے ہوئے کنٹینر کی چھت پر جانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران میں جاوید علی خود کو سنبھال کر ڈرائیور والی طرف سے نیچے اترنے لگا تھا۔ کنٹینر کی سست رفتار اس مشکل کام کو تھوڑا آسان بنارہی تھی۔ بالآخر وہ اس پوزیشن میں آگیا کہ ڈرائیور کو دیکھ سکے۔ بائیں ہاتھ سے خود کو سنبھال کر اس نے دائیں ہاتھ میں پسٹل پکڑا اور اس کی نال ڈرائیور کے سر سے لگادی۔

''کنٹینر روک دو ورنہ اپنی جان سے جاؤ گے۔'' بے پناہ سرد آواز میں دی گئی اس دھمکی کے ردِعمل میں ڈرائیور نے کنٹینر کو روکنے کے بجائے اسٹیئرنگ پر سے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر اسے گھونسا مارنے کی کوشش کی۔ جاوید علی نے فوری طور پر اپنا چہرہ پیچھے کرلیا پھر بھی اس کی ناک پر ہلکی سی چوٹ لگ ہی گئی۔ اس نے جھنجلا کر ہاتھ میں موجود پسٹل زور سے ڈرائیور کو مارا جو اس کے بچنے کی کوشش کے نتیجے میں سیدھا اس کے منہ پر جاکر لگا اور یقینی طور پر سامنے کے کئی دانت ٹوٹنے کے علاوہ دہانہ بھی شدید زخمی ہوگیا۔ اس ذرا سے دورانیے میں کنٹینر اس جگہ تک پہنچ چکا تھا جہاں سلمان چھپا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے سب کچھ دیکھ لیا تھا اور اب خود دوڑ کر سامنے آگیا تھا۔ ادھر کلینر کو بھی احساس ہوگیا تھا کہ اوپر جانا لاحاصل ہے۔ کھیل تو نیچے ہی شروع ہوچکا ہے اس لیے وہ آدھے راستے سے ہی واپس اترنے کی کوشش کررہا تھا۔ سلمان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بے آواز ریوالور سے اس کی ٹانگ کا نشانہ لے کر فائر داغ دیا۔ کلینر کے حلق سے ایک کربناک چیخ نکلی اور وہ بے قابو ہوکر نیچے جاگرا۔ فوراً ہی پچھلے پہیوں نے اس کے گرنے والے جسم کو اپنی زد میں لے کر کچل ڈالا اور فضا اس کی کربناک چیخوں سے گونج اٹھی۔

جاوید سے مقابلے کی کوشش میں زخمی ہوجانے والے ڈرائیور نے یہ چیخیں سنیں تو بدحواس ہوگیا اور خود بخود ہی بریک لگا بیٹھا۔ اس کے بعد سلمان اور جاوید علی کو روکنے والا کون

...نے جھپٹ کر دروازہ کھولا اور ڈرائیور کو کھینچ کر ...نے کے بعد اسے لیے تیزی سے سڑک سے ہٹتے چلے ...تیزی کی فکر کرنا غیر ضروری تھا۔ وہ بس آخری سانسیں ...تھا اور ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اسے بھاری پہیوں ...سے کھینچ کر نکال سکیں۔ ڈرائیور جسے وہ دونوں ڈنڈا ...کرتے ہوئے لے جارہے تھے، مسلسل چیخ رہا تھا اور ان ...جاننے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ کون ہیں لیکن ان کے ...پاس اس کے سوالوں کا جواب دینے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ ...کے بعد یہاں سے دور ہٹ جانا چاہتے تھے تاکہ اگر کوئی ...ئے حادثہ پر پہنچ بھی جائے تو ان تک رسائی حاصل نہ کر ...سکے۔ ملک عرفان نے انہیں ایک آدمی کو اس طرح لاتے ...دیکھا تو حیران رہ گیا۔

''ٹائم نہیں ہے۔ جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کرو اور یہاں سے واپس چلو۔'' جاوید علی نے تیز آواز میں اسے حکم ...دیا۔ وہ تیزی سے حرکت میں آگیا۔ ان دونوں نے ڈرائیور ...کو پچھلی سیٹ پر پٹخا اور دونوں طرف سے اسے دبوچ کر خود ...بھی سوار ہوگئے۔ اگلے ہی لمحے پراڈو واپسی کے سفر پر ...گامزن تھی۔

''تم نے مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں دی ورنہ ...میں نے تمہیں اس قسم کے کسی معاملے کے بارے میں کوئی ...بات نہیں کی تھی۔'' اس نے دبکے ہوئے ڈرائیور کی طرف ...اشارہ کرتے ہوئے شکایتی لہجے میں کہا۔ یقینی طور پر وہ ...پریشان تھا کہ کہیں اس چکر میں اس پر کوئی مصیبت نہ نازل ہو ...جائے۔ وہ جرائم کی دنیا کے لوگ تھے اس لیے خود کو بہت بچا ...کر رکھتے تھے۔

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ تمہارے بابا تم سے ناراض نہیں ...ہوں گے اور نہ ہی تم کسی پریشانی میں پڑو گے۔'' جاوید علی ...نے مختصر الفاظ میں اسے تسلی دی اور خود ڈرائیور کی طرف متوجہ ...ہوگیا جو زخمی چہرے کی وجہ سے ہیبت ناک لگنے کے ساتھ ...ساتھ وحشت زدہ بھی لگ رہا تھا۔ شاید کچھ کچھ صورت ...حال اس کی سمجھ میں بھی آرہی تھی کیونکہ بار بار وہ سلمان کا چہرہ ...دیکھ رہا تھا اور ظاہر ہے کہ اسے پہچان بھی رہا تھا۔ کوئی بہت ...زیادہ وقت تو نہیں گزرا تھا جب سلمان نے اپنے ساتھیوں ...کے ساتھ چوکی پر کنٹینر کی تلاشی لی تھی۔ اس وقت کنٹینر کو کلیئر ...کرکے بارڈر پوسٹ کر جانے کی اجازت دینے والے نے اگر اسے ...روک لیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ بہت بڑی گڑبڑ ہے ...اور اس گڑبڑ میں اسے اپنا انجام صاف نظر آرہا تھا۔ ان ...لوگوں نے اس سے تفتیش کا آغاز کیا تو اس کے بدترین

اندیشوں کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اس نے چاہا کہ اپنی زبان بند رکھے لیکن سی ایف پی کے تربیت یافتہ یہ جوان جو کسی صورت اسے رعایت دینے کے موڈ میں نہیں تھے، اس بری طرح اس پر ٹوٹے کہ وہ خود ٹوٹ گیا اور ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''اسد صاحب نے اوپر والوں کے معاملات طے تھے اور انہوں نے یقین دلایا تھا کہ معمولی سی چیکنگ کے بعد وہ ہمیں یہاں سے گزر جانے دیں گے لیکن عین موقع پر انہوں نے اطلاع دی کہ کسی طرح پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں تک یہ خبر پہنچ گئی ہے کہ پھلوں کی آڑ میں سرحد پار سے اسلحہ لایا جارہا ہے اور حکومت کے خصوصی نمائندے خود اس معاملے کا جائزہ لینے وہاں پہنچ رہے ہیں اس لیے بہتر ہے کہ ہم وہیں رک جائیں۔ ایمرجنسی میں ہمارے کنٹینر کو آنند فروٹ فارم پر روک کر اس سے اسلحہ اتارا گیا اور اس کی جگہ فروٹس لوڈ کیے گئے۔ اب سارا اسلحہ وہیں پڑا ہے اور مناسب وقت دیکھ کر کسی بھی طریقے سے اسے یہاں اسمگل کردیا جائے گا۔''

''یہاں کون... کیا ملک اسحاق اسلحے کو وصول کرے گا؟'' جاوید علی نے بے تابی سے پوچھا۔

Personality Development Dr. Online

۱۔ مضبوط قوت ارادی کے ساتھ پراعتماد اور کامیاب زندگی گزارنا آپ کا حق ہے
۲۔ آپ ہماری رہنمائی میں اپنی شخصیت کی خامیاں دور کرکے اپنا یہ حق حاصل کرسکتے ہیں۔
۳۔ Suggesion کی مشقوں کے ذریعہ احساس کمتری دور کرکے خود اعتمادی حاصل کریں۔ کامیاب زندگی گزاریں۔
۴۔ مسمریزم کی مشقوں کے ذریعے (صرف 27 دن میں) بے پناہ قوت ارادی حاصل کریں۔ ارادے کی قوت سے آپ جو چاہیں حاصل کرسکتے ہیں۔
۵۔ علم النفس کی مشقوں کے ذریعے دل دماغ کو پرسکون کرسکتے ہیں۔ مراقبہ کرسکتے ہیں اور ماورائی قوت حاصل کرسکتے ہیں۔
۶۔ مثبت انداز زندگی سیکھ کر آپ بہتر ازدواجی اور معاشرتی زندگی گزار سکتے ہیں خاندان اور معاشرے کے ہردل عزیز فرد بن سکتے ہیں۔
۷۔ اپنے Depression اور Anxiety کو (Medicine & Psychotherapy) کے ذریعے دور کرکے اپنے اندر کی اداسی مایوسی ناامیدی بے چینی بے خوابی غصہ چڑچڑا پن ذاتی اور ازدواجی زندگی میں ناکامی پر قابو پاکر ایک پرسکون اور کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔
۸۔ اپنے روحانی مسائل کے حل اور وظائف کے حصول کے لئے بھی رابطہ کرسکتے ہیں۔ ہر طرح کی نفسیاتی اور جسمانی کمزوری کے لئے Alternative Medicines بذریعہ ٹیلی فون ای میل ایس ایم ایس منگوائی جاسکتی ہیں

ڈاکٹر محمد لطیف شاہین
ایم بی بی ایس (پی ایس سی آنرز)
رابطہ اور فیس جمع کرنے کے لئے
1 تا 11 بجے تک، رات 8 تا 10
03216528001
email: dr.muhammadlatifshaheen@gmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ہاں، ہمیں مال وہیں ڈیلیور کرنا تھا لیکن ملک اصل آدمی نہیں ہے۔ وہ کسی اور پارٹی کے لیے کام کر رہا ہے اور اس کا کام یہاں سے مال اس پارٹی تک پہنچانا ہے۔ وہ دوسری پارٹی کون ہے، یہ میں نہیں جانتا۔" ڈرائیور نے انہیں بتایا۔ اس کے بعد بھی وہ اپنے ذہن میں آنے والے بہت سے سوالات اس سے کرتے رہے جس کے نتیجے میں انہیں بہت سی اہم معلومات حاصل ہو گئیں۔ جب انہیں لگا کہ اب ڈرائیور کے پاس انہیں بتانے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا ہے تو انہوں نے ملک عرفان سے گاڑی رکوائی اور ڈرائیور کو گاڑی سے اتار کر درختوں کے جھنڈ میں لے گئے۔ واپسی میں ڈرائیور ان کے ساتھ نہ تھا۔ نوجوان ملک عرفان نے زبان سے تو کچھ نہیں پوچھا لیکن اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

"ہم نے سوچا تمہاری گاڑی اتنی اچھی ہے اسے ایک وطن دشمن کے ناپاک خون سے گندا نہ ہونے دیں۔" جاوید علی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی نظروں کے سوال کا جواب دیا، اس کی سنگینی کو محسوس کر کے وہ چپ کا چپ رہ گیا۔ مزید سوال کرنے کی ہمت ہی نہیں رہی۔ وہ جرائم کی دنیا کا بندہ ضرور تھا لیکن ان کے دھندے میں جان لینے کی نوبت ذرا کم ہی آتی تھی۔ وہ اسمگلرز تھے اور زیادہ تر خود اپنی جان داؤ پر لگا کر کام کرتے تھے لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑا ہے، وہ کچھ مختلف ہیں۔ ان کے لیے جان دینا اور لینا دونوں ہی مشکل کام نہیں ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ یہ سب کچھ کسی ذاتی مفاد کے لیے نہیں کر رہے بلکہ اس کے پیچھے جذبۂ حب الوطنی ہے۔ ان کے انداز سے ایسا لگتا ہے کہ وہ ہر ملک دشمن کو چیر پھاڑ کر رکھ دینا چاہتے ہوں۔

ایک پل کے لیے اسے ان سے خوف بھی محسوس ہوا کیونکہ بہرحال وہ اور اس کا باپ بھی کوئی قانونی کام تو کرتے نہیں تھے۔ واپسی کا باقی راستہ اس نے مکمل خاموشی کے ساتھ طے کیا اور ان کی ہدایت کے مطابق انہیں انہی ٹیلوں کے پاس جہاں سے اس نے انہیں پک کیا تھا، اتارنے کے بعد خود اڑنچھو ہو گیا۔ جاوید علی اور سلمان کو اس کے احساسات کی اتنی پروا نہیں تھی۔ خصوصاً جاوید علی بہت گہری سوچ میں تھا۔ اس نے وہیں رک کر پہلے ذیشان سے رابطہ کیا اور اسے اب تک کے حالات سے آگاہ کر دیا۔ میجر اسد کے اس معاملے میں ملوث ہونے کا سن کر اسے شاک لگا اور اس نے یقین دہانی کروائی کہ اسد کا جلد از جلد بندوبست کر دیا جائے گا۔ ان کی ٹیم کے لیے بھی تا حکم ثانی وہیں رکے رہنے اور حالات پر نظر رکھنے کی تاکید تھی۔ جاوید علی نے اپنے طور پر اسے تسلی دی کہ وہ یہاں کے معاملات بہتر طریقے سے سنبھال لے گا۔ اس کے بعد ان کے درمیان رابطہ ختم ہو گیا لیکن وہ خود اس کیفیت سے نہیں نکل سکا جو ڈرائیور کے بعد سے اس پر طاری تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" سلمان نے اسے مستقل ایک ہی کیفیت میں دیکھا تو پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

"میں سوچ رہا ہوں..." اس نے اپنے ذہن میں موجود خیال اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ بہت خطرناک ہوگا۔ شاید اوپر سے بھی ہمیں اس کی اجازت نہ ملے۔" اس کا خیال سن کر سلمان نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

"خطروں سے میں نہیں ڈرتا اور فی الحال یہاں میں باس ہوں اس لیے اپنی صوابدید پر بھی بہت سے فیصلے کر سکتا ہوں۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے سلمان کے اعتراض کا جواب دیا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ اس فیصلے کو کوئی پسند کرے گا۔ یاد ہے نا کہ سنتھیا کی موت والی رات بھی میجر صاحب تمہارے جذباتی فیصلے پر کتنا ناراض ہوئے تھے۔" سلمان نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"یہ بالکل مختلف معاملہ ہے۔ میں دشمن کو سبق سکھانا چاہتا ہوں کہ یہاں سب... اسد جیسے ہی نہیں ہیں بلکہ بہت سے ایسے بھی ہیں جو اسے ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔" اس نے اپنی سابقہ سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"لیکن پھر بھی یار، یہ بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔" سلمان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم اگر میرا ساتھ نہیں دینا چاہتے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں نے جو سوچ لیا ہے، اس سے ہرگز پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔" اس کا ارادہ غیر متزلزل تھا، یہ بات سلمان نے سمجھ لی۔

"پاگل ہوئے ہو کیا؟ میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا، یہ تم سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟" اس کی ناراضی میں ہی اس کی رضامندی بھی چھپی ہوئی تھی جسے محسوس کر کے جاوید علی کھل اٹھا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔" اس نے بے ساختہ ہی سلمان کو اپنے گلے سے لگا لیا پھر بہت دیر تک وہ دونوں وہیں بیٹھ کر اپنا آگے کا لائحہ عمل طے کرنے لگے۔ سب طے کرنے کے بعد اس نے چوکی پر موجود اپنے دونوں ساتھیوں سے رابطہ

[illegible] کو آگے کے لیے مزید کچھ ہدایات دیں اور پھر ملک [illegible] سے رابطہ کر کے اس سے فوری ملاقات کی فرمائش کر [illegible] نے فوراً ہی گاڑی بھجوانے کا وعدہ کر لیا۔ گاڑی انہیں [illegible] لانے ملک عرفان کے بجائے کوئی اور چلا رہا تھا۔

"آپ لوگوں نے تو میرے بیٹے کو خوف زدہ کر دیا۔ [illegible] یہ لوگ ہمیں بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔" ان کا [illegible] کرتے ہوئے ملک نے ہنس کر انہیں یہ بات بتائی۔

"اس سے کہنا کہ ہمارے پاس ان معاملات کی [illegible] توجہ دینے کی فرصت نہیں ہے ورنہ اس کا خیال درست [illegible] ثابت ہو سکتا تھا۔" جاوید علی نے سنجیدگی سے یہ جواب دیا [illegible] کے چہرے کے تاثرات گمبھیر ہو گئے۔

"میرا ساتھی ٹھیک کہہ رہا ہے ملک سبحان۔ ہم لوگ بہت بڑے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں اور الجھے ہی رہتے [illegible] لیے تمہارے لیول کے لوگوں کو ہم سے کوئی خطرہ نہیں [illegible] بلکہ تم ہمارا ساتھ دے کر اپنے لیے مزید رعایت بھی حاصل کر سکتے ہو۔" سلمان نے فوری طور پر بات سنبھال لی کیونکہ اس مرحلے پر وہ ملک سبحان سے نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ جاوید علی کے ذہن میں جو منصوبہ تھا، اس کے لیے ملک کا تعاون بہت ضروری تھا۔

"میں اپنی اوقات کے مطابق آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں، فرمائیے کیا حکم ہے میرے لیے؟" سلمان کی بات نے کسی حد تک تو اثر کیا لیکن ملک کے لہجے سے ظاہر تھا [illegible] پوری طرح اپنی سابقہ کیفیت سے نہیں نکل سکا ہے۔ [illegible] کیفیت کی پروا کیے بغیر جاوید علی نے اس کے سامنے [illegible] مقصد بیان کر دیا جسے سن کر وہ حیران رہ گیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اس کی حیرت لفظوں میں [illegible] گئی۔

"وہی جو تم نے سنا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم ہمارا ساتھ دو گے یا نہیں؟" جاوید علی نے اسی سنجیدگی سے اس سے سوال کیا [illegible] آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگا جیسے اس کا [illegible] کے بجائے کسی غیر زمینی مخلوق سے واسطہ پڑ گیا ہو یا [illegible] اسے کوئی صحیح الدماغ آدمی تصور نہ کر رہا ہو کیونکہ [illegible] لوں کو تو اس نے کبھی ایسی احمقانہ بہادری سے کام [illegible] دیکھا تھا۔

☆☆☆

سلو ایک کثیر المنزلہ عمارت کی چوتھی منزل پر ایک ایسے [illegible] موجود تھا جہاں کام کے اوقات ٹھیک چھ بجے ختم ہو [illegible] تھے اور بہت سے بہت ساڑھے چھ سے پونے سات کے درمیان دفتر لازماً خالی ہو جاتا تھا۔ اس وقت گھڑی کی سوئیاں آٹھ کے ہندسے کو بھی کراس کر چکی تھیں اس لیے دفتر یقینی طور پر خالی تھا اور وہاں اس کے سوا کوئی دوسرا ذی نفس موجود نہیں تھا۔ البتہ وہ جانتا تھا کہ اس عمارت میں کئی ایسے دفاتر بھی موجود ہیں جہاں رات آٹھ اور نو بجے تک بھی کام جاری رہتا ہے اور بعض میں تو گیارہ بجے رات تک بھی۔ اس لیے یہ عمارت اس وقت بھی سنسان نہیں تھی اور وہ آس پاس سے ابھرنے والی مدھم آوازیں سن سکتا تھا لیکن اس کا دھیان ان آوازوں پر نہیں تھا اور وہ ایک بالکل تاریک کمرے کی کھڑکی کے سامنے اسنائپر گن سمیت جما بھرپور ارتکاز سے سڑک پار نظر آنے والے اس شاپنگ پلازا کی طرف متوجہ تھا جس کی تعمیر میں شیشے کا کثرت سے استعمال کیا گیا تھا اور نہایت مہارت سے لگائے گئے برقی قمقموں نے ان شیشوں کی چمک کے ساتھ مل کر دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ حقیقتاً اسے خود بھی کئی بار اپنی آنکھیں چندھیائی ہوئی محسوس ہوئی تھیں لیکن بہرحال، وہ ایک مضبوط قوتِ ارادی و اعصاب کا مالک شخص تھا جو ہر طرف سے توجہ ہٹا کر اپنے ٹارگٹ پر مرکوز کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ وہ اس جگہ پر توجہ مرکوز کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جہاں اسے اپنے مطلوبہ شخص کو شکار کرنا تھا۔

یہ مطلوبہ شخص بھائی جی کا حریف اشوک تھا اور سامنے موجود شاپنگ پلازا کی نئی نویلی عمارت اس کے بزنس ایمپائر کا ایک حصہ۔ شاپنگ پلازا کی یہ عمارت حال ہی میں مکمل ہوئی تھی اور آج اس کا باقاعدہ افتتاح ہونے والا تھا۔ افتتاح کا وقت رات نو بجے کا طے کیا گیا تھا اور معلوم ہوا تھا کہ اس کام کے لیے اشوک نے اپنے کسی منسٹر دوست کو بطور مہمان خصوصی مدعو کر رکھا تھا۔ اس حساب سے وہاں سیکیورٹی کے بھی سخت انتظامات تھے اور کسی غیر متعلقہ شخص کے لیے ممکن نہیں تھا کہ پلازا کی حدود میں داخل ہو سکے۔ انہیں جو کچھ کرنا تھا، اس کے لیے وہاں داخل ہونے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سارا منصوبہ عبدالرحمن نے تیار کر کے دیا تھا اور منصوبے پر عمل کے لیے درکار اشیا بھی اسی کی فراہم کردہ تھیں لیکن یہ طے تھا کہ ان میں سے کوئی بھی شے اپنے بھائی جی سے تعلق کو ظاہر نہیں کرتی تھی۔ جس گاڑی میں وہ دونوں یہاں تک آئے تھے، وہ چوری کی تھی اور چور بازار سے خریدی گئی اسنائپر گن بھی کسی تھرڈ پارٹی کے ذریعے حاصل کی گئی تھی۔ وہ اپنا کام مکمل کر لیتے تو کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ اشوک کی موت میں بھائی جی کا ہاتھ ہے، خصوصاً اس صورت میں کہ سلو کو یہاں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

جاتے جاتے یہ پیغام چھوڑ کر جاتا تھا کہ انسپکٹر پریم ناتھ کے لیے اشوک کی ڈیڈ باڈی کا تحفہ۔ یہ پیغام معاملات کو الجھا دیتا اور قدرتی طور پر اس کیس پر کام کرنے والے اس کا تعلق ڈاکٹر فرحان کے معاملے سے جوڑتے کیونکہ یہ پریم ناتھ ہی تھا جس کے ہاتھوں ڈاکٹر فرحان کی تباہی کا سفر شروع ہوا تھا اور سوچا جا سکتا تھا کہ پریم ناتھ کے خلاف انتقامی کارروائی کرتے ہوئے یہ قدم اٹھایا گیا ہے۔

اس طریقۂ کار میں ایک خوبی یہ تھی کہ بھارتی ایجنسیاں ایک نظریہ قائم کر لینے کے باوجود براہِ راست پاکستان پر کوئی الزام عائد نہیں کر سکتی تھیں۔ الزام عائد بھی کیا جاتا تو اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے شہریار نے اس طریقۂ کار کو قبول کر لیا تھا۔ وہ خود بھی سلو کے ساتھ یہاں آیا تھا اور اس وقت عمارت کے عقبی دروازے سے کچھ فاصلے پر گاڑی میں بیٹھا سلو کی واپسی کا منتظر تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس وقت جو کام سلو کو سونپا گیا ہے، اس میں وہ زیادہ خطرے میں ہے اور وہ اس کی نسبت محفوظ پوزیشن میں ہے لیکن سلو کا انتخاب میرٹ پر کیا گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سلو اپنی برسوں کی تربیت اور خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے اس کے مقابلے میں کہیں بہتر نشانچی ہے اس لیے اسے یہ ذمّے داری سونپی گئی تھی جو خود سلو نے بھی بنا کسی ہچکچاہٹ کے فوراً قبول کر لی تھی۔ اس کی اپنی فطرت میں تھرلنگ تھی اور وہ خطرناک صورتِ حال میں کام کرتے ہوئے ہچکچانے کے بجائے ایکسائٹمنٹ محسوس کرتا تھا۔

اس وقت بھی وہ دفتر کے تاریک کمرے میں پورے سکون سے کھڑا ہوا تھا اور کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ وہ غلط طریقے سے دفتر کا دروازہ کھول کر یہاں داخل ہوا ہے اور ایک ایسے شخص کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس کی موت کے نتیجے میں پورا ممبئی شہر ہل کر رہ جائے گا اور یہاں ہنگاموں کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ گولی چلانے کے بعد اسے یہاں سے فرار ہونے کے لیے زیادہ مہلت نہیں ملے گی اور فوراً اندازہ لگا لیا جائے گا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی ہے۔ البتہ اس بات کا تعین کرنے میں تھوڑا سا وقت لگ سکتا تھا کہ گولی کس دفتر کی کھڑکی سے چلائی گئی ہے۔ وہ پہلے سے تحریر کردہ پیغام اپنی جیب میں لیے کھڑکی کے قریب بالکل ساکت کھڑا تھا۔ ٹارگٹ سامنے آنے پر اسے گولی چلانی تھی اور پیغام والا کاغذ دفتر کی میز پر رکھ کر فوراً وہاں سے نکل جانا تھا۔ اس پر اسنائپر گن واپس اپنے ساتھ لانے کی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ ایک بڑے بریف کیس میں ٹکڑوں کی شکل میں لائی گئی گن کے حصوں کو اس نے اسی دفتر میں بیٹھ کر آپس میں جوڑا تھا۔ وہ دفتر میں داخل ہوا تھا تو اس کے ہاتھوں پر ربر کے باریک دستانے چڑھے ہوئے تھے اس لیے اسے اپنے فنگر پرنٹس کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی البتہ اس کے انتظار میں نیچے موجود شہریار کو خوشی ہو رہی تھی کہ وہ بھارتیوں کے تیار کردہ عفریت کو ان کے اپنے خلاف استعمال کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اور حقیقت میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا ورنہ اگر کوئی دیکھ سکتا تو دیکھتا کہ اسنائپر گن کے ساتھ کھڑکی کے قریب کھڑا سلو کتنا باوقار لگ رہا ہے۔ اس کا جسم بالکل ساکت تھا اور سانس اتنی ہموار کہ اس کے نتیجے میں بھی جسم میں کسی قسم کا تحرک محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بھورے رنگ میں ڈائی کیے گئے اپنے سر کے بالوں کو اس نے جیل کی مدد سے سیٹ کر رکھا تھا اس لیے کھڑکی سے اندر آتی ہوا کے باوجود اس کے بال بے ترتیب نہیں ہو رہے تھے۔ اس کے جسم پر قیمتی ٹو پیس سوٹ تھا جو اس کام کے لیے مناسب تو نہیں تھا لیکن اسے تحفظ ضرور دے رہا تھا کیونکہ اس حلیے میں دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کوئی ٹارگٹ کلر ہے۔ وہ دیکھنے میں کوئی بزنس مین یا کم سے کم بھی کسی تجارتی کمپنی کا منیجر لگ رہا تھا۔ اس تاثر کو مضبوط کرنے کے لیے اس نے اپنی آنکھوں پر زیرو نمبر کے شیشوں والی نفیس سی عینک لگا رکھی تھی اور چہرے پر بھورے رنگ کی ہی فرنچ کٹ داڑھی بھی تھی۔ وہ حالتِ انتظار میں تھا اور مسلسل اسنائپر گن کے ساتھ منسلک دوربین سے شاپنگ پلازا کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ وہاں سیکیورٹی کے لیے باوردی پولیس والوں کے علاوہ دوسرے بہت سے لوگ بھی نظر آ رہے تھے جن میں سے اکثریت یقیناً اشوک کے گرگوں کی تھی۔

گھڑی کی سوئیوں نے نو کے ہندسے کی طرف اپنا سفر مکمل کیا ہی تھا کہ اسے وہاں ہلچل سی محسوس ہوئی اور فوراً ہی وجہ بھی سمجھ آ گئی۔ وہ گاڑیوں کا پورا ایک قافلہ ہی تھا جو شاپنگ پلازا کے سامنے آ کر رکا تھا۔ گاڑیاں رکیں تو پہلے سے مستعد کھڑے افراد میں سے کچھ اس طرف لپکے۔ بہت سے محافظ کھٹا کھٹ کھلتے گاڑیوں کے دروازوں سے برآمد ہوئے اور پھر جب انہوں نے ”اوکے“ کا سگنل دیا تو ان دو خاص گاڑیوں کے دروازے کھلے جن سے اشوک اور منسٹر برآمد ہوئے۔ اشوک نے باہر نکل کر گرم جوشی سے منسٹر کو گلے لگایا اور پھر دوستانہ انداز میں اس کا ہاتھ تھام کر اس طرف بڑھا جہاں افتتاحی تقریب کے لیے پلازا کے مرکزی دروازے کو خوب صورتی سے سجایا گیا تھا اور سرخ ربن منسٹر صاحب کے ہاتھوں کاٹے جانے کی منتظر تھی۔ اس موقع پر وہاں میڈیا کے کئی نمائندے بھی

تقریب کی کوریج کر رہے تھے۔

اشوک اور منسٹر سرخ ربن کے عین سامنے جا کر رکے تو طشتری میں چھوٹی سی قینچی لائی گئی۔ اس موقع پر ... جو منسٹر کی دائیں جانب کھڑا ہوا تھا، اس کا اب تک ... مسکرا کر کچھ کہا۔ جواباً منسٹر بھی مسکرا کر ... چھوڑ دیا اور قینچی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اب سلو کے لیے مزید ... تھا۔ اس نے اپنی سانس روکی اور دیر سے لبلبی پر ... ہوئی انگلی حرکت میں آ گئی۔ اسے سو فیصد یقین تھا ... نکلی ہوئی گولی اشوک کے سر کو پاش پاش کر کے رکھ ... لیکن عین اس لمحے وہ ہوا جس کی اسے ذرا بھی امید ... وہ ایک ٹی وی چینل کا کیمرا مین تھا جو منظر کی بہترین ... کے لیے جوش میں آ کر اچانک ہی کیمرے سمیت ... معاون کے شانے پر سوار ہو گیا تھا اور اس کا جسم اچانک ... اور گولی کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ... صورتِ حال یکسر بدل گئی۔ کیمرا مین گولی کھا کر ایک ... نیچے گرا اور اشوک اور منسٹر کے محافظوں نے خودکار ... سے کام لیتے ہوئے اتنی تیزی سے ان دونوں کو اپنے ... میں لیا کہ سلو کے لیے دوسری گولی چلانے کی گنجائش باقی ... رہی اور وہ اپنی ناکامی کا بوجھ شانے پر اٹھائے وہاں سے ... اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ پچھلے دروازے پر شہریار ... سمیت اس کا منتظر تھا۔ وہ ناکامی کی تحریر چہرے پر رقم ... تک پہنچا تو اس نے کوئی بھی سوال کیے بغیر گاڑی چلا ... اسی وقت اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ یہ عبدل کے ... کی کال تھی جو بظاہر اشوک کے گینگ کے لیے کام کرتا ... لیکن اس کی حقیقی وفاداریاں بھائی جی کے ساتھ تھیں۔

”وہ بچ گیا ہے۔ تمہارے آدمی نے ایک کیمرا مین کو ... ڈالا۔“ کال ریسیو کرنے پر اس نے اس آدمی کی ہیجانی آواز سنی۔

”کوئی بات نہیں۔ کام پھر بھی مکمل ہو جائے گا۔“ اس ... جواب دے کر موبائل آف کر دیا۔

”میں نے اشوک کا ہی نشانہ لیا تھا لیکن وہ کیمرا مین ... اچانک درمیان میں آ گیا۔“ سلو نے شکستہ سے لہجے میں صفائی پیش کی۔

”مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ اگر مجھے تم پر اعتماد نہ ہوتا تو اس کام کے لیے تمہارا انتخاب ہرگز نہیں کرتا۔“ ... نے تسلی دینے والے لہجے میں اسے جواب دیا اور خود ... کاٹ کر گاڑی کو اس سڑک پر لے آیا جہاں شاپنگ ... موجود تھا۔ اس سے قبل وہ عقبی جانب ایک غیر مصروف راستے پر سفر کرتے رہے تھے۔

”اب تمہارے ذہن میں کیا ہے... کیا کرنا چاہتے ہو؟“ گاڑی کو پلازا والے روڈ پر آتے دیکھ کر سلو نے اس سے دریافت کیا۔ شہریار کے ایک ہی جملے نے اسے ناکامی کے صدمے سے نکال دیا تھا۔ ویسے بھی وہ کسی بات کو بہت دیر تک اپنے اعصاب پر سوار رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔

”ہمیں اپنا کام ابھی مکمل کرنا ہوگا ورنہ بعد میں یہ کام اور بھی مشکل ہو جائے گا اور ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب کو لے کر جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے۔“ اس نے جواب دیا اور قریب سے گزرنے والی ایک پولیس جیپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ہاتھوں کے اشارے سے اس نے ان لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”وہاں میں نے ایک آدمی کو گن لے کر بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔“ پولیس والے متوجہ ہوئے تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے سمت بتاتے ہوئے انہیں ہیجانی لہجے میں آگاہ کیا۔ یہ خبر سن کر وہ فوراً چونک گئے اور اپنی جیپ کا رخ اس کی بتائی ہوئی سمت میں موڑ کر اس بغلی گلی میں گھس گئے جو شاپنگ پلازا کے عقبی حصے کی طرف جا رہی تھی۔ اس وقت اس جگہ پر عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن گونج رہے تھے۔ لوگ ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے اور سڑک پر سے گاڑی لے کر گزرنے والے چاہ رہے تھے کہ جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جائیں۔ کوئی بھی خود کو اس ہنگامے میں پھنسانا نہیں چاہ رہا تھا جو صرف اور صرف ایک گولی چلنے کے نتیجے میں وہاں بپا ہوا تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ گولی سے مرا تو بے شک ایک بے چارہ کیمرا مین تھا لیکن گولی چلائی اشوک یا اس کے دوست منسٹر پر گئی تھی چنانچہ صورتِ حال بے حد گمبھیر تھی۔ پولیس جیپ کے پیچھے ہی اس نے اپنی گاڑی بھی موڑ لی تھی اور اب دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلتی ہوئی عقبی حصے میں پہنچ گئی تھیں۔ وہ جگہ تقریباً سنسان پڑی تھی اور کسی گن بردار آدمی کا وجود ظاہر ہے نظر نہیں آ رہا تھا۔

”کہاں دیکھا تھا تم نے اسے؟“ پولیس والوں میں سے ایک نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ اس وقت اگر وہ دونوں نہایت قیمتی ملبوسات اور مہنگی ترین گاڑی کی وجہ سے بے حد امیر نظر نہ آ رہے ہوتے تو شاید پولیس والوں کا رویہ بہت خراب ہوتا لیکن انہیں بھی خبر تھی کہ پیسے والوں کا اثر رسوخ بہت اوپر تک ہوتا ہے اس لیے اپنے روایتی طریقے پر بات کرنے سے بساط بھر گریز کر رہے تھے۔

”میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ گن لے کر اس عمارت

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں گھس رہا تھا۔'' شہریار نے ایک اور کمرشل عمارت کی طرف اشارہ کیا جو پانچ منزلہ بلند تھی۔ اس پوری سڑک پر دونوں اطراف میں زیادہ تر کمرشل بلڈنگز ہی تھیں اور چند ہی ایسی عمارتیں تھیں جو رہائشی فلیٹس کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں۔ ان میں بھی گراؤنڈ فلور پر مختلف چھوٹے بڑے کاروباری مراکز ہی قائم تھے۔

''ہمیں فورس کو کال کر کے اس بلڈنگ کو گھیرے میں لینا چاہیے۔ ہوسکتا ہے یہاں اس شخص کے دوسرے ساتھی بھی چھپے ہوں۔'' ایک پولیس والے نے ان سے گفتگو کر کے اپنے ساتھی کو مشورہ دیا جو یقیناً اسے پسند آیا اور اس نے وائرلیس نکال لیا۔ ان لوگوں کے لیے مزید انتظار بیکار تھا۔ شہریار جس نے پہلے ہی اپنی جیب میں پڑے سائیلنسر لگے پسٹل کو گرفت میں لے رکھا تھا، حرکت میں آگیا۔ ٹھک ٹھک کی آواز کے ساتھ اس کے پسٹل نے لگاتار چار گولیاں اگلیں اور وہ چاروں ہی پولیس والے ڈھیر ہو گئے۔ گرنے سے پہلے ان میں سے دو کو تو آواز تک نکالنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ شہریار نے کوشش کی تھی کہ ان کے سروں کو نشانہ بنائے۔ اس کی یہ کوشش اس حد تک کامیاب رہی تھی کہ ایک کی پیشانی پر گولی نے سوراخ کیا تھا، دوسرے کی دائیں آنکھ سے گولی اندر گھس کر سر کے پچھلے حصے سے باہر نکل گئی تھی اور تیسرے کی گردن میں چھید ہو گیا تھا چوتھا، البتہ محفوظ رہا تھا او گولی اس کے کان کی لو کو اڑاتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اسی نے سب سے بلند چیخ ماری تھی اور تیزی سے زمین پر گر گیا تھا۔ سلو نے اس کے مکر کو محسوس کر لیا اور لپک کر اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس سے قبل کہ پولیس والا کوئی حرکت کر پاتا، اس نے اس کے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں جکڑا اور پختہ سڑک پر زور سے دے مارا۔ پولیس والے کا سر کسی تربوز کی طرح پھٹ گیا اور اس سے سرخ سرخ خون بہنے لگا۔

''جلدی کرو، ان کی قمیصیں اتار کر پہن لو۔'' شہریار جو خود بھی حرکت میں آچکا تھا، زور سے بولا اور پھر دونوں نے ہی تیزی سے ان دو کو منتخب کرتے ہوئے ان کی شرٹیں اتارنا شروع کر دیں جو خون آلود نہیں ہوئی تھیں۔ شہریار کے حصے میں مکمل صاف ستھری قمیص آئی البتہ سلو نے جو قمیص پہنی، اس کے دائیں کندھے پر کچھ خون موجود تھا۔ یہ قمیصیں پہننے کے لیے انہیں اپنے کوٹ اتارنے پڑے تھے لیکن انہوں نے کوٹ وہیں پھینکنے کے بجائے اپنے ساتھ لے لیے تھے اور لمحوں میں اپنے ضروری سامان سمیت پولیس جیپ میں منتقل ہو چکے تھے۔ گاڑی چوری کی تھی اس لیے اس کی انہیں پروا نہیں تھی۔ سروں پر کیپ جمانے کے بعد وہ مکمل پولیس والے ہی لگ رہے تھے البتہ پینٹیں بدلنے کی مہلت نہیں تھی لیکن انہیں امید تھی کہ چونکہ کسی کی نظر میں نہیں آئے گی۔ شہریار نے جو پینٹ پہن رکھی تھی، وہ کسی حد تک پولیس یونیفارم سے میچ بھی کر رہی تھی اس لیے وہ زیادہ پراعتماد تھا۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ بھی اسی نے سنبھالی تھی اور فوری طور پر موبائل پر بھی مصروف ہو گیا تھا۔

''اشوک کہاں ہے منا؟'' رابطہ ہوتے ہی اس نے اشوک کے آدمیوں میں شامل بھائی جی کے مخبر سے دریافت کیا۔

''وہ منسٹر صاحب کو رخصت کرنے کے بعد اب خود بھی یہاں سے نکل رہا ہے۔ اس کے ساتھ اس کے پرسنل گارڈز کے علاوہ پولیس والوں کی بھی اچھی خاصی نفری جانے والی ہے۔'' منا نے اسے آگاہ کیا۔

''گڈ! یہ تو اچھی خبر ہے۔'' ملنے والی اطلاع پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور سلو کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم تیار ہو نا؟''

''یس باس۔'' سلو جو اس کے پروگرام کو سمجھ چکا تھا، اعتماد سے بولا۔ اسی وقت سست رفتاری سے چلتی ہوئی جیپ کو لے کر شہریار مین روڈ پر آگیا اور جیپ کی رفتار تیز کر دی۔ وہاں کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ جیپ کے سوار بدل چکے ہیں اور جو اصل پولیس والے ہیں، وہ اس وقت لاشوں کی صورت میں عقبی سڑک پر ایک نیم تاریک گوشے میں پڑے ہوئے ہیں۔ پولیس جیپ نے ان کا کام بے حد آسان کر دیا تھا۔ وہ آرام سے سفر کرتے ہوئے شاپنگ پلازا کے سامنے پہنچ گئے تھے جہاں سے اشوک کی گاڑی بہت سی دوسری گاڑیوں کے حصار میں روانہ ہو رہی تھی۔ شہریار نے اپنی جیپ بھی ان گاڑیوں میں شامل کر لی۔ چھ عدد گاڑیوں پر مشتمل وہ قافلہ وہاں سے روانہ ہوا، تب بھی فضا پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سے گونج رہی تھی۔ شہریار نہایت سکون سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑیاں اب اس سڑک سے ہٹ کر دوسری سڑک پر پہنچ چکی تھیں۔ شہریار بہت مہارت اور ہوشیاری سے اپنی جیپ کو اس طرح آگے بڑھا رہا تھا کہ اس کی اور اشوک کی گاڑی کا درمیانی فاصلہ گھٹ جائے۔ سلو اپنی جگہ بیٹھا خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔

''یہ بلٹ پروف بلکہ شاید بم پروف گاڑی ہے۔ ہم اس پر حملہ کر کے اندر بیٹھے اشوک کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔'' سلو جو عمل کے لیے تیار تھا، قریب سے گاڑی کا جائزہ لینے پر بڑبڑانے کے انداز میں بولا تو شہریار بھی چونک گیا۔ اس نے سوچا تھا چلتی گاڑی پر ہینڈ گرینیڈ برسا کر اسے تباہ کر دیں گے تو اشوک کا پتا خود بخود صاف ہو جائے گا لیکن موجودہ صورت

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں تو یہ امکان ہی ختم ہوگیا تھا۔ اشوک کی گاڑی کے بارے میں اسے یہ اندازہ تو تھا کہ وہ بلٹ پروف ہوگی لیکن بم پروف ہونے کی بات اس کے ذہن میں کبھی نہیں آئی تھی۔

"کوئی بات نہیں، ہم پھر بھی اپنا کام مکمل کر کے ہی رہیں گے۔ اشوک کو اس کے گھر پہنچنے دو۔" ہمت ہارنے کے بجائے اس نے فوراً ہی اپنا اگلا لائحہ عمل طے کرلیا اور سرگوشیوں میں سلو کو بتانے لگا کہ آگے کے لیے اس کا کیا پروگرام ہے۔ اللہ اللہ کر کے وہ سفر ختم ہوا اور ممبئی کے نہایت پوش علاقے میں پہنچ کر گاڑیاں ایک ایسے محل نما بنگلے کے سامنے جارکیں جو یقینی طور پر اس علاقے کا سب سے شاندار بنگلا تھا۔

"یہ اپنی گاڑی اندر لے جائے گا اور باقی گاڑیوں کو پھاٹک کے باہر ہی روک دیا جائے گا۔" سلو نے تشویش بھرے لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کیا جو درست ہی محسوس ہورہی تھی۔ شہریار کے ماتھے پر سلوٹوں کا جال سا بن گیا لیکن اسی وقت گویا ان کے لیے غیبی امداد آگئی۔ وہ میڈیا والے تھے جو گاڑیوں کے وہاں پہنچتے ہی ٹوٹ پڑے تھے اور اشوک کے ڈرائیور کے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ گاڑی کو گیٹ سے اندر لے جائے۔ اشوک کو ممبئی میں گینگسٹر کے علاوہ سوشل ورکر کی حیثیت سے بھی پہچانا جاتا تھا اس لیے اس پر ہونے والے حملے کے بعد اب میڈیا کا یہ حق بنتا تھا کہ وہ اشوک سے تھوڑی سی بات چیت کر کے اس بارے میں اس کی رائے سے عوام کو آگاہ کریں۔ اشوک اب اپنی محل نما رہائش گاہ کے عین سامنے تھا اس لیے یقینی طور پر اس کا خوف بھی خاصا دور ہوچکا تھا اس لیے اس نے گاڑی رکوالی اور ایک شیشہ کھول کر اپنا چہرہ باہر نکالا۔ باہر بہر حال وہ پھر بھی نہیں نکلا تھا اور انہیں اس مختصر مہلت سے فائدہ اٹھانا تھا۔

"شوٹ۔" شہریار نے سرسراتی ہوئی آواز میں حکم دیا۔ اشوک کے گرد میڈیا والوں کے ہجوم کی وجہ سے اس نے ہینڈ گرینیڈ کے استعمال کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ سلو اس کے پیغام کو سمجھ گیا اور فوراً ہی گن نکال کر نشانہ باندھ لیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پولیس کی گاڑی میں اشوک کے خون کے پیاسے موجود ہیں۔ گولی چلی اور سنسناتی ہوئی دو رپورٹرز کے سروں کے درمیان سے گزر کر عین اشوک کی پیشانی میں جا گھسی۔ سلو نے شاید یہ اپنی زندگی کا سب سے سچا نشانہ لیا تھا اور کچھ دیر قبل اٹھائی جانے والی ناکامی کے داغ کو دھو دیا تھا۔ لمحہ بھر کو تو شاید کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے لیکن پھر چیخ و پکار مچ گئی۔ شہریار نے اپنی جیپ کا انجن اسٹارٹ ہی رہنے دیا تھا چنانچہ سلو کے گولی چلاتے ہی اس نے بہت خطرناک طریقے سے جیپ کو ریورس کیا اور جیپ اپنے پیچھے موجود گاڑی کو دھکا مارتی ہوئی خاصی دور تک چلی گئی۔ وہاں موجود دوسرے لوگ اب صورت حال کو سمجھ چکے تھے۔ تابڑ توڑ کئی گولیاں جیپ پر برسیں اور ان کے سروں پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئیں۔ اگر انہوں نے اپنے سروں کو نیچے نہ جھکالیا ہوتا تو کوئی نہ کوئی گولی بھیجے میں گھس چکی ہوتی۔ اس وقت شہریار کے پاس اتنی مہلت بھی نہیں تھی کہ گاڑی کا رخ موڑ سکے۔ وہ اسے ریورس میں ہی پوری رفتار سے چلا رہا تھا ادھر سلو سر جھکائے جھکائے ہی تعاقب میں آنے والی گاڑیوں کا راستہ روکنے کے لیے مسلسل فائرنگ کررہا تھا لیکن گاڑیاں بھی رکنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

"ہینڈ گرینیڈ۔" آخر کار شہریار کو فیصلہ کرنا پڑا۔ ویسے بھی اب صحافی بہت دور اور پیچھے رہ گئے تھے اور تعاقب میں آنے والے پولیس والے یا اشوک کے آدمی تھے۔ سلو نے اس کی ہدایت پر فوراً ہی ایک ہینڈ گرینیڈ نکالا اور اس کی پن کھینچ کر آگے کو پہنچتی گاڑیوں کی طرف اچھال دیا۔ کان پھاڑ دھماکا ہوا جس نے ان کی جیپ کو بھی لرزا کر رکھ دیا لیکن شہریار اس پر اپنا کنٹرول قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔ سلو کے دوسرا گرینیڈ اچھالنے تک وہ اس قابل ہوچکا تھا کہ جیپ کو موڑ کر اسے سیدھا چلا سکے۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کی تیز ترین ڈرائیونگ کررہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ جلد از جلد اس جگہ سے نکل کر اس جیپ سے نجات حاصل کرلے لیکن سامنے سے آتی تیز رفتار پولیس موبائل نے اعلان کردیا کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس نے ایک نظر سلو کی طرف دیکھا اور ایکسلریٹر پر دباؤ کچھ اور بڑھا کر جیپ کو اس کی انتہائی رفتار پر لے گیا۔ پولیس موبائل کا ڈرائیور اس دیوانگی کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا اس لیے بری طرح بوکھلا گیا اور فیصلہ نہ کرسکا کہ تصادم سے بچنے کے لیے کیا کرے۔ آخری لمحات میں اسے صرف ایک بات سوجھی اور وہ یہ کہ وہ خوف سے اپنی آنکھیں بند کرلے۔ پھر جب دونوں برق رفتار گاڑیاں آپس میں ٹکرائیں تو ڈرائیور کو بند ہونے والی آنکھوں کے ہمیشہ کے لیے بند ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن اس خطرناک تصادم میں صرف ڈرائیور ہی تو متاثر نہیں ہوسکتا تھا ان دو دیوانوں کو بھی تو کوئی نہ کوئی نتیجہ بھگتنا تھا جنہوں نے یہ خطرناک فیصلہ کیا تھا۔

یہ پرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

عہد رفتہ میں رہنا... اس کو سوچنا بہت ہی دلفریب عمل ہے... اس کے ردعمل میں جو کچھ رونما ہوتا ہے... وہ سنگین بھی ہوتا ہے... اور رنگین بھی... اس دفعہ جلیل اور اس کے پرانے ساتھیوں کی یکجائی نے ایک انوکھا رنگ دکھایا ہے... فساد... کی جڑ رنگین کاغذ... کے حصول کے لیے کیا جانے والا دھوم دھڑکا...

یادش بخیر

کاشف زبیر

یادوں کے خزانے میں سے برآمد ہونے والا جلیل کا کھلکھلاتا سلسلہ...

حلقۂ یاراں وسیع اور بے روزگار تھا۔ یعنی میں اور راجا حسب معمول بیکار تھے۔ جیب خالی تھی اس لیے فتو کے کیفے ڈی پھونس جانے کی استطاعت بھی نہیں تھی۔ میں اور راجا پیدل ہی جمی کے جمن خانے کی طرف رواں تھے۔ راجا نے بیڑی سلگا رکھی تھی اور وقفے وقفے سے اس کا دھواں یوں خارج کرتا جیسے دھواں پھیپھڑوں کے بجائے دل سے نکل رہا ہو خاص طور سے جب سامنے سے کوئی نظر نواز خاتون آتی نظر آجائے۔ انداز آہ بھرنے والا ہوتا تھا۔ ایک ایسے ہی نظر

WWW.PAKSOCIETY.COM

نواز موقع پر راجا نے آہ بھر کر دھواں خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”جلیل! اپنی بھی کیا قسمت ہے۔“

”تیرے بارے میں اس جملے سے اتفاق ہے۔“ میں نے سامنے سے آتی خاتون کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی جو شاید اپنا شادی سے پہلے کا سوٹ پہن کر شاپنگ اور نمائش عام کے لیے نکل آئی تھی۔ شادی کو کم سے کم دس سال اور پانچ چھ بچے گزر چکے تھے۔ وہ خود سوٹ سے اور کدو کر یلے شاپر سے نکلنے کے لیے بے تاب تھے۔ نہ صرف خاتون کا سانس رکا ہوا تھا بلکہ آس پاس کے تقریباً تمام آنکھ والے دم بہ خود یوگا کی مشق کر رہے تھے۔ حد یہ کہ برسوں سے یہاں موجود نابینا فقیر بھی بھول گیا تھا کہ اسے نظر نہیں آتا ہے۔ یوگا کی اس اجتماعی مشق سے سڑک پر آکسیجن کی کافی بچت ہو رہی تھی مگر گاڑیوں کے دھوئیں میں اضافہ ہو رہا تھا کیونکہ ہمارے پھیپھڑے اس کی صفائی سے قاصر تھے۔ ایک بڑے میاں کو دمے کا دورہ پڑ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی جان دے دیں گے مگر آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے۔ بڑے میاں کا ناخلف بیٹا باپ کے بجائے اپنے دل کو سنبھال رہا تھا۔ غرض حشر کا سماں تھا یعنی سب کو اپنی پڑی تھی۔ خدا خدا کر کے خاتون ایک گلی میں مڑیں تو لوگوں کی رکی سانس اور ٹریفک بحال ہوا۔

”عارفہ اس سے کہیں زیادہ حسین ہے۔“ راجا نے مجھے مطلع کیا۔

”ہاں لیکن وہ شنو کا مقابلہ نہیں کر سکتی… نہ حسن میں، نہ حیا میں اور نہ وفا میں۔“ میں نے راجا سے اتفاق کیا۔ اس پر اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور خبردار کیا کہ وہ عارفہ کے معاملے میں دو سو فیصد سنجیدہ ہے۔ اگر کسی نے اس کے بارے میں کوئی نازیبا بکواس کی تو اپنی وفات کا خود ذمے دار ہوگا۔

”مسئلہ میرا نہیں راجا چندا… کاش تُو مسجد کا چندہ ہوتا تو میں ایک کپ چائے تو پی سکتا تھا۔“ میں نے کہتے ہوئے بغیر دھوئیں کی سرد آہ بھری۔ ”بات یہ ہے کہ کیا عارفہ تجھے گود لے گی اور کیا تجھے معلوم ہے کہ اس کی گود کئی بار بھرتے بھرتے رہ گئی تھی؟“

اس سچ بیانی پر راجا یوں تھر تھر کانپنے لگا جیسے بعض اعلیٰ مرتبت راجاؤں کو آج کل عدلیہ کا نام سنتے ہی لرزا چڑھ جاتا ہے۔ مجھے راجا کی طرف سے قاتلانہ حملے کا خطرہ نہیں تھا۔ اوّل اس میں اتنی استطاعت نہیں تھی، دوسرے وہ احمق نہیں تھا کہ اپنے اکلوتے دوست کو قتل کر دیتا جو بار ہا خود اسے قتل ہونے سے بچا چکا تھا۔ دراصل اس طرح کانپ کر وہ غصے کی اضافی انرجی اور حرارت خارج کر رہا تھا۔ جب اس کا غصہ اور درجۂ حرارت اعتدال پر آ گیا تو اس نے گویا میرے قتلِ عام کا ارادہ ملتوی کر کے ازسرِ نو بیڑی سلگائی۔ بیڑی اور سگار میں یہ آٹومیٹک سسٹم ہے کہ اگر زیادہ کش نہ لیا تو یہ از خود بجھ کر ماحول اور جیب پر بوجھ نہیں بنتی ہیں۔ بیڑی تو ویسے بھی وزن میں بہت ہلکی ہوتی ہے۔ نیا کش لے کر راجا نے ماحول کو مزید دھواں دھواں کیا اور بولا۔ ”جلیل! بہت دنوں سے جیب خالی ہے۔“

”تیرے خالی سر کی قسم، میرا ابھی یہی حال ہے۔“ میں نے اس سے بیڑی لے کر سرد آہ بھری۔ ابھی کل ہی شنو نے جگۂ خاص یعنی چھت پر، وقتِ خاص پر ایک ادائے خاص سے مجھے مطلع کیا کہ ابھی تک میں نے اسے منگنی پر کچھ خاص گفٹ نہیں کیا ہے۔

”خاکسار سے کام چل سکتا ہے۔“ میں نے دانت نکالے تو شنو شرمائی اور دوپٹا انگلی پر لپیٹنے لگی۔ تیسرے بل پر اسے رک جانا پڑا کیونکہ اس سے زیادہ لپیٹنے کی صورت میں دوپٹا بس انگلی پر ہی آ جاتا۔

”جی نہیں، جو گفٹ دیتے ہیں وہ خود گفٹ نہیں ہو سکتے۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہاں، وہ کچھ اور ہوتے ہیں۔ لیکن شنو پیاری، تم جانتی ہو میں بے روزگار ہوں۔“

مگر وہ شنو ہی کیا جو قائل ہو جائے۔ اس نے کہا کہ آج کل وہی لوگ سب سے زیادہ عیش کرتے ہیں جو کچھ نہیں کرتے۔ نیز میں نے ابھی مدرسۂ عشق میں داخلہ لیا ہے، مجھے آگے بڑھنے اور مزید پڑھنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ اس بہت کچھ کی فہرست اتنی طویل تھی کہ اس کا موازنہ بہ آسانی یونیورسٹی کے نصاب سے کیا جا سکتا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا، اب مجھے کچھ کرنا تھا اور اسی امید کے ساتھ میں اس وقت راجا کے ساتھ جمن خانے جا رہا تھا۔ جانا تو میں اکیلا چاہتا تھا مگر راجا نزلے زکام کے وائرس کی طرح چمٹ گیا تھا اور نکلیریا کے پیراسائیٹ کی طرح میرا دماغ کھا رہا تھا۔

”جمی سے کچھ ملنے کی امید ہے؟“ راجا نے ہم سب امید سے ہیں کی عملی تفسیر بن کر پوچھا۔ اس وقت اس کی صورت بھی اس میں کام کرنے والے ایک کریکٹر سے ملتی تھی۔ اب زمانے نے ایسا بدلا ہے کہ راجا کی صورت خود سے بھی نہیں ملتی۔ صرف اپنے کرتوتوں سے ملنے لگی ہے۔ میں نے سر ہلایا اور حقیقت پسندی سے کام لیا۔

”گالیاں اور دھمکیاں مل سکتی ہیں۔ تیرے بارے میں اس کا خیال ہے کہ تُو دھرتی کا بوجھ ہے۔“

”حالانکہ وہ خود دھرتی کا بوجھ ہے۔“ راجا نے بھنا کر کہا۔ اس نے جمی کے بارے میں مزید فکر انگیز انکشافات کیے جن میں سے اکثر کا تعلق حقیقت کے بجائے راجا کے دلی جذبات سے تھا جو اپنے بارے میں جمی کی رائے سنتے ہی ابل کر راجا کے مختصر سینے سے باہر آنے لگے تھے۔ میں نے راجا سے اتفاق کیا۔

”وہ جتنی دولت دبائے بیٹھا ہے، اس لحاظ سے زیادہ بوجھ ہے۔“

راجا نے حسرت سے کہا۔ ”اگر مجھے اس کا دس فیصد بھی مل جائے تو کہیں سے کہیں پہنچ جاؤں۔“

اس بار بھی میں نے اس سے اتفاق کیا کہ وہ نیپئر روڈ کے سرخ محلے سے ہوتا اسی علاقے کے تھانے پہنچ سکتا تھا۔ راجا نے تیسری بار اشتعال میں آنے سے گریز کیا۔ البتہ کچھ فکر انگیز انکشافات میرے بارے میں کیے تھے۔ اتفاق سے حقیقت سے ان کا بھی تعلق نہیں تھا اس لیے میں نے بُرا نہیں منایا۔ اسی اثنا میں جمن خانہ آ گیا۔ خلافِ توقع جمی اس کے صحن میں چوکیداری کے لیے موجود نہیں تھا۔ وہ کڑی نظر رکھتا تھا کہ کون سا غیر متعلقہ فرد کس فلیٹ میں جا رہا ہے، بعد میں جمی خود وہاں پہنچ جاتا تھا کیونکہ وہ اس ساری بلڈنگ کا مالک تھا اس لیے اس کے پاس کسی بھی وقت معائنے کا بہانہ و اختیار موجود تھا۔ راجا نے تمسخر سے کہا۔ ”وہ مس حسینہ کے فلیٹ میں ہوگا۔“

اگرچہ جب سے مس حسینہ کا استاد جانی چڑیا سے تعلق ختم ہوا تھا، لوگ اس کے فلیٹ کے سامنے سے بھی دو گز کا فاصلہ چھوڑ کر گزرتے تھے۔ اس سے زیادہ گنجائش نہیں تھی کیونکہ سیڑھیاں اتنی ہی چوڑی تھیں۔ قارئین کو وہ مہم یاد ہوگی جب جانی چڑیا نے مس حسینہ کے فلیٹ میں اپنے رقیبِ روسیاہ کا مرڈر کیا تھا حالانکہ اسے مس حسینہ کا مرڈر کرنا چاہیے تھا۔ لاش میرے اور جمی کے گلے پڑ گئی تھی۔ یہ کیس بالآخر تھانے میں ختم ہوا اور کیونکہ اس میں جانی چڑیا اور استاد ٹی ٹی کا نام آیا تھا اس لیے پولیس نے خوش اسلوبی سے لاش کو نامعلوم افراد کے کھاتے میں ڈال دیا۔ جمی کی جان بھی اسی وجہ سے بچی بلکہ مس حسینہ کی وجہ سے بچی تھی ورنہ جانی چڑیا جمی کے مرڈر کے موڈ میں تھا۔ مس حسینہ نے استاد جانی چڑیا کو یقین دلایا تھا کہ جمی بے ضرر ہے۔ اگر مس حسینہ کسی مرد کے بارے میں ایسی گواہی دے تو اسے سند سمجھا جا سکتا تھا۔ فلیٹ سے دور سے گزرنے والوں میں جمی بھی شامل تھا۔ وہ جتنا کنجوس تھا، اتنا ہی بزدل بھی تھا۔

مگر میں نے مس حسینہ کے دیدار کی آس میں راجا کی تائید کی اور ہم چوتھے مالے پر موجود اس کے فلیٹ تک جا پہنچے۔ ایک زمانے میں گراؤنڈ فلور پر رہنے والے قبر رسیدہ بڑے میاں بھی صرف اس دروازے کے سامنے سے گزرنے کے لیے لرزتی ٹانگوں سے ہوا کھانے اوپر جاتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ صرف پانچ منٹ ہوا کھا کر وہ واپس آ جاتے تھے البتہ آتے جاتے ہر بار دس منٹ مس حسینہ کے فلیٹ کے سامنے رک کر ستاتے تھے۔ اب تو سامنے والے فلیٹ کا رہائشی اور آخری فلور کے باسی بھی بادِ صبا کے جھونکے کی طرح مس حسینہ کے فلیٹ کے سامنے سے گزر جاتے تھے۔ چوتھی منزل تک جاتے جاتے راجا کا سانس اور ہمت دونوں جواب دے گئے اس لیے دروازے پر دستک کی سعادت بھی مجھے حاصل ہوئی۔ پہلی بار نزاکت سے تین تال میں دروازہ بجایا مگر جب کوئی جواب نہیں ملا تو مجبوراً طبلِ جنگ کے انداز میں دستک دی۔ اس پر مس حسینہ ایسا آتش فشاں بنی نمودار ہوئی جس پر بارش ہوئی ہو۔ مطلب وہ غصے میں اور نہائی ہوئی تھی۔ گیلے بال اور گیلا تر لباس، کیونکہ قمیص مس حسینہ کی ذاتی کھال سے زیادہ فٹ تھی اس لیے نہ چپکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا تو پتا نہیں تھا کہ وہ کیسے سانس لے رہی تھی مگر میری اور راجا کی سانس پچھلے بیس منٹ میں دوسری بار رکی تھی۔ ممکن ہے یہ سانس روکنے کا عالمی ریکارڈ ہو اور گینز بک میں شامل کیے جانے کے قابل ہو مگر اس وقت ہمیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ یہ حشر سامانی ایسی تھی کہ ہم نے اس کی گفتگو بھی نہیں سنی اور اچھا ہی ہوا نہیں سنی کیونکہ وہ سب ناقابلِ بیان تھی۔ ویسے اس کا حلیہ بھی قابلِ بیان نہیں تھا۔

”کیا ہے… کیوں اِدھر آیا ہے اس لنگور کو لے کر؟“ وہ غرائی تو ہم دونوں کو ہوش آیا۔ راجا بوکھلا کر بولا۔ ”یہ جلیل ہے، لنگور نہیں۔“

اس سے پہلے میں راجا کو کچھ کہتا، مس حسینہ نے مزید غرا کر کہا۔ ”میں جلیل سے کہہ رہی ہوں۔ جلیل اس منحوس صورت کو دفع کر۔“

مس حسینہ کی تصحیح نے میرا دل باغ باغ کر دیا مگر میں نے متانت سے مسکرا کر کہا۔ ”یہ دفع نہیں ہوگا۔ ہم دونوں جمی کو تلاش کرتے ہوئے آئے ہیں۔“

مس حسینہ نے جمی کو ہاتھی قرار دیتے ہوئے اسے ایک ناقابلِ بیان جگہ تلاش کرنے کا مشورہ دیا۔ مشورے میں ہتھنی شامل تھی۔ راجا کا مجھے نہیں پتا لیکن مجھے پسینا آ گیا تھا۔ مس

WWW.PAKSOCIETY.COM

حسینہ نہایت واہیات عورت تھی۔ اتنی مردانہ گفتگو تو آج کل مرد بھی نہیں کرتے ہیں۔ یہ سن کر اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا کہ ہم اس کے لیے نہیں بلکہ جمی کے لیے آئے ہیں۔ وہ واہیات ہونے کے ساتھ نمائش پسند بھی تھی اور اپنے سیاہ فام حسنِ شباب کی رونمائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ ہمت کر کے میں نے جائے وقوع کی تردید کی کہ جمی کے یہاں پائے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لیے اگر وہ جمی کے بارے میں جانتی ہے تو ہمیں آگاہ کر دے۔ دروازہ دھڑ سے بند کرنے سے پہلے اس نے بتا دیا کہ جمی صبح تھانے میں تھا۔ اب پتا نہیں اسپتال میں تھا یا مردہ خانے میں۔ مجھے شبہ ہوا کہ میرے کانوں نے کچھ غلط سنا ہے۔ میں نے تصدیق کے لیے راجا کی طرف دیکھا تو وہ بھی دم بہ خود تھا۔

تھانہ اس دنیا میں وہ آخری جگہ تھی جہاں جمی جا سکتا تھا۔ ویسے تو وہ جمن خانے کے سامنے برسوں سے ڈیرا جمائے جبو سے بھی ڈرتا تھا۔ جبو کسی زمانے میں اپنی گلی کا شیر کتا تھا مگر اب وہ تقریباً دو ڈھائی سو پلوں کا باپ بن گیا تھا، یعنی کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ اپنے ٹھیے پر پڑا اونگھتا رہتا یا ایسے ہی دل پشوری کے لیے آنے جانے والوں پر بھونکتا تھا۔ کاٹا تو اس زمانے میں بھی کسی کو نہیں تھا جب منہ میں پورے دانت تھے مگر جمی کی جتنی جان پولیس والوں سے نکلتی تھی، اتنی شاید ملک الموت سے بھی نہ نکلتی۔ وجہ صاف ظاہر ہے ملک الموت صرف جان لیتے ہیں پولیس والے جان سے پہلے بہت کچھ لے لیتے ہیں جس میں سرِفہرست پیسا ہے اور جمی جان دے سکتا ہے لیکن پیسا نہیں۔ اس لیے وہ ہر ایسا کام کرنے سے گریز کرتا تھا جس میں تھانے جانے کا امکان ہو۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، راجا نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

''تو نے بھی وہی سنا ہے جو میں نے؟''

''جمی تھانے کیسے چلا گیا؟'' میں نے تشویش سے کہا۔ تشویش جمی کی کم تھی، یہ زیادہ تھی کہ پولیس تھانے آنے والے گرفتار شدگان کے لواحقین اور عزیز و اقارب کے ساتھ دوستوں کو بھی سمیٹ لاتی ہے۔ خاص طور سے جب وہ میرے جیسے اعزاز یافتہ ہوں اور سرکاری مہمان رہ چکے ہوں۔ مبینہ... مجرموں کے لیے حوالات میں جگہ ہو نہ ہو، پولیس والوں کے دل میں ضرور ہوتی ہے اس لیے وہ پوری فراخ دلی سے گرفتاریاں کرتے ہیں۔

''میرا خیال ہے کہ وہ مفت کی چرس پیتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔''

میں اچھل پڑا۔ ''مفت کی چرس اسے کہاں سے ملتی ہے؟''

''یہی... دیتی ہے۔'' راجا نے بند دروازے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مس حسینہ کو ایک ناقابلِ بیان مگر قابلِ تعین لقب سے نوازا۔ لیکن وہ کان لگائے کھڑی تھی، اس نے دروازہ کھول کر کہا۔

''تو خود ہو گا کمینے...'' اس کے بعد کی بات بھی ناقابلِ بیان تھی۔ راجا بھڑک اٹھا اور کچھ دیر دونوں میں پارلیمانی الفاظ کا تبادلہ ہوتا رہا مگر یہاں بھی مس حسینہ کا پلہ بھاری رہا اور بالآخر راجا کو پسپا ہونا پڑا اور وہ جاتے ہوئے مجھے مس حسینہ کے ساتھ غلط ملط کرتے ہوئے نیچے آنے کو کہہ گیا۔ خلافِ توقع مس حسینہ نے اس بات کا برا نہیں منایا اور راجا کے جاتے ہی ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر بولی۔

''کیا خیال ہے، اب تیرا یار بھی بول گیا ہے۔ آنا اندر...''

''اپنے یار کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''مجھے ابھی زندہ رہنا ہے۔''

اس پر مس حسینہ کا موڈ پھر خراب ہو گیا۔... ''پھر تو برا اٹھائے کائے کو کھڑا ہے؟''

''یہ پوچھنے کہ جمی کو پولیس کیوں لے گئی ہے؟''

''پتا نہیں، بس صبح اچانک آئی اور اسے بکروں سمیت لے گئی۔ اور جانا ہے تو تھانے چلا جا...'' مس حسینہ نے چیلنج دینے کے انداز میں کہا۔ ''مرد ہے تو چھڑا لا۔''

کیونکہ اوپر والے نے پہلے ہی مرد بنایا تھا، اس لیے مجھے مزید ثبوت دینے کے لیے تھانے جانے اور جمی کو چھڑانے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ مجھے تجسس ضرور تھا کہ جمی کس سلسلے میں تھانے یاترا پر لے جایا گیا تھا۔ نیچے آیا تو راجا کا حال زیادہ برا تھا۔ وہ میرے سر ہو گیا۔ ''ذلیل کچھ کر...''

میں نے بدک کر کہا۔ ''جمی کو چھڑانے کے لیے؟''

''نہیں، یہ جاننے کے لیے کہ اسے پولیس نے کیوں پکڑا ہے؟''

''کسی کو گرفتار کرنے کے لیے ہماری پولیس کو روایتی وجوہات درکار نہیں ہوتیں، وہ صرف اتنا دیکھتی ہے کہ پارٹی کتنا مال پانی دے سکتی ہے۔''

''سب جانتے ہیں کہ جمی جان دے دے گا، مال پانی نہیں دے گا۔''

''کیا کہا جا سکتا ہے، تھانے میں اس کا مقابلہ ان ماہرینِ فن سے ہو گا جو بہ قولِ شخصے بیل سے بھی دودھ نکال لیتے ہیں۔'' میں نے فکرمندی سے کہا۔ راجا نے میری طرف دیکھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"جلیل! تو معلوم کرسکتا ہے۔"
"ضرور... اس کے بعد میرا معلوم کرنے کون آئے گا؟" میں خفا ہو کر بولا۔ "تو کیوں نہیں معلوم کرلیتا؟ اب تو نادر شاہ بھی تجھے پہچاننے لگا ہے۔ تو اکثر اس کی گلی میں پایا جاتا ہے۔"
راجا نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ "وہ آتے جاتے مجھے جن نظروں سے دیکھتا ہے اگر میں تھانے جمی کا معلوم کرنے گیا تو وہ جمی کو چھوڑ دے گا لیکن مجھے رکھ لے گا۔"
"ظاہر ہے تو اس کی دختر بداختر کے بارے میں فاسد عزائم رکھتا ہے۔"
راجا نے دانت نکالے۔ "میں اسے اپنی بہن... بالکل نہیں سمجھتا۔"
میں نے تائید کی۔ "عارفہ کا بھائی بننا بڑے دل گردے کا کام ہے، غالباً اسی وجہ سے اس کے کچھ بھائی پیدا ہوتے ہی چل بسے تھے۔ نادر شاہ کیونکہ عادی حرام خور ہے اس لیے عارفہ کا باپ ہونے سے اسے فرق نہیں پڑتا۔"
ہم اسی قسم کی بکواس کرتے باہر آئے تو سامنے سڑک کے پار ایک پورٹیبل سا شخص اپنی اوقات سے بڑا چھرا لیے اچھل رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ "قسم اللہ کی... چھوٹی بوٹی کر دوں گا... چانپ نہ کی تو بلو نام نہیں میرا... ہڈیاں توڑ دوں گا۔"
اس کی گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ وہ قصائی برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر آس پاس ایسا کوئی فرد نظر نہیں آرہا تھا جسے دھمکیاں دی جاسکتیں۔ اس کا مطلب تھا وہ غائبانہ دھمکیاں دے رہا تھا۔ بہر حال ہمارا مسئلہ بلو قصائی نہیں، جمی تھا جو تھانے میں تھا۔ اگرچہ میں نے راجا کو جواب دے دیا تھا لیکن میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا تھا کہ جمی کتنا ہی کمینہ اور کنجوس سہی بالآخر ہمارا دوست تھا۔ اس وقت وہ مشکل میں تھا اور ہمارا فرض تھا کہ اس کی مدد کرتے۔ میں نے ضمیر صاحب کو سمجھایا کہ جمی کو چھڑانے کے سلسلے میں اگر ہم بھی پکڑے گئے تو چھتر ہمیں پڑیں گے ضمیر صاحب کو نہیں۔ مگر یہ حضرت بھی اپنے نام کے ہیں۔ غلط موقع پر بیدار ہوں گے اور پیچھے پڑ جائیں گے۔ مجبور ہو کر میں نے راجا سے کہا۔
"تو ٹھیک کہہ رہا ہے یار... ہمیں جمی کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔"
مگر اس وقت تک راجا مجھ سے متفق ہو گیا تھا۔ "اس کے برعکس اب میرا خیال ہے کہ ہمیں اس چکر سے دور رہنا چاہیے۔"
جب میں ہوا کافر تو وہ مسلماں ہو گیا۔ میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "راجا! مجھے بہکا کر تو خود فرنٹ ہو رہا ہے۔"
"تھانے جانے سے بہتر ہے آدمی فرنٹ ہو جائے۔"
"جمی ہمارا یار ہے۔"
"جو بالکل بیکار ہے۔" راجا نے قافیہ ملایا۔ "پیسے کے پیچھے ذلیل و خوار ہے۔"
میں نے راجا سے اتفاق کیا اور اگلا مصرع تکرار کہا۔
"پھر بھی ہمارا یار ہے۔"
راجا نے شاعری ترک کر کے نفی میں سر ہلایا۔ "میں تھانے نہیں جاسکتا۔"
"اگر پولیس والے لے جانا چاہیں؟"
راجا بدکا۔ "پولیس والے کیوں؟"
"دیکھ یار، جمی ہمارا دوست ہے یہ سب جانتے ہیں۔ اگر جمی نے پولیس گردی کی تاب نہ لاتے ہوئے ہمارے بارے میں کچھ الٹا سیدھا بک دیا تو پولیس کیا کرے گی؟"
"ہمیں گرفتار۔" راجا نے مردہ لہجے میں کہا۔
"دوسرے اگر ہم نے جمی کو چھڑا لیا تو امید ہے کہ اس سے کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔"
"وہ سوائے شکریہ کے کچھ نہیں دے گا۔" راجا نے نفی میں سر ہلایا۔
"دوست... امید پر دنیا قائم ہے۔"
میں نے بالآخر راجا کو خوف اور لالچ کے درمیان پھانس لیا اور وہ تھانے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے سرد آہ بھری جو بغیر دھوئیں کے تھی کیونکہ وہ آخری بیڑی بھی پی چکا تھا۔ "ٹھیک ہے جلیل... پر یاد رکھنا اگر ہم بھی اندر ہو گئے تو کوئی چھڑانے نہیں آئے گا۔"
"تیرا ابا..."
"ابا کو مجھ سے زیادہ اپنا گدھا پیارا ہے۔" راجا نے بات کاٹ کر کہا۔ "اگر وہ ذرا بھی انسان لگتا تو ابا اسے بیٹا بنا لیتا میری جگہ..."
میں نے کہنے سے گریز کیا کہ اس کا باپ ٹھیک کرتا۔ گدھا راجا کی نسبت زیادہ کارآمد اور فرمانبردار تھا۔ راجا بدک جاتا اور میں اکیلے تھانے نہیں جانا چاہتا تھا۔ کم سے کم کوئی لواحقین تک اطلاع پہنچانے والا ہو۔ تھانے کے قریب پہنچ کر راجا نے کہا۔ "جلیل! ایک بات تو بھول گیا... یہاں ہر کام کے پیسے لگتے ہیں اور ہم دونوں خالی ہیں۔"
وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر ہم جمی سے ملنا چاہتے تو یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ اول تو ملنے نہیں دیا جاتا اور اگر اجازت ملتی تو

میں نہیں ملتی... کیونکہ توجہ دلاؤ نوٹس راجا نے دیا تھا لیے میں نے اسی سے حل بھی پوچھا۔ "تب کیا کیا
خلاف توقع راجا نے حل بھی پیش کر دیا۔ "تھانے کے پیچھے ایک مارکیٹ ہے، اس کی چھت تھانے کی حوالات سے ملی ہے اور وہاں روشن دان بھی ہیں۔"
"پکڑے جانے کا خطرہ تو نہیں ہے؟"
"بہت کم..." راجا نے دانت نکالے۔ "تھانے سے جانے کے لیے بہت گھوم کر آنا پڑتا ہے اور جتنی دیر میں یہ آئے گی، ہم گھر بھی جاچکے ہوں گے۔"
راجا کا کہنا درست ثابت ہوا۔ دکانوں کی چھت پر جانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ تیسرے روشن دان سے جھانکنے پر جمی کسی اداس الو کی طرح حوالات میں اکیلا بیٹھا تھا۔ جب اسے متوجہ کرنے کے لیے راجا نے آواز نکالی تو وہ سلاخوں سے باہر دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "ابے ادھر دیکھ... بے سونڈ کے ہاتھی۔"
جمی اچھل پڑا۔ پھر اس نے روشن دان کی طرف دیکھا اور لپک کر آیا۔ "جلیل تو... مجھے یہاں سے نکال..."
"اسی لیے تو آئے ہیں۔" میں نے کہا اور راجا سے ادھر ادھر نظر رکھنے کو کہا پھر جمی کی طرف متوجہ ہوا۔ "آہستہ بول۔ کیا ہمیں بھی اندر بلوانا چاہتا ہے... پھر تجھے باہر کون نکالے گا؟"
"میں آہستہ بولوں گا۔" جمی نے سرگوشی میں کہا۔ یہ الگ بات تھی، اس کی سرگوشی ایسی ہی تھی جیسے کوئی ہاتھی سرگوشی میں شکایت کرنے کی کوشش کرے۔
"اس سے پہلے کوئی آجائے تو مختصر الفاظ میں گوش گزار کر دے کہ تو یہاں کیوں آیا؟"
"یہ سارا بلو قصائی کا کمینہ پن ہے۔"
میں دنگ رہ گیا۔ "بلو قصائی... وہ کیسے؟"
"وہ میرا حریف بن رہا ہے۔ تو جانتا ہے میں قربانی کے لیے بکرے پالتا ہوں اور اس سے زیادہ اچھے پالتا ہوں۔ میرے بکرے اچھی قیمت میں بکتے ہیں، وہ جلتا ہے۔ اس نے پیشکش رکھی ہے کہ جو بکرا کرے گا، میں اس کا قصائی بنوں گا۔"
"تو نے براہ راست بلو کے پیٹ پر لات ماری لیکن اس نے تجھے تھانے کیسے پہنچا دیا؟"
جمی نے جواب میں انکشاف کیا کہ اس تھانے کا ایک حوالدار نادر شاہ کا ایک چیٹی بند بھائی حوالدار
عالم قریشی عرف ظالم قریشی بلو قصائی کی برداری سے تعلق رکھتا ہے۔ کام وہ یہاں بھی وہی کرتا تھا یعنی کھال اتارنا، لیکن آمدنی کہیں زیادہ تھی۔ اس کا ثبوت مارکیٹ میں اس کی چلنے والی چار دکانیں تھیں۔ پولیس جمی کو اس کے درجن بھر بکروں سمیت لائی تھی اور اس پر بکرا فروشی کی آڑ میں چرس فروشی کا الزام لگایا تھا۔ میں نے غور کیا اور جمی سے پوچھا۔ "بیٹے! یہ کیا چکر ہے، اس سے پہلے راجا بھی تجھے چرس فروش قرار دے چکا ہے۔"
"راجا جھوٹا ہے۔" جمی نے ڈھٹائی سے کہا۔
راجا کی نظریں آس پاس منڈلا رہی تھیں لیکن کان اسی طرف لگے تھے۔ اس نے بلا تردید کہا۔ "تو اسی قابل ہے... جلیل! چل یہاں..."
"نہیں، مجھے یہاں سے نکالو۔" جمی بلبلا گیا۔
"اس کی صرف ایک صورت ہو سکتی ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "جمی... پورا سچ بول اور یہ بھی کہ تجھے یہاں سے نکلوا دیا تو ہمیں کیا ملے گا۔"
جمی غالباً بُری طرح پھنسا تھا۔ اگر خود نکلنے کے قابل ہوتا یعنی اتنی رقم دے کر چھوٹ سکتا، جتنی وہ جان دیے بغیر دے سکتا تھا مگر معاملہ اب انتقامی کارروائی کا بن گیا تھا۔ بلو قصائی چاہتا تھا کہ وہ بڑی عید حوالات میں گزارے اور تب تک وہ سیزن ٹھیک سے کما لے۔ جمی اپنے بکروں کے لیے بھی فکر مند تھا جو فی الحال تھانے کے صحن میں بندھے تھے لیکن کچھ پتا نہیں تھا کب وہ پولیس والوں کے پیٹ یا گھروں میں منتقل ہو جائیں۔ مگر ابھی بکروں کے بجائے جمی کو اپنی فکر کرنی چاہیے تھی۔ میں جمی سے اصل بات پوچھ رہا تھا اور وہ بات گھما رہا تھا۔ جب میں نے وہاں سے روانگی کا ارادہ کیا تو اس نے اصل بات اگل دی۔ "میرے فلیٹ میں چار کلو گرام چرس ہے۔"
میں اچھل پڑا۔ پیچھے کھڑے راجا کو دھکا لگا تو وہ چھت سے گزرنے والے کنڈے کے تاروں سے ٹکرایا۔ پہلے تار چڑچڑائے اور اس کے بعد راجا دیر تک چڑچڑاتا رہا۔ مگر وقت نہیں تھا اس لیے میں جمی کی طرف متوجہ رہا۔ "جمی! تو پاگل ہے... اگر پولیس نے چھاپا مار دیا تو؟"
جمی نے دانت نکالے۔ "انہوں نے تو جھوٹے الزام میں پکڑا ہے... انہیں کیا پتا کہ سچ مچ میرے پاس چرس ہے۔"
"تو چرس فروشی کرتا ہے؟"
"مجبوراً۔" جمی نے اقرار کیا۔ "یہ جانی چڑیا کا مال ہے۔ پہلے وہ مس حسینہ سے بکواتا تھا لیکن اس میں کچھ مسئلے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔ ایک تو وہ چرس بیچ دیتی تھی لیکن جانی چڑیا کو کچھ نہیں ملتا تھا، دوسرے چرس کے لیے آنے والے اس کے چکر میں پڑ جاتے تھے۔"

"اس لیے اس نے تجھے پکڑ لیا... تجھے کیا ملتا ہے؟"

"بیس فیصد کمیشن۔" جمی نے بادل ناخواستہ بتایا۔ وہ بکواس کر رہا تھا کہ مجبوراً یہ کام کر رہا ہے۔ چار کلوگرام چرس کم سے کم بھی چار لاکھ میں بکتی اور اسے اسی ہزار روپے کمیشن ملتا مگر اس وقت سب خطرے میں تھا۔

"تجھے جانی چڑیا نکلوا لے گا۔"

جمی نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ فلیٹ سے چرس نکال لے گا اور مجھے یہیں پڑا رہنے دے گا۔"

وہ بھی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جمی کو جانی چڑیا ہی نکلوا سکتا تھا اور اگر چرس اس کے ہاتھ لگ جاتی تو وہ جمی کو بھول جاتا۔ جمی نے گھگیا کر کہا۔ "جلیل... کچھ کر۔"

"مجھے سوچنے دے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتا کہ چرس کہاں ہے؟"

"جلیل! وہ کسی کی امانت ہے۔" جمی نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔

"تب اللہ حافظ... اسی سے بات کرنا۔"

"بتا تو رہا ہوں۔" جمی نے جلدی سے کہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے کباڑ خانے میں چرس کہاں ہوگی۔

"اب اپنے بیان پر جمے رہنا... جلد جانی چڑیا یہاں آئے گا اور تجھے نکال لے جائے گا۔"

"جلیل! تو کیا کرے گا؟"

"جو کروں گا تیرے لیے بہتر ہی ہوگا۔" میں نے کہا اور راجا کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ راجا نے چیخنا چلانا بند کر دیا تھا لیکن بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ کرنٹ نے اس کے حواس گم کر دیے تھے اور یہ اچھا ہی ہوا کہ وہ میری اور جمی کی گفتگو کا کارآمد حصہ نہیں سن سکا تھا۔ حواس بحال ہونے پر اس نے پہلا سوال اسی بارے میں کیا۔ میں نے کہا۔ "جمی کو چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے، تیرے نہ ہونے والے سسر سے بات کی جائے۔"

"نادر شاہ۔" راجا نے کہا اور تجویز کو فوراً ویٹو کر دیا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔"

راجا نے نہ صرف میری تجویز کو ویٹو کیا تھا بلکہ فوری مجھ سے الگ ہو کر روانہ بھی ہو گیا تھا اور یہی میں بھی چاہتا تھا۔

میں نے جمن خانے کا رخ کیا۔ پہلے جمی جمن خانے کی چھت پر بنے ایک کمرے میں رہتا تھا لیکن جب نیچے والوں نے واویلا کیا کہ جمی کے بوجھ سے چھت ہلتی ہے اور کسی دن گر گئی تو جمن خانہ سب کا مشترکہ مقبرہ بن جائے گا تو مجبوراً جمی کو گراؤنڈ فلور پر منتقل ہونا پڑا تھا کہ صرف دھرتی اس کا بوجھ سنبھال سکتی تھی۔ یہ فلیٹ سب سے پچھلے حصے میں اور ایک تنگ و تاریک راہداری میں تھا۔ روشنی سے یہاں آنے پر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا اس لیے ٹٹول کر آگے جانا پڑ رہا تھا۔ ٹٹولتے ہوئے اچانک جو چیز ہاتھ میں آئی، وہ اچھل پڑی اور ہلکی سی چیخ بھی ماری۔ میں بوکھلا گیا کیونکہ چیز اور چیخ دونوں نسوانی تھیں۔ "کک... کون ہے؟"

"جلیل۔" مس حسینہ کی برہم سرگوشی سنائی دی اور خاصی قریب سے سنائی دی۔ "تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"میں کچھ بھی کر رہا ہوں، سوال یہ ہے کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" میں نے جوابی سرگوشی کی۔ اتنی دیر میں کچھ کچھ دکھائی اور سجھائی دینے لگا تھا۔ مس حسینہ ایک عدد مڑے تڑے تار سمیت وہاں موجود تھی اور جب میرا اسے ہاتھ لگا تو وہ جمی کے فلیٹ کے تالے پر جھکی ہوئی تھی۔ "تم ٹریس پاس کر رہی تھیں۔"

مس حسینہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی مگر اسے عادت تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس سے پہلے پکڑنے والی عام طور سے ان شوہروں کی بیویاں ہوتی تھیں جن کے ساتھ وہ پکڑی جاتی تھی۔ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "میں اپنی ایک چیز لینے آئی تھی۔"

میں نے غور کیا۔ "اپنی چیز...؟ مطلب تمہارے ذاتی استعمال کی چیز جو تم یہاں بھول گئی تھیں؟"

تاریکی، تنہائی اور تارک الذہن ہونے کی وجہ سے وہ شوخ ہونے لگی۔ "میں ایسی چیزیں کبھی نہیں بھولتی... ایک امانت ہے جمی کے پاس..."

مجھے فوراً خیال آیا۔ "چرس... تم یہاں چرس چرانے آئی ہو؟"

"چرانے؟" وہ برہم ہو گئی۔ "اپنا مال لینے آئی ہوں، اس سے پہلے کہ وہ پولیس کو پھوٹ دے اور وہ یہاں آ جائے۔ پر تجھے کس نے بتایا... اسی نے؟" اس نے جمی کو گالی دی۔

"جمی کا کہنا ہے، یہ مال جانی چڑیا کا ہے۔"

"جانی کا ہے پر اس نے مجھے دیا تھا۔ میں نے جمی کے

رکھوایا تھا۔"

"تم وہ مال واپس لینے آئی ہو؟"

"ہاں، پر یہ... تالا نہیں کھل رہا۔" اس نے تالے کے بارے میں ایک ناقابلِ بیان لفظ ادا کیا۔ میں نے اس سے تار لیا۔ کچھ عرصے پہلے میں اس کام کے ایک ماہر کی شاگردی میں رہا تھا اور اس سے خاصے اسرار و رموز سیکھے تھے۔ استاد محترم چھ مہینے کے لیے آرام کرنے آئے تھے اور چونکہ باہر مانگ بہت تھی اس لیے راتوں میں اکثر باہر تفریح لے جاتے تھے۔ اس پر بھی باہر والوں سے جدائی برداشت نہ ہوئی تو چار مہینے بعد ہی اچھے چال چلن کی وجہ سے رہا ہو گئے۔ میں نے ایک منٹ سے بھی پہلے تالا کھول دیا۔ یہاں حبس اور گرمی بھی تھی۔ ذرا سی دیر میں پسینے پسینے ہو گیا تو یقیناً مس حسینہ کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اندر آتے ہی اس نے لائٹ آن کرنے کی کوشش کی اور ٹوٹے بٹن سے کرنٹ کھا کر اس نے کچھ فرمایا۔ اس میں قابلِ اشاعت چیز نبی کا نام تھا۔ وہ بلبلا کر بولی۔ "بٹن تک ٹھیک نہیں کراتا۔"

"جمی چیزوں کی مرمت یا تبدیلی کا قائل نہیں ہے۔" میں نے مس حسینہ کو آگاہ کیا۔ "اسے امید ہے کہ چند سال بعد جمن خانے کو تاریخی ورثہ قرار دے کر یونیسکو کی امداد کا مستحق قرار دے دیا جائے گا۔"

ویسے تو جمن خانہ کسی کباڑ خانے سے کم نہیں تھا لیکن جمی کا فلیٹ کسی کباڑیے کی دکان سے بھی گیا گزرا تھا۔ اندر داخل ہونے کا راستہ تھا لیکن اس کے بعد آگے کیسے جایا جائے، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہاں فرش سے چھت تک اور دیوار سے دیوار تک کباڑ بھرا ہوا تھا۔ دو کمروں کا فلیٹ شہد کے چھتے کی طرح کباڑ سے بھرا تھا اور یہ کباڑ جمی گلیوں میں پھرتے پھرتے جمع کرتا تھا۔ اسی طرح جمن خانے سے نکلنے والا کباڑ بھی پہلے وہ چیک کر کے اس میں سے اپنے مطلب کی چیزیں نکال لیتا تھا اور پھر ان کو الگ کر کے ایک ٹھیلے پر لاد کر کباڑیے کو بیچ آتا۔ جمن خانے میں کئی کرائے دار ٹھیلے والے تھے اور وہ کسی کا بھی ٹھیلا استعمال کر لیتا تھا۔ مس حسینہ نے پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ "یہاں راستہ کہاں ہے؟"

راستہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ پتا نہیں جمی کیسے حرکت کرتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ دروازے کے سامنے جو مختصر جگہ تھی، وہیں قیام کرتا تھا۔ گدا دیوار کے ساتھ پڑا تھا اور ایک بریکٹ فین لگا ہوا تھا جس کا تار اس نے برابر والے فلیٹ کی بجلی سے جوڑ رکھا تھا۔ ایک لوہے کے پلنگ کے نیچے سے گزر کر میں دوسری طرف طلوع ہوا تو مس حسینہ کو پہلے سے وہاں موجود پا کر دنگ رہ گیا۔ "تم کیسے آئیں؟"

"یہاں سے۔" اس نے اوپر والے پلنگوں میں موجود خلا کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے صرف مس حسینہ گزر سکتی تھی، میں پھنس جاتا۔ "جلیل! اب بتا جمی نے مال کہاں رکھا ہے؟"

"یہ میں تمہیں کیوں بتاؤں؟" میں نے انکار کیا۔ "مجھے کیا ملے گا؟"

مس حسینہ نے سوال کا غلط مطلب نکالا اور خود کو مزید نمایاں کر کے بولی۔ "جو تو چاہے۔"

"لاحول ولا..." میں نے گڑبڑا کر کہا۔ "میرا مطلب... مال پانی سے ہے۔"

"اچھا۔" وہ ذرا مایوس ہوئی۔ "تو کیا چاہتا ہے؟"

"پچیس فیصد۔"

وہ اچھل پڑی اور غرائی۔ "جلیل! تیرا دماغ درست ہے؟"

"بالکل درست ہے۔ اگر تمہیں منظور نہیں ہے تو اس کباڑ سے خود تلاش کر لو۔"

اس نے آس پاس دیکھا اور فوراً مسکرانے لگی۔ "جلیل! تو بہت چالاک ہے۔ چل ٹھیک ہے، پچیس فیصد تیرا... اب بتا مال کہاں ہے؟"

میں نے ہاتھ آگے کیا۔ "پہلے پچیس فیصد رکھو پھر بتاتا ہوں۔ ویسے تم نے ٹھیک کہا، جلیل چالاک ہے۔"

"ابھی سے کہاں سے دوں؟ پہلے مال تو ہاتھ آ جائے۔"

"بے وقوف کسی اور کو بنانا... مال ہاتھ میں آنے کے بعد تُو اپنے باپ کو نہ پہچانے، جلیل کس کھیت کی مولی ہے۔ یہ نقد سودا ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔"

"ٹھیک ہے نہ بتا، میں خود تلاش کر لوں گی۔"

"شوق سے۔" میں نے واپسی کا ارادہ کیا۔ "کچھ دیر میں پولیس بھی آ جائے گی تو تمہیں اور آسانی ہو جائے گی۔ وہ مل کر تلاش کرے گی اور تمہیں چرس سمیت لے جائے گی۔"

مس حسینہ فوراً راستے میں آ گئی۔ "تو ایسے نہیں جا سکتا۔"

میں نے اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھا کر ڈٹی رہی اور میں ہانپنے لگا۔ "حسینہ مجھے جانے دے ورنہ..."

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ورنہ...؟" وہ چیلنج سے بولی۔ "بول کیا کرے گا؟"
"میں کچھ نہیں کروں گا۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "یہیں رہوں گا۔"
مس حسینہ نے غور کیا اور پھر میری طرف دیکھا۔ "جلیل! تو کیا چاہتا ہے؟"
"جمی کی تھانے سے رہائی۔"
"یہ میرے بس کا کام نہیں ہے۔"
"جانی چریا کے بس کا ضرور ہے لیکن اسے اپنے مال سے مطلب ہوگا۔"
"مال اس کا نہیں، اب میرا ہے۔ میں ادائیگی کر چکی ہوں۔"
میں نے اس سے پوچھا نہیں کہ اس نے ادائیگی کیسے کی تھی۔ "ٹھیک ہے، تمہارا مال ہے۔ اب جمی کو رہا کرانا تمہاری ذمے داری ہے ورنہ پولیس یہاں آئی تو نقصان تمہارا بھی ہوگا۔"
"جلیل، جمی کو جہنم میں ڈال... یہاں سے مال لے۔ بے شک مجھے بھی نہ دے، میرے ساتھ چل اور پچیس فیصد لے لے۔"
مس حسینہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ مال جلد از جلد اس کے ہاتھ آجائے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے... تو سوچ اگر جمی کو آزاد نہ کرایا تو وہ پولیس کو بتا سکتا ہے۔ پولیس مجھے پکڑے گی اور میں تیرے بارے میں بک دوں گا پھر تو سوچ لے کہ کیا ہوگا؟"
مس حسینہ نے غالباً اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ عام جرائم پیشہ افراد کی طرح اس کی سوچ نہایت محدود تھی۔ اس نے فکر مند ہو کر کہا۔ "تب کیا کروں؟"
میں سمجھ رہا تھا کہ وہ جانی چریا کو ڈبل کراس کرنے جا رہی تھی اور اسی لیے اسے پولیس کی فکر تھی ورنہ وہ اسے جوتے کی نوک پر رکھتی۔ وہ چرس لے کر نو دو گیارہ ہو جاتی اور جانی چریا جمی سے اپنا مال مانگتا۔ مال نہ ملتا تو وہ جمی کی کھال اتار لیتا۔ مجھے جمی کو تھانے سے نکلوانا تھا اور ساتھ ہی اس کی کھال بھی بچانی تھی۔ میں نے مس حسینہ کے ساتھ ذرا کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ "دیکھ حسینہ تو عورت ہے اور اپنے عورت ہونے کا پورا فائدہ بھی اٹھاتی ہے اس لیے اگر تو تھانے دار سے بات کرے گی تو وہ مانے گا... نہیں مانے گا تب بھی تو منوا سکتی ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہے نا؟"
مس حسینہ نے بادل ناخواستہ سر ہلایا کیونکہ صاف نظر آ رہا تھا اس سودے میں اسے کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ اسے تھانے دار کو مفت میں خوش کرنا پڑے گا حالانکہ اس کے عوض اسے چرس ملتی۔ لیکن یہ اس کا خیال تھا کہ اسے چرس ملتی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس بارے میں میں کچھ اور سوچ چکا تھا مگر فی الحال اسے بتانا مناسب نہیں تھا۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ کسی نے پولیس والے انداز میں دروازہ بجایا یعنی اسے توڑنے کی کوشش کی۔ مگر جمی نے مفت کی لکڑیاں دروازے پر جوڑ کر اتنا مضبوط کر دیا تھا کہ اب وہ آسانی سے نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔ مس حسینہ نے گھبرا کر میرے کان سے لگ کر سرگوشی کی۔
"پولیس...!"
"یہاں سے تو بھاگنے کا دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا اور سامان کے بیچ سے گزر کر دوسرے کمرے میں آیا۔ اس دوران میں پولیس نے باقاعدہ دروازہ توڑنے کی سعی کا آغاز کر دیا تھا۔ پولیس کی تصدیق ان گالیوں سے ہو رہی تھی جو وہ ہر ضرب کے ساتھ دل سے دے رہے تھے۔ دوسرے کمرے میں ایک کچن تھا جس میں چولہا بھی نہیں تھا۔ جمی کھانے پینے کے سارے کام باہر کرتا تھا اس لیے یہاں بھی اوپر تک کباڑ بھرا ہوا تھا البتہ باتھ روم کسی قدر کھلا تھا کیونکہ یہاں کرنے والا کوئی کام جمی باہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس دوران میں مس حسینہ نے ایک دروازہ دریافت کر لیا اور اسے کھولتے ہی بدبو، شور اور کبوتروں کے پروں کا ایک طوفان آیا۔ یہ گیلری تھی اور یہاں جمی نے کبوتر پال رکھے تھے۔ مس حسینہ کا اپنا تعلق جس جگہ سے تھا یعنی جن گلیوں میں وہ کھیل کر جوان ہوئی تھی، وہاں گھٹنوں تک کیچڑ رہتا تھا لیکن یہ بدبو اس کے لیے بھی ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا جسے میں نے دوبارہ کھولا اور گیلری کا معائنہ کیا۔ چار فٹ دیوار کے بعد اس پر فولادی گرل لگی تھی۔ اوپر پانی کی ٹنکی کی جگہ تھی لیکن وہاں ٹنکی نہیں تھی اور غور کرنے پر پتا چلا کہ گرل کو کاٹ کر اوپر ایک دروازہ بنایا گیا تھا تاکہ ٹنکی کسی مشکل کے بغیر نکالی اور لگائی جا سکے۔ اس دروازے پر تالا لگا تھا جو زنگ کی وجہ سے اپنی اصل شکل کب کی کھو چکا تھا۔ مس حسینہ نے لاشعوری طور پر میرے بازو سے لگ کر پوچھا۔
"جلیل! اب کیا کریں؟"
"پہلے تو میرا بازو چھوڑو۔" میں نے بادل ناخواستہ اس کے گداز وجود سے خود کو الگ کیا۔ اندر کباڑ سے لوہے کی ایک مضبوط راڈ لا کر میں گرل پر چڑھا اور اسے تالے میں پھنسا کر اس کے بل لٹک گیا۔ حسب توقع زنگ آلود تالا جواب دے گیا۔ میں نیچے مس حسینہ پر گرا۔ اس نے ہلکی سی

[...]ی اور پر بھی میں کچھ کہا لیکن اس کی بات پر توجہ دینے کا [...] نہیں تھا۔ میں نے گرل کھولی اور مس حسینہ سے کہا۔ "[...] آؤ، وقت کم ہے۔"
وہ اوپر چڑھی۔ میں نے اس کی ریشمی کمر اور ریشمی [...] سے پکڑ کر اوپر کیا تو وہ پھسلنے لگی۔ پھر اس نے خود کوشش [...] اوپر چڑھ گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی میں نیچے اترا اور [...] کی طرف گیا۔ پولیس والے اب لاتوں کے ساتھ رائفل کے بٹ بھی استعمال کر رہے تھے۔ دروازہ بس ٹوٹنے کے قریب تھا۔ دو منٹ بعد میں ایک تھیلے کے ساتھ واپس آیا اور گرل کے اوپر چڑھ کر باہر کود گیا۔ اس بار بھی مس حسینہ پر گرا [...] مجھ سمیت نیچے گری۔ اس نے بھنا کر کہا۔ "اندھا ہے جو [...] مجھ پر گرتا ہے۔"
"تم چیز ہی ایسی ہو۔" میں نے دانت نکال کر کہا اور وہاں سے اٹھ کر دوڑا۔ ابھی پولیس والوں کا دھیان عقبی سمت نہیں آیا تھا لیکن کیا کہا جا سکتا تھا کہ کب آجائے اور فرار کا یہ راستہ بھی بند ہو جائے۔ مس حسینہ میرے پیچھے لپکی۔
"مجھے کہاں چھوڑ کر جا رہا ہے؟"
"جا نہیں رہا، فرار ہو رہا ہوں اور تم چہل قدمی کرنا چاہ [...] ہو اس لیے خدا حافظ..." میں نے رفتار تیز کی تو اسے [...] گنا پڑا۔ وہ میرے برابر آ کر ہانپتے ہوئے بولی۔
"جلیل! یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟"
"انگلیاں۔" میں نے جواب دیا۔ اس پر مس حسینہ نے بھنا کر مغلظات بکیں اور تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔
"یہ کیا ہے؟"
"کپڑے کا تھیلا۔"
اس پر مس حسینہ نے اس کے بھی کچھ دیگر استعمالات پر روشنی ڈالی۔ اس سے پہلے کہ اس کا تحقیقی کام آگے بڑھتا، گلی [...] شیطان کی آنت سے کچھ ہی کم تھی، ہم سڑک پر نکل آئے اور مجبوراً مجھے اپنی رفتار کو چہل قدمی کی حد تک لانا پڑا لیکن مس حسینہ کو اب بھی بھاگنا پڑ رہا تھا۔ مس حسینہ کا چلنا ہی [...] سے کم نہیں تھا۔ اسے یوں بھاگتے دیکھ کر ایک بار پھر [...] پر صبح والی حبس دم کی کلاس شروع ہو گئی تھی جس میں [...] والے بھی شریک تھے۔ کیونکہ مس حسینہ میرے [...] تھی اس لیے مجھے مزید بادل ناخواستہ اپنی رفتار کم کرنا [...] اور میں تقریباً نیوٹرل گیئر میں آگیا۔ میں نے بھنا کر کہا۔ "میرے ساتھ کیوں چپکی ہو، اپنا راستہ لو۔"
اس کی سوئی میرے پاس موجود تھیلے میں اٹکی ہوئی [...] "اس میں کیا ہے؟"

میں نے مس حسینہ کے تحقیقی کام کو آگے بڑھاتے ہوئے انکشاف کیا کہ تھیلے میں کیا کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن وہ بے شرمی سے ہنسنے لگی تو میں خود خفیف ہو گیا۔ اس معاملے میں اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ شوخی سے بولی۔ "آگے بول نا۔"
"جہنم میں جاؤ۔" میں نے مشورہ دیا۔ اس وقت میرا ہاتھ ذرا آگے تھا اور تھیلا میں نے ایسے ہی پکڑ رکھا تھا اس لیے جب مس حسینہ نے جھپٹ کر اسے میرے ہاتھ سے چھینا تو وہ بہ آسانی نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تقریباً خودکشی کے انداز میں سڑک پار کی۔ گاڑیاں لہرائیں مگر مس حسینہ سے کم لہرائیں جس نے سڑک پار کرنے میں حیرت انگیز پھرتی اور مہارت کا مظاہرہ کیا تھا۔ کچھ گاڑیاں دوسری گاڑیوں سے ٹکرائیں جن کے ڈرائیوروں کا دھیان بریک سے زیادہ مس حسینہ کے کرتبوں کی طرف تھا۔ دوسری طرف پہنچ کر اس نے ایک ہوائی بوسہ میری طرف ارسال کیا اور پہلی گلی میں گھس گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں جان پر کھیل کر دوسری طرف پہنچ جاتا، تب بھی اس تک پہنچنا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس طرف آڑی ترچھی گلیوں پر مشتمل ایسی بھول بھلیاں تھیں جن سے صرف وہیں کے رہنے والے ٹھیک سے گزر سکتے تھے۔ باقی

بے شک شفا اللہ ہی دیتا ہے
Alternative & Integrated Medicine
کمزوری و بانجھ پن
ہر طرح کی جسمانی۔ اعصابی۔ نفسیاتی۔ ازدواجی کمزوری و بانجھ پن (بے اولادی) کے مریض کلینک کے نئے اوقات کار نوٹ فرمالیں۔
روزانہ دوپہر نماز ظہر تا نماز مغرب چھٹی بروز جمعۃ المبارک
دوسرے شہروں میں رہنے والے مریض اب بذریعہ ٹیلی فون۔ ای میل۔ ایس ایم ایس۔ گھر بیٹھے (B 2 C Online) ادویات منگوا سکتے ہیں
ڈاکٹر محمد لطیف شاہین
ایم بی بی ایس (بی ایس سی آنرز)
معالج نفسیاتی، ازدواجی امراض و بانجھ پن
نزد ریلوے کراسنگ کوجرہ روڈ جھنگ صدر
03216528001 03457601156
email: dr.muhammadlatifshaheen@gmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہیں چکراتے رہ جاتے۔ مس حسینہ کے غائب ہوتے ہی میں نے دوبارہ جمن خانے کا رخ کیا جہاں صحن میں پولیس والے موجود تھے اور کچھ یقیناً اندر جمی کے فلیٹ کی تلاشی لے رہے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ پولیس کیوں آئی تھی؟ جبکہ جمی نے اب تک زبان بند رکھی تھی اور آگے بھی امکان کم تھا کہ وہ کچھ کہتا۔ ویسے حوالات میں اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اسے ڈرائنگ روم کی سیر نہیں کرائی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد اندر سے نادر شاہ کو صورت لٹکائے دیکھ کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے اور میں سمجھ گیا کہ پولیس کیوں آئی تھی اور اس تک چرس والی بات کس نے پہنچائی تھی؟ میں ایک درخت کی آڑ میں تھا اس لیے نادر شاہ کی گدھ نما نگاہوں سے بچ گیا۔ اس کی برہمی بتا رہی تھی کہ کسی کی شامت آنے والی تھی۔ پولیس کے رخصت ہوتے ہی میں باہر آیا اور کیفے ڈی پھونس کی طرف روانہ ہو گیا۔ حسب توقع وہاں راجا موجود تھا۔ میں نے جاتے ہی اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کی بکواس کی پروا کیے بغیر اسے باہر لے آیا۔ آخر میں راجا نے فریاد کی۔ ”میری چائے... فتو کمینے نے پیشگی بل بھی لے لیا تھا۔“

”بیٹے! یہاں سے نکل... اگر نادر شاہ آگیا تو تجھے تھانے میں خونِ جگر پینا پڑے گا۔“

نادر شاہ کے ذکر پر راجا کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ کیفے ڈی پھونس سے دور نکلتے ہی اس نے معصوم بننے کی کوشش کی۔ ”تو نے نادر شاہ کا ذکر کیوں کیا؟“

”راجا۔“ میں نے دانت پیسے۔ ”یہ سارا تیرا کیا دھرا ہے۔ تُو نے نادر شاہ کو جمی کے فلیٹ میں موجود چرس کے بارے میں بتایا تھا۔“

راجا نے ایک بار پھر انجان بننے کی کوشش کی لیکن جب میں نے تھانے چلنے کو کہا تو وہ کتے کی دُم کی طرح سیدھا ہو گیا۔ مطلب یہ کہ بادل ناخواستہ حالات کی نلکی میں آ کر۔ اس نے اقرار کیا کہ اس نے عارفہ سے سودا کر لیا تھا کیونکہ معاملہ خاصی بڑی رقم کا تھا۔ اس نے عارفہ سے دو ہزار روپے لیے تھے اور امکان تھا کہ وہ باپ سے دو لاکھ روپے وصول کر لے گی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”راجا! تُو نے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جب پولیس نے چھاپا مارا تو میں وہیں تھا۔ تُو نے یقیناً جمی سے سن لیا ہوگا جب وہ مجھے بتا رہا تھا لیکن تیری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ چرس وہاں نہیں ملی۔ مجھے نہیں ملی اور پولیس کو بھی نہیں ملی۔ مجھے نہ ملنے سے تجھے فرق نہیں پڑے گا لیکن سوچ نادر شاہ کو نہیں ملی ہے، اب تجھ پر کیا اثر ہوگا۔“

”بہت بُرا۔“ راجا نے فکر مند ہو کر کہا۔ ”لیکن تُو وہاں کیوں گیا تھا؟“

”میں جمی کو تھانے سے نکلوانا چاہتا ہوں۔“

”تُو فکر نہ کر، وہ عنقریب نکل آئے گا۔ ظالم قریشی سے اس کے مذاکرات آخری مرحلے میں ہیں۔“

”تبھی اس نے مجھے ٹالا اور غلط جگہ بتا دی۔“ میں نے سوچا۔

”تجھے کس نے بتایا؟“

”عارفہ نے۔“

”راجا! غائب ہو جا یا جا کر عارفہ کے پیر پکڑ لے کیونکہ اس کے باپ نے تجھے پکڑ لیا تو تجھے پھر ملک الموت آ کر اس کی گرفت سے چھڑائیں گے۔“

”غائب ہو کر کہاں جاؤں؟“

”ایسا کر اپنے باپ کی دکان پر چلا جا۔ وہاں کسی کا خیال نہیں آئے گا۔“

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا اور فوراً روانہ ہو گیا۔ یہ معاملہ چوں چوں کا مربا بن گیا تھا۔ اس میں جانی چڑیا سے لے کر نادر شاہ تک کئی لوگ ملوث ہو گئے تھے۔ جمی کے بارے میں یہ خبر مصدقہ نہیں تھی کہ وہ جلد رہا ہونے والا تھا کیونکہ اس کی سورس عارفہ تھی لیکن یہ بات درست بھی ہو سکتی تھی۔ اس کی تصدیق ایک ہی طریقے سے ممکن تھی۔ میں اس بار تھانے کی طرف روانہ ہو گیا اگرچہ مسلسل مارچ پاسٹ سے پیٹ میں چوہوں نے میرا اٹھن شروع کر دی تھی لیکن فی الحال یہ کام زیادہ اہم تھا۔ گھر جا کر اماں کی جھڑکیاں اور کھانا میں کسی وقت بھی کھا سکتا تھا۔ تھانے کے سامنے ایک مناسب جگہ چن کر میں وہیں جم گیا۔ یہاں سے مین گیٹ صاف نظر آ رہا تھا لیکن نادر شاہ یا جمی نکل آتے تو میں ان کو نظر نہیں آتا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جمی ٹہلتا ہوا بکروں سمیت باہر آیا تو میں نے ٹھنڈی سانس لی کیونکہ جمی خاصا خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اگر اس کی رہائی کسی رقم کی ادائیگی سے مشروط ہوتی تو وہ اتنا خوش نظر نہ آتا جتنا اس وقت تھا۔ یہ کچھ اور ہی چکر تھا۔ جمی روانہ ہوا تو میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس وقت میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا جب بلو قصائی نے راستے میں جمی کو روکا اور اس سے یوں لپٹ گیا جیسے جمی اس کا بچھڑا ہوا بھائی ہو۔ حالانکہ دونوں کی جسامت میں وہی فرق تھا جو کسی بیل اور بکرے کی جسامت میں ہو سکتا ہے۔ جمی نے بکروں کی رسیاں اسے تھما دیں اور وہ رخصت ہو گیا۔ میں اپنا سر سہلاتا

...تیا کہ یہ کیا چکر ہے؟ جمی کسی کو اپنا غم بھی نہ دے اور اس نے ایک درجن پلے پلائے بکرے بلو قصائی کے حوالے کر دیے تھے۔ اچھی خاصی مسٹری چل رہی تھی اور اب مجھے اس کی تہ تک پہنچنا تھا کیونکہ میں اس میں ملوث ہو گیا تھا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ عقب سے کسی نے میرا بازو دبوچ لیا۔ میں نے دیکھا تو ایک برقع پوش خاتون کو پا کر بدک گیا۔ میں نے بازو چھڑانے کی کوشش کی۔

”معاف کر مائی... ابھی تو میرے پاس زہر کھانے کے پیسے بھی نہیں ہیں۔“

”جلیل! تھیلا مجھ سے لے لے۔“ عورت نے بیٹھی آواز میں کہا تو میں اچھل پڑا۔ وہ مس حسینہ تھی۔ میں دنگ رہ گیا۔

”تم برقع میں...؟ تم تو کپڑے بھی بہ مشکل پہنتی ہو۔“

”مجبوری ہے۔“ اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ”جانی نے میری تلاش شروع کر دی ہے۔ اب میں اپنے گھر بھی نہیں جا سکتی۔ جلیل! تو نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔“

”وہ کیسے؟“

”تھیلے میں چرس نہیں تھی۔“ وہ غرائی۔

”تو کیا میں نے کوئی حلف اٹھایا تھا کہ تھیلے میں چرس ہے؟“ میں نے بھنا کر کہا۔ ”تم نے اپنے طور پر فرض کر لیا اور تھیلا لے کر فرار بھی ہو گئیں۔“

”اس میں گندے کپڑے بھرے ہوئے تھے۔“

”تم اسی قابل ہو۔ اب میرا پیچھا چھوڑ دو۔ جمی چھوٹ کر آ گیا ہے اور جلد وہ تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینکے گا۔“

”میں اس کا سر پھاڑ دوں گی، اس کے کپڑے پھاڑ دوں گی۔“ مس حسینہ نے اعلان کیا۔ اس کے اگلے اعلانات ناقابلِ بیان تھے۔ اس سے پہلے کہ جمی کی ہر قابلِ ذکر چیز پھٹ جاتی، میں نے اسے روکا۔

”میرا خیال ہے کہ اب معاملے کا تجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چرس جمی کے پاس ہے اور جانی چڑیا اسی سے نمٹے گا۔ اگر تجھ سے پوچھے تو معصوم بن جانا کہ ہم بہو بیٹیاں کیا جانیں۔“

”تیرا مطلب ہے کہ میں اپنے فلیٹ چلی جاؤں؟“

”اور کیا... کسی بات کا اقرار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جانی چڑیا ویسے ہی تمہارا قتیل ہے، اس کی عقل کو گھاس چرنے کے لیے بھیجنا تمہارے لیے کیا مسئلہ ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔ ”جلیل! دل چاہ رہا ہے تیرا منہ چوم لوں۔“

”ہم شاہراہِ عام پر کھڑے ہیں۔ ایسی کوئی حرکت حدود آرڈی نینس کے تحت آئے گی۔“ میں نے جلدی سے اسے خبردار کیا۔

”اسی لیے تو رک گئی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”خیر پھر سہی۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت ہم شاہراہِ عام پر تھے۔ اصولاً اب مجھے گھر کا رخ کرنا چاہیے تھا جہاں اماں اور شنو میری منتظر تھیں۔ بھوک سے پیٹ میں دوڑنے والے چوہے بھی نڈھال ہو رہے تھے اس لیے اب وہ ذرا سکون سے تھے۔ لیکن میں فی الحال یہاں سے نہیں جا سکتا تھا۔ معاملے کا کلائمکس قریب تھا۔ کم سے کم میرا اندازہ یہی تھا اس لیے میں صبر سے اپنی جگہ جما رہا۔ مس حسینہ کے جانے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد جانی چڑیا دندناتا ہوا جمن خانے پہنچا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ جمی کی خیر نہیں ہو گی، اگر اس نے چرس دینے میں ذرا بھی تاخیر کی کیونکہ جانی چڑیا اکیلا تھا اس لیے میں نے اندر جانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ میں بروقت پہنچا کیونکہ جانی چڑیا جمی کی موٹی گردن دبوچ چکا تھا۔ اگرچہ جانی چڑیا کے ہاتھ کسی گوریلے سے کم نہیں تھے لیکن جمی کی گردن بھی کسی گینڈے سے کم نہیں تھی اس لیے وہ اسے پوری طرح دبوچنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ وہ جمن خانے کے عقب والی پتلی سی گلی میں تھے۔ جانی چڑیا کے غرانے کی آواز نے میری راہنمائی کی۔ جمی کسی بکری کی طرح منمنا رہا تھا۔

”مال کدھر ہے؟“

”استاد! وہ پولیس والے لے گئے۔“

”جھوٹ بولتا ہے... نادر شاہ کو ادھر کچھ نہیں ملا۔“

جمی قسمیں کھانے لگا کہ نادر شاہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ مال لے گیا ہے اور اب جانی سے جھوٹ بول کر جمی کو مروا رہا ہے۔ جمی نے جانی چڑیا کو پیشکش کی کہ وہ چل کر اس کا فلیٹ دیکھ لے۔ جانی چڑیا خطرناک تھا مگر اس کا اوپری خانہ زیادہ بھرا ہوا نہیں تھا اسی لیے مس حسینہ اور جمی جیسے لوگ بھی اسے بے وقوف بنا سکتے تھے۔ اس وقت بھی وہ جمی کی باتوں میں آ گیا۔ اس نے تسلیم کر لیا کہ مال نادر شاہ لے گیا ہے مگر یہ نقصان جمی سے ہوا تھا اس لیے وہی اس نقصان کو بھرے گا۔ اس پر جمی نے اتنے دلدوز انداز میں اپنی ناداری اور افلاس کا نقشہ کھینچا کہ جانی چڑیا تو کیا میں بھی آبدیدہ ہو گیا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ جمی چکر کر رہا ہے اور وہ ہرگز اتنا مفلس نہیں ہے۔ البتہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

جانی چڑیا کو یقین آگیا کہ وہ سچ مچ مفلس ہوگیا ہے۔ اس نے جمی کو کچھ بے ضرر دھمکیاں دیں اور جمن خانے سے رخصت ہوگیا۔ بے شک چار لاکھ بڑی رقم تھی لیکن جانی چڑیا کا بزنس اس سے کہیں زیادہ تھا اور وہ نقصان برداشت کرسکتا تھا۔ ویسے بھی اسے یقین آگیا تھا کہ چرس نادر شاہ کے ہاتھ لگ گئی ہے اور بات کیونکہ پولیس تک پہنچ گئی تھی اس لیے اس نے بات بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔

جانی چڑیا کے جانے کے بعد جمی اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی اسے علم نہیں تھا کہ پولیس نے اس کے فلیٹ کا کیا حشر کیا ہے۔ میں وہاں پہنچا تو جمی یوں واویلا کررہا تھا جیسے اس کے فلیٹ میں خزانہ تھا اور کوئی اسے لوٹ کرلے گیا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”جلیل! میں لٹ گیا، برباد ہوگیا۔“

”انشاء اللہ۔“ میں نے خلوص سے کہا۔ ”میرا مطلب ہے اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔ لیکن ہوا کیا ہے؟“

”دیکھ پولیس نے چھاپا مارا اور مال لے گئی۔ اب میں جانی چڑیا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟“

مجھے جمی کی اداکاری پر غصہ آرہا تھا لیکن میں نے ظاہر کیے بغیر افسوس سے کہا۔ ”اچھا... یہ پولیس والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ویسے انہوں نے تجھے چھوڑ کیسے دیا؟“

”بس یار ترس آگیا۔“ اس نے رونی صورت بنا کر کہا۔

”بکرے کہاں گئے؟“

”وہ تھانے والوں نے رکھ لیے۔ ایسے ہی تو نہیں چھوڑتے وہ...“

”یہ تو ہے، پر تیرا دُہرا تہرا نقصان ہوا ہے۔ بکرے الگ گئے، جانی چڑیا کا مال الگ گیا اور اب تجھے اس کا ڈنٹ بھی بھرنا پڑے گا۔“

”لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔“ جمی نے پُھس پُھس کرکے رونا شروع کردیا۔ وہ نہایت تھرڈ کلاس اداکاری کررہا تھا۔ اگر ایسی سچویشن سچ مچ پیش آتی تو وہ دھاڑیں مار کر رو رہا ہوتا، یوں پُھس پُھس نہ کرتا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔

”تمہیں یقین ہے، چرس نادر شاہ لے گیا ہے؟“

”اس میں کیا شک ہے؟“

”مجھے شک ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”کیونکہ پولیس سے پہلے میں یہاں آیا تھا اور مجھے اس جگہ چرس نہیں ملی۔“

”تب تُو نے لی ہے۔“ جمی نے الزام مجھ پر رکھنے میں سیکنڈ کی دیر بھی نہیں لگائی۔

”نہیں جمی... تُو نے صفائی سے سب کو بے وقوف بنایا ہے۔ تُو نے جان کر راجا کے سامنے چرس رکھنے کی غلط جگہ بتائی۔ تجھے معلوم تھا کہ وہ عارفہ کے چکر میں ہے اور عارفہ نادر شاہ کی دختر بداختر ہے۔ جب تک تیرے گھر پولیس کا چھاپا نہیں پڑ گیا تو آرام سے حوالات میں بیٹھا رہا حالانکہ انہی شرائط پر تُو پہلے بھی وہاں سے رہا ہوسکتا تھا۔“

”کن شرائط پر؟“ جمی نے بے ساختہ پوچھا۔

”یہی کہ تو بکرے بلو قصائی اور خالم قریشی کے حوالے کررہا ہے اور اس بزنس سے دست بردار ہورہا ہے۔ تیرے بکرے کتنی مالیت کے ہوں گے؟ زیادہ سے زیادہ لاکھ روپے کے (ہائے کیا سستا زمانہ تھا) اور اب تیرے پاس چار لاکھ روپے کی چرس آگئی ہے۔“

جمی کے تاثرات چغلی کھارہے تھے کہ میری کہی ہوئی ہر بات درست تھی لیکن اس نے کمال ڈھٹائی سے تردید کی۔ ”جلیل! تیری کہی کوئی بات ٹھیک نہیں ہے۔ چرس نادر شاہ لے گیا ہے۔“

”تب چرس کو وہاں نہیں ہونا چاہیے جہاں تُو نے اسے چھپایا تھا۔“

”جلیل! تُو دیکھ تو چکا ہے چرس وہاں نہیں ہے۔“

”جمی! میں اس جگہ کی بات نہیں کررہا ہوں جو تُو نے بتائی تھی۔ میں اس جگہ کی بات کررہا ہوں جہاں تو نے سچ مچ چھپائی تھی۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا تو جمی اچھل پڑا۔ وہ کچن کی طرف بھاگا اور میں نے باہر کا رخ کیا۔ اس وقت جمی کے فلیٹ میں رکے رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ جمی ایک منٹ سے بھی پہلے آپے سے باہر ہوجاتا اور وہاں بے شمار آلاتِ قتل پڑے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا جمی میرے پیچھے آئے گا اور اس سے بچنے کی ایک ہی جگہ تھی۔ میں نے راجا کے باپ کی دکان کا رخ کیا اور عین موقع پر وہاں پہنچا کیونکہ ایک پہلوان نما گاہک نے راجا کی گردن دبوچ رکھی تھی اور اس سے جل جانے والی پتلون کا تاوان طلب کررہا تھا۔ راجا کی آنکھیں رخساروں پر آگئی تھیں اور زبان منہ چڑانے کے انداز میں باہر نکلی ہوئی تھی۔ وہ اب تب کا مہمان لگ رہا تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ وہ جان بچانے کے لیے یہاں آیا تو یہ پہلوان نما گاہک اس کے گلے پڑ گیا۔ شائستگی سے بیچ بچاؤ کرنے کا وقت اور موقع نہیں تھا۔ وہ میرے گلے پڑ جاتا تو میں کیا کرتا اس لیے میں نے کپڑے کوٹنے والے ڈنڈے سے پہلوان کے سر پر ایک ضرب لگائی۔ اس نے فوراً راجا کی گردن چھوڑ دی، مسکرانے لگا مگر اس وقت اس کی مسکراہٹ چیخ میں بدل گئی جب راجا نے استری اٹھا کر وہاں لگائی جہاں سے وہ اس کی پتلون پہلے ہی جلا چکا تھا۔ اب اگر وہ یہ پتلون پہنتا تو لگتا کہ اس نے پتلون پہن کر استری کی کوشش کی تھی۔ بہرحال راجا کی اس احمقانہ حرکت سے ڈنڈے کی ضرب کا اثر زائل ہوگیا اور پہلوان نے بلبلا کر دوبارہ راجا کی گردن دبوچ لی۔ مجبوراً مجھے دوسری بار ڈنڈے کا غلط استعمال کرنا پڑا۔ پہلوان دوسری بار مسکرانے لگا اور اس سے پہلے کہ راجا مزید کوئی احمقانہ حرکت کرتا، میں اسے وہاں سے کھینچ کر باہر لے آیا۔

”لگتا ہے آج تُو اپنے باپ کو لاولد کرنا چاہتا تھا۔ پتلون کیسے جلی؟“

”بس یار دکان کے سامنے سے ناصر مع اپنی کوہِ نور جیسی بیوی کے گزر رہا تھا۔ اسے دیکھنے لگا۔“ راجا نے سرد آہ بھری۔

”تب تو قابلِ معافی ہے۔“ میں نے تائیدی سرد آہ بھری۔ ”ناصر جیسے ایکسپائر کو کوہِ نور جیسی بیوی مل گئی۔ حد یہ کہ چاند میاں کی شادی ہونے والی ہے (ان دنوں چاند میاں اکیلے اور اداس تھے)۔

”ہم دونوں ایسے ہی پھر رہے ہیں۔“

”اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کام دھندے کی کتنی اہمیت ہوتی ہے۔ کم سے کم آدمی کی شادی تو ہوجاتی ہے۔“ [illegible] نے حسرت سے کہا۔ ”راجا! میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ کچھ کروں۔“

”تو کورٹ میرج کرلے۔“ راجا نے تجویز دی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”شنو ایک باحیا اور شریف لڑکی ہے۔ وہ کبھی کورٹ میرج کے لیے نہیں مانے گی۔“

”تب بیٹھا رہ۔“ راجا نے قہقہہ مارا۔ جان بچ جانے پر وہ خاصا مسرور نظر آرہا تھا لیکن کچھ دیر بعد کیفے ڈی پھونس میں انکشاف ہوا کہ جب پہلوان اس کی گردن دبا رہا تھا تو [illegible] اس کی جیبیں ٹٹول رہا تھا اور اس نے جیبوں میں جو کچھ تھا نکال لیا تھا۔

”بیٹے تیری عادتیں عارفہ نے خراب کردی ہیں ورنہ شرافت سے انتظار میں جو مزہ ہے، وہ بھاگ کر کورٹ میرج کرنے میں کہاں ہے۔ عارفہ تو سرے سے میرج کی قائل ہی نہیں ہے۔“

راجا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کہاں خراب کی ہیں؟ [illegible] تو بس امورِ خارجہ چل رہے ہیں۔“

”بیٹے، عارفہ معاملات کو زیادہ دیر باہر رکھنے کی قائل نہیں ہے۔ جلد وہ تجھے وزیرِ داخلہ بنادے گی۔“

”تو عارفہ کو چھوڑ، یہ بتا کہ جمی کا معاملہ کہاں تک پہنچا؟“

”تُو جانتا ہے؟“

”جلیل! میں تجھے جانتا ہوں۔ تُو نے مجھے ٹالا تھا اور خود میرا موڈ بھی نہیں تھا۔ اب بتا کیا ہوا میرے بعد؟“

مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ راجا اتنا گھامڑ نہیں تھا جتنا میں سمجھتا تھا، اس سے کچھ ہی کم تھا۔ بہرحال میں نے اسے بتایا کہ اس کی غیر موجودگی میں کیا ہوا تھا۔ میں نے سوائے ایک بات کے سب بتادیا اور راجا نے وہی تاڑ لی۔ اس نے کہا۔ ”جلیل! چکر بازی مت کر شرافت سے پوری بات بتا۔“

”پوری بات کون سی؟“ میں انجان بنا۔

”یہی کہ چرس کہاں ہے جو اس سارے فساد کی جڑ ہے؟“

”مجھے کیا معلوم؟“

”حالانکہ تجھے ہی معلوم ہے۔“ راجا نے یقین سے کہا۔ ”جلیل! یہ آرام سے تین میں بک جائے گی، سامنے بھی نہیں آنا پڑے گا۔ تین لاکھ بہت ہوتے ہیں۔ میں اپنی فلم پروڈیوس کرسکوں گا۔“ (اس زمانے میں راجا پر فلم کا بھوت سوار تھا۔ بعد میں خود فلم والوں کا بھوت اتر گیا تھا)۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ نہیں ہوسکتا۔“

”بالکل ہوسکتا ہے، ممکن ہے ساڑھے تین لاکھ مل جائیں۔“

”راجا! میں چرس فروخت کرنے کی بات کررہا ہوں۔ تُو جانتا ہے میں نے آج تک ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے۔ میں ہیرا پھیری کرتا ہوں، چوری نہیں۔“

”تب ہی یہ حال ہے، چائے پینے تک کے پیسے نہیں ہیں۔“ راجا نے خفا ہوکر کہا۔

”تیرے پاس تو ہیں۔“ میں نے دانت نکالے۔ ”فکر مت کر میں نے ایک چکر چلایا ہے۔“

”کیسا چکر؟“ راجا نے پوچھا اور اسی لمحے جمی دھم سے ایک کرسی پر بیٹھا۔ ہم میں سے کسی نے اسے آتے نہیں دیکھا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ کرسی نہیں ٹوٹی تھی حالانکہ فتو جمی کو دیکھ کر دوڑا تھا اور پھر کرسی کو صحیح سلامت پاکر واپس لوٹ گیا۔ جمی نے جگ ایک ہی سانس میں خالی کیا اور راجا سے کہا۔

”میں بتاتا ہوں اس نے کیا چکر چلایا۔“ جمی نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

میری طرف دیکھا۔ ''جلیل! مال کہاں ہے... حسینہ آئی تھی۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ وہ جانی چریا کو حقیقت بتا دے گی۔''

''تب میں کیا کروں؟''

''مجھے مال چاہیے۔ آدھا حسینہ مانگ رہی ہے۔''

''باقی آدھا کس کا ہوگا؟'' راجا نے سوال کیا۔

''میرا۔'' جمی غرایا۔ ''وہ میرا مال ہے۔''

''وہ حرام کا مال ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''میں نے تجھے حوالات سے نکلوانے کی بات کی تھی۔ اب تُو باہر ہے تو میرا حصہ کہاں ہے؟''

''کیسا حصہ؟ میں خود باہر آیا ہوں۔''

''اچھا، تب حوالات میں ہمیں دیکھ کر کیوں رویا دھویا تھا؟''

''جذباتی ہو گیا تھا دوستوں کو دیکھ کر۔ حالانکہ تم دوست کہاں دشمن ہو۔''

''تب تُو دشمنوں کے پاس کیا لینے آیا ہے؟'' راجا نے جمی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

''تم دونوں اپنی بکواس بند کرو۔'' میں نے کہا۔ ''جمی! تُو یار ہے پر نہایت کمینہ یار ہے۔ ہمیشہ دغا اور دھوکا کرتا ہے۔ پیسے کی خاطر دوستوں کو ڈبل کراس کرتا ہے۔ میں تیری چال کا پول پہلے ہی کھول چکا ہوں اس لیے اپنی دوستی دشمنی کی بکواس بند کر اور کام کی بات کر۔''

جمی پیسے کے معاملے میں قیامت کی چھٹی حس رکھتا تھا۔ وہ سمجھ گیا، اس نے مرے مرے انداز میں کہا۔ ''کام کی بات تُو کر... پر خیال رکھنا، مجھے جو ملے گا اس میں میرا نقصان بھی پورا نہیں ہوگا۔''

''آدھا مال بھی دو لاکھ کا ہے اور تُو اسے جانی چریا کے مال کے ساتھ بیچے گا تب بھی زیادہ ہی کما لے گا۔''

''میرے بکرے؟'' جمی کا لہجہ دردناک ہو گیا۔ ''وہ تو گئے ہاتھ سے۔''

''یہ سارا تیرا کمینہ پن ہے۔'' راجا نے طنز کیا۔ ''اب روتا کیوں ہے؟''

''جمی! فکر نہ کر اس بلو سے بھی نمٹ لیں گے۔ ابھی تو مال کی بات کر۔''

''جلیل! مال کہاں ہے؟ مجھے ابھی چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، دس ہزار روپے دے حوالات سے نکالنے کا معاوضہ... میں تجھے مال دیتا ہوں۔''

''دس ہزار...'' جمی نے آخری ہچکی لینے کے انداز میں کہا۔ ''جلیل! یہ بہت زیادہ ہیں۔''

جمی اتنی آسانی سے ماننے والا کہاں تھا لیکن اس وقت پھنسا ہوا تھا اس لیے مان گیا۔ بادل ناخواستہ اس نے جان دینے کے انداز میں اپنی کسی خفیہ جیب سے دس ہزار نکالے۔ جمی چلتی پھرتی تجوری تھا۔ اپنے لباس میں ایسی ایسی جگہوں پر رقم رکھتا تھا کہ آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس کے خیال میں آدمی کی دولت سب سے زیادہ اس کے پاس محفوظ ہوتی ہے۔ وہ بینکوں پر بھی اعتبار نہیں کرتا تھا۔ اگرچہ دولت جمع کرنے میں وہ بینک سے کم نہیں تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ دنیا بالآخر بینکوں کی وجہ سے تباہ ہوگی چونکہ ہم سرِعام بیٹھے تھے اس لیے میں نے پھرتی سے نوٹ اپنی جیب میں غائب کیے۔ جمی نے صدمے سے باہر آتے ہوئے مال کا پوچھا۔

''جلیل! اب مال دے۔''

''وہ تیرے پاس ہے۔'' میں نے دانت نکالے۔

''کیا مطلب؟'' جمی چونکا۔

''تُو نے پانی کی ٹنکی میں چھپایا تھا۔ میں نے اسے وہاں سے نکال کر فلیش ٹینک میں چھپا دیا۔''

جواب میں جمی نے اپنے جیسی وزنی گالی دی اور وہاں سے یوں روانہ ہوا جیسے لوگ برات کا کھانا کھلتے ہی بھاگتے ہیں۔ اس کے جاتے ہی راجا نے اپنے حصے کا مطالبہ کر دیا۔ میں نے اسے گھورا۔ ''کیسا حصہ... تُو نے کیا کیا ہے؟''

''تھانے تک تو تیرے ساتھ گیا تھا اور نادر شاہ بھی تیری وجہ سے میرے پیچھے ہے۔''

''وہ تیرے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے پیچھے ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''کیونکہ تُو اس کی دخترِ بداختر کے پیچھے ہے۔''

''چل آدھا نہ سہی، تہائی دے دے۔'' راجا نے امن کی آشا کی بات کی۔ بالآخر معاملہ پچیس فیصد پر طے ہوا لیکن جب میں نے جیب سے رقم نکالی تو میرے منہ سے جمی کے لیے جمی سے زیادہ وزنی متعدد گالیاں نکل گئیں۔ یہ ذرا اچھی قسم کے وہ نوٹ تھے جو عید کے موقع پر بکتے ہیں اور ان پر عید مبارک لکھا ہوتا ہے۔ جمی حسبِ معمول دھوکا کر گیا تھا۔ راجا کا حال زیادہ برا تھا اور وہ اسی وقت جمن خانے جانے کے لیے تیار ہو گیا مگر عین موقع پر نادر شاہ وہاں نازل ہوا اور ہمیں کیفے ڈی پھونس سے فرار ہونا پڑا۔ راجا پتا نہیں کہاں گیا لیکن میں برابر والے جوئے خانے میں جا گھسا۔ وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں پولیس اطلاع دیے بغیر نہیں جاتی تھی۔ اس ساری بھاگ دوڑ میں بس ایک ہی فائدہ ہوا تھا، فتو کا بل نہیں دینا پڑا تھا۔

سراغ رسانی اور تفتیش کی گاڑی حاضر دماغی سے چلتی ہے... اس کی ذہانت اور باریک بینی کا امتحان تھا... وہ ایک ایسے کیس کی باریکیوں میں الجھا ہوا تھا... جہاں چار چور اور ایک سپاہی والا معاملہ درپیش تھا...

شیطان مسیحا

جمال دستی

...بے انتہا خوب صورت تھی۔ اس کی آنکھیں بادامی ...چہرے پر ابھرے ہوئے ہونٹ غنچے کی طرح ...بے حد شفاف تھی اور اسے سورج کی کرنوں نے ...رکھا تھا۔

...کرائم سین تصویروں کو بار بار دیکھ رہا تھا جن میں ...سینٹ پال کیتھیڈرل کے وسطی باغ میں آڑھی ...تھی۔ ایک لمبا رنگین دستے والا چاقو اس کے سینے ...ہوا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا، وہ ایک نن ہونے کے لحاظ سے بہت ہی زیادہ حسین ہے۔

میں زیادہ دیر تک ان تصویروں کو نہیں دیکھ سکا۔ میں نے وہ تمام تصویریں برنارڈ کو لوٹا دیں۔ اس نے فوراً ہی ان تصویروں کو ایک پیپر کلپ کے ساتھ انویسٹی گیشن فائل کے اندرونی کور سے منسلک کر دیا۔

''اس کیس میں ہم اب کہاں تک پہنچے ہیں؟'' میں نے برنارڈ سے پوچھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

برنارڈ فولڈر میں موجود بغیر بندھے کاغذات کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ گزشتہ پندرہ برسوں سے روزانہ اپنے کمپیوٹر پر مستقل کام کرتے رہنے سے اس کے رخساروں کا گوشت ڈھیلا ہو کر لٹک گیا تھا اور جب وہ بولتا تھا تو اس کے گال تھلتھلاتے لگتے تھے۔ البتہ وہ جو بھی معلومات تلاش کرتا تھا، اس کی صداقت میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

"میں چرچ گیا تھا لیکن کوئی بھی بات نہیں کر رہا۔ انہوں نے یہ معاملہ ویٹیکن کو بھیج دیا ہے۔ انہوں نے دعائیں مانگنا شروع کر دی ہیں کہ یہ جس کسی نے بھی کیا ہے، اس کے ساتھ عدالتی کارروائی کی جائے۔ سو وہاں اور کچھ نہیں ہے۔ البتہ میں نے شہر میں پوچھ گچھ کی تو سنار کاریگر جس نے چاقو بنایا تھا، بتایا کہ اس نے مقامی پادریوں کے لیے ایسے مزید تین چاقو بنائے تھے۔ یہ گرجا میں مستقل عبادت کرنے والوں کی جانب سے ان پادریوں کے لیے بطور تحفہ تھے۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی معلومات نہیں ہیں۔" برنارڈ نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"اور وہ پادری کہاں ہیں؟ کیا تم نے انہیں تلاش کر لیا اور پوچھ گچھ کے لیے یہاں لے آئے ہو؟"

"میں انہیں گھیر کر تو لے آیا ہوں لیکن میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی یہ بتایا کہ انہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس صورت میں سوالوں کا جواب دینا زیادہ مناسب سمجھیں گے اگر یہ سوالات ہومی سائڈ کا ایک سرکردہ سراغ رساں پوچھے گا۔"

میں نے فولڈر اٹھایا اور ناموں کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالی۔ تمام ناموں کا آغاز فادر سے ہو رہا تھا اور آخری نام کچھ مخصوص نوعیت کے تھے۔ فادر گرانٹ، فادر ڈیوٹ اور فادر ملبیری!

ہمیں اپنی تفتیش کا آغاز پادری سے کرنا تھا۔

برنارڈ نے آفس کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ "سو ہم کس پادری سے اپنی تفتیش شروع کر رہے ہیں؟"

"میرے خیال سے اوپر سے شروع کیا جائے اور پھر آخر تک چلتے ہیں۔ شاید ہم کسی قسم کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو جائیں اور انہیں قانون کے شکنجے میں جکڑ سکیں۔"

ہم نے آغاز فادر گرانٹ سے کیا۔

فادر گرانٹ بے چین سا تھا۔ وہ نروس ٹائپ کے لوگوں میں سے نہیں تھا بلکہ اس قسم کے لوگوں میں سے تھا جو یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ ان کا وقت ضائع کر رہے ہیں اور وہ ایک سرد تفتیشی کمرے میں بیٹھے پانی کا ایک گلاس پینے کے بجائے کوئی اور بہتر کام کر رہے ہوتے۔

اس نے میز پر انگلیاں بجاتے ہوئے بات چیت کا آغاز کیا۔ یہ میرے لیے ایک اشارہ تھا۔ انگلیاں بجانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بظاہر منتشر ذہن حقیقت میں اندر سے بالکل پُرسکون ہے۔ اس انجان ہرن کی طرح جو کسی جھیل کے کنارے پانی پی رہا ہو اور اس کی ذات کے تحفظ کا مبہم احساس جلد ہی اس مگرمچھ کے گلے سے ریزہ ریزہ ہو جائے جو خاموشی کے ساتھ کھڑے پانی میں اس اہم موقع کا انتظار کر رہا ہو کہ ایک ہی جست میں اچھل کر اسے دبوچ لے اور دلدل میں گھسیٹ کر لے جائے۔

تفتیشی کمرے کا دروازہ اچانک کھلنے پر وہ قدرے چونک سا گیا۔

"فادر گرانٹ؟"

اس نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور بے ترتیب سانسوں کو چھپاتے ہوئے بولا۔ "جی...!"

"میرا نام سارجنٹ ونسنٹ ہے۔ آپ کیسے ہیں؟"

"سنو مسٹر... ونسنٹ ہی نام بتایا نا؟" اس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکا دیں اور میری جانب جھکتے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے اور ہماری تنظیم اس معاملے کو اندرونی طور پر ہینڈل کرنا چاہتی ہے۔ اگر تم مجھ سے کوئی اور سوال پوچھنا چاہتے ہو تو میری گزارش ہے کہ میرے اٹارنی کو یہاں موجود ہونا چاہیے۔"

میں فائل میں موجود کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا جیسے میں بہرا ہوں اور اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ میرا پختہ کار مشیر ہمیشہ مجھ سے یہی کہا کرتا تھا کہ ایک بار اگر تم نے کسی کی وکیل کے لیے درخواست قبول کر لی تو تمہارے کھرا بچ جانے کا امکان گھٹ کر پچیس فیصد رہ جائے گا۔

میں نے فولڈر میں سے کرائم سین کی ایک تصویر نکال کر میز پر پادری کی جانب بڑھا دی۔ فادر گرانٹ نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ اسے پہچانتے ہیں۔ ایگی فراسٹ، عمر بیس سال۔ اس کے ریکارڈ کے مطابق اس نے آپ کی تنظیم میں اس دن شمولیت اختیار کر لی تھی جس روز بچوں کی دیکھ بھال کے ادارے میں اس کی عمر بلوغت کو پہنچی تھی اور مجھے یقین ہے کہ آپ نے اس چاقو کے دستے کو بھی پہچان لیا ہوگا جو اس کے سینے میں دھنسا ہوا ہے۔ ہم آپ کے وکیل کو طلب کر رہے ہیں۔ اس کے یہاں پہنچنے تک آپ یہاں خاموش بیٹھ سکتے ہیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

فادر گرانٹ کی نظریں ایمی کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کی آنکھوں کے گرد سخت شکنوں کو نرم پڑتے دیکھا۔ شاید انہیں اپنا وہ عہد یاد آ گیا تھا کہ وہ اپنے کلیسا کے بچوں کی حفاظت کریں گے۔ مجھے بھی امید بندھی کہ شاید وہ مجھے کوئی ایسی بات بتا دیں جو میرے لیے کارآمد ثابت ہو جائے۔

''تم نے مجھے ایک تکلیف دہ پوزیشن میں لا کھڑا کیا ہے۔'' فادر گرانٹ نے کہا۔ ''میں نے قسم کھائی تھی کہ میں اس معاملے میں کسی باہر کے فرد سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ اس قسم کے وعدوں کو توڑنے کے نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔''

''مجھے علم ہے کہ اس مخصوص طرز کے مخصوص چاقو آپ سمیت تین پادریوں کو دیے گئے تھے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ایک جیسے ثبوت کی وجہ سے یہ بڑا مشکل ہو رہا ہے...''

''وہ ایک جیسے نہیں ہیں۔''

میں نے فولڈر میں موجود نوٹس پر سے نگاہ اٹھا کر فادر گرانٹ کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے... وہ ایک جیسے نہیں ہیں؟ جس کاریگر نے وہ چاقو بنائے تھے، اس کا کہنا ہے کہ وہ تمام ایک ہی سانچے میں ڈھالے گئے تھے؟''

''چاقوؤں کے دستے ایک جیسے ہو سکتے ہیں لیکن ان کے پھل مختلف لمبائی کے ہیں۔ ہر لمبائی چرچ میں ہماری تعیناتی کی مدت کو ظاہر کرتی ہے۔ دیکھو، میں واقعی تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن میں مزید کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں خود کو یا کلیسا کے دیگر افراد کو خطاوار ٹھہرانا نہیں چاہتا۔ اگر تمہیں مزید سوالات پوچھنے ہیں تو تم میرے وکیل کی موجودگی میں وہ سوالات کر سکتے ہو۔''

اس کے چہرے کے کرخت تیور ظاہر کر رہے تھے کہ اس پر سے تفتیشی روم... میں موجودگی کا دباؤ ختم ہو گیا ہے اور اب وہ ذہنی طور پر مطمئن ہے۔ وہ باتیں بھی کر چکا ہے۔

میں نے اپنا فولڈر اکٹھا کیا اور کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہم نے آپ کے وکیل کو طلب کر لیا ہے۔ آپ کے تعاون کا شکریہ۔ یہ ہمارے لیے ایک بڑی مدد تھی۔''

جب میں کمرے سے نکل رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ فادر گرانٹ نے اپنا سر جھکا لیا تھا اور سرگوشی کے انداز میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ یا تو دعا مانگ رہا تھا یا مناجات پڑھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔

ایک سراغ رساں ہونے کے ناتے میں ان باتوں پر خاص دھیان دیتا تھا اور میرے خیال سے خدا سے معافی مانگنے کا یہ انتہائی بے تکا وقت تھا۔ وہ لازمی کچھ چھپا رہا تھا اور خود کو خطاوار محسوس کر رہا تھا یا پھر وہ مجھ سے جھوٹ بول رہا تھا۔

میں دونوں ہی صورتوں میں اس کی باتوں کو مشتبہ سمجھ رہا تھا۔

''تو پھر اس نے کیا بتایا؟'' برنارڈ نے پوچھا۔

''کچھ زیادہ نہیں۔ ہم نے صرف چاقوؤں کے بارے میں بات کی اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اپنے وکیل کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میری اعانت کرو اور مرفی سے کہو کہ وکیلوں کو جتنی دیر تک اس سے ہو سکتا ہے، روکے رکھے۔ دیگر پادری شاید بچ اگل دیں جب وہ یہ سمجھیں کہ ان کے وکیل نہیں آ رہے۔ میں فادر ڈیوٹ سے بات کرنے جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

جب برنارڈ اٹھ کر جانے لگا تو میں نے چوری چھپے اس تفتیشی روم... میں جھانکا جس میں فادر ڈیوٹ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی حالت قدرے ابتر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بار بار اپنی پیشانی سے پسینا پونچھ رہا تھا اور خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس پہ دھیرے دھیرے کام کروں تو وہ کھل جائے گا۔ اس لیے نہیں کہ وہ مدد کرنے کے لیے بے تاب تھا بلکہ اس لیے کہ ناپسندیدہ ماحول میں کسی بھی آدمی کو اپنے قبیلے کے احکامات کے مقابلے میں اپنے بچاؤ کی زیادہ فکر لاحق رہتی ہے۔

''فادر ڈیوٹ... میرا نام سارجنٹ ونسنٹ ہے۔ آپ کیسے ہیں؟''

''فائن۔'' اس نے قدرے کانپتی آواز میں جواب دیا۔

میں نے میز کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی کھینچ لی۔ کنکریٹ کے فرش پر کرسی کی دھاتی ٹانگوں کی رگڑ کی آواز پر وہ اچھل پڑا۔

''مجھے یقین ہے آپ جانتے ہوں گے کہ آپ یہاں کیوں ہیں؟'' میں نے اس کے مقابل کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔ میرے وکیل نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر مجھ پر کسی قسم کا الزام عائد نہیں کیا گیا ہے تو میں...''

میں نے فولڈر میں سے مقتولہ کی تصویر نکال لی۔

''آپ پر ابھی تک کسی قسم کا الزام عائد نہیں کیا گیا۔ اور میں اس بات سے بھی بہ خوبی آگاہ ہوں کہ آپ کے وکیل نے آپ کو ہم سے بات کرنے سے منع کر دیا ہے کیونکہ اس معاملے کی اندرونی طور پر تحقیقات کی جا رہی ہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، قتل کے اس کیس میں جو ہتھیار استعمال کیا گیا ہے، وہ تین لوگوں میں سے کسی ایک کا ہے۔ یہ بات دیگر کے بچاؤ کے مفاد میں نہیں کہی جا رہی، یہ آپ کے بچاؤ کے بارے میں کہی جا رہی ہے۔''

فادر ڈیوٹ نے نظریں چراتے ہوئے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ''میرے وکیل نے مجھے بتایا تھا کہ اگر مجھ پر کسی قسم کا الزام نہیں لگایا گیا تو میں اپنے اس حق کو محفوظ رکھتا ہوں کہ کسی بھی سوال کا جواب نہ دوں۔''

اسے کرائم سین کی تصویر دکھانے کی ضرورت تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا ضمیر بیدار ہے۔ اگر میں نے دھیرے دھیرے اس پر دباؤ ڈالا تو وہ ہمت ہار جائے گا اور اپنا راز اگل دے گا۔

میں نے فولڈر میں کاغذات کو ٹٹولتے ہوئے وہ تصویر تلاش کر لی۔ میں نے شائستگی کے ساتھ وہ تصویر اس کے سامنے رکھ دی۔ پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یقین ہے آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے۔ اسی کی بنا پر آپ یہاں موجود ہیں۔ آپ کا خیال ہو سکتا ہے کہ یہ معاملہ اندرونی طور پر ہینڈل کر لیا جائے گا۔ لیکن یہ انسان کے ہاتھوں انسان کا قتل ہے اور میں اس قسم کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اس کی سزا نہ ملے۔ یہ جس کسی نے بھی کیا ہے وہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کے درمیان محدود ہے۔ ایک اسمارٹ آدمی کو تعاون کرنا چاہیے کیونکہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ہر مرتبہ معصوم اور بے گناہ لوگ جیل چلے جاتے ہیں۔''

فادر ڈیوٹ نے تصویر اٹھالی۔ مقتولہ کے سینے میں دھنسے ہوئے چاقو پر براہِ راست نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

''یہ میرا چاقو نہیں ہے۔''

''کیا آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں؟'' میں نے متجسس لہجے میں کہا۔

''ہم میں سے ہر ایک کو چرچ میں ہماری خدمات کے اعتراف میں ایک آرائشی چاقو دیا گیا تھا۔ ہم تینوں میں چونکہ میری تعیناتی کی مدت سب سے کم تھی، اس لیے مجھے جو چاقو دیا گیا تھا اس کا پھل اس چاقو کے پھل سے دو انچ چھوٹا تھا۔''

''تو پھر آپ سے زیادہ تعیناتی مدت کس کی تھی؟'' میں نے جاننا چاہا۔

تصویر کو دیکھتے ہوئے فادر ڈیوٹ کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ ''فادر میلبری کی!'' اس نے جواب دیا۔

اتنے میں تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے اپنا بریف کیس اپنے سینے سے چمٹایا ہوا تھا۔ برنارڈ اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''لیسٹر میکملن!'' اس نے بلا تاخیر اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میں سینٹ پال کیتھیڈرل کی نمائندگی کرتا ہوں۔ میرے موکل نے وکیل کی موجودگی کا مطالبہ کیا ہے، اس لیے اب اس انٹرویو کا اختتام ہو جانا چاہیے۔ جو جبری بیان میرے کسی بھی موکل سے لیا گیا ہے تو میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اسے رد کر دیا جائے گا۔ اب اگر میرے موکلین پر کسی قسم کا الزام نہیں ہے تو میں مطالبہ کرتا ہوں کہ انہیں فوری طور پر چھوڑ دیا جائے۔''

میں مرفی کا شکر گزار تھا کہ اس نے وکیل کو دیر تک روکے رکھا کیونکہ مجھے اب اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں جو کچھ جاننا چاہتا تھا وہ مجھے معلوم ہو چکا تھا۔

''فادر ڈیوٹ! آپ پر ایمی فراسٹ کے قتل کا الزام عائد کیا جا رہا ہے۔ برنارڈ، فادر کو حراست میں لے لو۔''

جونہی برنارڈ، فادر ڈیوٹ کی جانب بڑھنے لگا تو وکیل نے اپنا بریف کیس گھماتے ہوئے اس کا راستہ روک لیا۔ یہ واضح طور پر انصاف کی راہ میں جان بوجھ کر روڑے اٹکانے والی بات تھی لیکن میں نے اسے درگزر کر دیا۔

''تم انہیں کس بنیاد پر حراست میں لے رہے ہو؟'' وکیل نے پُرجوش انداز میں پوچھا جیسا کہ ان کا اندازِ تخاطب ہوتا ہے۔

''میں نے تمہارے موکل سے سوالات پوچھے تھے جن کا وہ رضاکارانہ طور پر جواب دے سکے۔ میں نے اس سے چاقو کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کا چاقو اس چاقو سے دو انچ چھوٹا ہے جو تصویر میں دکھائی دے رہا ہے۔''

''تو پھر؟'' وکیل نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''تو پھر تم دیکھ سکتے ہو کہ چاقو مقتولہ کے سینے میں دھنسا ہوا ہے۔ وہ کسی صورت یہ نہیں جان سکتا کہ وہ چاقو کتنا لمبا ہے۔ اسے بس یہ پتا تھا کہ یہ چاقو اس چاقو سے لمبا ہو سکتا ہے جو فادر میلبری کی ملکیت میں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جب دیگر مشتبہ افراد کو یہ خبر سننے کو ملے گی اور وہ یہ جان لیں گے کہ وہ الزام سے بری ہیں تو وہ تعاون کرنے میں کہیں زیادہ خوشی محسوس کریں گے۔ برنارڈ، پلیز فادر ڈیوٹ کو حراست میں لے لو۔''

جب آہنی ہتھکڑیاں فادر ڈیوٹ کی کلائیوں میں باندھی جا رہی تھیں تو ان کا وکیل مبہوت کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

جب برنارڈ، فادر ڈیوٹ کو کمرے سے باہر لے جا رہا تھا تو میں نے لپک کر فادر کا بازو تھام لیا۔ ہر بات اپنی جگہ فٹ بیٹھ رہی تھی ماسوائے اس قتل کے مقصد کے۔

''سو تم نے ایسا کیوں کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

تب فادر ڈیوٹ کے افسردہ چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ عود کر آئی۔

''تم اتنے اسمارٹ ہو تو خود اندازہ لگا لو!''

WWW.PAKSOCIETY.COM

قابلِ علاج

مریم کے خان

معمولی سی لغزش بڑے عذاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے... اس سے بھی نادانستگی میں ایک غلطی سرزد ہو گئی تھی... اور اس کا خمیازہ اسے مسلسل اٹھانا پڑ رہا تھا... حواس باختہ اور منتشر مزاج شخص کی کتھا جس نے اپنے پر غالب مصیبت کا حل سوچ لیا تھا...

ایک مدیر اور مصنف کی یکجائی... دونوں اپنے اپنے کام میں مہارت رکھتے تھے...

رات طوفانی اور نہایت سرد تھی۔ جیسا کہ عموماً جاسوسی ناولوں یا فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ یہ قتل یا کسی جرم کے لیے نہایت موزوں رات تھی۔ جب دیکھنے اور سننے والا کوئی نہ ہوتا اور بارش نے ہر طرف پردے ڈال دیے تھے۔ برستا پانی جرم کے نشانات مٹا دیتا اور مجرم اپنا کام کر کے نہایت اطمینان سے رخصت ہو سکتا تھا۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ میں اس قسم کی گفتگو کیوں کر رہا ہوں... اس کی بڑی سادہ سی وجہ ہے۔ میں جرائم پر مبنی کہانیاں شائع کرنے والے ایک رسالے کا مدیر ہوں۔ صبح سے شام تک ایسی ہی کہانیاں پڑھتا ہوں اور اکثر کہانیوں میں جرم کے وقت کچھ ایسا ہی ماحول ملتا ہے۔ اتفاق سے کچھ ایسی ہی رات تھی اور میرا ذہن اور کیا سوچ سکتا تھا۔ میری بیوی رمیا کو بھی ایسا موسم بہت پسند ہے اس لیے نہیں کہ وہ جرائم اور ان سے متعلق کہانیاں پسند کرتی ہے بلکہ وہ اس موسم میں آتش دان کے سامنے بیٹھ کر اپنی پسندیدہ شاعری پڑھتی ہے۔ رمیا خواتین کے ایک رسالے میں کام کرتی ہے۔

پیشے کے اختلاف سے قطع نظر ہمارے درمیان بہت اچھی گزر رہی ہے۔ ہمارے دو بچے ہیں۔ اکیس سالہ طرڈ جو امریکی فوج میں ہے حالانکہ وہ میوزیشن بننا چاہتا تھا مگر ان دنوں گولیوں اور بموں کی آوازیں سن رہا ہے۔ اس سے دو سال چھوٹی امیلا شکا گو انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن آرٹ میں پڑھ رہی ہے۔ نیویارک کے اس پرانے علاقے کے فلیٹ میں ہم میاں بیوی رہتے ہیں۔ نومبر کا آغاز ہی سرد تھا۔ پہلے برف باری ہوئی اور اس کے بعد برف سے زیادہ سرد بارش نے معمول بنا لیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ٹی وی دیکھوں یا سونے کے لیے لیٹ جاؤں، اچانک میرے موبائل نے بیل دی۔ میں نے دیکھا کہ لیون کی کال تھی۔ لیون اسٹیو میرے رسالے کا سب سے بہترین کرائم رائٹر تھا، خاص طور سے قتل کی کہانیاں لکھنے میں اسے کمال حاصل تھا۔

وہ نیویارک سے تقریباً بیس میل جنوب مغرب میں واقع اسٹیٹن آئی لینڈ میں رہتا تھا۔ یہ جزیرہ نہیں ہے لیکن اسے آئی لینڈ ہی کہتے ہیں۔ لیون ہفتے میں ایک بار لازمی نیویارک آتا تھا۔ پہلے وہ نیویارک میں ہی رہتا تھا۔ بہت دھکے کھا کر وہ اس مقام پر پہنچا تھا کہ آج اس کا نام امریکا کے چند معروف کرائم اسٹوری رائٹرز میں شامل تھا اور جب اس کے پاس پیسا آیا تو وہ دوسرے لکھنے والوں کی طرح سکون کی تلاش میں شہر سے باہر نکل گیا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی تھا۔ لکھنے والے زیادہ وقت لکھنے میں صرف کرتے تھے اور ہمیں کہانیاں چھاپنے کا موقع ملتا تھا۔ پبلشنگ کا کام مصنفوں کے بل پر چلتا ہے۔ میں نے کال ریسیو کی۔ میرا خیال تھا کہ لیون اپنی کسی نئی کہانی کے بارے میں تبادلہ خیال کرنا چاہتا ہے۔ جب اس کے ذہن میں کوئی آئیڈیا آتا تھا اور وہ کسی جگہ پھنستا تھا تو مجھ سے مشورہ کر لیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں مصنف نہیں لیکن کہانیوں کے بارے میں سب سے بہترین مشورہ دیتا ہوں۔ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''کیا حال ہیں لیون... کوئی نیا آئیڈیا آیا؟''

''جرنی پلیز۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' اس کی مضطرب آواز آئی۔ ''تم فوراً میرے پاس آجاؤ۔''

''تمہارے پاس...؟'' میں نے بے یقینی سے کہا۔ ''تم نیویارک آئے ہو؟''

''نہیں، میں اسٹیٹن آئی لینڈ میں ہوں۔''

''تم دیکھ رہے ہو رات کے گیارہ بجے ہیں اور باہر موسم کتنا خراب ہو رہا ہے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن پھر بھی تم سے درخواست کر رہا ہوں۔''

''لیون! مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ رمیا نے

...نظروں سے میری طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

''میں فون پر نہیں بتا سکتا۔ یوں سمجھ لو کہ میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔''

اس بار میں سوال کرتے ہوئے ہچکچایا۔ ''کیا اس مسئلے کا تعلق مجھ سے ہو سکتا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''دور کا بھی نہیں۔''

''او کے، میں آرہا ہوں۔'' میں نے کہا اور کال منقطع کی تو رمیا اٹھ کر میرے پاس آئی۔

''تم اس وقت جاؤ گے... موسم دیکھ رہے ہو؟''

''مجبوری ہے ڈیئر۔'' میں نے اوورکوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتی ہو لیون صرف ایک مصنف ہی نہیں، میرا بہت اچھا دوست بھی ہے۔''

رمیا سمجھ گئی کہ میں نہیں رکوں گا۔ ''اچھا، احتیاط سے ڈرائیو کرنا اور وہاں پہنچ کر مجھے کال کر دینا۔ اور ہاں، اگر واپس آنا ہو تو رات میں مت آنا، تم صبح بھی آسکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے، میں خیال رکھوں گا۔'' میں نے چابیاں، پرس اور موبائل جیب میں رکھا اور باہر نکل آیا۔ کار تک آتے آتے بارش نے اچھا خاصا بھگو دیا تھا لیکن اوورکوٹ کی وجہ سے پانی اندر تک نہیں پہنچا۔ اس کے باوجود سردی مزاج پوچھ رہی تھی۔ انجن اسٹارٹ کر کے میں نے سب سے پہلے ہیٹر آن کیا، تب کہیں جا کر جان میں جان آئی۔ میں نے ریڈیو آن کیا اور موسم اور ٹریفک کی رپورٹ لیتا ہوا روانہ ہو گیا۔ حالانکہ دونوں کی ضرورت نہیں تھی۔ موسم تو صاف دکھائی دے رہا تھا اور اس موسم میں ساری سڑکیں بھی صاف ملتیں۔ انتہائی رش والی جگہیں بھی خالی ہوتی ہیں ایسے موسم میں۔ میں نے ہائی وے دو سو اٹھتر پکڑی۔ بارش کی وجہ سے بہت کم ٹریفک تھا مگر میں ایک حد سے تیز ڈرائیو نہیں کر سکتا تھا اس لیے لیون کے گھر تک پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹا لگ گیا۔ اس کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

مکان قصبے کے نواحی علاقے میں تھا۔ یہاں زیادہ تر امراء کے گھر تھے۔ بڑے رقبے پر پھیلے اور خاموش لیکن خوب صورت مکانات۔ یہاں بارش زیادہ شدید تھی۔ میں نے کار پورچ میں روکی اور دوڑتا ہوا برآمدے تک آیا۔ کال بیل کے جواب میں لیون نے دروازہ کھولا تو اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں سے لگ رہا تھا کہ وہ پیتا رہا ہے۔ میں اندر آیا اور اوور کوٹ اتارتے ہوئے پوچھا۔

"لیون! ایسی کیا مصیبت آگئی جو تم نے مجھے اس موسم میں بلوالیا؟ راستہ بھی ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا۔"

اس نے میری بات نظر انداز کی اور مجھے پکڑ کر لاؤنج میں لے آیا۔ "جرنی! میں بہت مشکل میں پھنس گیا ہوں۔"

"یہ بات تم فون پر کہہ چکے ہو۔" میں نے اپنے لیے گلاس میں برانڈی نکالتے ہوئے کہا۔ لیون کے پاس بہت اعلیٰ درجے کی برانڈی تھی، اس کے ایک گھونٹ نے ساری سردی دور کردی تھی۔ گھر میں رمیا مجھ پر کڑی نظر رکھتی تھی اور ایک حد سے زیادہ پینے نہیں دیتی تھی۔ میں آتش دان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیون مضطرب انداز میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی عمر چالیس کے آس پاس تھی لیکن اپنے متناسب جسم اور دلکش نقوش کی وجہ سے وہ پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ اس کے گھنے گھنگرالے بال گردن سے نیچے آرہے تھے۔ اس کا یہ مکان ایک ایکڑ رقبے پر تھا اور اس میں اوپر نیچے ایک درجن سے زیادہ کمرے تھے۔ لیون یہاں اکیلا رہتا تھا کیونکہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ گھر میں انڈور اور آؤٹ ڈور کھیلوں کی سہولت تھی۔ ایک بڑا سوئمنگ پول تھا۔ کبھی کبھی میں اور رمیا اس کے پاس ویک اینڈ گزارنے آتے تھے۔

"پلیز لیون! ٹہلنا بند کرو اور یہاں آکر بیٹھ کر بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟"

اس نے میرے مشورے پر عمل کیا اور بولا۔ "مسئلہ ایک لڑکی سے شروع ہوا تھا۔"

"لڑکی؟"

"ہاں، میری اس سے ملاقات ایک مہینا پہلے ایک مقامی بار میں ہوئی تھی۔"

"ٹھیک ہے، اس کے بعد؟"

"وہ میری فین نکلی۔ ہم نے کچھ ڈرنک کی۔"

"کتنی ڈرنک؟"

"شیمپین کے چند گلاس۔" اس نے ہچکچا کر بتایا۔ "لیکن میں ہوش میں تھا۔"

"اوکے، تم ہوش میں بھی تھے۔"

"پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے لفٹ دوں۔ وہ بھی اسی قصبے میں رہتی ہے۔"

اب میں سمجھ رہا تھا کہ کہانی کہاں پہنچی ہوگی۔ "تم نے اسے لفٹ دی لیکن اس کے گھر پہنچانے کے بجائے اپنے گھر لے آئے۔"

"بائی گاڈ، باتوں میں پتا ہی نہیں چلا۔" لیون نے گویا صفائی پیش کی۔ "جب یہاں پہنچے تو میں چونکا پھر اس نے کہا کہ وہ میرا گھر اندر سے دیکھنا چاہتی ہے۔ یہ اس کے لیے اعزاز کی بات ہوگی اور وہ اپنے فرینڈز کو فخر سے بتا سکے گی۔"

"تم اسے اندر لے آئے... میرا خیال ہے اسے... بیڈروم بھی دکھایا ہوگا؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ساری گڑبڑ یہاں سے شروع ہوئی۔ پیش قدمی اس نے کی تھی اور میں اسے نہیں روک سکا۔ صبح جب میں جاگا اور میرا نشہ اترا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے کیا کیا ہے۔ وہ کم عمر لڑکی تھی۔"

رفتہ رفتہ مسئلے کی سنگینی واضح ہو رہی تھی۔ "کم عمری سے کیا مراد ہے؟"

"وہ سترہ سال اور تین سو ترپن دن کی تھی۔"

"یعنی قانونی بلوغت سے صرف دو دن کم... لیکن ویسے وہ بالغ ہی ہوگی؟"

"کچھ زیادہ ہی۔" لیون نے جھرجھری لی۔ "صبح میں نے اسے بیدار کیا تو وہ یوں رونے دھونے لگی جیسے وہ کنواری ہو اور میں نے اس کا ریپ کیا ہو۔"

میں نے کہنے سے گریز کیا کہ اس نے جو کیا تھا، وہ ریپ کے زمرے میں آتا تھا اور اس پر خاصی سنگین دفعات لگ سکتی تھیں۔ پبلک اٹارنی مشہوری کے لیے ایسے کیسز کی تلاش میں رہتے ہیں جن میں کوئی عوامی شخصیت ملوث ہو۔ کیس ثابت ہونے پر اسے کم سے کم دو سال کی جیل ہو سکتی تھی اور اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ اس کا کیریئر تباہ ہو جاتا۔ مگر میں نے تبصرے کے بجائے حقائق جاننے پر توجہ مرکوز رکھی۔ لیون ان لوگوں میں سے ہے جو کسی واقعے کے بارے میں مشکل سے بات کرتے ہیں اور ان سے معلومات کھود کر نکالنی پڑتی ہے۔ میں نے سر ہلایا۔ "تمام لڑکیاں ایسا ہی کرتی ہیں۔ بہرحال، اس کے بعد کیا ہوا؟"

"میں نے گھبرا کر اسے ہزار ڈالرز دیے اور رخصت کردیا۔"

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ یہ تو شیر کے منہ کو خون لگانے

...بات ہوئی۔"

"ایسا ہی ہوا۔" اس نے سر ہلایا۔ "ایک ہفتے بعد اس ...کال آئی کہ وہ بہت مشکل میں ہے۔ جس بار میں ہم ملے ...وہاں ادائیگی کا کوئی مسئلہ ہوا تھا اور بار کا مالک پولیس ...کی دھمکی دے رہا تھا۔ اسے یاد تھا کہ وہ..."

"ایک منٹ... اس کا کوئی نام بھی ہوگا؟" میں نے ...بات کر پوچھا۔

"جیسی... پورا نام ہے جیسیکا مارک۔"

"اوکے، جیسی نے تمہیں کال کی تو تم نے کیا کیا؟"

"میں کیا کرتا، میں رقم لے کر وہاں پہنچ گیا۔ کوئی تین ...ڈالرز کا مسئلہ تھا۔"

"تم کس خوشی میں رقم لے کر دوڑے گئے؟"

"جیسی کا کہنا تھا کہ اگر پولیس نے اسے پکڑا تو وہ میرا ...بھی لے گی اور پھر وہ سب بھی سامنے آئے گا جو اس رات ...تھا۔"

"لیون! بات پرانی ہوگئی تھی۔ کوئی ثبوت باقی نہیں رہا ...تب تم نے انکار کیوں نہیں کیا؟"

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ "تم جانتے ...، میں جھوٹ نہیں بول سکتا، کم سے کم اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ہاں، یہ ہے کہ میں دھوکا کھا گیا تھا۔ میں اسے اوور ایج سمجھا تھا۔"

"کوئی عدالت اسے تسلیم نہیں کرے گی۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے اور بار کے مالک کو رقم کس لیے ادا کرنی ہے؟"

"نہیں اور نہ جیسی نے بتایا۔"

"لیون! وہ تمہیں لوٹ رہی تھی اور تم آسانی سے لٹنے لگے۔" میں نے ملامت کی۔ "تم ایک عام آدمی نہیں ہو، ایک صاحب حیثیت اور دولت مند مصنف ہو۔"

"اسی وجہ سے تو میں پھنسا۔" اس نے کراہ کر کہا۔ "بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔"

"اس نے تم سے مزید رقم اینٹھی؟"

"پندرہ ہزار ڈالرز۔" لیون نے اعتراف کیا۔ "اس نے کُل چھ بار مجھ سے رقم لی اور آخری تین بار اس نے بغیر کسی بہانے کے کھل کر مجھے بلیک میل کر کے رقم وصول کی۔ آخری بار میں نے اس سے کہا کہ اب میں اسے ایک ڈالر نہیں دوں گا، اس کی جو مرضی ہو، وہ کرلے۔"

"اس نے کیا کیا؟"

"اس نے ایک لڑکے کو بھیج دیا۔" لیون نے رونے

دسمبر 2013ء ...... جاتے ہوئے
سال کے سرد موسم کی سوغات
خوب صورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مزید
خطوط کی محفل،
محفل شعر و سخن ...... اور
ملک صفدر کی تھانیداری

دھوپ چھاؤں
خزاؤں میں جب اچانک بن موسم پھول کھل جائے ...اور کڑکتی دھوپ میں برسات ہو جائے تو اسے مقدر کی مہربانی کہتے ہیں ...... آخری صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم کی پھوار

لذت آشنائی
مہاراجا رنجیت سنگھ ...... جس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی مگر اس نے جب عشق کیا تو ہر ایک وار کو دل پہ سہہ لیا ...... تاریخ کا ایک انوکھا کردار الیاس سیتاپوری کے قلم کی روانی

کشکول
قدم قدم پر خطرات سے کھیلتے ہوئے منزل مقصود کی جانب رواں دواں ......
انوار صدیقی کے قلم سے ایک پراسرار سلسلے کا احوال

تحفہ
عہد حاضر کی ستم ظریفیاں ...... رشتوں کے ایسے بندھن جو رفتہ رفتہ بیڑیوں کی زنجیر بن کر مقید ہو جانے کا احساس دلاتے ہیں ...... محبوب قلم کار طاہر جاوید مغل کا دلچسپ انداز

ماروی
دلربا انداز، رنگین و سنگین لمحات اور حالات کی کشمکش کی روداد ......
محی الدین نواب کے قلم سے نئی طویل داستان کا آغاز

اس کے علاوہ
منظر امام، تنویر ریاض، امجد رئیس، سلیم انور کی تحاریر

WWW.PAKSOCIETY.COM

والے انداز میں کہا۔ ''ایک رات میں اپنے کام میں مصروف تھا کہ کال بیل بجی، میں نے جھانک کر دیکھا تو ایک چھ فٹ کا اور کوئی ڈھائی سو پونڈ وزنی لڑکا کھڑا تھا۔ وہ رگبی کا کھلاڑی لگ رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولے بغیر پوچھا کہ کیا بات ہے، وہ کون ہے۔ اس نے جواب دیا اُس کا نام کلائڈ جوزف ہے اور وہ جیسی کا بوائے فرینڈ ہے۔''

''تم نے اس سے پوچھا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا؟''

''ہاں، اس نے کہا کہ وہ جیسی کے بارے میں بات کرنے آیا ہے۔ وہ اتنے شریفانہ انداز میں بات کر رہا تھا کہ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ اسے اندر بلا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''تم نے اسے اندر بلا لیا؟''

''ہاں اور اندر آتے ہی اس کا رویّہ بالکل بدل گیا۔ اس نے پہلے راہداری میں لگی ایک قیمتی تصویر جان بوجھ کر شانے کی رگڑ سے گرائی اور اس کا فریم ٹوٹ گیا۔ تصویر پر بھی خراشیں آئی تھیں۔ پھر اس نے ماربل کا ایک شوپیس گرایا۔ سچی بات ہے کہ میں خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے جیب سے ایک چاقو بھی نکال لیا تھا جو بٹن دبانے سے کھلتا تھا۔ تمہیں پتا ہے میں نے گھر میں سیکیورٹی سسٹم لگوایا ہوا ہے جو میری آواز سے کام کرتا ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر وہ مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کرے گا تو میں سیکیورٹی سسٹم آن کر دوں گا۔ گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں خود بہ خود بند ہو جائیں گے اور اس کے بعد سیکیورٹی کمپنی والے آ کر ہی انہیں کھول سکتے تھے۔''

''اس نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا؟''

''نہیں، کچھ بدمعاشی دکھانے کے بعد وہ مطلب کی بات پر آ گیا۔ اس نے کہا کہ میں نے جیسی کو کچھ رقم کی ادائیگی کا وعدہ کیا تھا اور اب میں اس وعدے سے مکر گیا ہوں اس لیے وہ رقم لینے آیا ہے۔ بہتر ہے میں اسے ادائیگی کر دوں، دوسری صورت میں اسے غصہ آ جاتا تو وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس نے ایک واقعہ سنایا کہ ایسے ہی ایک موقع پر اس نے ایک آدمی کو گھونسوں سے اتنا مارا تھا کہ اس کی شکل تمام عمر کے لیے بگڑ گئی تھی۔ بے شک اسے بھی چار مہینے کی جیل ہوئی تھی مگر مذکورہ شخص کو اب ساری عمر اسی بگڑے چہرے کے ساتھ گزارنی تھی۔''

میں سوچ سکتا تھا کہ لیون کی اس دھمکی کے بعد کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اسے اپنا چہرہ بہت عزیز تھا حالانکہ وہ مصنف تھا۔ لوگ اس کا منہ نہیں، اس کی تحریریں دیکھتے تھے۔ اس کے باوجود اسے اپنا چہرہ بہت عزیز تھا۔ ''پھر تم نے کیا کیا؟''

لیون نے سرد آہ بھری۔ ''میں نے اسے دو ہزار ڈالرز دے دیے۔''

''گویا تم نے سترہ ہزار ڈالرز سے ہاتھ دھو لیے۔'' میں نے ملامت کی۔ ''لیون! میں تمہیں اتنا بزدل نہیں سمجھتا تھا۔ تم ایک اسمارٹ کرائم رائٹر ہو۔ تم اپنی کہانیوں میں ہیرو کو ذہین اور صلاحیتوں سے مالا مال دکھاتے ہو لیکن عملی زندگی میں تم ایک چھوٹے سے مسئلے کے ہاتھوں زیر ہو گئے۔''

لیون نے اپنے اور میرے لیے برانڈی نکالی۔ ''یہی سوچ کر مجھے غصہ آنے لگا کہ میں لفظوں کی دنیا میں بادشاہ ہوں اور حقیقی دنیا میں غلاموں سے بدتر ثابت ہو رہا ہوں۔''

میں نے گلاس سے گھونٹ بھرا۔ یہ خاصی تیز برانڈی تھی اور ایک ہی پیگ میں میرا سر کسی قدر گھوم گیا تھا۔ ''تم نے اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے کچھ سوچا؟''

''ہاں، سب سے پہلے تو میں نے فیصلہ کیا کہ اب مجھے کوئی رقم نہیں دینی۔ اس کے بعد میں نے دوسرا فیصلہ یہ کیا کہ جیسی یا کلائڈ سے نہیں ملنا۔''

''دوسرے فیصلے پر عمل کیسے کیا جبکہ پہلی مرتبہ کے سوا ہمیشہ جیسی یا کلائڈ ہی تم سے ملتے تھے۔''

''اپنے گھر پر میں انکار کر سکتا تھا اور باہر کے لیے میں نے یہ کیا کہ اس بار... بلکہ اس سڑک پر جانا بھی ترک کر دیا جہاں یہ بار تھا۔''

''اس سے فائدہ ہوا؟''

''ہاں، کچھ دن سکون رہا۔ پھر ایک رات میں ڈنر کے ارادے سے باہر نکلا تو سڑک پر آتے ہی ایک ڈوج پک اپ میرے پیچھے لگ گئی۔ اس وقت میں نے دھیان نہیں دیا لیکن ہائی وے پر آتے ہی وہ رفتار بڑھا کر تیزی سے پاس آئی اور اس نے میری کار کے پچھلے حصے کو ٹکر ماری۔ میں تیار نہیں تھا لیکن خوش قسمتی سے کوئی حادثہ نہیں ہوا اور میں کار کی رفتار بڑھا کر آگے نکل گیا۔ پک اپ رفتار میں میری فراری کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ آگے نکل کر میں نے پولیس کو کال کر کے اطلاع دی۔ آگے ایک پولیس پیٹرول کار موجود تھی۔ اس کے ساتھ میں شیرف آفس آیا اور میں نے اس واقعے کی رپورٹ کرائی۔''

میں تشویش زدہ ہو گیا۔ ''تم نے جیسی اور کلائڈ کا ذکر تو نہیں کیا تھا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں احمق نہیں ہوں، اس

[illegible] پھنس جاتا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ان کا ہی کام تھا۔ [illegible] مجھے خوف زدہ کر رہے تھے۔''

''کیا انہوں نے تم سے کوئی بڑا مطالبہ کیا تھا؟''

''نہیں، مطالبہ انہوں نے اس واقعے کے بعد کیا اور [illegible] طور پر پہلے سے اس کے لیے تیار تھا۔ اس دوران [illegible] نے کچھ انویسٹی گیشن بھی کی تھی۔ میں نے بھیس بدل [illegible] کی کار میں جیسی اور کلائڈ کا تعاقب کیا اور پورے [illegible] ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا رہا۔ اس سے کچھ [illegible] ہوئے۔ اوّل تو جیسی اور کلائڈ دونوں جرائم پیشہ ہیں [illegible] سے ان کی گزر اوقات ہوتی تھی۔ دوسرے جیسی کلائڈ [illegible] رہتی ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے جھونپڑے نما گھر [illegible]۔''

''اسی قصبے میں؟''

''ہاں لیکن آبادی سے باہر... یہاں آبادی میں ایسی [illegible] کی گنجائش نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم نے ان سے نمٹنے کا کیا طریقہ سوچا؟ [illegible] پولیس شامل تھی؟''

''بالکل نہیں... میں پولیس سے بچنے کی کوشش کر رہا [illegible] پولیس تک معاملہ جاتا تو لازمی میڈیا تک جاتا۔ [illegible] معلوم ہے پولیس میں انفارمر ہوتے ہیں جو ایسی [illegible] فروخت کرتے ہیں۔ میں اپنی منفی پبلسٹی کا متحمل [illegible] ہو سکتا۔ تم جانتے ہو میرا پہلا ناول چند مہینے میں مارکیٹ [illegible] والا ہے اور اس کی تشہیر شروع ہو چکی ہے۔ اس [illegible] میرا کوئی منفی اسکینڈل سامنے آیا تو ناول مارکیٹ میں [illegible] سے پہلے فلاپ ہو جائے گا۔''

''اس کا امکان ہے۔ بہرحال پھر تم نے کیا سوچا؟''

''میں انتظار کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے [illegible] کریں گے اور ڈرا دھمکا کر مجھ سے بڑی رقم اینٹھنے کی [illegible] کریں گے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس [illegible] سے اگلے دن مجھے کسی فون بوتھ سے کال آئی۔ وہ [illegible] لیکن آواز بدل کر بول رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میں [illegible] شناخت کر لیا ہوگا۔ میں نے کہا ہاں میں پہچان گیا [illegible] کلائڈ ہو۔ وہ چالاکی سے بولا کہ تم مجھے جو چاہے [illegible] دو۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس نے [illegible] پرسوں والے واقعے سے تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا [illegible] کس حد تک جا سکتے ہیں اس لیے شرافت سے ہمارا [illegible] پورا کر دو۔''

''ان کا مطالبہ کیا تھا؟''

''دو لاکھ ڈالرز۔'' لیون نے بتایا تو میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''بصورتِ دیگر کیا دھمکی دی؟''

''اس کا کہنا تھا کہ اگلی بار میری کار سے کوئی چوری کا ٹرک بھی ٹکرا سکتا تھا جو اسے کچل کر رکھ دیتا۔ اسی طرح چند نقاب پوش میرے خوب صورت گھر کو چاروں طرف سے پیٹرول چھڑک کر آگ لگا سکتے تھے۔ جب تک فائر بریگیڈ کا عملہ آتا، یہ گھر جل کر راکھ ہو جاتا۔ میرے پول کے پانی میں ایسا کیمیکل ملایا جا سکتا تھا جو جلد سے جسم میں سرایت کر کے مجھے کسی موذی جلدی بیماری میں مبتلا کر سکتا تھا۔''

یہ ساری دھمکیاں دہشت ناک تھیں اور ان پر عمل کرنا بہت آسان تھا۔ سچی بات ہے کہ میں سن کر ڈر گیا تھا تو لیون کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اس نے بڑی کوشش کے بعد یہ مقام حاصل کیا تھا اور ابھی اسے دولت مند زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی اسے کامیابیوں اور کامرانیوں کے مزید سفر کرنے تھے۔ وہ ناول لکھتا اور پھر اس کے ناولوں پر فلمیں بنتیں۔ وہ ٹی وی کے لیے لکھتا۔ ابھی وہ امریکا میں مقبول تھا، آنے والے وقت میں ساری دنیا میں مقبول ہو سکتا تھا۔ وہ کامیابیوں کے آسمان کی طرف پرواز کرنے والا تھا اور ایسے وقت میں جیسی اور کلائڈ جیسے لوگوں کی مداخلت کسی طور مناسب نہیں تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ''یہ سب بہت خوفناک تھا۔ تم نے کیا کہا اس سے؟''

اس نے اعتراف کیا۔ ''میں ڈر گیا تھا اور میں ذہنی طور پر ان کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ تم جانتے ہو اب میں ملینیر ہوں اور دو لاکھ ڈالرز آسانی سے ادا کر سکتا ہوں۔''

''ہاں... لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں۔ یہ تو جونک کو جسم سے لگانے والی بات ہے۔ جب تک تمہارے جسم میں خون رہے گا وہ چپکی رہے گی۔''

''بعد میں مجھے بھی یہی خیال آیا۔ تب میں نے خاصی عرق ریزی کے بعد ایک پلان تیار کیا۔ میں نے پہلی کال پر اس سے سوچنے کی مہلت مانگی۔ اگلے دن جب کلائڈ نے مجھے کال کی تو میں سوچ چکا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں ادائیگی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ خوش ہو گیا تو میں نے کہا کہ میں اپنا اطمینان چاہتا ہوں کہ آئندہ تم دونوں مجھے بلیک میل نہیں کرو گے۔ کلائڈ نے قسمیں کھائیں کہ اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''وہ تمہیں قابلِ رحم حد تک احمق سمجھ رہا ہوگا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بالکل۔" لیون نے سرد آہ بھری۔ "سچی بات ہے کہ میں خود بھی ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کلائڈ سے کہا کہ انہیں رقم لینے کے لیے میرے گھر آنا ہوگا اور انہیں ایک تحریر دینا ہوگی کہ آئندہ وہ مجھے بلیک میل نہیں کریں گے۔"

"وہ راضی ہوگیا؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں، دو لاکھ ڈالرز کے تصور سے ان کے ہوش گم ہو گئے تھے۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ میں نے کہا نا وہ بہت معمولی درجے کے چور اُچکے ہیں۔ جیسی اسی طرح کسی آدمی کو پھانس لیتی اور جب اس کے ساتھ رات گزار لیتی تو کلائڈ اس کا غیرت مند بوائے فرینڈ بن کر پہنچ جاتا اور پھر وہ ڈرا دھمکا کر اس کی جیب خالی کرا لیتے۔ وہ پولیس کے پاس بھی نہیں جا سکتا ہوگا۔"

"جیسے تم نہیں جا سکتے؟" میں نے بے ساختہ کہا تو لیون کھسیا گیا۔

"اس میں میرا اتنا قصور نہیں ہے۔ تم نے جیسی کو دیکھا نہیں ہے۔ وہ ایسی لڑکی ہے جو کسی بھی آدمی کو اپنے بس میں کر سکتی ہے۔"

"میں بھی تمہیں ایسا نہیں سمجھتا۔" میں نے خلوص سے کہا اور یہ حقیقت تھی۔ لیون عورتوں کے معاملے میں دل پھینک نہیں تھا ورنہ اس کی لاکھوں خواتین فین۔۔۔۔ اس کے ایک اشارے پر کھنچی چلی آتیں اور اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کر دیتیں۔ اس سے شادی کی خواہش رکھنے والیوں کی بھی کمی نہیں تھی مگر وہ اس معاملے میں بہت محتاط اور باوقار رویہ رکھتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے بے احتیاطی کی تھی اور اب اس کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ "تم نے کلائڈ کو بلایا تھا یا جیسی کو بھی بلایا تھا؟"

"دونوں کو۔۔۔ میں نے کہا کہ وہ دونوں مجھے لکھ کر دیں گے تب ہی میں انہیں دو لاکھ ڈالرز دوں گا۔ دو لاکھ ڈالرز کے لیے وہ قتل کا اقرار نامہ بھی لکھ سکتے تھے۔"

"تم پولیس کو بھی بلا سکتے تھے یا کسی طریقے سے ان کے خلاف ثبوت حاصل کر سکتے تھے۔"

"نہیں، ایک بات وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ میں کسی صورت معاملے کی پبلسٹی پسند نہیں کروں گا۔ اس لیے میں نہ تو پولیس کو بلاؤں گا اور نہ ہی کسی اور طریقے سے ان کے خلاف ثبوت حاصل کروں گا کیونکہ وہ بھی میرے خلاف جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے، تم نے ان کو بلا لیا اور وہ مان گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟"

"میں نے ان کو شام کے وقت بلایا تھا۔ میں نے شرط رکھی تھی کہ وہ مسلح ہو کر نہیں آئیں گے۔"

"تم نے کیسے جانا کہ وہ مسلح نہیں ہوں گے۔ گن سے کم چاقو چھپانا تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"

لیون مسکرایا۔ "میں نے طریقہ سوچ لیا تھا۔ جب وہ میرے گھر کے دروازے پر پہنچے تو میں نے ان سے کہا کہ وہ کپڑے اتار کر بالکل عریاں ہو جائیں اسی صورت میں میں دروازہ کھولوں گا۔ مجبوراً انہیں میری بات ماننی پڑی۔ انہوں نے اپنے کپڑے بھی جھاڑ کر دکھائے کہ ان میں کچھ نہیں۔ اس کے بعد میں نے انہیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔ میں انہیں یہیں لایا۔ میز پر دو لاکھ ڈالرز، ایک لکھا ہوا معاہدہ اور برانڈی کی بوتل رکھی۔ میں نے ان کے لیے گلاسوں میں برانڈی نکالی اور ان سے کہا کہ وہ اس معاہدے کو دیکھ کر اس پر دستخط کر دیں اور یہ دو لاکھ ڈالرز لے جائیں۔ کلائڈ نے ایک ہی سانس میں اپنا گلاس خالی کر دیا۔ البتہ جیسی گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔ بہر حال معاہدہ پڑھتے پڑھتے اس نے بھی گلاس خالی کر دیا اور ایک منٹ بعد دونوں لڑھک گئے تھے۔"

میں گھونٹ لینے جا رہا تھا کہ لیون کی بات سن کر مجھے پھندا لگ گیا اور میں کھانسنے لگا۔ بڑی مشکل سے کھانسی تھمی میں آئی تو میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "لڑھک گئے۔۔۔ میرے خدا! لیون یہ تم نے کیا کیا؟"

"تو اور کیا کرتا۔" اس نے تنک کر کہا۔ "ان لوگوں نے میرے لیے کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا تھا۔"

یہ سوچ کر میرا دل حلق میں آرہا تھا کہ لیون نے وہی کیا تھا جو وہ اپنی کہانیوں میں دکھاتا تھا۔ میں نے بہ مشکل پوچھا۔ "تم نے ان کا کیا کیا؟"

"کچھ نہیں، وہ تہ خانے میں ہیں۔"

اگر میں پھر گھونٹ لے رہا ہوتا تو مجھے لازماً دوبارہ پھندا لگتا۔ بے شک مجھے کال کرتے وقت لیون کچھ حواس باختہ تھا لیکن تہ خانے میں لاشوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ بالکل پُرسکون تھا۔ میں نے گلاس رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اپنے گلے میں کچھ پھنستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ "میرے خدا! وہ تہ خانے میں ہیں۔ تم نے اب تک انہیں یہاں رکھا ہوا ہے انہیں ٹھکانے نہیں لگایا۔"

"اسی لیے تو تمہیں بلایا ہے۔" اس نے کہا۔ "اور یہ چند گھنٹے پہلے کی تو بات ہے۔"

اس بار مجھے پھندا نہیں لگا۔ میں نے خود کو سنبھال لیا تھا مگر میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ میں نے لیون کی طرف دیکھا۔ "پہلے مجھے دکھاؤ۔"

"آؤ میرے ساتھ۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ لیون کا عالی شان مکان اندر سے سینٹرلی ہیٹڈ تھا اور یہاں بغیر کپڑوں کے بھی آدمی آرام سے رہ سکتا تھا۔ شاید اسی لیے مجھے اس کے ساتھ تہ خانے میں جاتے ہوئے ہلکا سا پسینا آرہا تھا۔ تہ خانے میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی دو کرسیوں پر پشت سے پشت ملائے اور مضبوط ٹیپ سے بندھے بیٹھے تھے۔ ان کے منہ پر بھی ٹیپ لگا ہوا تھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ سانس لے رہے تھے۔ گویا میرا اندازہ غلط تھا۔ لیون نے انہیں قتل نہیں کیا تھا۔

"یہ زندہ ہیں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"سو فیصد، تم کیا سمجھ رہے ہو؟ میں نے ان کو بے ہوشی کی دوا دی تھی۔ دوا پہلے سے ان کے گلاسوں میں موجود تھی اور برانڈی ڈالتے ہی وہ اس میں حل ہو گئی۔ ویسے بھی یہ شفاف مائع شکل میں ہوتی ہے۔ انہیں پتا بھی نہیں چلا۔ ابھی یہ مزید دو گھنٹے سوتے رہیں گے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "میں سمجھا کہ تم نے انہیں زہر دے دیا ہے۔"

"میں جرائم کی کہانیاں لکھتا ہوں، خود مجرم نہیں ہوں۔" لیون نے خفگی سے کہا۔

"اوکے، اب یہ بتاؤ کہ ان کا کیا کرنا ہے؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔" لیون نے اعتراف کیا۔ "یہاں آکر میرا دماغ جواب دے گیا اور مجھے تم سے مدد مانگنے کے سوا اور کوئی راستہ سمجھ نہیں آیا۔ تم نے ہر بار مجھے بہترین مشورہ دیا ہے۔"

"تمہیں مشورہ دیتے ہوئے میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم کبھی ایسے معاملے میں مجھ سے مشورہ لو گے۔" میں نے کہتے ہوئے ان دونوں کا معائنہ کیا۔ لڑکی بلاشبہ حسین تھی مگر شبہ تھا کہ وہ انڈر ایج ہے۔ وہ بیس بائیس کی لگ رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں لڑکا نہ صرف زیادہ عمر کا تھا بلکہ صورت سے ہی منحوس شکل لگ رہا تھا مگر اس کی طاقت میں شبہ نہیں تھا۔ وہ بہت وزنی اور ٹھوس مسلز رکھنے والا نوجوان تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ لیون نے اسے جتنا باندھا تھا، شاید یہ اسے باندھے رکھنے کے لیے کافی نہ ہو اور وہ آزاد ہو سکتا ہے۔ میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا اور پھر ہم دونوں نے مل کر انہیں مزید ٹیپ سے باندھ دیا۔ آخر میں میں نے ان کی آنکھوں پر بھی ٹیپ لگا دیا۔ لیون نے اعتراض کیا۔ "یہ کیوں۔۔۔ یہ سب تو دیکھ چکے ہیں۔"

"سوائے میرے۔۔۔ اور میں نہیں چاہتا کہ یہ مجھے دیکھیں اور کل کو مجھے کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑے۔"

مزید احتیاط کے طور پر ان دونوں کے پاؤں بھی کرسی کے پایوں کے ساتھ ٹیپ کر دیے تھے۔ پھر ہم اوپر آئے اور آتش دان کے سامنے جگہ سنبھالی۔ اچانک مجھے رمیا کا خیال آیا۔ میں نے آنے کے بعد اسے اطلاع نہیں دی تھی اور وہ مجھے کال کر رہی ہوگی لیکن میرا موبائل اوورکوٹ کی جیب میں تھا۔ میں جلدی سے اوورکوٹ تک آیا۔ اتفاق سے رمیا کال کر رہی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی اور اس سے پہلے معذرت کرتا وہ مجھ پر برس پڑی میں کیا کرتا، غلطی میری تھی اس لیے خاموشی سے سنتا رہا۔ مجھے اچھی طرح سنا کر اس نے میری سوری سنے بغیر فون بند کر دیا۔ لیون کو غالباً اندازہ تھا اس لیے جب میں واپس آیا تو اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اسی لیے میں شادی کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔"

"کاش کہ میں بھی ڈرتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب خاصی تاخیر ہو گئی ہے۔"

لیون نے کچھ دیر بعد کہا۔ "ان کا کیا کرنا ہے؟"

"فی الحال تو مجھے بھی سمجھ نہیں آرہا ہے۔" میں نے کہا۔ "قتل اس مسئلے کا ایک ممکنہ حل۔۔۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔" لیون نے جلدی سے کہا۔ "اس بارے میں سوچنا بھی مت۔۔۔ میں قتل کا قائل نہیں ہوں۔"

"لیکن دوسری پارٹی کے بارے میں تم ایسا نہیں کہہ سکتے، اگر تم نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ لڑکا مجھے بہت خطرناک لگ رہا ہے۔۔۔ ممکن ہے یہ کر گزرے۔"

"مجھے بھی اسی کا ڈر ہے اور اصل مسئلہ یہی ہے کہ میں انہیں چھوڑوں بھی تو کیسے چھوڑوں کہ پھر یہ میرے لیے خطرہ نہ بن سکیں۔ جب سوچ سوچ کر میرا دماغ جواب دینے لگا تو میں نے تمہیں کال کر دی۔"

"تم نے اچھا کیا اگر تم عجلت میں کوئی قدم اٹھا لیتے تو خود بھی مشکل میں پھنستے اور ظاہر ہے میں بھی مشکل میں پڑ جاتا کیونکہ رسالے کی مقبولیت میں سب سے بڑا کردار تمہارا ہی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے میں نے تمہیں کال کر کے ٹھیک کیا؟" وہ خوش ہو گیا اور گلاسوں میں دوبارہ برانڈی انڈیلی۔ میں گھونٹ لیتے ہوئے یہ سوچنے لگا کہ ان دونوں بدبختوں کا کیا کیا جائے۔ ویسے وہ اس قابل تھے کہ انہیں لے جا کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

سمندر میں شارکوں کے سامنے ڈال دیا جاتا لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ہم دونوں قانون پسند شہری تھے۔ برانڈی کی بوتل رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی تھی مگر کوئی ترکیب ذہن میں نہیں آرہی تھی۔ تنگ آکر میں نے لیون سے اس کی کہانیوں پر بات کرنی شروع کر دی۔ لیون اب تک کوئی دو سو چھوٹی اور درمیانی کہانیاں لکھ چکا تھا۔ ان میں سے ستر فیصد میرے رسالے میں شائع ہوئی تھیں۔ اس کی کہانیوں کے چھ مجموعے مارکیٹ میں آکر قارئین سے پذیرائی حاصل کر چکے تھے۔ اب وہ ناول نگار بننے والا تھا۔ پہلے مجھے خدشہ ہوا تھا کہ اس نے ناول لکھنا شروع کر دیے اور مقبول بھی ہو گیا تو چھوٹی کہانیوں کی طرف اس کی توجہ کم ہو جائے گی کیونکہ چھوٹی کہانیوں میں آئیڈیاز پر محنت کرنا پڑتی تھی اور معاوضہ اتنا نہیں ملتا تھا جبکہ ایک بیسٹ سیلر ناول مصنف کو ساری عمر کے لیے ضرورتِ معاش سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ امریکا میں ایسے ناول نگار تھے جو تین چار سال بعد ایک ناول دیتے تھے اور وہ کروڑپتی تھے۔

مگر لیون نے مجھے یقین دلایا کہ وہ چھوٹی کہانیاں لکھتا رہے گا۔ کم سے کم میرے رسالے کے لیے لکھتا رہے گا۔ ناول نگاری کے لیے وقت نکالنے کی خاطر اس نے دوسرے رسالوں میں لکھنا بند کر دیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرا شوق چھوٹی کہانیاں ہیں اور ان سے میں قارئین کے حلقے سے مسلسل رابطے میں رہتا ہوں۔ اس لیے چھوٹی کہانیاں لکھنا جاری رکھوں گا۔“

لیون سے بات کرتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا۔ ”تم نے ایسی کئی کہانیاں لکھی ہیں جو بلیک میلنگ کے حوالے سے ہیں۔“

”درست ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔

”ان میں سے کسی کہانی میں تم نے یہ سچویشن بیان کی ہے جو اس وقت درپیش ہے؟“

”مجھے نہیں یاد۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن میں نے اپنی کہانیاں کیٹیگری کے حساب سے رکھی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ بلیک میلرز کی کہانیاں الگ سے تھیں۔۔۔ ایک منٹ میں آتا ہوں۔“

وہ دس منٹ بعد ایک فولڈر لے آیا، اس میں کہانیوں کے پرنٹ موجود تھے۔ یہ کوئی درجن کہانیاں تھیں جنہیں آپس میں جوڑ کر پھر اس فولڈر میں لگا دیا گیا تھا۔ اس نے فولڈر کا کلپ ہٹا کر کہانیاں الگ الگ کیں اور ان کے انٹرو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کچھ مجھے پکڑا دیں۔ ”تم بھی دیکھو، شاید کوئی کام کی کہانی مل جائے۔“

میں اسٹیپل کیے ہوئے مسودے دیکھنے لگا۔ یہ ساری کہانیاں شائع ہو چکی تھیں۔ ان پر شائع شدہ لکھا ہوا تھا لیکن میں نے ایک کہانی اٹھائی تو اس پر غیر مطبوعہ لکھا تھا۔ میں چونک گیا۔ کہانی نو سال پہلے کی لکھی ہوئی تھی جب لیون مقبول ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔ ”بلیک میلر سے نجات۔“ میں نے لیون کو متوجہ کیا۔ ”تمہاری یہ کہانی شائع نہیں ہوئی؟“

اس نے کہانی کو دیکھا۔ ”ہاں، میں نے ایک رسالے کو بھیجی تھی لیکن اس کے مدیر کو پسند نہیں آئی۔ اس کا کہنا تھا اس کا انجام مزے کا نہیں ہے۔“

میں کہانی لے کر آتش دان کے پاس بیٹھ گیا اور برانڈی کی بچ جانے والی بوتل بھی پاس رکھ لی۔ اس کے بعد میں آنے والے ایک گھنٹے تک کہانی میں گم رہا۔ کہانی بہت اعلیٰ درجے کی تھی۔ لیون کی مخصوص منظر نگاری اور جملے بازی اس میں عروج پر نظر آئی۔ یہ خالص لیون اسٹائل کی بہت اچھی کہانی تھی اور جب میں نے اس کا اینڈ پڑھا تو اچھل پڑا۔ اینڈ بہت شاندار تھا اور کہانی کا اس سے اچھا انجام نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کہانی کو رکھ کر لیون سے پوچھا۔ ”کس۔۔۔ رسالے نے اسے مسترد کیا تھا اس کا۔۔۔ مدیر کون تھا۔“ میں نے خالی جگہوں پر نامناسب الفاظ کہے تھے اس لیے انہیں ایڈٹ کر دیا۔

لیون مسکرایا۔ ”تمہارا رسالہ تھا اور تم نے مسترد کیا تھا۔ یہ تمہارے رسالے کے لیے میری پہلی کہانی تھی۔“

میں بوکھلا گیا۔ ”میں نے؟ ناممکن۔۔۔“

”تم نے ہی کیا تھا۔ میرے پاس اس کا مسودہ بھی محفوظ ہے جس پر تمہارے ریمارکس ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اس وقت میں نیا تھا لہٰذا تم نے اس کہانی کو اسی نظر سے دیکھا اور اب میں کامیاب ہو گیا ہوں تو تم اسے دوسری نظر سے دیکھ رہے ہو۔“

”تم نے اسے دوبارہ شائع کرانے کی کوشش نہیں کی؟“

”کیونکہ میں مدیر کا احترام کرنے کا قائل ہوں۔ تم نے اسے مسترد کر دیا تھا اس لیے یہ مسترد رہی۔“

”میں اسے قبول کرتا ہوں اور اپنی معذرت کے ساتھ شائع کروں گا اور میں تم سے اور خود سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کسی نئے مصنف کی کہانی کو یہ سوچ کر نہیں دیکھوں گا کہ وہ نیا ہے اور پہلے کہیں شائع نہیں ہوا۔“

لیون ہنسا۔ ”جرنی! میں ایسے ہی تمہارا احترام نہیں کرتا ہوں۔ بہرحال، تمہیں ایک کہانی مل گئی۔۔۔ میرے مسئلے کا حل پھر بھی نہیں نکلا۔“

”تمہارے مسئلے کا حل بھی اس میں موجود ہے۔“ میں نے مسودہ لہرا کر کہا۔ ”تم اس کا آخری حصہ پڑھ لو پھر میں اس پر بات کروں گا۔“

کہانی ایک عام شریف آدمی کی تھی جو بدقسمتی سے ایک بلیک میلر کے چنگل میں پھنس جاتا ہے کیونکہ اس سے ایک غلطی ہو جاتی ہے۔ پھر وہ بلیک میلر سے چھٹکارے کے لیے ایک پلان بناتا ہے اور اس پلان کو پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ہم بھی اسی ترکیب سے ان دونوں سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ اب لیون نے مسودہ اور برانڈی کی بوتل سنبھال لی۔ وہ لکھنے میں جتنا تیز تھا، پڑھنے میں اتنا ہی سست ثابت ہوا۔ میں اونگھنے لگا اور پھر میری آنکھ لگ گئی۔ جب لیون نے ہلایا تو میں اٹھا۔ ”کک۔۔۔ کیا ہوا؟“

”میں نے پوری کہانی پڑھ لی ہے لیکن مسئلے کا حل اس میں کہاں ہے؟“

”حل انجام میں ہے۔“ میں نے جماہی لے کر کہا۔ ”جیسے اس میں آدمی بلیک میلر سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے، اسی طرح ہم بھی حاصل کر سکتے ہیں۔“

”وہ کیسے۔۔۔ میں نفسیاتی قاتل نہیں ہوں۔“ اس نے اعتراض کیا۔

”تم فکر مت کرو، اگر ہم نے اس آئیڈیے پر عمل کیا تو امید ہے اس کے بعد تمہیں ہمیشہ کے لیے ان دونوں سے نجات مل جائے گی۔“

”کرنا کیا ہے؟“

”یہ سوچنا ہے۔“ میں نے مایوسی سے برانڈی کی خالی بوتل کی طرف دیکھا۔ ”لیکن تم فکر مت کرو، تم جانتے ہو میں مصنف نہیں ہوں لیکن آئیڈیاز بہت اچھے دے سکتا ہوں۔ جلد کوئی نہ کوئی آئیڈیا آجائے گا اور تم اسے ریفائن کرو گے۔“

لیون نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔“

”ان لوگوں کا کیا کرنا ہے، کہیں وہ خود کو آزاد نہ کرا لیں۔“

”وہ آزاد نہیں ہو سکتے اور اگر ہو بھی گئے تو تہ خانے سے نہیں نکل سکتے۔“

لیون کے مطمئن ہونے پر میں نے سونے کے لیے گیسٹ روم کا رخ کیا۔ بستر پر لیٹتے ہی میں سو گیا۔ پھر لیون نے صبح سات بجے مجھے اٹھا دیا۔ موسم بدستور طوفانی تھا بلکہ اب بارش کے ساتھ تیز ہوائیں بھی چلنے لگی تھیں۔ پانی کی لہراتی چادر آسمان سے برس رہی تھی۔ لیون نے ناشتا تیار ہونے کی خوشخبری سنائی اور میں نے رمیا کو کال کر کے لیٹ آنے کی اطلاع دی۔ اس نے پوچھا کہ لیون کے ساتھ کیا مسئلہ ہوا ہے تو میں نے اسے ٹال دیا کہ ایک کہانی کا مسئلہ تھا اور وہ میرا مشورہ چاہ رہا تھا۔ میں نہا کر کچن میں آیا تو لیون ناشتا تیار کر کے لگا چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے صبح جا کر دیکھا تھا، دونوں ٹھیک ٹھاک اور مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ جیسی کا خوف سے برا حال تھا۔ وہ رو رہی تھی جبکہ کلائڈ خاموش تھا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ اندر سے وہ بھی ڈرا ہوا ہے۔ ناشتے کے بعد میں نے نیچے جا کر ان کو دیکھا۔ جیسی اب خاموش تھی مگر اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی اور وہ بار بار ناک سڑک رہی تھی۔ ہم نے خاموشی سے دونوں کا معائنہ کیا اور انہیں ہماری آمد کی خبر نہیں ہوئی۔ اوپر آکر میں نے لیون سے کہا۔

”ایک آئیڈیا آرہا ہے لیکن کام پرفیکٹ ہونا چاہیے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا کوئی پکنک کیبن ہے؟“

”میرا تو نہیں، میرے ایک دوست کا ہے۔ اس کی چابی میرے پاس ہوتی ہے۔ جب میرا دل چاہتا ہے میں وہاں چلا جاتا ہوں۔“

”کہاں ہے اور یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”بلیک ریور پارک میں۔۔۔ یہاں سے کوئی چالیس میل کی ڈرائیو ہے۔ کبھی کبھی میرا موڈ ہوتا ہے تو میں وہاں چلا جاتا ہوں۔ بہت خوب صورت اور پُرسکون جگہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں اور کیبن کے پاس ہی ایک جھیل بھی ہے۔“

”بس تو کام بن گیا۔“ میں نے کہا۔ ”اچھا، ایک بلیک وین چاہیے ہوگی جس کا پچھلا خانہ خالی ہو اور کچھ کپڑے اور سامان درکار ہوگا۔“

لیون سوچ میں پڑ گیا۔ ”بلیک وین تو نہیں ہے لیکن مل سکتی ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں منصوبہ کیا ہے؟“

میں نے اسے اپنا آئیڈیا بتایا تو اسے خاص پسند نہیں آیا۔ اس نے فوراً اعتراض کیا۔ ”اس میں بھاگ دوڑ ہے۔“

”ہاں لیکن ہم کر سکتے ہیں۔ تم جوان ہو اور میں بھی بوڑھا نہیں ہوا ہوں۔ کم سے کم میری بیوی کا یہی کہنا ہے۔“

”ہمیں ڈبل رول کرنا پڑے گا۔“ اس نے دوسرا اعتراض کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"یہ کام بھی ہم کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی مشکل نہیں ہے۔"

اس نے چند معمولی اعتراضات کیے جنہیں میں نے مسترد کر دیا۔ بالآخر وہ اس کام پر راضی ہو گیا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور وہ دونوں یہاں گزشتہ بارہ گھنٹے سے بندھے ہوئے تھے۔ دونوں تھکن اور بھوک پیاس کا شکار تھے لیکن ان کے مرنے یا بے ہوش ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ جوان اور مضبوط تھے، اس سے بھی زیادہ برداشت کر سکتے تھے۔ ان کا بھوکا پیاسا اور کمزور ہونا ہمارے مفاد میں تھا۔ ان کی طرف سے بے فکر ہو کر میں اور لیون روانہ ہوئے۔ اس کے پاس فراری کے علاوہ بھی تین گاڑیاں تھیں۔ ان میں ایک شاندار قسم کی لینڈ کروزر تھی لیکن میں لیون کی کوئی گاڑی استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ گاڑی لینے ہم اسی پر روانہ ہوئے تھے۔ میں نے ہائی وے پر ایک رینٹ اے کار سے مطلوبہ وین لی۔ پھر ہم گاڑیوں کے ایک جنک یارڈ پہنچے۔ یہاں سے ہم نے ایک گاڑی کی نمبر پلیٹس اتاریں پھر ایک چوبیس گھنٹے کھلے رہنے والے سپر اسٹور پہنچے۔ یہاں سے کچھ سامان کی خریداری کی۔

طوفانی بارش جاری تھی۔ آتے ہوئے لیون کی لینڈ کروزر میں اس کا پتا ہی نہیں چلا۔ یہ ایسے موسم میں سفر کے لیے بہترین گاڑی تھی۔ البتہ وین اس موسم میں سفر کے لیے اتنی اچھی نہیں تھی اور مجھے اسے ڈرائیو کرنا پڑا تھا۔ بہر حال وہ بھی اچھی کنڈیشن میں تھی۔ ہم دس بجے تک واپس آ گئے تھے۔ پہلے میں نے اسکرپٹ ترتیب دیا اور لیون نے اسے لکھ لیا۔ جب ہم مطمئن ہو گئے اور ایک بار ریہرسل بھی کر لی تو ہم نیچے تہ خانے میں آئے۔ جیسی ایک بار پھر رو کر خاموش ہو گئی تھی۔ ہم بات کرتے ہوئے آئے تھے اس لیے وہ باخبر ہو گئے اور بے چینی سے جسم کو حرکت دینے لگے۔ وہ ناک سے آوازیں نکال رہے تھے۔ غالباً فریادیں کر رہے تھے۔ میں نے سخت اور سرد لہجے میں کہا۔ "تو یہ ہیں وہ دونوں؟"

"ہاں یہی ہیں..." لیون نروس لہجے میں بولا۔

"تم سے کتنی رقم وصول کی ہے انہوں نے؟"

"سترہ ہزار ڈالرز..."

"تم پہلے ہی ہم سے رابطہ کر لیتے۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ "آخر ہمیں کس بات کی ادائیگی کرتے ہو... ہم مافیا والے معاوضہ ٹھیک ٹھاک لیتے ہیں لیکن اس کے بعد پوری ذمے داری بھی اٹھاتے ہیں۔"

"میں نے سوچا کہ بغیر قتل و خون کے کام چل جائے تو اچھا ہے۔" لیون نے دبے لہجے میں کہا۔ "لیکن ان لوگوں نے مجبور کر دیا کہ میں معاملہ تم لوگوں تک پہنچاؤں۔"

اب تک وہ دونوں حرکت کر رہے تھے اور ناک سے آوازیں نکال رہے تھے لیکن جب مافیا کا نام سنا اور پھر لیون نے قتل و خون کی بات کی تو انہوں نے باقاعدہ تڑپنا شروع کر دیا۔ میں نے ناگواری برقرار رکھی۔ "آئندہ ایسی بیوقوفی مت کرنا۔ تم مشکل میں پڑ جاتے یا بات پولیس تک جاتی تو ہماری ساکھ بھی خراب ہوتی۔ سب کلائنٹ جانتے ہیں کہ تمہیں ہم نے تحفظ دیا ہوا ہے۔ تم نے رقم بھی خرچ کر دی۔ خیر، تمہارے سترہ ہزار ڈالرز تمہیں واپس مل جائیں گے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے، بس ان سے میری جان چھڑا دو۔"

"سمجھو لو چھوٹ گئی۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ کر جیسی کے منہ سے ٹیپ ہٹا دیا۔ میں آواز بدل کر بول رہا تھا۔ منہ کھلتے ہی وہ رونے اور دہائیاں دینے لگی۔

"پلیز... پلیز... مجھے معاف کر دو... یہ سارا چکر کلائڈ کا ہے... اسی نے مجھے مجبور کیا تھا... پلیز مجھے چھوڑ دو۔"

"بکواس مت کرو۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "میں تم دونوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تم گلیوں میں رینگنے والے کیڑے مکوڑے تمہاری اتنی جرأت کہ تم مافیا کے سامنے آئے۔"

میں نے کہتے ہوئے کلائڈ کے منہ سے بھی ٹیپ ہٹا دیا۔ حسبِ توقع وہ بھی گھگیانے لگا۔ "سوری سر... آئی ایم رئیلی سوری... ہمیں معلوم نہیں تھا اور یہ کتیا بکواس کرتی ہے... سر! آپ نے ٹھیک کہا، ہم مل کر کام کرتے ہیں..."

"جھوٹ بکتا ہے یہ..." جیسی چلائی۔ "یہ مجھے مجبور کرتا تھا۔"

"اگر یہ مجبور کرتا تھا تب بھی تم اپنا پارٹ بہت اچھے طریقے سے ادا کرتی رہی ہو۔" میں نے طنز کیا۔ "تم نے فوائد حاصل کیے ہیں اس لیے اب سزا میں بھی حصے دار بنو۔"

میں نے کہتے ہوئے جیسی کے منہ پر ٹیپ لگا دیا اور کلائڈ سے پوچھا۔ "لیون سے وصول کیے سترہ ہزار ڈالرز کہاں ہیں؟"

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ "وہ ہم نے خرچ کر دیے۔ اب تو ہزار ڈالرز بھی نہیں بچے ہیں۔"

"تم نے رقم نہیں اپنی زندگی خرچ کی ہے اور وہ بھی بہت تیزی سے۔" میں نے کہا اور کلائڈ کے منہ پر بھی ٹیپ لگا دیا۔ "خیر، اب یہ ہماری ذمے داری ہے۔ لیون کا نقصان ہم پورا کریں گے، ہم اسی بات کا معاوضہ لیتے ہیں۔"

"تم ان کے ساتھ کیا کرو گے؟" لیون نے پوچھا۔

"کچھ دیر میں ہمارے کلینرز آئیں گے، وہ انہیں لے جائیں گے اور کہیں ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"ان کی لاشیں ملیں تو..."

"فکر مت کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "مافیا والے کچے کام نہیں کرتے۔ سب بہت صفائی سے ہو گا۔ کوئی نشان اور کوئی لاش نہیں ملے گی۔ یوں سمجھ لو کہ یہ دنیا سے غائب ہو جائیں گے ہمیشہ کے لیے۔"

ان دونوں کا تڑپنا اور مچلنا پھر سے شروع ہو گیا تھا لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جس کرسی سے بندھے تھے، وہ دھات کی اور بہت مضبوط تھی۔ ٹیپ کی بندشیں بھی ایسی نہیں تھیں جن سے وہ آزاد ہو سکتے اس لیے ہم مطمئن تھے۔ اوپر آ کر ہم نے وین کے اندرونی حصے میں بعض تبدیلیاں کیں اور اندر سے ہینڈل اور دوسری چیزیں نکال کر ان کی جگہ پلاسٹک کے ٹکڑے لگا دیے اور انہیں ٹیپ کر دیا۔ اب کوئی اندر سے وین کا دروازہ نہیں کھول سکتا تھا۔ وین کا پچھلا حصہ اب پیک تھا۔ ڈرائیونگ کمپارٹ بالکل الگ تھا۔ وین کے شیشوں پر اندر سیاہ کاغذ چپکا دیے۔ آخر میں اس کی نمبر پلیٹ تبدیل کی۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم نے لباس تبدیل کیے۔ ہم نے سیاہ پتلون، سیاہ جرسی، اوپر گرے جیکٹ اور سر پر سیاہ اونی ٹوپی لی۔ اسے کھینچ لینے سے یہ نقاب بن جاتی تھی۔ اس میں آنکھوں کی جگہ سوراخ لیون نے کاٹ کر بنائے تھے۔ ہم نے پیروں میں ربر کے بنے لانگ بوٹ پہنے... اپنے پاس سے ہر ایسی چیز ہٹا دی جس سے ہماری نشان دہی ہو سکے۔

لیون آواز تبدیل کرنے پر قادر نہیں تھا اس لیے میں نے اسے خاموش رول دیا۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں مجھے اداکاری کا شوق تھا اور یہ شوق اب کام آ رہا تھا۔ میں کامیابی سے کئی طرح کی آوازیں نکال سکتا تھا۔ ان دونوں کو تہ خانے سے نکالنے کا مسئلہ اس طرح حل کیا کہ ہم نیچے آئے۔ میں نے آواز بدل کر کہا۔ "تو یہ ہیں جنہیں ٹھکانے لگانا ہے۔"

یہ سن کر ان دونوں کا بُرا حال ہو گیا۔ لیون برانڈی میں دوا حل کر کے اور اسے ایک چھوٹی منرل واٹر کی بوتل میں ڈال کر لے آیا تھا۔ پہلے میں نے جیسی کا منہ کھولا۔ جیسے ہی اس نے چلانے کی کوشش کی، میں نے بوتل اس کے منہ سے لگا دی اور لیون نے اس کا سر پیچھے کھینچتے ہوئے اس کی ناک بند کر دی۔ نصف بوتل اس کے حلق سے اتری تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ البتہ منہ ہاتھ سے بند کر دیا کہ وہ برانڈی واپس نہ الٹ سکے۔ اس کے بعد یہی مشق کسی قدر دقت سے کلائڈ کے ساتھ دہرائی گئی۔ دس منٹ میں دونوں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ ہم نے انہیں کھولا، اس کے بعد فوراً ان کے ہاتھ پیر ٹیپ سے باندھ دیے۔ پھر باری باری دونوں کو کھینچتے ہوئے وین تک لائے اور اس میں ڈال کر دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ اس مشقت نے ہمیں تھکا دیا تھا اور ناشتا بھی خاصی صبح کیا تھا اس لیے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ کھا پی کر ہم دوبارہ تازہ دم ہوئے۔ میں نے دفتر کال کر کے طبیعت ناسازی کے بہانے سے چھٹی لی اور پھر ہم وین میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

بارش ہو رہی تھی البتہ طوفانی ہوائیں رک گئی تھیں اور جب ہم بلیک ریور پارک پہنچے تو وہاں برف باری جاری تھی۔ یہ جگہ اونچی تھی اور شمال سے تیز ہوا چل رہی تھی اس لیے درجۂ حرارت منفی میں تھا۔ سردی سے برا حال تھا۔ کیبن میں انہیں لا کر ہم نے سب سے پہلے آتش دان جلایا، تب کہیں جان میں جان آئی۔ کیبن خالصتاً تفریح کے لیے تھا۔ وہاں معمولی فرنیچر اور سامان تھا۔ اب ہمیں اصل کام شروع کرنا تھا۔ لیون نے بتایا تھا کہ دوا کا اثر چھ سے آٹھ گھنٹے رہتا ہے، گویا

التجا

اے بجلی فراہم کرنے والو! بے شک تم مریضوں، ضعیفوں، طبی آپریشن سے گزرنے والوں، اپنے ہم وطن مردوں، عورتوں اور بچوں پر ذرا بھی رحم نہ کھاؤ مگر ان بے زبان جانوروں کا تو ذرا خیال کرو جو سر جھکا کر خاموشی سے عیدِ قرباں پر اپنی جانوں سے گزر کر بارگاہِ الٰہی میں سرخ رو ہوئے اور اب ملک کے لاکھوں ڈیپ فریزرز میں آرام کر رہے ہیں۔

بُراوقت

زندگی میں اگر کسی پر براوقت نہ آئے تو اس کے اپنوں میں چھپے ہوئے دشمن اور دشمنوں میں چھپے ہوئے سچے ہمدرد ہمیشہ چھپے ہی رہتے ہیں۔

زاہد صادق...... لٹن روڈ، لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہمیں ان کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا تھا۔ ہم نے ان کے ہاتھ پیر کھول دیے تھے اور منہ سے بھی ٹیپ ہٹا دیا تھا۔ وقت گزاری کے لیے ہم برانڈی سے شغل کرنے لگے مگر احتیاطاً بات چیت سے گریز کیا تھا۔ عین ممکن تھا، ان میں سے کوئی قبل از وقت ہوش میں آجاتا اور ہماری بات سن لیتا، اس لیے خاموشی بہتر تھی۔

دوپہر تک برف باری بھی رک گئی تھی مگر سرد ہوائیں بدستور چل رہی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ سردی میں مزید اضافہ ہوگا۔ لنچ میں ہم نے کچھ چاکلیٹس اور کافی سے گزارہ کیا۔ پانچ بجے ان لوگوں نے ہلنا جلنا شروع کر دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ہوش میں آرہے ہیں۔ میں نے لیون کو اشارہ کیا اور ہم اٹھ کر دبے قدموں کیبن کے بیڈ روم میں آئے اور وہاں ایک جھری سے جھانکنے لگے۔ پہلے جیسی ہوش میں آئی تھی۔ اس نے ڈولتے ہوئے اٹھ کر آس پاس دیکھا اور پھر اس نے کلائڈ کو اٹھانے کی کوشش شروع کی۔ وہ دبی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”کلائڈ اٹھو... پلیز! دیکھو یہ ہمیں کہاں لے آئے ہیں... اٹھو... ذلیل شخص...“ وہ اسے گالیاں دینے لگی اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ کلائڈ ہوش میں آنے لگا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور آواز نکالنا چاہی تھی کہ جیسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”شش... آواز مت نکالنا، وہ یہیں ہیں۔“

اس دوران میں میں اور لیون بیڈ روم میں کچھ کھٹ پٹ کر رہے تھے اور اس کی آواز یقیناً جیسی نے سن لی تھی۔ کلائڈ کچھ دیر میں پوری طرح ہوش میں آگیا۔ اسی وقت میں نے کہا۔ ”بس اب کچھ دیر رہ گئی ہے، باہر تاریکی چھانے والی ہے۔ اس کے بعد ہم انہیں ہاتھ پاؤں کے ساتھ وزن باندھ کر جھیل میں ڈال دیں گے جہاں یہ قیامت تک رہیں گے۔“

یہ سن کر لیون نے ہنسنے کی آواز نکالی جیسے اس خیال سے محظوظ ہوا ہو۔ پھر نے اس دبی اور غیر مبہم آواز میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں بھی نہیں آیا لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے طے شدہ اسکرپٹ کے مطابق جواب دیا۔ ”فکر مت کرو، وہ ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گے اور ہوش میں آنے سے پہلے ہمیشہ کی نیند سو جائیں گے۔“

جواب میں لیون نے پھر وہی دبی اور مبہم آوازیں نکالیں۔ میں نے کہا۔ ”اگر یہ کسی طرح بھاگ بھی گئے تو ہم سے نہیں بچ سکتے۔ ہم ان کے ٹھکانوں سے واقف ہیں، دوبارہ پکڑ لائیں گے۔“

تیسری بار لیون کی مبہم آوازوں کے جواب میں میں نے کہا۔ ”شوق سے پولیس کے پاس جائیں، وہ الٹا انہیں پکڑ لے گی۔ ہمارے بارے میں یہ جانتے نہیں ہیں اور لیون اسٹیو معزز آدمی ہے۔ پولیس اس کی بات پر اعتبار کرے گی، ان لفنگوں کی بات پر نہیں۔“

اس گفتگو کے دوران میں ان کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ دونوں کا خوف سے بُرا حال تھا بلکہ جیم کلائڈ کی حالت زیادہ بُری تھی۔ وہ کانپ رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں جیسی لڑکی ہوتے ہوئے بھی خود پر قابو رکھے ہوئے تھی۔ اس نے اشارے سے کلائڈ سے کہا کہ انہیں یہاں سے نکل جانا چاہیے اور اس نے اتفاق کیا۔ دونوں دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے بہت آہستگی سے دروازہ کھولا اور پھر باہر نکل کر اسی طرح بند کر دیا۔ لیون کھڑکی کی جھری سے دیکھ رہا تھا۔ میں تیزی سے اس کے پاس آیا تو جیسی اور کلائڈ کی آخری جھلک دکھائی دی..... وہ اندھا دھند درختوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ بھاگنے میں کلائڈ آگے تھا اور بے چاری جیسی سرد ترین موسم میں ناکافی کپڑوں کے ساتھ اس کے پیچھے دوڑی جا رہی تھی۔ میں نے لیون سے ہاتھ ملایا۔

”مبارک ہو، امید ہے اب تمہیں ان کی صورت دوبارہ نہیں دکھائی دے گی۔“

لیون اپنی ہنسی روک رہا تھا۔ ”مجھے تو لگ رہا ہے، یہ ریاست سے نکلنے تک ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکیں گے۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”اب چلو، یہاں سردی بہت ہے اور کام بھی نمٹانا ہے۔“

ہم وین میں واپس لیون کے گھر آئے۔ وین کو دوبارہ پہلے والی حالت میں لائے۔ اس کی نمبر پلیٹ تبدیل کی۔ کپڑوں سمیت تمام چیزوں کو ایک بڑے شاپر میں ڈال کر وین میں رکھا پھر ہم الگ الگ گاڑیوں میں روانہ ہوئے۔ راستے میں شاپر ایک ڈسٹ بن میں ڈالا اور وین رینٹ اے کار والوں کو واپس کر دی۔ واپسی میں لیون نے جان چھوٹنے کی خوشی میں مجھے اپنے پسندیدہ ریستوران میں ڈنر کرایا کیونکہ رات ہو گئی تھی اور بارش دوبارہ ہونے لگی تھی اس لیے میں نے روانگی صبح تک کے لیے ملتوی کر دی۔ رمیا کو اطلاع کر دی تھی ورنہ اس سے بہت باتیں سننے کو ملتیں۔ اگلی صبح جب میں جانے لگا تو لیون نے میرے گلے لگ کر جذباتی انداز میں کہا۔ ”شکریہ دوست! تم ہمیشہ میرے کام آتے ہو۔“

”ہاں لیکن اس بار میں خالی ہاتھ نہیں جا رہا۔“ میں نے کہانی کے مسودے کی طرف دیکھا۔ ”آئندہ بھی جب ضرورت پڑے، تم مجھے بلا تکلف پکار سکتے ہو۔“

سرورق کی پہلی کہانی

شاہین و کرگس

سرور اکرام

امن اور آزادی بہت ہی تابناک نعمتیں ہیں... جو انسانی زندگی کے لیے شرطِ اول بھی... آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے... شعور... ذہانت انصاف اور صداقت... نیکی اور رواداری... بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوش مندوں میں اختلاف کی گنجائش نہیں... لیکن بدقسمتی سے انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں مختلف قوتیں برسرِپیکار رہی ہیں... تغیر و تعمیر... ترقی و زوال... روشنی و تیرگی... انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی تو ہین اور ان کے درمیان کشمکش آج بھی جاری و ساری ہے... اسی تناظر میں لکھی گئی کہانی کے پیچ و خم... جو ہر لمحے آپ کو آزادی اور نشیمن کی اصل وقعت سے آگاہی دیتے ہیں...

جنگ و نفرت... ظلم و کدورت کے بجائے

باہمی امن آشتی کا درس دیتی ایک دل گداز تحریر

وہ ہی سنگلاخ راستے تھے۔

دونوں طرف کھردرے، بے رحم، غرور سے سر اٹھائے ہوئے پہاڑ جن کے پتھر سورج کی گرمی سے انگاروں کی طرح لودے رہے تھے۔ انہی کے درمیان ایک پتلا سا راستہ تھا جن پر صرف گھوڑے دوڑ سکتے تھے کہیں کہیں خاردار جھاڑیاں بھی تھیں۔

شہباز خان کا گھوڑا رستم اگرچہ دوڑتے دوڑتے تھک چکا تھا، اس کے باوجود وہ اپنے مالک کو اس کی منزل تک پہنچانے کے لیے دوڑا جا رہا تھا۔

گھوڑے کے ٹاپوں سے دور تک پھیلا ہوا سناٹا بکھر کر رہ گیا تھا۔ شہباز اپنے گھوڑے پر لوہے کے کسی مجسمے کی طرح تن کر بیٹھا تھا۔ اس کی عقابی نگاہیں آس پاس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کی ساری زندگی انہی پہاڑوں کے درمیان گزری تھی۔

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بظاہر خاموش اور ویران نظر آنے والے پہاڑ کس طرح اچانک دشمنوں کی پوری فوج اگل دیتے ہیں۔ یہ دشمن کوہلی تھے۔

ایک جنگجو اور وحشی قبیلہ جس کا کام لوٹ مار کرنا تھا۔ یہ لوگ آناً فاناً نمودار ہوتے اور قافلے کو تباہ و برباد کر کے پہاڑوں کی آغوش میں جا چھپتے۔ ان کوہلیوں پر اب تک قابو نہیں پایا جا سکا تھا۔

شہباز کو ان پہاڑوں کے درمیان سے گزر کر بلند پیر کے میدان تک پہنچنا تھا جہاں مویشیوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ یہ میلہ ہر سال لگتا تھا۔

آس پاس کے رہنے والے اپنے خوبصورت ترین مویشی اس میلے میں خرید و فروخت کے لیے لاتے تھے۔ پندرہ دن تک جاری رہنے والا یہ میلہ ان علاقوں کے لوگوں کے لیے سب سے بڑی تفریح تھی۔

ہر سال میلے میں کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ضرور رونما ہو جس کی کہانیاں پورے سال تک دہرائی جاتیں اور اگلے سال پھر کوئی نیا واقعہ اس واقعے کی جگہ لے لیتا۔

یہ سب بہادر اور جفاکش لوگ تھے۔

پہاڑوں کی انتہائی مشکل زندگی اور جفاکشی نے انہیں ٹھوس بنا دیا تھا۔ ان کی عورتیں بھی بے مثال تھیں۔ پہاڑی ہرنوں جیسی آنکھوں والی عورتیں خود بھی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی تھیں۔ ان کی رنگت میں جیسے سورج کی تمازت بھی شامل ہو گئی تھی۔ یہ عورتیں دیکھنے ہی سے لودیتی ہوئی محسوس ہوتیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ان علاقوں کے اپنے اُصول اور دستور تھے۔ یہ کسی سرکاری قانون وغیرہ کو نہیں مانتے تھے۔ ان کے یہاں موت، زندگی کی علامت تھی۔ ذرا سی دیر میں مرنے مارنے پر تل جاتے اور پہاڑ گولیوں کی آوازوں سے گونجنے لگتے۔

ان کی معاش کا دارومدار جانوروں کی کھالوں، پنیر، مقامی طور پر تیار کردہ اسلحے وغیرہ پر تھا۔ جن کو بنانے میں ان کی مہارت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ لوگ جس کے دوست ہو جاتے، اس کے لیے اپنی جان تک دے دیتے اور جس کے دشمن ہوتے اسے کہیں پناہ نہیں ملتی تھی۔

شہباز خان بارھویں قبیلے کے سردار کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ لاابالی، بہادر، بے فکر...... وہ جتنا بہادر تھا، اتنا ہی نرم دل بھی تھا۔ بہت اچھا رباب بجایا کرتا۔ مویشیوں کے میلے میں ہر سال اسے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔

اس کے رباب کی دھن پر قبائلی تلواروں کے ہمراہ رقص کرتے اور ساتھ ہی ہوائی فائرنگ سے لطف اندوز ہوتے۔

اس کے قبیلے کا نام زرطفیل تھا چونکہ اس علاقے میں مختلف قبیلوں کے لیے مختلف نمبر تھے اس لیے اس کے قبیلے کو آسانی کے لیے بارہواں قبیلہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

شہباز کا گھوڑا رستم دوڑتے دوڑتے اچانک رک گیا۔

شہباز کو اندازہ تھا کہ گھوڑا یوں ہی نہیں رکا ہوگا۔ کسی بھی ممکنہ خطروں کو بھانپ لینے کی صلاحیت ان میں بہت زیادہ ہوتی ہے اور رستم کی تو تربیت بھی اسی انداز سے ہوئی تھی۔ شہباز نے اپنی رائفل اپنے شانے سے اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کے ٹھیک سامنے ایک پہاڑ کا سا چھجا تھا اگر وہ کسی طرح وہاں تک پہنچ جاتا تو تمام اطراف سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ سوائے سامنے کے۔

اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

سدھائے ہوئے گھوڑے نے اس کا اشارہ سمجھ کر پہاڑ کے چھجے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ اسی وقت ایک گولی اس کے گھوڑے سے کچھ فاصلے پر گرد اڑاتی چلی گئی۔ گھوڑے نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔

دو گولیاں اور چلیں لیکن گھوڑا پہاڑ تک پہنچ چکا تھا۔ شہباز نے اپنی رائفل ہاتھ میں لے لی۔ سامنے ایک پہاڑ کے عقب میں ایک سر ابھرا لیکن شہباز کی گولی نے اسے غروب کر دیا۔

نہ جانے وہ کون تھا اور شاید تنہا ہی معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کے بعد پھر کوئی گولی نہیں چلی۔ شہباز بہت دیر تک انتظار کرتا رہا۔ اس دوران میں سورج مکمل طور پر غروب ہو چکا تھا۔

ان علاقوں میں رات کے سائے تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں۔ اس وقت بھی ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ شہباز نے اس اندھیرے میں نکلنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے چاند کے طلوع ہونے کا انتظار تھا جو کچھ دیر بعد طلوع ہونے والا تھا۔

چاند طلوع ہوا اور شہباز ایک بار پھر رستم کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اب راستہ صاف تھا اور بظاہر کوئی خطرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

میلے کے میدان میں اس وقت بے شمار الاؤ روشن تھے۔

تُند خو، کڑیل جوان ہر طرف گھومتے پھر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ نے مقامی طور پر کشید کی ہوئی شراب "قلگان" پی رکھی تھی۔ ایسے لوگ لڑکھڑاتے اور شور کرتے ہوئے چل رہے تھے۔

ایک طرف ایک بازی گر اپنا کرتب دکھا رہا تھا اور اس کے گرد بے شمار لوگ جمع تھے۔ میلے کی روایت کے مطابق یہاں آتشیں ہتھیار لانا سختی سے منع تھا۔

ہر بار میلے میں کچھ دشمنیاں جنم لیا کرتیں لیکن ان کے فیصلے میلے کے بعد کہیں اور جا کر ہوا کرتے۔ اس میلے کے لیے بزرگ بابا خیر نے دعائیں مانگی تھیں اس لیے یہ میلہ ان کے لیے مقدس تہوار کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔

اس میلے میں ایک چرب زبان شخص نہ جانے کیا کیا چیزیں سامنے رکھے ان چیزوں کی خوبیاں بیان کر رہا تھا۔ "یہی وہ انگوٹھیاں ہیں جو مصر کی شہزادیاں استعمال کیا کرتی تھیں۔ ان شہزادیوں نے یہ انگوٹھیاں میرے جدِ اعلیٰ کو تحفے میں دی تھیں۔ وہاں سے یہ نسل در نسل مجھ تک پہنچی ہیں اور آج میں انہیں آپ کے سامنے بیچنے کے لیے آیا ہوں۔"

"کیوں بھائی، تم نے اپنی نسل کو یہ تحفے کیوں نہیں دیے۔" کسی نے پوچھا۔

"اس لیے کہ میری کوئی نسل ہی نہیں ہے۔ میں نے شادی نہیں کی اس لیے میری نسل تمہی لوگ ہو۔"

اس کی بات پر ایک قہقہہ بلند ہوا تھا۔

چرب زبان شخص کی زبان تو بہت چل رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی بہت تیزی سے گردش کر رہی تھیں جیسے اسے کسی کی تلاش ہو۔

چرب زبان شخص نے اپنا نام سمندر خان بتایا تھا۔

"میرا سینہ سمندر کی طرح ہے۔ میں دنیا بھر کا علم جانتا ہوں اس لیے سمندر خان ہوں۔ آؤ مجھ سے پوچھو میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

"اچھا چلو یہ بتاؤ۔ آسمان پر کتنے ستارے ہیں؟" کسی نے سوال کیا۔

"پانچ کروڑ چھ لاکھ۔" اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"خود گن کر دیکھ لو۔" سمندر خان نے کہا۔

اس پر پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ لوگوں کو اس چرب زبان کی باتوں میں مزہ آ رہا تھا لیکن چرب زبان اب سامنے پھیلی ہوئی چیزیں سمیٹنے لگا تھا۔

"ارے کیا ہو گیا سمندر خان؟" کسی نے پوچھا۔

"تم اپنی دکان کیوں سمیٹ رہے ہو؟"

"اس لیے کہ اب مجھے ستاروں کے اس پار جانا ہے۔" سمندر خان نے ساری چیزیں چادر میں باندھتے ہوئے کہا۔

اس نے لوگوں سے اجازت لی۔ خدا حافظ کہا اور چادر کا گٹھر اپنی پشت پر لاد کر ایک طرف چل پڑا۔ مجمع منتشر ہو کر ادھر اُدھر بکھر گیا تھا۔

سمندر خان پُرسکون انداز میں چل رہا تھا۔ جیسے وہ آہستہ آہستہ میلے کی سیر کر رہا ہو لیکن میلے کی حد سے نکلتے ہی اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ اب وہ تیز رفتار بھی تھا اور محتاط بھی۔

وہ چند قدم چلنے کے بعد دائیں بائیں کا جائزہ لیتا پھر آگے بڑھ جاتا۔ اب میلے کی آوازیں اور روشنیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔

دور کہیں کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ سمندر چلتے چلتے رک گیا۔ آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس نے آواز کی طرف اپنا رخ کر لیا پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر خود بھی کتے جیسی آواز نکالی جواب میں وہ آواز پھر سنائی دی۔ اس بار وہ آواز بہت قریب سے آئی تھی۔

سمندر خان کی رفتار اب مزید تیز ہو گئی۔ اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اب ہر طرف سناٹا تھا۔ سامنے پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ نہ جانے پہاڑوں کے یہ سلسلے کتنی دور تک چلے گئے تھے۔

اچانک ایک پہاڑ کے سائے سے دو آدمی نکل کر اس کے سامنے آ گئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ "نام بتاؤ۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"میں وہ ہوں جس کے سینے میں سمندر ہے۔" سمندر خان نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ آ جاؤ۔"

وہ ان دونوں کی رہنمائی میں ان کے پیچھے چل پڑا۔ دونوں بڑی خاموشی سے چل رہے تھے۔ وہ اسے کچھ فاصلے پر پہاڑ کی کھوہ کے پاس لے آئے۔

اندر موم کے چراغ جل رہے تھے لیکن ان کی روشنیاں کھوہ تک ہی محدود تھیں۔ غار سے باہر سات آٹھ آدمی اور بھی تھے۔ وہ بھی مسلح تھے۔ انہوں نے آنے والوں سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

غار بہت کشادہ تھا۔

دیواروں کے ساتھ موم کے چراغ رکھے ہوئے تھے۔ جن کی روشنیوں میں وہ غار خوب روشن ہو رہا تھا۔ سامنے جہاں غار ختم ہوتا تھا وہاں ایک نورانی صورت کا بوڑھا چادر بچھائے بیٹھا تھا۔ سمندر خان نے سلام کرتے ہوئے اس بوڑھے کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور ادب سے گردن جھکا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

بوڑھے نے شفقت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں بیٹے سمندر خان۔ کیا خبر لے کر آئے ہو؟"

"محترم بزرگ، میلہ زوروں پر ہے۔" سمندر خان نے بتایا۔ اس کے ساتھ ہی خرافات کی بھی انتہا ہو چکی ہے۔ اس بار میلے میں رقاصائیں بھی بلوائی گئی ہیں جو ناچ گا کر لوگوں کے دل بہلا رہی ہیں۔"

"افسوس۔" بوڑھے نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "جہاں کی زمین پر رقاصاؤں کے گھنگھرو بولنے لگتے ہیں وہاں سے غیرت ختم ہو جاتی ہے۔"

"ایسا ہی ہے محترم بزرگ۔" سمندر خان ادب سے بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''اور ان سب خرافات کا ذمے دار کون ہے؟''

''داور خان کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔'' سمندر خان نے نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑے۔ ''اس نے ان سب باتوں کی روایت ڈالی ہے۔ بستی میں صرف ایک مسجد ہے۔ وہ بھی اب ویران پڑی رہتی ہے۔''

''تو اس کا علاج کیا ہے سمندر خان؟''

''داور خان کی موت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے فرنگیوں کے کہنے پر آ کر یہ سب کیا ہے۔'' سمندر خان نے بتایا۔ ''محترم بزرگ یہاں کی پہاڑیوں اور پہاڑوں میں خزانے پوشیدہ ہیں۔ سونا اور تانبا۔ یہ فرنگی اپنی مشینیں لگا کر سارا خزانہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔''

''اس کے بعد ہمارے پہاڑ کھوکھلے ہو جائیں گے۔ کیوں؟''

''جی ہاں۔'' اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔''

''لیکن ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔'' بوڑھے کے چہرے پر عزم کی روشنی تھی۔ اگر ایسا ہوا تو بہت بُرا ہو گا۔''

کچھ دیر خاموشی کے بعد سمندر خان نے کہا۔ ''محترم بزرگ میرا دوست شہباز خان اس طرف آنے کے لیے نکل پڑا ہے۔ وہ آ جائے تو ہمیں بہت قوت مل جائے گی۔''

''ہاں، میں نے بھی اس کے بارے میں بہت سنا ہے۔'' بوڑھا اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''وہ جیسے ہی پہنچ جائے اسے میرے پاس لے آنا۔''

یہ پورا علاقہ اس وقت فرنگیوں کی گاڑیوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ ان پہاڑوں کے سینوں میں ایسے خزانے تھے جن سے کام لے کر اس علاقے کی تقدیر بدلی جا سکتی تھی۔

اس علاقے کے لوگ مذہبی اعتبار سے مسلمان تھے۔ ان کے سلسلے وسطی روس کے باہمت اور باکردار مسلمانوں سے جا کر مل جاتے تھے۔ انہیں اپنی تہذیب، روایت اور مذہب پر بہت فخر تھا۔

پھر ان علاقوں کے سب سے بڑے سردار نے غیر ملک کے سفر کی ٹھان لی، اسے کون روک سکتا تھا وہ سردار تھا۔ وہ سمندر پار کے ملکوں کے دورے پر چلا گیا۔

دو سال کے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ وہ اپنے ساتھ نئے نظریات اور خیالات لے کر آیا۔ اس نے باہر جا کر فرنگیوں سے دوستیاں کر لی تھیں جس کے نتیجے میں وہ بے شمار خرافات بھی ساتھ آ گئیں۔

ان میں رقص اور موسیقی بھی تھی۔ جس کی ان علاقوں میں پہلے کبھی گنجائش نہیں ہوئی تھی لیکن اب دھڑلے سے شراب نوشی بھی ہوا کرتی۔

اس علاقے کے شریف لوگ خاموش ہو کر رہ گئے تھے۔ فرنگیوں نے داور خان پر نہ جانے کیسا جادو کیا کہ وہ اپنی زمینیں ان کے حوالے کر رہا تھا۔

فرنگی ان زمینوں اور پہاڑوں سے خزانے نکال رہے تھے۔ نہ جانے کتنی قسم کی معدنیات نکل رہی تھیں۔ جن کا تھوڑا فائدہ داور خان کو بھی ہو رہا تھا۔ بقایا فرنگی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ وہاں کے لوگوں کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

بوڑھا جلال بابا ایک روحانی شخصیت کے علاوہ ایک ذہین اور باعمل انسان بھی تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر بگاڑ کا یہی حال رہا تو پورا علاقہ تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ پہاڑوں کے درمیان بسنے والوں کی غیرت ختم ہو کر رہ جائے گی۔

اس نے داور خان اور فرنگیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس کا ساتھ دینے والے بہت سے لوگ مارے گئے اور اپنے جان نثاروں کی ضد پر اسے فرار ہونا پڑا۔

لیکن وہ چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ وہ اس علاقے کو فرنگیوں سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ داور خان کی جگہ کسی نیک ایماندار اور محب وطن قسم کے شخص کو حکمران بنانا چاہتا تھا۔

اسی لیے وہ جدوجہد کیے جا رہا تھا اور بہت سے نیک اور بہادر لوگوں کی اسے حمایت حاصل تھی۔ ان ہی میں سمندر خان بھی تھا۔

سمندر خان بظاہر الٹی سیدھی چیزیں فروخت کیا کرتا تھا لیکن درپردہ وہ جلال بابا کے لیے جاسوسی کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ اس کی اطلاعات پر جلال بابا کے آدمی کئی بار کامیاب بھی ہو چکے تھے۔

سمندر خان نے جلال بابا کی طاقت میں اضافہ کی غرض سے اپنے دوست شہباز خان کو بھی بلوا لیا تھا۔ شہباز خان بظاہر میلے میں مویشیوں کی خرید و فروخت کے لیے آتا تھا لیکن اس کا اصل مقصد جلال بابا سے ملاقات کر کے اس علاقے کے لیے حکمتِ عملی طے کرنا تھا۔

☆☆☆

جولیا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا باپ رابرٹ ہڈسن اسے اپنے ساتھ کہاں لے کر آ گیا۔

یہاں سوائے پہاڑوں کے علاوہ اور تھا ہی کیا اونچے اونچے پہاڑ تھے یا پھر ان علاقوں کے رہنے والے بلند قامت، مضبوط بدن اور عقابی نگاہوں والے لوگ تھے جنہیں دیکھ کر جولیا خوفزدہ ہو جاتی تھی۔

وہ ایک دن اپنے باپ رابرٹ سے الجھ پڑی۔ ''ڈیڈ یہ تم مجھے کہاں لے کر آ گئے ہو کیا کرنا ہے یہاں۔''

''یہاں بہت کچھ ہے مائی ڈیئر۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''یہاں کی زمینوں میں اتنا خزانہ ہے کہ ہمارا ملک ایک ہزار برس تک پوری دنیا پر راج کر سکتا ہے۔''

''ڈیڈ۔ خدا کے لیے یہ بتاؤ میں یہاں کیوں جھک مار رہی ہوں۔ اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی کہ تم مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے۔''

''ٹھہرو میں بتاتا ہوں کہ میں تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں یا ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟'' رابرٹ نے اپنا سگار سلگایا۔ ''تم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بارے میں پڑھا ہے۔''

''جی ہاں۔'' جولیا نے جواب دیا۔

''ان جیالوں نے ہمارے وطن کے لیے ایک تاریخ بنائی تھی۔ شاندار تاریخ۔ ہم نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہم تجارت کرنے گئے تھے لیکن ہم نے سونے کی چڑیا کو اپنی ہوشیاری سے اپنے قابو میں کر لیا۔''

''نو ڈیڈ۔ یہ ہوشیاری نہیں، مکاری تھی۔''

''ایک ہی بات ہے مائی ڈیئر تو یہ علاقہ ہمارے لیے دوسرا ہندوستان بننے جا رہا ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''اس علاقے کے لوگ بھی جاہل، گنوار اور آپس میں دشمنیاں رکھنے والے ہیں۔ ہم بڑی آسانی سے ان کی روایات کو کھوکھلا کر کے اس علاقے میں اپنا تسلط قائم کر سکتے ہیں۔''

''لیکن ڈیڈ ہندوستان تو خیر سونے کی چڑیا تھا لیکن یہ علاقہ کس کام کا ہے؟'' جولیا نے پوچھا۔

''یہ سونے کا پہاڑ ہے۔'' رابرٹ نے جواب دیا۔ ''تمہارے چاروں طرف جو پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں، تم انہیں خالی مت سمجھو۔ ان کے اندر بہت کچھ ہے۔ ہم ان کو حاصل کرنے آئے ہیں۔''

''اوہ۔ اب سمجھی۔'' جولیا نے برا سا منہ بنایا۔ ''تو یہ سڑکیں وغیرہ یونہی دکھانے کے لیے بن رہی ہیں۔''

''ہاں۔ صرف دکھانے کے لیے۔'' رابرٹ نے بتایا۔ ''بظاہر ہمارا مقصد کچھ اور ہے۔''

''چلیں۔ مان لیا کہ یہ سب ہے لیکن میں کس مرض کی دوا ہوں۔ میں یہاں کیا کر رہی ہوں؟''

''تمہیں بھی کام کرنا پڑے گا۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''وہ میں ابھی نہیں بتا سکتا لیکن میری بچی تمہیں اپنے ملک اور قوم کے لیے ایک تاریخ بنانی ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ڈیڈ کہ میں کیا کر سکتی ہوں؟'' جولیا نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں داور خان کے بیٹے مراد خان کو اپنے قابو میں کرنا ہے۔'' رابرٹ نے بتایا۔ ''گرچہ داور خان ہمارے مفادات کے لیے کام کر رہا ہے لیکن اس کا بیٹا مراد خان شاید اپنے باپ کی پالیسیوں کے خلاف ہے اس نے کھل کر تو ایسی کوئی بات نہیں کی لیکن اس کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ کسی وقت بھی ہمارے لیے مشکلات کھڑی کر سکتا ہے۔''

''اور آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اسے کنٹرول میں رکھوں۔'' جولیا نے پوچھا۔

''ہاں کیونکہ تم خوبصورت ہو، ذہین ہو اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمہیں اپنے آپ پر کنٹرول حاصل ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کی آنکھوں پر پٹی باندھنے میں کامیاب رہو گی۔''

''مجھے افسوس ہے ڈیڈ کہ آپ ابھی تک ان لوگوں کو سمجھ نہیں سکے۔'' جولیا نے کہا۔ ''یہ لوگ لاکھ وحشی اور غیر تعلیم یافتہ سہی لیکن یہ عورت کا احترام کرتے ہیں۔ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' رابرٹ نے اس کی تائید کی۔ ''میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں یہاں خود کو اپنے وطن سے زیادہ محفوظ سمجھتی ہوں۔''

''جولیا ڈیئر تمہیں کوشش تو کرنی ہوگی۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''اپنی قوم کے وسیع تر مفاد کے لیے۔''

''چلیں۔ میں کوشش کر کے دیکھ لیتی ہوں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

''اب تیار ہو جاؤ۔ چلو میرے ساتھ۔ داور خان نے ہماری دعوت کی ہے۔ آج ان کا قومی کھیل بزکشی بھی دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ میلے کی خاص دلچسپی یہی کھیل ہوتا ہے۔''

''یہ کون سا کھیل ہے ڈیڈ۔'' جولیا نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''تم اسے پولو کی ایک غیر ترقی یافتہ شکل کہہ سکتی ہو۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''فرق یہ ہوتا ہے کہ بال کی جگہ ایک دنبہ ہوتا ہے جس کو نیزے پر اٹھا کر دوڑ لگاتے ہیں۔ اس دوران میں اس مرے ہوئے دنبے کو چھیننے کی کوشش کی جاتی ہے چاہے کسی بھی طرح ہو۔''

''اوہ سمجھ گئی۔ سلوسٹر اسٹون کی ایک فلم میں یہ گیم دیکھ چکی ہوں۔'' جولیا نے بتایا۔ ''میں ضرور چلوں گی۔''

☆☆☆

جولیا کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

وہ حیرت انگیز کھیل تھا...... طاقت، جرأت، اور ہنر مندی کا مظہر۔ اس میں گھڑ سواری کی پھرتی کے ساتھ ساتھ نیزہ بازی کی مہارت بھی لازمی تھی۔ اس کے ساتھ ہی عقابی نگاہوں کی پوری ہوشیاری اس کھیل کے لیے ضروری تھی۔

جس طرح شاہین پلٹ پلٹ کر جھپٹتے ہیں اور اپنے شکار کو بے بس کر کے رکھ دیتے ہیں اسی طرح آج کے کھیل میں ایک نوجوان اپنی مہارت دکھا رہا تھا۔

وہ اپنے گھوڑے کی پشت پر اس طرح جم کر بیٹھا ہوا تھا جیسے لوہے کا مجسمہ مجسم ہو۔ اس کی دلیری دیکھنے کے قابل تھی۔

وہ جب اپنے مخالف سے بز جھپٹ لیتا تو سبحان اللہ، سبحان اللہ کے نعرے بلند کرنے لگتا۔

جولیا اس وقت اپنے باپ رابرٹ، حاکم داور خان اور اس کے بیٹے مراد خان کے ساتھ کھڑی تھی۔

''داور خان۔'' رابرٹ نے داور کو مخاطب کیا۔ ''وہ نوجوان کون ہے؟ اس کا اشارہ اسی شہسوار تھا۔

داور خان نے اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک آدمی سے اس نوجوان کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کا جواب نفی میں تھا۔ ''نہیں، سردار ہم اسے نہیں جانتے۔''

''اس کو چرب زبان اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔'' ایک دوسرے آدمی نے بتایا۔

''اور یہ چرب زبان کون ہے؟'' مراد خان نے پوچھا۔

''چھوٹے سردار۔ وہ میلے میں گھوم پھر کر مختلف چیزیں فروخت کرتا ہے۔'' بتایا گیا۔ ''چونکہ اس کی باتیں بہت دلچسپ اور لچھے دار ہوتی ہیں اس لیے اسے چرب زبان کا خطاب دیا گیا ہے۔''

رابرٹ یہ ساری باتیں ترجمہ کر کے جولیا کو بتا رہا تھا۔ رابرٹ کو مقامی زبان بہت اچھی آتی تھی۔ داور خان اور اس کا بیٹا مراد خان دونوں بہت اچھی انگریزی بھی جانتے تھے۔

اس دوران میں کھیل ختم ہو گیا۔

کھیل کے خاتمے کا اعلان بگل بجا کر کیا گیا۔ اب انعامات کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ چرب زبان کا لایا ہوا کھلاڑی جس ٹیم میں شامل تھا، اس ٹیم کی جیت ہوئی تھی۔

سارے کھلاڑی ایک ایک کر کے داور خان کے سامنے آتے رہے۔ وہ انہیں انعام کے طور پر طلائی سکے دیتا رہا اور جب وہ نوجوان سامنے آیا تو اس نے سکے لینے سے انکار کر دیا۔ ''نہیں سردار مجھے یہ سکے نہیں چاہئیں۔''

''کیا مطلب؟'' داور خان غرایا۔ ''کیا تمہیں انعام لینے سے انکار ہے؟''

''نہیں سردار، بالکل نہیں۔'' نوجوان نے کہا۔ ''لیکن مجھے انعام کے طور پر سونے کے سکے نہیں چاہئیں۔ یہ تو عام لوگوں کے لیے ہیں۔ وہ ان سے خوش ہو سکتے ہیں۔''

''تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟''

''آپ کے خاص لڑاکوں میں شامل ہونے کی آرزو لے کر آیا ہوں۔'' نوجوان نے کہا۔

داور خان نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''نوجوان میرے خاص لڑاکوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟

''محترم سردار میں جانتا ہوں کہ ان کی تعداد چالیس ہے۔ سب کے سب سیاہ پوش ہوتے ہیں اور لڑنے کے فن میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پوری فوج سے ٹکرانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور سب آپ کے نام پر جان دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔''

''اور یہ بھی جانتے ہو گے کہ ان کی تعداد صرف چالیس کیوں رہتی ہے۔'' داور خان نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ کیونکہ کسی ایک کو شامل ہونے کے لئے ایک کو مرنا پڑتا ہے۔'' نوجوان نے کہا۔

''کیا تم مقابلے کے لیے تیار ہو؟'' ''قبیلہ کون سا ہے تمہارا؟''

نوجوان نے ایک دور دراز قبیلے کا نام بتایا تھا۔

''اور تمہارا اپنا نام کیا ہے؟''

''شہباز خان۔'' نوجوان نے جواب دیا۔ ''میں یہاں مویشیوں کی تجارت کے لئے آیا ہوں۔''

جولیا کے لئے یہ سب بہت دلچسپ اور پُراسرار تھا۔ اس نوجوان کے تیور اس کی شخصیت کی طرح شاندار تھے۔ وہ ایک خواب آگیں کیفیت میں اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ لیکن اس نے بس ایک بار جولیا کو دیکھ کر اپنی نگاہیں اس کی طرف سے ہٹالی تھیں۔

''ٹھیک ہے۔ تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔'' داور خان نے کہا۔ ''تمہیں ان چالیس میں سے کسی ایک سے لڑنا ہو گا۔ یا تو وہ کامیاب ہو گا یا پھر تم۔ یہ موت اور زندگی کی جنگ ہو گی شہباز خان۔''

''محترم سردار، میں ہر امتحان کے لئے تیار ہوں۔''

داور خان نے ہاتھ کے اشارے سے محفل برخاست کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ اعلان کیا کہ یہ مقابلہ دو دن کے بعد اسی مقام پر ہو گا۔

سمندر خان نے آگے بڑھ کر شہباز خان کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میرے دوست، چلو اب چلتے ہیں یہاں سے۔''

شہباز خان داور خان کو تعظیم دے کر سمندر خان کے ساتھ چل پڑا۔ جولیا کی نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

وہ دونوں بھیڑ بھاڑ سے کتراتے ہوئے بہت دور نکل آئے تھے۔ سمندر خان اس دوران میں بالکل خاموش رہا۔

''اوئے تجھے کیا ہو گیا یار؟'' شہباز خان نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔

''شہباز خان، میں تمہاری طرف سے فکر مند ہوں۔'' سمندر خان نے کہا۔ ''سیاہ پوش بہت بے رحم اور طاقت ور لوگ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تم ان کا مقابلہ نہ کر سکو۔''

''میرے دوست، اصل بات یہ ہے کہ میرا مقصد نیک ہے۔ میں اس سر زمین کو فرنگیوں سے آزاد کرانا چاہتا ہوں اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ بابا جلال کے ہاتھ مضبوط کروں تاکہ اس زمین سے برائیاں دور ہو سکیں۔''

''شہباز خان، اس کے لیے تم نے بہت دور کا راستہ اپنایا ہے۔''

''اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ فرنگی بہت چالاک ہوتے ہیں۔ ان کو انہی کے ہتھیار سے مارا جا سکتا ہے۔ ورنہ داور خان کے سیاہ پوشوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''ویسے ایک بات ہے۔'' سمندر خان مسکرا دیا۔ ''تم فرنگیوں سے نفرت کرتے ہو لیکن ان ہی میں سے ایک تمہیں پسند کرنے لگا ہے۔''

''وہ کون ہے؟''

''رابرٹ کی بیٹی جولیا۔''

''اوئے چرب زبان بکواس نہ کیا کر۔''

''شہباز خان، عورت کی آنکھیں بتا دیتی ہیں کہ وہ کس کو کن نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔'' سمندر خان نے کہا۔ ''وہ تمہیں اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے تم پر قربان ہو جانے کا ارادہ کر رہی ہو۔''

''میرے دوست۔'' شہباز خان نے سمندر خان کا ہاتھ تھام لیا۔ ''اگر تیری بات سچ ہے تو یہ سمجھ لو کہ میرا کام بہت آسان ہو جائے گا۔''

''یہ بالکل سچ ہے شہباز خان۔ میں نے اتنے دنوں تک گاؤں گاؤں گھوم کر جھک نہیں ماری ہے۔ عورتوں کو سمجھنے لگا ہوں۔''

☆☆☆

داور خان کے بیٹے مراد خان کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ رابرٹ کی بیٹی جولیا اس سے ملنے کے لیے ڈیرے تک آجائے گی۔

اپنے باپ کے برعکس وہ ایک محبِ وطن اور شریف النفس نوجوان تھا۔

اس نے بہت حیران ہو کر جولیا کا استقبال کیا تھا۔

''میڈم، اگر آپ کسی کو بھیج دیتیں تو میں خود آپ سے ملنے آپ کے کیمپ پہنچ جاتا۔''

''نہیں مراد خان۔ مجھے خود آنا تھا۔'' جولیا نے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''فرمائیں۔ آپ کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا؟''
''مراد خان۔ یہاں کے لوگ بہت بے مروت ہوتے ہیں۔'' جولیا نے کہا۔ ''انہیں کسی کے جذبات و احساسات کی پروا نہیں ہوتی۔''
''ایسا کون ہے میڈم؟ آپ نام بتائیں مراد خان اسے آپ کی خدمت میں پیش کر دے گا۔''
''تو پھر یہ سن لو کہ وہ تم ہو۔'' جولیا نے کہا۔
''میں سمجھا نہیں میڈم؟'' مراد خان حیران رہ گیا۔
''دیکھو مراد خان۔ میں ایک ایسی جگہ سے یہاں آئی ہوں جہاں ہر وقت میرے آس پاس دوستوں کا مجمع رہتا تھا۔ ہر قسم کی سیر اور تفریح ہوتی تھی۔ ہفتے میں... کم از کم دو بار پارٹیز ہوا کرتیں۔ میں اس ماحول کی عادی تھی پھر ڈیڈ مجھے وہاں سے اٹھا کر یہاں لے آئے۔ میرے لئے تو یہاں سوائے پہاڑوں کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔''
''آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم لیکن مسٹر رابرٹ بھی پہاڑوں کے سینے یوں ہی تو نہیں چیر رہے ہوں گے؟''
''وہ بات اور ہے۔ لیکن میں اپنے نظریئے سے بات کر رہی ہوں۔'' جولیا نے کہا۔ ''میں ایک لڑکی ہوں۔ ایک انسان ہوں۔ میرا سیاست اور تجارت وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو یہ دیکھ رہی ہوں کہ یہاں میرا کوئی دوست نہیں ہے اور نہ ہی میری زبان سمجھنے والا ہے۔ گنتی کے دو تین آدمی ہیں۔ جن میں سے ایک تم ہو اس لئے میں نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔''
''لیکن ہمارے ہاں لڑکیوں سے دوستی نہیں کرتے میڈم۔''
''لیکن تمہارے فادر کی تو کئی لڑکیوں سے دوستی ہے۔'' جولیا نے کہا۔
مراد خان کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔
''ہاں لیکن ہر شخص اپنے اپنے عمل کا خود ذمے دار ہوتا ہے میڈم۔''
''چلو دوست نہ سہی لیکن میں کم از کم تمہاری مہمان تو ہوں۔''
مراد خان نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ جولیا کی اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اس کی مہمان تھی۔ اس کے بنجر علاقے میں رہنے کے لیے آئی تھی چاہے اس کے آنے کا مقصد کچھ بھی ہو۔
''آپ بتائیں میں اس دوستی کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' مراد نے پوچھا۔
''کل صبح تم مجھے ان علاقوں کی سیر کراؤ گے۔'' جولیا نے کہا۔
''میڈم، یہاں گھومنا پھرنا آسان نہیں ہے۔ یہاں کے راستے بہت دشوار ہیں۔''
''تم اس کی پروا مت کرو۔ مجھے گھوڑے پر بیٹھنا اچھی طرح آتا ہے۔'' جولیا نے کہا۔
مراد اس لڑکی کی ضد کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ کسی لڑکی کی ہمراہی اس کی روایات کے خلاف تھی لیکن یہ مغربی لڑکی بہت آہستگی سے مراد جیسے شخص کے دل کے دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ مراد کے لیے یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔
وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ دوست بن کر یہاں رہنے نہیں آئے ہیں۔ ان فرنگیوں کو دور دراز کے ان پہاڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود وہ بے بس سا ہو گیا۔ وہ لڑکی اس علاقے میں مہمان تھی اور ان علاقوں میں مہمان کی ہر خواہش پوری کی جاتی ہے۔
''ٹھیک ہے میڈم۔ کل صبح تیار رہنا، میں کیمپ سے تمہیں لے لوں گا۔'' مراد نے کہا۔
''اور میرے لیے تم گھوڑے کا بندوبست مت کرنا۔'' جولیا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میرے پاس اپنا گھوڑا ہے اور وہ یہاں کے راستوں سے واقف ہو چکا ہے۔''
دوسری صبح سورج نکلتے ہی مراد خان کیمپ پہنچ گیا۔ وہ پہلی بار اس طرف آیا تھا اور جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، وہ اسے پریشان کر دینے کے لیے بہت تھا۔ زمینوں اور پہاڑوں کو زیر کرنے والی مشینوں کے ساتھ ساتھ اسے جگہ جگہ پہرے دیتے ہوئے فوجی بھی دکھائی دے رہے تھے۔
وہ پورا علاقہ فوجی چھاؤنی میں تبدیل ہو گیا تھا۔
مراد خان کو بھی یہاں روک لیا گیا۔ ''نہیں، تم آگے نہیں جا سکتے۔'' ایک فوجی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔
''کیوں نہیں جا سکتا۔'' مراد خان غصے سے دھاڑنے لگا۔ ''کون ہوتے ہو تم لوگ۔ یہ پورا علاقہ ہمارا ہے۔ تمہیں یہاں حکومت کرنے کی اجازت کس نے دی ہے؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کا شور سن کر کچھ اور لوگ بھی وہاں آ گئے۔ ان میں سے دو تین مراد خان کو پہچانتے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مراد خان سے معذرت کی اور اسے اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

مراد خان اس وقت بہت تلخ ہو رہا تھا۔ وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا جولیا اور رابرٹ کے کیمپ پہنچ گیا۔ جولیا اور رابرٹ کو اس کے آنے کی خبر دے دی گئی تھی۔ وہ دونوں اس کے استقبال کے لیے کیمپ کے باہر موجود تھے۔

''مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اس طرح روکا گیا۔'' رابرٹ نے کہا۔

''افسوس تو مجھے کرنا چاہیے جسے اپنے علاقے کی کچھ خبر نہیں۔'' مراد تلخ ہو کر بولا۔ ''آپ لوگ یہاں پہاڑوں سے معدنیات کی تلاش کے لیے آئے ہیں تو اتنے لاؤ لشکر کی کیا ضرورت ہے؟''

رابرٹ نے جولیا کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے مراد خان کے پاس آ گئی۔ ''یہ سارے لوگ ہمارے محافظ ہیں۔ اب دیکھو نا ہم اجنبی جگہ پر کام کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ تمہارے خلاف بھی ہوں۔ وہ نہیں چاہتے ہوں کہ تمہارے علاقے میں ترقی ہو اور وہ تمہیں پریشان کرنے کی کوشش کریں اسی لیے ہم نے اپنے طور پر اپنی حفاظت کا بندوبست کیا ہے۔''

''کیا بابا نے اس کی اجازت دی ہے؟'' مراد خان نے پوچھا۔

''ہاں نوجوان، داور خان کو سب معلوم ہے۔'' رابرٹ نے بتایا۔ ''اس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ہم نے یہ سب اس کی اجازت سے کیا ہے۔''

''چلو اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' جولیا نے اچانک اس کا ہاتھ تھام لیا۔

مراد خان کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ موم کی طرح پگھل کر بہہ جائے گا۔ ان ہاتھوں میں نرمی کے ساتھ ساتھ حرارت بھی تھی۔ اس کی زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ کسی غیر لڑکی نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور وہ بھی جولیا جیسی حسین لڑکی نے۔

جولیا اسے ساتھ لیے کیمپ میں آ گئی۔ رابرٹ باہر ہی رہ گیا۔

یہ کیمپ بہت بڑی چھولداری کی شکل میں تھا۔ اندر مسہری کے ساتھ سنگار میز بھی تھی۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ درمیان میں ایک میز تھی جس پر ناشتے کے لوازمات تھے۔

''چلو، پہلے ناشتا کر لو۔'' جولیا نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے بعد ہم باہر چلیں گے۔''

''میں ناشتا کر کے آیا ہوں۔''

''میرا ساتھ تو دو۔'' جولیا نے اسے ایک کرسی کی طرف دھکیل دیا۔

مراد خان نے اپنے آپ پر قابو تو پا لیا تھا لیکن اس کا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ آخر یہاں کیا ہو رہا ہے بابا اپنے ساتھ ان فرنگیوں کو کیوں لے آئے تھے اور یہ فرنگی یہاں کے مالک کیوں بنتے جا رہے ہیں۔

کئی سوالات تھے لیکن جولیا اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دے رہی تھی، اس نے مراد خان کی طرف کافی بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مراد خان یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ شاید غلط بھی ہے اور صحیح بھی۔''

''دونوں باتیں ایک ساتھ کس طرح ہو سکتی ہیں؟'' مراد خان نے پوچھا۔

''اتفاق سے دونوں باتیں ایک ساتھ ہی ہیں۔'' جولیا نے کہا۔ ''میں اس وقت تمہیں نہیں سمجھا سکتی لیکن تمہیں سب بتا دوں گی حالانکہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن میں یہ ضرور کروں گی۔''

مراد خان نے کافی ختم کر لی تھی۔ ''اب چلیں؟'' اس نے دریافت کیا۔

''ہاں چلو لیکن کل صبح سے تم یہاں نہیں آؤ گے، میں خود تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔ تم کوئی جگہ بتا دینا۔''

☆☆☆

اس وقت سورج پوری طرح روشن ہو چکا تھا۔

اگرچہ صبح سے آسمان کو بادلوں نے اوجھل کر رکھا تھا لیکن اس وقت بادلوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ ہواؤں کے جھونکے ان بادلوں کو اڑا کر کہیں دور لے گئے تھے۔

میلے کے میدان میں ایک بہت بڑی جگہ خالی کر دی گئی تھی۔ یہاں شہباز خان نام کا ایک سیہ پوش سے مقابلہ ہونے والا تھا۔

داور خان نے دہری چال چلی تھی۔

دونوں صورتوں میں اس کا فائدہ تھا۔ وہ جس سیہ پوش سے اس اجنبی نوجوان کا مقابلہ کروانے والا تھا، وہ اس کے دستے کا سب سے طاقت ور اور غضب ناک آدمی تھا۔

اس کا جسم شاید لوہے اور پتھروں کی آمیزش سے بنایا گیا تھا۔ داور خان کو اس پر بہت ناز تھا لیکن پچھلے کچھ دنوں سے اس سیہ پوش کے تیور باغیانہ ہوتے جا رہے تھے۔

داور خان کو یہ سب پسند نہیں تھا لیکن وہ اسے راستے سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ اس طرح دوسرے سیاہ پوش اس کے خلاف ہو جاتے اسی لیے اس نے اس اجنبی کو اس سیاہ پوش سے لڑا دینے کا سوچا تھا۔

دوسری طرف وہ اجنبی بھی باغیانہ تیور کے ساتھ اس کے سامنے آیا تھا۔

پورے علاقے میں اس مقابلے کا ڈھنڈورا پیٹ دیا گیا تھا۔ لوگ صبح ہی سے اس خاص میدان میں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سیاہ پوش داور خان کے پاس ہی کھڑا تھا جب کہ اس اجنبی نوجوان اور اس چرب زبان کا ابھی تک کوئی پتا نہیں تھا۔

وہ دونوں اس وقت جلال بابا کے پاس تھے۔ جلال بابا اس وقت کچھ پڑھ رہا تھا کیونکہ اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد جلال بابا نے شہباز خان پر دم کرتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ بیٹا، خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے کیونکہ تم ایک نیک مقصد کے لیے جنگ کرنے جا رہے ہو۔''

''محترم بزرگ میرے لیے کوئی حکم؟'' شہباز خان نے پوچھا۔

''ہاں کوشش کرنا کہ تمہارے ہاتھوں اس کا خون نہ ہو۔'' جلال بابا نے کہا۔

''محترم بزرگ۔ میں نے آپ کا یہ حکم سن لیا۔'' شہباز خان ادب سے سر جھکا کر بولا۔ ''میری کوشش تو یہی ہو گی کہ میری وجہ سے کسی کا خون نہ ہو۔ اب اجازت دیں۔''

''ہاں، جاؤ فی امان اللہ۔''

شہباز خان اور سمندر خان دونوں نے باری باری جلال بابا کی دست بوسی کی اور غار سے باہر آ گئے۔ اب ان کے گھوڑے پوری رفتار سے میلے کے میدان کی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔

ان کے وہاں پہنچتے ہی ہر طرف ایک غلغلہ سا بپا ہو گیا۔ ''وہ دیکھو، وہ ہے چرب زبان اور وہ ہے اس کا ساتھی۔''

اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے داور خان کے پاس ہی مراد خان، جولیا اور رابرٹ بھی کھڑے تھے۔ مراد بہت دلچسپی سے اس شہ زور کو دیکھ رہا تھا۔ جس کا گھوڑا سیاہ پوش کے گھوڑے کے پاس آ کر رک گیا تھا۔ دونوں جنگ جو داور خان کی اجازت لینے کے لیے اس کے سامنے آئے۔

داور خان نے ہاتھ کے اشارے سے اجازت دے دی۔ دونوں کو تیز دھار نیزے دیے گئے تھے۔ دونوں اپنے اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے مخالف سمتوں میں چلے گئے۔

''اوہ ڈیڈ۔ یہ تو بالکل پرانی رومن فلموں جیسا دکھائی دے رہا ہے۔'' جولیا اس وقت بہت پُرجوش ہو رہی تھی۔

''ہاں، یہ جاہل لوگ ابھی تک ہزار سال پیچھے کے دور میں زندہ ہیں۔'' رابرٹ نے دھیرے سے کہا۔

جولیا اپنے باپ کو کوئی سخت جواب دینا چاہتی تھی لیکن اس نے اپنی توجہ ان دونوں کی طرف مرکوز کر دی۔ ان کے درمیان ایک خطرناک جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔

دونوں پینترے بدل بدل کر ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔ دونوں کے گھوڑے بہت تربیت یافتہ تھے۔ وہ ایک ذرا سے اشارے پر دوسرے کے زور سے باہر نکل جاتے۔ نیزوں کے ٹکرانے کی آوازیں چاروں جانب گونج رہی تھیں۔

پھر سیاہ پوش کے ہاتھ سے نیزا گر گیا۔ لوگوں نے داد و تحسین کے نعرے بلند کیے۔ اب کھیل ختم ہونے والا تھا لیکن کھیل ختم نہیں ہوا۔ نوجوان نے بھی اپنا نیزہ ایک طرف پھینک دیا۔

لوگوں نے سانسیں تک روک لی تھیں۔ اجنبی اپنے گھوڑے سے نیچے آ گیا۔ سیاہ پوش بھی جھلا کر گھوڑے سے اتر آیا۔ لوگوں نے صرف اتنا ہی دیکھا کہ دو پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرائے اور دوسرے ہی لمحے سیاہ پوش نیچے تھا جب کہ اجنبی نے اس کے سینے پر بیٹھ کر اپنے خنجر کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔

ہر طرف خاموشی طاری تھی اس خاموشی میں صرف سانسوں کی آوازیں تھیں۔ سیاہ پوش کی موت چند لمحوں کی دوری پر تھی لیکن وہ چند لمحے نہیں آ سکے۔ اجنبی نوجوان نے خنجر اپنے نیفے میں اڑس لیا تھا۔

اس نے سیاہ پوش کی جاں بخشی کر دی تھی۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسے چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ مجمع تالیاں بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ ہر طرف سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعرے گونج رہے تھے۔

''شاندار۔'' جولیا تالیاں بجا رہی تھی۔ ''ڈیڈ وہ ایک بہادر آدمی ہے۔''

''ہاں۔'' رابرٹ نے پُرخیال انداز میں گردن ہلائی۔ ''ایسے لوگ کبھی کبھی خطرناک بھی ہو جاتے ہیں۔''

نوجوان نے سیاہ پوش کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ دونوں داور خان کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔

''نوجوان کیا تو اس کی جاں بخشی چاہتا ہے؟'' داور خان نے پوچھا۔

''جی محترم سردار۔ یہ ایک بہادر انسان ہے اور جنگ کے میدان اور کھیل کے میدان میں فرق ہونا چاہیے۔ یہ اگر جنگ ہوتی تو اب تک اس کے شانے اس کے سر سے محروم ہو چکے ہوتے لیکن میں کھیل کو انتہا تک نہیں لے جانا چاہتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' داور خان غرایا۔ ''تجھے میں نے اپنے خاص دستے میں شامل کر لیا ہے لیکن اس سے کہہ دے کہ یہ یہاں کی سرحدوں سے کہیں دور چلا جائے اگر دوبارہ نظر آیا تو اس کی موت اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوگی۔''

☆☆☆

چرب زبان لہک لہک کر گا رہا تھا۔ ''وہ شہباز ہے، آسمانوں پر پرواز کرتا ہے لیکن اس کی نگاہیں زمین پر ہوتی ہیں اور پلک جھپکنے میں وہ اپنے شکار پر قابو پا لیتا ہے۔''

''اے چرب زبان اور تو کیا کرتا ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''میں اس شہباز کی آنکھیں ہوں۔ اسے دیکھ کر بتا دیتا ہوں کہ تیرا شکار کہاں ہے۔ اس کے کان ہوں۔ ہواؤں کا پیغام اس تک پہنچاتا ہوں۔''

وہ اس قسم کی باتیں کرتا رہا اور لوگ اس کی باتوں پر قہقہے لگاتے رہے۔

اس وقت بھی وہاں جگہ جگہ الاؤ روشن تھے۔ آج کا دن بہت اہم تھا۔ آج ایک ایسی کہانی وجود میں آئی تھی جو شاید برسوں تک دہرائی جاتی۔

ایک اجنبی نوجوان نے ایک سیاہ پوش کو بہت بڑی شکست دی تھی اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے سیاہ پوش کو معاف بھی کر دیا تھا۔ چھوڑ دیا تھا اس کو۔

چرب زبان سمندر خان اس وقت ایک الاؤ کے پاس بیٹھا ہوا لوگوں کو شہباز خان کی بہادری کی داستانیں سنا رہا تھا۔ اس نے اپنی طرف سے بھی نہ جانے کتنی کہانیاں اس میں شامل کر دی تھیں۔

شہباز خان اس چرب زبان کی چرب زبانی سے بے خبر اس وقت جلال بابا کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ وہ سیاہ پوش بھی تھا۔ وہ اس وقت نہایت عقیدت کے ساتھ بابا سے مخاطب تھا۔ ''بابا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس نوجوان کے پیچھے آپ ہیں۔ ورنہ میں اس کا مقابلہ کبھی نہیں کرتا۔ ویسے بھی اس کے اس احسان نے مجھے خرید لیا ہے۔''

''ایسا مت کہو۔'' شہباز نے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں کون ہوتا ہوں احسان کرنے والا۔ زندگی اور موت دینے والا تو پروردگار ہے۔''

''میرے بچو! تم دونوں خوش رہو۔'' جلال بابا کی آواز گونجی۔ ''یہاں ایک دوسرے سے دشمنی نہیں بلکہ محبت کرنی ہے تاکہ ہم ایک ہوکر اپنی دھرتی کو ان فرنگیوں سے نجات دلا سکیں۔''

''داور خان اس لیے مجھ سے ناراض رہتا ہے بابا۔'' سیاہ پوش نے بتایا۔ ''کیونکہ مجھے بھی فرنگیوں کی آمد پسند نہیں۔ میں دبی زبان سے ایک آدھ بار اظہار بھی کر چکا ہوں۔ اسی لیے شاید داور خان مجھے باغی سمجھنے لگا ہے۔''

''اور شاید اس لیے وہ اس بات پر خوش ہو گیا تھا کہ ایک شخص تمہارے مقابلے پر آگیا ہے۔'' شہباز خان نے کہا۔

''میرے بچو! اب یہ سوچو کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔'' جلال بابا نے پوچھا۔

''محترم بزرگ، یہ تو طے ہے کہ ہم فرنگیوں کو یہاں برداشت نہیں کر سکتے۔'' شہباز خان نے کہا۔ ''کیونکہ وہ اپنے ہمراہ صرف مشینیں نہیں لائے بلکہ ایک تہذیب بھی ساتھ لائے ہیں۔ جو ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔''

''بابا، اس کے علاوہ انہوں نے ہمارے پہاڑوں سے سونا بھی نکال لیا ہے۔'' سیاہ پوش نے انکشاف کیا۔

''کیا۔'' بابا جلال اور شہباز خان دونوں ہی چونک اٹھے۔ ''کیا کہہ رہے ہو، وہ سونا نکال رہے ہیں؟''

''جی بابا، میں چونکہ داور خان کے خاص دستے میں شامل تھا اس لیے یہ راز جانتا ہوں۔'' سیاہ پوش نے بتایا۔ ''سونے کا بہت تھوڑا سا حصہ داور خان کے پاس آیا ہے جبکہ زیادہ تر ان فرنگیوں نے اپنے وطن روانہ کر دیا ہے۔''

''اور عام لوگوں کے لیے۔''

''معاف کرنا بابا میں یہ لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ عام لوگوں کے لیے خراب قسم کی عورتیں منگوائی گئی ہیں۔ جو ناچ گا کر پوری نسل کو برباد کر رہی ہیں۔''

''اوہ!'' بابا جلال مضطرب ہو کر رہ گئے۔

غار میں مکمل خاموشی تھی...... اذیت پہنچاتی ہوئی خاموشی۔

''کیا ہم ان کا مقابلہ کر کے انہیں یہاں سے نہیں نکال سکتے؟'' جلال بابا نے پوچھا۔

''محترم بزرگ، بہت خوں ریزی کا اندیشہ ہے۔'' سیاہ پوش نے کہا۔ ''یہ لوگ اپنے ساتھ افرادی قوت بھی لائے ہیں اور ان کے پاس جدید قسم کا اسلحہ اور ہتھیار ہیں جبکہ ہمارے پاس ان کا مقابلہ کرنے کے لیے نیزے، تلواریں یا پرانی قسم کی رائفلیں ہیں۔ اس زمین پر بہت خون بہے گا بابا۔''

''اور داور خان بھی کھل کر ان کا ساتھ دے گا۔'' شہباز خان نے کہا۔ ''کیونکہ وہ اپنے آپ کو ان کے ہاتھوں فروخت کر چکا ہے۔''

''یہ مکار لوگ اسی انداز سے اپنا تسلط قائم کرتے ہیں۔'' جلال بابا نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ تہذیب کی جڑیں کھوکھلی کر دیتے ہیں۔''

''ہمیں ان کی مکاریوں کا جواب مکاری ہی سے دینا ہوگا بابا۔'' شہباز خان نے کہا۔

''وہ کس طرح؟''

''میرے دوست سمندر خان نے گھوم پھر کر بہت سی معلومات حاصل کر لی ہیں۔'' شہباز خان نے بتایا۔ ''اس نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ ان فرنگیوں کو لانے والا اور یہاں ان کا سربراہ رابرٹ نام کا ایک آدمی ہے۔ رابرٹ اپنے ساتھ اپنی بیٹی کو بھی لے کر آیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ اسے اپنے ساتھ کیوں لایا ہے لیکن سنا ہے کہ اسے اپنی بیٹی سے بہت محبت ہے۔ وہ اس کی ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتا۔''

''یہ بات تو ہے۔'' سیاہ پوش نے اس کی تائید کی۔ ''میں خود بھی ان دونوں کی محبت دیکھ چکا ہوں۔''

''تو پھر تمہارے ذہن میں کیا ہے میرے بچے؟'' بابا جلال نے شہباز خان سے پوچھا۔

''میرے محترم بزرگ یہ ہے تو بُری سی بات۔'' شہباز خان نے کہا۔ ''لیکن یہ ہم اپنے مقصد کے حصول کے لئے کریں گے۔ ہم اس لڑکی کو اغوا کر کے یرغمال بنا کر اپنے پاس رکھ لیں گے۔''

''نہیں، ہم کسی کمزور کو ڈھال بنا کر یہ جنگ نہیں لڑنا چاہتے......'' بابا جلال غصے سے بولے۔

''میرے محترم! یہ ہمیں خود بھی پسند نہیں ہے لیکن خون خرابے کے بغیر ان فرنگیوں کو یہاں سے نکالنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔'' شہباز خان نے کہا۔

بابا جلال سوچ میں پڑ گئے۔

''میرے محترم بزرگ، آپ کو اس بات کا اطمینان اور یقین کر لینا چاہئے کہ اس لڑکی کی عزت اور حرمت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔'' شہباز خان نے کہا۔

''تو پھر... ٹھیک ہے۔'' جلال بابا کے چہرے سے کدورت غائب ہو گئی۔ ''بس اسی شرط پر اجازت دی جا سکتی ہے۔''

''محترم بزرگ، میں نے تو ایک اور بات سوچی ہے۔'' شہباز خان کچھ دیر بعد بولا۔ ''اور وہ بات یہ ہے کہ ہم اسے اغوا کرنے کے بعد آپ کے حوالے کر دیں گے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک یہ کہ وہ آپ کی نگرانی میں رہے گی اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم زیادہ آزادی سے اپنا کام انجام دے سکیں گے۔''

''ہاں، یہ سب سے زیادہ مناسب رہے گا۔ تو پھر کب تک ارادہ ہے تمہارا؟''

''میرے بزرگ، ہم یہ کام کل ہی انجام دیں گے۔'' سیاہ پوش نے کہا۔ ''اور یہ کام میری بیوی انجام دے گی۔''

''تمہاری بیوی؟''

''جی ہاں، میری بیوی زرگل۔'' سیاہ پوش نے بتایا۔ ''داور خان نے اسے اس لڑکی کی خدمت پر مامور کروا دیا تھا۔ وہ کچھ دنوں سے ان لوگوں کے ساتھ اسی کیمپ میں رہتی ہے۔ وہ لڑکی میری بیوی پر بہت بھروسا کرنے لگی ہے۔ میری بیوی اسے اپنے ساتھ ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

مخصوص مقام پر لے آئے گی۔ جہاں ہمارے آدمی موجود ہوں گے اس طرح اسے اغوا کرلیا جائے گا۔"

"اس طرح تو خود تمہاری بیوی بھی لپیٹ میں آجائے گی؟"

"نہیں بابا!" اس بار شہباز خان نے کہا۔ "ہم نے اس کا بھی بندوبست کردیا ہے۔ اس کی بیوی کو باندھ کر ڈال دیا جائے گا۔ اس طرح کوئی اس پر شبہ نہیں کرسکے گا۔"

"کمال ہے۔" بابا جلال کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ "تم دونوں اس انداز سے کس طرح کام کرنے لگے ہو؟"

"بابا، یہ ساری سازش ہمارے دوست چرب زبان نے تیار کی ہے۔" شہباز خان نے بتایا۔ "وہ بہت ذہین وفطین قسم کا انسان ہے۔"

"تو پھر میں اس کی عقل کی سلامتی کے لیے دعائیں کرتا رہوں گا۔"

☆☆☆

مراد خان اور جولیا دونوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں ایک ایسی جگہ آگئے جہاں کچھ درخت دکھائی دے رہے تھے۔

جولیا ان بنجر پہاڑوں کے درمیان ایسی جگہ دیکھ کر بہت حیران ہورہی تھی۔ "مراد خان، کمال ہے۔ ایسی پر بہار جگہ ان پہاڑوں کے درمیان کہاں سے آگئی؟" اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میری محنت ہے۔" مراد خان نے بتایا۔ "میں نے یہاں درخت لگوائے، ان کی آبیاری کرتا رہا۔ یہ میرا شوق ہے اور جب بھی تنہا ہونا چاہتا ہوں تو یہاں گھنٹوں آکر بیٹھا رہتا ہوں۔"

اس کا مطلب ہے تمہاری محنت کی تعریف کرنی پڑے گی۔"

"میں نے یہاں اپنے لیے ایک چھوٹی سی کٹیا بھی بنا رکھی ہے۔" مراد خان نے بتایا۔ "تم بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھیں؟"

"چلو تمہاری کٹیا میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" جولیا نے کہا۔

جولیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کٹیا میں چائے بنانے کے سارے لوازمات موجود تھے۔ لکڑی کا چولہا بھی تھا۔ فرش پر مقامی طور پر تیار کیا ہوا قالین بھی بچھا ہوا تھا۔

مراد خان نے فوری طور پر چائے تیار کی۔ "یہ چائے ہمارے لئے بہت قیمتی ہوتی ہے میڈم۔" اس نے چائے کی پیالی جولیا کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "اب تم مجھے بتاؤ کہ تمہارے سینے میں کیا راز چھپا ہوا ہے؟"

"سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کہاں سے شروع کروں۔" جولیا نے کہا۔ "مراد خان، کیا تم یہ جانتے ہو کہ میرے ڈیڈ اور ان کے ساتھی یہاں سے کیا نکالنے کے لئے آئے ہیں؟"

"ظاہر ہے کہ سونا نکال رہے ہیں۔" مراد خان نے کہا۔

"نہیں، سونے سے بھی کئی لاکھ گنا زیادہ اہم دھات نکالی جارہی ہے۔" جولیا نے بتایا۔ "تمہیں شاید اس کے بارے میں نہیں معلوم۔ وہ مہلک قسم کے ہتھیار بنانے کے کام آتی ہے۔ اس سے جو بنایا جاتا ہے وہ ذرا سی دیر میں پورے کے پورے شہر کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔"

"اوہ خدا!" شہباز خان بے چین ہوگیا۔ "یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا تو پھر یہ سونا کیوں نکالا جارہا ہے۔"

"سونا نکال کر تمہارے باپ کو مطمئن کیا جارہا ہے جبکہ اندر ہی اندر کچھ اور ہورہا ہے۔"

"لڑکی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم لوگ ہمیں پوری طرح برباد کرنے کے لئے یہاں آئے ہو۔"

"ایسا ہی سمجھ لو۔" جولیا نے کہا۔ "یہ بہت اہم بات ہے۔ جو میں نے تمہیں بتادی ہے۔"

"لیکن کیوں بتائی ہے۔ تمہیں تو اپنے باپ اور اپنے ہم وطنوں کا ساتھ دینا چاہئے۔"

"یہ ایک دوسری کہانی ہے مراد خان۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا باپ ان ظالموں میں شامل ہوجائے جو بستیاں اجاڑ دیا کرتے ہیں۔ جو پوری نسل انسانی کو مفلوج کردیتے ہیں۔ مراد خان، ہر شخص کی فطرت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ میں ایک رومان پسند لڑکی ہوں۔ مجھے آسمان پر اڑتے بادلوں، پھولوں، کتابوں اور بچوں سے پیار ہے۔ مجھے رقص اور موسیقی سے محبت ہے اور خون خرابے سے نفرت ہے۔ میں اس دھات کے ذریعے بنائے ہوئے بموں کی تباہ کاریوں کی تصویریں دیکھ چکی ہوں۔ تم یقین نہیں کروگے کہ وہ کتنی بھیانک تصویریں ہیں۔"

"جولیا، تم مجھے خوفزدہ کررہی ہو۔" مراد خان نے کہا۔

"خوفزدہ نہیں کررہی، تمہیں حالات کی سنگینی کا احساس دلارہی ہوں۔ اچھا چلو یہ بتاؤ تم نے جنگیں لڑی ہیں۔ تم کیا کرتے ہو، تمہارے سامنے تمہارا دشمن تلوار لیے کھڑا ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ کیا کرتے ہو؟"

"اس دشمن کی گردن اڑا دیتا ہوں۔"

"بس یہی کرتے ہونا۔ یہ تو نہیں کرتے کہ اس کے ماں باپ، بھائی بہن اور بیوی بچوں کو ماردو بلکہ اس کے محلے والوں اور اس کے پورے شہر کو اڑا کر رکھ دو۔"

"نہیں، کوئی بھی ایسا نہیں کرسکتا۔ یہ ظلم ہے۔"

"لیکن وہ ہتھیار ایسا ہی ظلم کرتا ہے۔ پورے کے پورے شہر کو ایسی اذیت ناک موت دیتا ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

"جولیا، تم نے تو مجھے پریشان کردیا ہے۔"

"مراد خان۔ تم یہ ہرگز نہیں چاہو گے کہ تمہاری زمین سے ایسا مواد نکالا جائے جو پوری انسانیت کو برباد کرکے رکھ دے۔"

"نہیں، کبھی نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو نہ تو کبھی خدا ہمیں معاف کرے گا اور نہ ہمارے اجداد کی روحیں۔"

"لیکن ایسا ہی کچھ ہورہا ہے۔" جولیا نے کہا۔ "اور تمہارا باپ ان لوگوں کا آلۂ کار بن گیا ہے۔ وہ اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت میں یہ سب کررہا ہے۔"

"لیکن تم اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت میں شامل کیوں نہیں ہو؟"

"اس لیے کہ محض قوم اور اس کی محبت کی قیمت پوری انسانیت کی محبت سے زیادہ اہم نہیں ہوسکتی۔" جولیا نے کہا۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"کسی طرح اس سلسلے کو روکو۔ لیکن کم از کم تم سے اتنا تو میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ میرے باپ کو کوئی نقصان نہ ہو۔"

"جولیا، تم ایک اچھی لڑکی ہو۔" مراد خان نے کہا۔ "میرے دل میں تمہاری عزت بڑھ گئی ہے۔"

"کیا تم یہ جانتے ہو کہ میں نے تم سے دوستی اپنے باپ کے کہنے پر کی ہے؟" جولیا نے بتایا۔

"کیا؟" مراد خان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں مراد خان۔" جولیا نے ایک گہری سانس لی۔ "میرے باپ کو اندیشہ ہے کہ تمہیں اپنے باپ کی پالیسیاں پسند نہیں ہیں اور تمہارے تیور کچھ اور ہیں۔ تم اپنی زمین پر ہمارا وجود برداشت نہیں کرتے۔ اسی لیے اس نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے دوستی کروں اور تمہیں بھی اسی طرح قابو میں کرلوں جس طرح تمہارا باپ قابو میں آیا ہے۔"

"لیکن تم نے یہ سب بتا کر اپنے باپ سے عہد شکنی کی ہے۔" مراد خان مسکرادیا۔

"ہاں...... لیکن انسانیت کو بچانے کی کوشش کررہی ہوں۔" جولیا نے کہا۔ "اب میں نے سب کچھ تمہیں بتادیا ہے۔ اب تم اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق پالیسی بنا سکتے ہو۔"

"جولیا۔ یہ مسئلہ بہت سنجیدہ اور خطرناک ہے۔" مراد خان کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارا باپ اور اس کے ساتھی اگر وقتی طور پر یہاں سے چلے بھی گئے تو کیا پھر دوبارہ یہاں آنے کی کوشش نہیں کریں گے؟"

"اس کے بعد کی صورتِ حال اور زیادہ بھیانک ہے مراد خان۔" جولیا نے کہا۔ "اس دھات کی موجودگی کی اطلاع دنیا کے کئی اور ملکوں کو ہوچکی ہوگی اور وہ سب یہاں قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ پھر ایک ایسی جنگ شروع ہوجائے گی جس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔"

"پھر تو صورتِ حال اور خراب ہوجائے گی۔"

"ہاں...... بہت زیادہ۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔"

"مراد خان، تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔" جولیا نے کہا۔ "اور تمہیں سوچ سمجھ کر اس کا جواب دینا ہے۔ پہلا تو یہ کہ تمہیں صرف اپنی قوم سے دلچسپی ہوگی یا دنیا بھر کے انسانوں سے۔ اگر تمہیں صرف اپنی قوم سے دلچسپی ہے تو پھر کوئی بات نہیں۔ ہونے دو جو ہورہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہماری قوم تمہیں بہت کچھ دے کر جائے اور اگر تمہیں پوری انسانیت سے دلچسپی ہے تو پھر تمہیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔"

اس وقت مراد خان کو وہ لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ جو سات سمندر پار سے اپنے باپ اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ آئی تھی۔ لیکن اب وہ پوری انسانیت کی بات

WWW.PAKSOCIETY.COM

کر رہی تھی۔ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے نقصان کی پروا بھی نہیں کی تھی۔

"جواب دو مراد خان۔" جولیا نے کہا۔ چلو، یہ بتادو کہ اس سلسلے میں تمہارا مذہب کیا کہتا ہے؟"

"میرا مذہب تو یہ کہتا ہے کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔" مراد خان نے کہا۔

"تو بس اپنے مذہب کی روشنی میں فیصلہ کرلو۔"

"تم بتاؤ، کیا کروں میں؟" مراد خان نے کہا۔

"فی الحال تو میری عقل کام نہیں کررہی۔ میں تو اس وقت اس دنیا کو تمہاری آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ سوچنا پڑے گا۔" جولیا نے اس کی طرف دیکھا۔ "سوچنا پڑے گا کہ ہم کس طرح دنیا کو بچا سکتے ہیں۔ چلو آؤ اب واپس چلتے ہیں بہت دیر ہوگئی ہے۔"

"ہاں۔ باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔"

لیکن وہ زیادہ دور نہیں جاسکے تھے۔ ان کو تھوڑے ہی فاصلے پر کچھ گھڑ سواروں نے اپنے نرغے میں لے لیا۔ وہ سب کے سب مسلح افراد تھے۔

☆☆☆

وہ ایک وسیع وعریض غار تھا۔

دن ہونے کے باوجود اس غار میں اندھیرا تھا۔ اسے روشن رکھنے کے لئے قندیلیں روشن کی گئی تھیں۔ ان دونوں کو وہاں تک لانے والے اجنبی چہروں کے لوگ تھے۔

وہ سب انہی کے علاقوں کے تو تھے لیکن مراد خان کے لیے ان کے چہرے شناسا نہیں تھے۔ شاید اسی طرح وہ بھی مراد خان کو نہیں پہچانتے تھے۔

جولیا نے خوفزدہ انداز میں مراد خان کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور مراد خان اسے تسلی دے رہا تھا۔ "تم فکر مت کرو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ یہاں کے رہنے والے عورتوں کی عزت کرتے ہیں۔"

"لیکن یہ کون لوگ ہیں؟" جولیا نے پوچھا۔

"اور یہ ہمیں یہاں کیوں لائے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ کچھ دیر بعد ہمیں خود ہی پتا چل جائے گا۔" مراد خان نے کہا۔

مراد خان نے مقامی زبان میں ان میں سے ایک کو مخاطب کر کے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں اور ان سے کیا چاہتے ہیں لیکن وہ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے کہ وقت آنے پر انہیں خود ہی سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔

غار میں قدموں کی آہٹ گونجی اور کچھ لوگ اندر آگئے۔

ان دونوں نے ان آنے والوں میں سے تین کو شناخت کرلیا تھا۔ ایک تو وہی جیالا نوجوان تھا۔ جو ایک سیاہ پوش کو شکست دے کر خود سیاہ پوش بنا تھا اور دوسرا وہی سیاہ پوش تھا جس کو شکست ہوئی تھی اور تیسرا سمندر خان تھا۔ وہ چرب جس کی باتیں لوگوں کو ہنسایا کرتی تھیں اور جو عقل کا خزانہ تھا۔

شہباز خان نے بھی مراد خان کو پہچان لیا تھا۔

"او مراد خان۔ یہ تم ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہمارے آدمی تمہیں بھی اپنے ساتھ لے آئیں گے۔"

"اور یہ سب تمہارے آدمی ہیں۔" مراد خان نے غار میں موجود مسلح لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں۔" شہباز خان نے جواب دیا۔ "میرے آدمی مت کہو۔ یہ سب محبِ وطن اور محبِ قوم لوگ ہیں۔"

"اور تمہارے خیال میں کون ہوں؟" مراد خان نے پوچھا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ داور خان کا بیٹا۔" شہباز خان نے کہا۔ "وہ شخص جس نے اپنے مفاد کے لیے اپنی زمین اور اپنی غیرت کا سودا کرلیا ہے۔"

"میرے دوست، تم غلطی پر ہو۔" مراد خان نے کہا۔

"میری بات سنتے رہو۔" شہباز خان جلدی سے بولا۔ "میں اپنے قبیلے میں رہنے والا ایک آزاد منش انسان تھا۔ مجھے دولت اور سیاست وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو مویشیوں کا ایک سیدھا سادہ تاجر ہوں لیکن جب میں نے یہ سنا کہ ہماری زمین فرنگیوں نے اپنے قبضے میں کرلی ہے اور یہاں کی تہذیب اور روایات کا نیلام ہو رہا ہے تو پھر مجھ سے برداشت نہیں ہوسکا اور میں نے اپنے دوست سمندر خان کو یہاں کے حالات جاننے کے لیے روانہ کیا۔"

"میرا دوست شہباز ٹھیک کہتا ہے۔" سمندر خان نے کہا۔ "خود میرے سینے میں بھی آگ لگی ہوئی تھی۔ میں یہاں کے حالات معلوم کرتا رہا۔ اس لیے میں نے الم غلم چیزوں کی خرید و فروخت شروع کردی اور یہاں

کے حالات معلوم کرتا رہا اور مجھے یہ جان کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ اس علاقے کے ایک بہت بڑے بزرگ جلال بابا نے بغاوت کا پرچم بلند کردیا ہے کیونکہ انہیں یہ سب گوارا نہیں ہے۔"

"میں اپنے علاقے سے نکل کر یہاں آگیا۔" اب شہباز خان کہہ رہا تھا۔ "میں جلال بابا سے ملا اور ان کے آدمیوں میں شامل ہوگیا۔ پھر میں سیاہ پوش بنا اور وہ بھی اس لیے کہ داور خان کے قریب ہو کر اس پر نظر رکھ سکوں لیکن پھر یہ لڑکی سامنے آگئی۔" اس نے جولیا کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ خیال آیا کہ کیوں نا اس کو اغوا کرکے فرنگیوں پر واپسی کے لئے دباؤ ڈالا جائے۔ اس سلسلے میں ہم نے زرگل کی خدمات بھی حاصل کرلی تھیں۔"

"کون زرگل؟" مراد بول پڑا۔ "وہی جولیا کی خدمت پر مامور ہے۔"

"ہاں، وہ اس سیاہ پوش کی بیوی ہے جسے میں نے شکست دی تھی۔" شہباز خان نے بتایا۔ "سیاہ پوش بھی ایک محبِ وطن انسان ہے اور اب وہ ہمارے ساتھ شامل ہوگیا ہے۔ خیر...... تو زرگل کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور تم دونوں اچانک ہمارے آدمیوں کے سامنے آگئے اور اب ہمیں دہرا فائدہ ہوا ہے۔ ایک طرف تو ہم فرنگیوں پر دباؤ ڈال سکیں گے اور دوسری طرف داور خان پر کیونکہ اس کا بیٹا ہمارے قبضے میں ہے۔"

"لیکن افسوس کہ تم نے دونوں غلط آدمیوں کا انتخاب کیا ہے۔" مراد خان کھڑا ہوگیا۔

"وہ کس طرح؟"

"وہ اس طرح کہ ہم بھی کسی طرح تم سے الگ نہیں ہیں۔" مراد خان نے بتایا۔

"ہم سے کیا مراد ہے تمہاری؟"

"یعنی میں اور یہ لڑکی؟" مراد خان نے جولیا کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں بے وقوف بناتے ہو۔ تم ایک دشمن لڑکی کے لیے یہ کہہ رہے ہو کہ وہ بھی ہم میں شامل ہے؟"

"میں بتاتی ہوں تم لوگوں کو۔" جولیا کھڑی ہوگئی۔

پھر اس نے وہ سب کچھ بتادیا جو وہ مراد سے کہہ چکی تھی۔ شہباز خان کے ساتھی اس کی بات اس طرح سمجھ سکے تھے کہ مراد خان جولیا کی باتوں کا ترجمہ کرتا جارہا تھا۔

شہباز خان نے اس کی باتیں دوسروں کو بھی بتادیں۔

اب غار میں مکمل سناٹا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوگیا۔

"میرے خدا! یہ تو بہت خطرناک صورتِ حال ہے۔" شہباز خان نے کہا۔

"ہاں۔" مراد خان نے اس کی تائید کی۔ "اب معاملہ صرف میری قوم کا نہیں رہا بلکہ پوری دنیا بھر کے انسانوں کا ہوگیا ہے۔"

"لیکن ہمیں دنیا بھر کے انسانوں سے کیا لینا دینا۔" سمندر خان جو اتنی دیر سے خاموش تھا، اچانک بول پڑا۔ "میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ ہماری ترقی کے لیے ایک بہت زبردست راستہ نکل آیا ہے۔"

"وہ کس طرح؟" وہ سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"اس لڑکی کے مطابق اگر وہ دھات اتنی ہی قیمتی ہے تو ہم فرنگیوں کو اسے نکالنے کی اجازت تو دیں لیکن اسے اپنی زمین سے باہر نہ لے جانے دیں۔"

وہ کچھ اور کہنے والا تھا کہ ایک ہلچل سی مچ گئی۔ جلال بابا غار میں داخل ہو رہا تھا۔ سب اسے دیکھ کر ادب سے کھڑے ہوگئے۔

وہ مراد خان کو پہچانتا تھا۔ مراد خان نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ "بیٹا، تم...... تم یہاں کیسے۔" بابا جلال نے پوچھا۔

مراد خان نے مختصر الفاظ میں بابا کو اب تک کی پوری کہانی سنادی۔ "جزاک اللہ۔" جلال بابا نے پیار سے جولیا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "یہ لڑکی مجاہدہ ہے۔ یہ جو کچھ بھی کررہی ہے، اس کا اجر خدا ضرور دے گا۔"

"بابا، سمندر خان کی ایک تجویز سامنے آئی ہے۔" شہباز خان نے کہا۔ "پھر اس نے وہ تجویز بتادی۔

"نہیں، یہ غلط ہے۔" جلال بابا نے کہا۔ "یہ مت سمجھو کہ وہ ہتھیار طاقت ور قوموں کے خلاف استعمال ہوگا۔ نہیں، بلکہ اسے ہم جیسے غریب اور کمزور لوگوں پر آزمایا جائے گا۔ ہم یہ گوارا نہیں کرسکتے کہ ہم صرف اپنی قوم کی خوشحالی کے لیے پوری عالمِ انسانیت کو برباد کردیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

جولیا کو جلال بابا کی یہ بات ترجمہ کر کے بتادی گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر جلال بابا کے ہاتھوں کو اسی عقیدت اور احترام کے ساتھ بوسہ..... دیا تھا جس احترام اور عقیدت کے ساتھ شہباز اور مراد خان نے دیا تھا۔

''اب میں ایک تجویز پیش کرتی ہوں۔'' جولیا نے کہا۔ ''اور وہ تجویز وہی ہے جو تم لوگوں نے پہلے سوچی تھی۔ یعنی مجھے یرغمال بنالینا۔ میں اپنی خوشی سے یہاں رہنے کے لیے تیار ہوں۔''

☆☆☆

کیمپ میں ہلچل مچ گئی۔

جولیا اور مراد خان صبح سے غائب تھے اور اب شام ہونے والی تھی۔ خود داور خان بھی کیمپ پہنچ گیا تھا۔ اس نے ان دونوں کی تلاش میں سیاہ پوشوں کو دوڑا دیا تھا جو چاروں طرف ان دونوں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

شام کے بعد انہیں پتا چلا کہ ان دونوں کو چند نامعلوم افراد اٹھا کر لے گئے ہیں۔

یہ ایک بہت بڑی خبر تھی۔

اس علاقے میں ایسا کون ہوسکتا ہے ''جس نے اتنی بڑی حرکت کی ہو۔'' داور خان زخمی شیر کی طرح دہاڑ رہا تھا۔ اسے اپنے بیٹے مراد خان سے بہت محبت تھی۔ وہ اس کی اکلوتی اولاد تھا۔ بیوی کی موت کے بعد اس نے ماں بن کر مراد خان کی پرورش کی تھی۔ اور اب اس کی اپنی حکمرانی میں کون اس کے بیٹے کو اٹھا لے گیا تھا۔

داور خان کی نسبت رابرٹ کچھ پُرسکون تھا۔

پریشان تو وہ بھی تھا لیکن اس نے اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ اب ہر طرف اندھیرا ہونے لگا تھا کہ انہیں وہ شخص کیمپ کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا جو پہلے داور خان کے سیاہ پوش دستے میں شامل تھا اور جسے اس اجنبی نوجوان نے مقابلے میں شکست دی تھی۔

اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر زخموں کے نشانات تھے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ جیسے زخمی حالت میں دور سے سفر کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہو۔

''کیا بات ہے شامل خان؟'' داور نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔''

''سردار۔ میں ان دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔'' شامل خان نے بتایا۔

''کن دونوں کو؟''

''چھوٹے سردار اور فرنگن لڑکی کو۔''

''کہاں ہیں وہ دونوں؟'' داور خان نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''میں نہیں جانتا سردار کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟'' شامل خان نے جواب دیا۔

''شامل خان، کیوں نہ تیری گردن اڑا دی جائے۔ تو یہ کیا الٹی سیدھی بکواس کر رہا ہے۔''

''محترم سردار، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کہانی کیا ہے۔''

''جلدی بتا۔''

''سردار میں اپنے گھوڑے پر سوار مغربی پہاڑوں کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک کچھ لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ وہ سب نقاب پوش تھے سردار اور ان کی تعداد ایک درجن کے قریب ہوگی۔ وہ سب مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں بھی ان کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ چار پانچ کو تو میں نے زیر کرلیا پھر کسی نے عقب سے میرے سر پر وار کیا اور میں ڈھیر ہوگیا۔ میرے گرتے ہی انہوں نے مجھے دبوچ لیا اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔'' شامل خان اپنے سر کو اس طرح ٹٹولنے لگا جیسے اب تک تکلیف محسوس کر رہا ہو۔

''جلدی جلدی بتا شامل خان۔''

''سردار، نیم بے ہوش ہونے کے باوجود مجھے اتنا اندازہ تھا کہ گھوڑا بہت دیر تک چلتا رہا ہے۔ پھر جب میری آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی تو میں ایک غار میں تھا اور چھوٹے سردار اور وہ لڑکی بھی وہیں تھے اور ان کے چاروں طرف درجنوں نقاب پوش تھے۔''

''کس حال میں تھے وہ دونوں؟'' رابرٹ نے پوچھا۔

''بہت برا حال تھا جناب۔ دونوں کو رسیوں سے جکڑ کر باندھ دیا گیا تھا۔''

''لیکن کیوں؟''

''ابھی بتاتا ہوں سردار۔'' شامل خان نے کہا۔ ''انہوں نے آپ لوگوں کے لئے ایک پیغام دے کر بھیجا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ان کا مطالبہ نہیں مانا گیا تو وہ ان دونوں کی گردنیں اڑا دیں گے۔''

''اور وہ پیغام کیا ہے؟''

''پیغام یہ ہے کہ فرنگی ایک ہفتے کے اندر اندر اپنا سارا سامان لے کر یہاں سے چلے جائیں۔'' شامل خان نے کہا۔ ''اور انہوں نے اب تک یہاں کی زمین سے جو کچھ نکالا ہے، اس کو یہیں چھوڑ جائیں۔ وہ اپنے ساتھ ان عورتوں کو بھی لے جائیں جنہیں بے حیائی کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔''

سب طرف سناٹا ہوگیا تھا۔ شامل خان بہت ہی بے رحم قسم کا پیغام لے کر آیا تھا۔

''داور خان اس سے پوچھو کہ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو پھر وہ کیا کریں گے؟'' رابرٹ نے کہا۔

''پھر وہ نہ صرف ان دونوں کو مار دیں گے بلکہ یہاں موجود سارے فرنگی بھی مار دیے جائیں گے۔'' شامل خان نے بتایا۔

''ہمیں مارنا آسان نہیں ہوگا۔'' رابرٹ نے کہا۔

''ہوسکتا ہے جناب۔ لیکن میں ان کی طاقت دیکھ کر آیا ہوں۔ انہوں نے یہ سب مجھے اس لیے دکھایا ہوگا کہ میں آپ لوگوں کو سب کچھ بتا سکوں۔''

''کیا طاقت ہے ان کی۔'' داور خان نے پوچھا۔

''ہزاروں جوان ان کے ساتھ ہیں سردار۔'' شامل خان نے بتایا۔ ''میں نہیں جانتا کہ وہ لوگ کہاں سے آئے ہیں۔ کئی قبیلوں کے ہیں لیکن میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد ہزاروں میں ہے اور ان کے پاس ایسی ایسی بندوقیں ہیں جو میں نے کبھی نہیں دیکھیں۔''

''کمال ہے۔'' داور خان مضطرب ہوگیا۔ ''اتنے لوگ اتنی خاموشی سے یہاں کس طرح جمع ہوگئے؟''

''پہاڑوں کے پیچھے سیکڑوں میل تک صحرا پھیلا ہوا ہے سردار۔ پھر پہاڑوں کے سلسلے ہیں۔ نہ جانے کتنی آبادیاں ہوں گی۔ لگتا ہے سب ہی اکٹھی ہوگئی ہیں۔''

''رابرٹ کیا کہتے ہو تم؟'' داور خان نے رابرٹ سے پوچھا۔

''میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اپنے آدمیوں سے مشورے کے بعد جواب دوں گا۔''

''شامل خان۔ تم یہ بتاؤ تم ہمارا جواب کس طرح ان تک پہنچاؤ گے؟'' داور خان نے پوچھا۔

''مجھے پھر اس جگہ جانا ہوگا سردار۔'' شامل خان نے بتایا۔ ''وہاں سے وہ لوگ پھر میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس غار تک لے جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے تو پھر کل صبح کا تم بھی انتظار کرو اور ہمیں بھی انتظار کرنا ہے۔''

☆☆☆

دوسری صبح داور خان سویرے ہی کیمپ پہنچ چکا تھا۔ یہاں سیاہ پوش شامل خان بھی تھا جسے پیغام لے کر جانا تھا۔ رابرٹ بھی تھا اور اس کے ساتھ دوسرے فرنگی بھی تھے۔

داور خان کو ہر حال میں اپنے بیٹے کی واپسی درکار تھی۔ اب اس کی نگاہیں رابرٹ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

''داور خان۔'' بالآخر رابرٹ نے بولنا شروع کیا۔ ''جولیا میری اکلوتی اولاد ہے۔ میں بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی تمہیں اپنے بیٹے مراد خان سے ہوگی۔ لیکن تاریخ میں نام بنانے اور اپنی قوم کی نگاہوں میں خود کو سرخرو کرنے کے لیے مجھے اس سے اچھا موقع اور نہیں ملے گا۔ اس لیے میں ان لوگوں کی شرائط ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ چاہے جولیا واپس آئے یا نہ آئے۔''

شامل خان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی جبکہ وہاں موجود لوگوں میں سنسنی سی پھیل گئی تھی۔

''لیکن مجھے اپنا بیٹا واپس چاہیے۔'' داور خان نے کہا۔

''اس کے لیے تم اپنے طور پر ان لوگوں سے سودے بازی کرسکتے ہو۔'' رابرٹ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اور یہ یاد رکھو کہ یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ تمہاری بات مان لینے کے بعد وہ لوگ تمہارا بیٹا واپس کردیں۔''

''وہ واپس کریں گے کیونکہ ہماری طرف کے لوگ بدعہد نہیں ہوتے۔'' داور خان نے کہا۔ ''وہ جو کچھ کہہ دیں، اس پر قائم رہتے ہیں۔ چاہے انہیں کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو رہا ہو۔''

''تو پھر تم اب کیا چاہتے ہو؟'' رابرٹ نے پوچھا۔

''یہی کہ تم لوگ واپس چلے جاؤ۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہم نے تم سے دس سال کا ایگری منٹ کیا ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''اس سے پہلے ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ اس کے علاوہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہم نے یہاں اپنا پورا سیٹ اَپ بنالیا ہے۔ لاکھوں پاؤنڈز خرچ ہوچکے ہیں۔ نہیں داور خان ہم اتنا بڑا نقصان برداشت نہیں کرسکتے۔"

"لیکن میں وہ معاہدہ منسوخ کرتا ہوں۔"

"تم یہ بھی نہیں کرسکتے۔" رابرٹ نے کہا۔ "عقل سے کام لو داور خان۔ تمہارا بیٹا تو اب ہاتھ سے گیا۔ اب تم اپنا دوسرا نقصان کیوں کررہے ہو؟"

"رابرٹ، میں یہ سب نہیں جانتا۔" داور خان غصے سے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کا یہ مطالبہ ناجائز نہیں ہے۔ انہیں احساس ہوگیا ہے کہ تم لوگ اس زمین کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کررہے ہو۔"

"اوہ۔ تو اب تمہارے بھی تیور بدل رہے ہیں۔"

"ایسا ہی سمجھ لو۔ میں تمہیں کل تک کی مہلت دیتا ہوں۔ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔ اس طرح خود تمہاری بیٹی بھی تمہیں واپس مل جائے گی۔"

"میں نے کہا ناکہ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔" رابرٹ نے کہا۔ "میں تاریخ میں اپنا نام رقم کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم لوگ واپس نہیں جاؤ گے۔" داور خان نے پوچھا۔

"داور خان۔ تم اپنے بیٹے کو کسی اور طریقے سے رہا کرانے کی ترکیب کیوں نہیں سوچتے۔ تم ہمارے جانے کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"

"کیونکہ شاید اب میں نے بھی محسوس کرلیا ہے کہ تم لوگوں کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔" داور خان نے کہا۔ "یہاں کے لوگ بغاوت پر اتر آئے ہیں۔ آج ایک معاملہ ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کل دوسری مصیبت کھڑی ہوجائے۔ اس لیے میری اور تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔"

رابرٹ گہری نگاہوں سے داور خان کو دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

کئی خبریں ایک ساتھ آئی تھیں۔

ایک خبر تو یہ تھی کہ رابرٹ کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ اس کی بیٹی کس کے قبضے میں ہے۔ اسے تاریخ میں اپنا نام زندہ رکھنے کی فکر تھی۔

دوسری خبر یہ تھی کہ فرنگیوں نے وہاں سے جانے سے انکار کردیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ دس سالہ معاہدے کے طور پر وہاں آئے ہیں اور دس سال کے بعد ہی جائیں گے۔

تیسری سب سے اہم خبر یہ تھی کہ داور خان اور رابرٹ کے درمیان شدید اختلافات شروع ہوگئے ہیں داور خان کے آدمیوں نے پورے کیمپ کا محاصرہ کرلیا تھا۔ لیکن رابرٹ اور اس کے فرنگی ساتھی اپنے جدید ترین ہتھیاروں کے ساتھ ان کے سامنے آگئے۔

اس علاقے میں کسی وقت بھی ایک خوفناک جنگ شروع ہوجاتی۔ یہ جنگ تہذیب اور زمین کی حفاظت کرنے والوں اور دوسری طرف جدید ٹیکنالوجی والوں کے درمیان تھی اور اس کا انجام کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔

اس وقت اس غار میں جلال بابا، شہباز خان، مراد خان، جولیا اور شامل خان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ تھے اور یہی سوال گردش کررہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔

"محترم بزرگ۔" مراد خان نے جلال بابا سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم سب کو یہاں سے نکل کر بابا کا ساتھ دینا چاہیے۔ کیونکہ اب ان کو عقل آگئی ہے۔ ان کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔"

"اب ساتھ دینے کے بعد کیا کرنا ہوگا؟"

"جنگ، صرف جنگ...... کیونکہ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"نہیں مراد خان بالکل بھی نہیں۔" جولیا نے کہا۔ "تم لوگ یہ جنگ صرف اپنے جذبے سے نہیں جیت سکتے۔ کیونکہ ہمارے پاس پرانی رائفلوں، تلواروں اور نیزوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور دوسری طرف ایسے ہتھیار ہیں کہ تم جن کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ذرا سی دیر میں ہر طرف لاشیں ہی لاشیں ہوں گی۔"

"یہ لڑکی ٹھیک کہہ رہی ہے۔" جلال بابا کی آواز گونجی۔ "ہمارے پاس وہ وسائل و ہتھیار نہیں ہیں۔ پھر یہ شیطان اپنے ساتھ لے کر آئے ہوں گے۔ یہ جدید مہارت اور پرانے انداز کی جنگ ہوگی۔ افسوس ہم نے کبھی اس بات پر دھیان ہی نہیں دیا۔ ہم آپس کے جھگڑوں میں الجھے رہے جبکہ ہمارا قرآن یہ کہتا ہے کہ دشمن سے جنگ کے لیے اپنے آپ کو ہر وقت جدید اسلحے سے مسلح رکھو۔ لیکن ہم کیا کرتے رہے...... اور دشمن ہماری زمین تک چلا آیا۔"

"بابا۔ پھر یہ بتائیں کہ ہم کیا کریں؟"

"مراد، تم یہ جنگ رکوانے کی کوشش کرو۔" جولیا نے کہا۔ "ورنہ بہت بڑی تباہی آئے گی۔"

"ہاں، کہو کیا کہتے ہو؟"

"میں نے ان علاقوں میں آوارہ گردی کرتے ہوئے اپنا وقت برباد نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ کانیں کہاں کہاں کھودی جارہی ہیں۔ پورا نقشہ میرے ذہن میں ہے اور جب ایک بار یہ کانیں برباد ہوجائیں تو پھر فرنگیوں کے یہاں رکنے کا کوئی جواز بھی نہیں ہوگا؟" سمندر خاں نے انکشاف کیا۔

"لیکن یہ کانیں کیسے برباد ہوں گی؟" جلال بابا نے پوچھا۔

"پانی محترم بزرگ...... صرف پانی کیونکہ پانی بہت سے دکھوں کا علاج ہے۔"

"کھل کر بات کرو۔" شہباز خان جھلا گیا۔

"ہمارے علاقے کا اکلوتا پرشور دریا ان ہی کانوں کی طرف سے کتراتا ہوا گزر جاتا ہے تو ہم اسے کترانے کی اجازت کیوں دیں۔ کیوں نہ کانوں میں داخل کردیا جائے۔ صرف اس کا راستہ بدلنے کی دیر ہے۔"

اس کی بات سن کر سناٹا ہوگیا تھا۔

سب سوچ میں پڑ گئے۔ "خدا کی قسم، اس آدمی نے شیطان کا دماغ پایا ہے۔" مراد خان نے کہا۔

"شیطان کا نہیں انسان کا۔" سمندر خان جلدی سے بولا۔

"یہ سب سے اچھی ترکیب ہوگی۔" جولیا بھی بول پڑی۔ "کانوں کے بےکار ہوجانے کے بعد پھر ان کی ساری محنت بےکار ہوجائے گی اور وہ یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوجائیں گے۔"

"اور وہ جنگ جو بابا اور فرنگیوں کے درمیان ہونے والی ہے، اس کا کیا ہوگا؟" مراد خان نے پوچھا۔

"میں نے اس کے لیے بھی ترکیب سوچ لی ہے۔" سمندر خان نے کہا۔ "اس کے لیے سردار کو تھوڑی اداکاری کرنی ہوگی۔ انہیں رابرٹ سے یہ جاکر کہنا ہوگا کہ ان کی سمجھ میں ساری بات آگئی ہے۔ اگر مراد خان کی زندگی ہے تو خدا اسے زندہ رکھے گا ورنہ جو خدا کی مرضی۔ وہ رابرٹ سے کہیں گے کہ وہ پھر سے فرنگیوں کے ساتھ ہیں۔ وہ لوگ اپنا کام کرتے رہیں بس صرف ایک ہفتہ چاہیے۔ صرف ایک ہفتے کی محنت کے بعد ہم اپنے دریا کا رخ بدل دیں گے، اس کے بعد سب کام ہماری مرضی کے مطابق ہی ہوگا۔"

☆☆☆

داور خان بہت پریشان تھا۔

وہ جانتا تھا کہ رابرٹ اور اس کے ساتھی کیسے ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ وہ چالاک لوگ بڑی ہوشیاری سے اپنے لڑاکے بھی اس علاقے میں لے آئے تھے۔

داور خان کے پاس بھی بے شمار نوجوان تھے۔ ایک سے ایک جیالا۔ زندگی اور موت کے کھیل سمجھنے والے۔ اس کے باوجود داور خان جانتا تھا کہ وہ ان فرنگیوں کا مقابلہ نہیں کرسکے گا۔ اس نے کئی مقام پر جدید ہتھیاروں کی تباہ کاریاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔

ذرا سی دیر میں ان کا پورا قبیلہ خاک اور خون میں نہا جاتا۔

اسے کئی پریشانیاں ایک ساتھ لاحق ہوگئیں۔ پہلی بات تو یہی تھی کہ اس کے علاقے پر کسی اور کا تسلط ہوتا جارہا تھا اور دوسری پریشانی اسے اپنے بیٹے مراد خان کی تھی جو نہ جانے کس حال میں ہوگا۔

مراد خان جن لوگوں کے قبضے میں تھا، وہ بھی آسان لوگ نہیں تھے۔ انہوں نے داور خان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ مراد خان اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ شیروں کا شیر لیکن اس وقت وہ شیر قید میں تھا۔

داور خان کے ساتھ ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ اسے اپنے آس پاس ایسا کوئی آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا جس سے وہ مشورہ لیتا۔

ان فرنگیوں نے دور تک اور بڑی ہوشیاری سے اپنے جال بچھا رکھے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے کون اس کا اور اپنی زمین کا وفادار ہے اور کون فرنگیوں سے ملا ہوا ہے۔

وہ ایک ایسے عذاب میں تھا جس سے نکلنا فی الحال اس کے بس کی بات نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

تلخ قہوے کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ یہی سب سوچ رہا تھا کہ کسی نے آکر بتایا۔ "سردار وہ مسخرہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"کون مسخرہ؟" داور خان نے اس کی طرف دیکھا۔

"وہی جو میلے میں سامان فروخت کرتا اور بڑی بڑی باتیں بناتا ہے۔" اطلاع دینے والے نے بتایا۔

"جاؤ اس سے کہہ دو کہ میں اس وقت کسی سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں ملنا چاہتا۔“
”لیکن سردار وہ ہر حال میں ملنا چاہتا ہے۔“
داور خان نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اجازت دے دی۔ ”جاؤ بلا کر لاؤ۔ کیا بکواس کرنے آیا ہے؟“
چند لمحے بعد سمندر خان اس کے سامنے کھڑا تھا۔
”کیا بات ہے تو مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟“ داور خان نے پوچھا۔
”سردار بات شروع کرنے سے پہلے میں ذرا اطمینان کرلوں کہ دیواروں کے پاس کان تو نہیں ہیں۔“ سمندر خان دروازے کے آس پاس جھانکتا ہوا بولا۔
داور خان اسے حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔
”ٹھیک ہے سردار۔ اب بات ہو سکتی ہے۔“ سمندر خان نے کہا۔
”کیا کوئی ایسی بات ہے جس کے لیے تو اتنی احتیاط کر رہا ہے؟“
”جی ہاں سردار، معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔“ سمندر خان دھیرے سے بولا۔ ”پہلی بات تو یہ بتا دوں کہ تمہارا بیٹا مراد خان بہت مزے میں ہے۔ وہ اس وقت جلال بابا کی پناہ میں ہے۔“
”کیا کہہ رہا ہے تُو؟“
”جی ہاں سردار۔ اب تم اطمینان اور توجہ سے میری پوری بات سن لو۔ پھر تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔“ سمندر خان نے اسے اب تک کی ساری بات بتا دی تھی۔
”سمندر خان، تُو میرے لیے بہت بڑی خبر لے کر آیا ہے۔“ داور خان نے کہا۔
”بس سردار تم جا کر رابرٹ سے یہی کہو۔ اسے یقین دلا دو کہ تمہیں فرنگیوں کا ساتھ دینا ہے اور تمہارا بیٹا مراد خان ایک سرپھرا اور باغی نوجوان ہے۔ تمہیں اس کی پروا نہیں ہے۔ اس طرح دس پندرہ دنوں کی مہلت مل جائے گی اور ان دنوں میں ہم اپنا کام کر دکھائیں گے۔“
”سمندر خان، ہم نے اب تک کوئی جنگ اس طرح نہیں لڑی؟“
”لیکن اب لڑنی ہوگی سردار۔“ سمندر خان نے کہا۔ ”کیونکہ یہ مکار لوگ ہیں اور مکاری کا جواب مکاری ہے۔“
”تو کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ رابرٹ اور اس کے ساتھی میری باتوں میں آجائیں گے؟“
”اس کے لیے آپ کو زبردست اداکاری کرنی ہوگی سردار۔“ سمندر خان نے کہا۔ ”انہیں یقین دلانا ہوگا کہ آپ ان کے ساتھ ہیں۔ اس دوران میں ہم اپنا کام دکھا دیں گے۔“
”تو ایک عقل مند انسان ہے سمندر خان۔“
”شکریہ سردار۔ بس آپ اپنا کام کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔“

☆☆☆

جولیا پر یہاں کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ وہ جہاں چاہے جا سکتی تھی بلکہ وہ اگر اپنے آدمیوں میں بھی جانے کی خواہش ظاہر کرتی تو اسے عزت و احترام کے ساتھ بھیج دیا جاتا۔
لیکن اسے کہیں نہیں جانا تھا۔
لندن سے شروع ہونے والا یہ سفر ان اجنبی پہاڑوں کے درمیان آکر ختم ہو گیا تھا۔
اور یہاں آکر اسے احساس ہو رہا تھا کہ زندگی کتنی مختلف ہوتی ہے۔ ایک تصویر سچی دکھائی دیتی ہے پھر وہی تصویر کچھ اور ہو جاتی ہے۔
اس کا باپ رابرٹ یہاں آکر کچھ اور ہو گیا تھا۔ اجنبی سا۔ صرف اپنے مفاد کو سامنے رکھنے والا جبکہ یہاں کے سخت دل اور محنت جاں جفاکش لوگ کتنے مہربان روپ میں اس کے سامنے آئے تھے۔ شہباز خان، مراد خان اور جلال بابا ان کے ساتھ یہ سب کیسے لوگ تھے۔
ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم۔ رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن۔ یہ بڑے لوگ تھے اور وہ ان ہی لوگوں کے درمیان روز و شب بسر کر رہی تھی۔
یہ سب غیر تھے۔ اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا نہ تو یہ اس کے ہم زبان تھے نہ ہم مذہب اور نہ ہی ہم نسل۔ اس کے باوجود جولیا اور ان کے درمیان ایک تعلق قائم ہو گیا تھا۔
اب ایک نئی کشمکش اس کے سامنے تھی۔
ایک طرف اسے مراد خان کا رویہ اچھا لگتا تھا تو دوسری طرف شہباز خان کی وجاہت اور مردانگی نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔
شہباز خان سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں تھا صرف دو چار بار کی ملاقات تھی لیکن مراد خان کچھ دن اس کے ساتھ رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ گھومتا رہا تھا۔ اس نے جولیا کو اپنے خوابوں اور نظریات کے بارے میں بتایا تھا۔ دوسری طرف جولیا نے بھی اس سے اپنی ہر بات کہہ دی تھی۔
اسی لیے جولیا خود کو ذہنی طور پر اس سے زیادہ قریب محسوس کرنے لگی تھی لیکن اسے فی الحال یہ سب سوچنے کا موقع کہاں ملا تھا۔ یہاں تو صورتِ حال ہی کچھ اور ہو گئی۔
پھر جلال بابا تھے جنہیں دیکھ کر جولیا کو گھنی چھاؤں کا احساس ہونے لگتا تھا۔ کیسی معصوم اور شفقت بھری مسکراہٹ تھی ان کے ہونٹوں پر۔
وہ شخص اس عمر میں اپنی زمین، اپنی ثقافت اور اپنے مذہب کو بچانے کے لیے تلوار ہاتھ میں لے کر جدید ہتھیاروں کے مقابلے پر نکل آیا تھا۔ اس کے اسی جذبے نے جولیا کو بے حد متاثر کیا تھا۔
جولیا کو اب دھوپ ستانے لگی تھی۔ وہ ایک اونچی سی چٹان کے سائے میں آکر بیٹھ گئی۔ حدِ نظر تک بنجر پہاڑ اور سنگلاخ زمینوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔
”اوپر آسمان بالکل صاف تھا، سورج کی کرنیں براہِ راست چٹانوں پر گر کر انہیں انگاروں کی طرح دہکا رہی تھیں۔ بے کراں آسمان کے پیش منظر میں کچھ پرندے پرواز کرتے پھر رہے تھے۔ بس ان کے سوا وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ازلی خاموشی، ابدی سکون۔
وہ پانی کی بوتل اپنے ساتھ لائی تھی۔ پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ایک ہی سانس میں آدھی بوتل خالی کر ڈالی۔ اسی وقت اچانک کسی سائے نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔
وہ ایک قبائلی تھا۔
وہ صرف اکیلا ہی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو اور بھی تھے۔ اسی کی طرح لمبے چوڑے اور درشت چہرے والے لوگ۔
وہ جولیا کو گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔
جولیا نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ بری طرح خوفزدہ ہو چکی تھی۔ یہ لوگ مراد خان اور شہباز خان اور جلال بابا کی طرح نہیں تھے بلکہ یہ کسی اور طور کے لوگ تھے۔
ایک قبائلی آگے بڑھا۔ ”تو جولیا ہے نا فرنگی رابرٹ کی فرنگی اولاد۔“
”ہاں۔“ جولیا نے گردن ہلا دی۔ ”تم کون ہو؟“
”میرا نام دلدار خان ہے۔“ وہ صاف انگریزی بول رہا تھا۔ ”اور اب تو ہمارے ساتھ چلے گی۔“
”تمہارے ساتھ؟“ جولیا کانپ کر رہ گئی۔
”ہاں دیکھ لڑکی۔ ہمیں نہ تو اس زمین سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی تجھ فرنگیوں سے۔“
”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“
”دولت۔“ دلدار خان ہنس پڑا۔ ”تو ہمارے ساتھ ہوگی تو تیرا باپ تیرے بدلے ہمیں بہت کچھ دے دے گا۔ یہ سمجھ لے کہ تو ہمارے پاس یرغمال رہے گی۔“
”نہیں۔“ جولیا کھڑی ہو گئی۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں جلال بابا کی پناہ میں ہوں۔“
”جلال بابا۔“ قبائلی ہنس پڑا۔ ”ہم لوگوں کو جلال بابا سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ ”ہمیں تو سودا کرنا ہے۔ اگر تیرے پیسے جلال بابا دے دیتا ہے تو پھر تو جلال بابا کے پاس چلی جائے گی ورنہ تیرا باپ تو دے ہی دے گا۔“
ایک لمحہ، صرف ایک لمحہ۔
جولیا نے دیکھ لیا تھا کہ اس قبائلی اور اس کے ساتھیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ قبائلی عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا کرتے۔
اس نے دونوں کے درمیان دوڑ لگا دی۔ وہ ہرنی کی طرح نکلتی جا رہی تھی۔ اس کی یہ حرکت اتنی غیر متوقع تھی کہ قبائلی اور اس کے ساتھی حیران ہو کر پکارتے ہی رہ گئے۔
”او لڑکی رک جا۔“ قبائلی دہاڑا۔ ”ورنہ گولی مار

گفتگو

سردار بلدیو سنگھ نے دورۂ انگلستان کے دوران میں پنڈت نہرو سے پوچھا۔
”خواتین سے عموماً کس قسم کی گفتگو کرنی چاہیے؟“
وہ بولے۔ ”بس یہی کہ آپ کی عمر کتنی ہے؟ یا آپ کی شادی ہو چکی ہے وغیرہ۔“
ایک محفل میں سردار صاحب نے اپنے سامنے بیٹھی ایک خاتون سے جوان سے گفتگو کرنے کے لیے بے چین ہو رہی تھیں، پوچھا۔ ”محترمہ آپ کے کتنے بچے ہیں؟“
”پانچ۔“ خاتون بولیں۔
”آپ کی شادی ہو چکی ہے؟“ سردار نے فوراً اگلا سوال داغا۔

شاہین و کرگس

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوں گا۔“

لیکن جولیا نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ دوڑتی ہی چلی گئی تھی۔ ایک گولی چلی اور اس کے برابر سے گزر گئی۔

ایک اور گولی چلی۔ جولیا بال بال بچی۔ وہ لوگ شاید اسے مارنے پر تل گئے تھے۔ ایک اور گولی کی آواز آئی لیکن یہ گولی جولیا کے قریب نہیں آئی البتہ ایک چیخ ضرور سنائی دی پھر دوسری چیخ اس کے بعد سناٹا۔

جولیا نے خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ خوف کے بے پناہ احساس نے اسے گھیر لیا تھا۔

سناٹا، ازلی اور ابدی سناٹا پھر کسی پرندے کی آواز...... اس کے بعد کسی قدموں کی آہٹ۔ کوئی بھاری قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

جولیا نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول دیں۔

اس کے سامنے مراد خان کھڑا تھا۔

”پریشان مت ہو۔“ اس نے جولیا کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں نے ان تینوں کو مار دیا ہے۔“

جولیا ایک کمزور، نازک اندام سی لڑکی تھی جسے بچانے کے لیے ایک مرد اس کے سامنے آ گیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں صرف عورت اور مرد تھے صرف عورت اور مرد۔

جولیا اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں کسی ننھی سی بچی کی طرح سمٹ آئی۔

☆☆☆

رابرٹ، داور خان کو بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے رابرٹ۔“ داور خان نے درشت ہو کر پوچھا۔ ”کیا تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا؟“

”ہم لوگ بہت مشکل سے یقین کرتے ہیں۔“ رابرٹ نے کہا۔ ”مراد خان یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں اپنی اولاد کی بھی پروا نہیں ہے۔ تم اسے بھول جانے کو تیار ہو گئے ہو۔“

”میں اسے بھول نہیں رہا ہوں بے وقوف آدمی۔“ داور خان غصے سے بولا۔ ”بلکہ میں اس کے مقابلے میں اپنی پوری قوم کا مفاد دیکھ رہا ہوں۔ وہ تو کسی نہ کسی طرح آزاد ہو ہی جائے گا لیکن تم لوگ ناراض ہو گئے تو پھر خوش حالی ہم سے روٹھ جائے گی۔“

”یہ بات تو ہے۔“ رابرٹ مسکرا دیا۔

”تم بتاؤ، کیا تم اپنی بیٹی کو بھول گئے ہو؟“ داور خان نے پوچھا۔

”نہیں، ہرگز نہیں۔“

”تو پھر میں کس طرح بھول سکتا ہوں۔ جب تم تاریخ میں اپنا نام بنانے جا رہے ہو تو کیا داور خان اپنی قوم میں سرخرو نہیں ہو سکتا......“

”تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ ہم دونوں کے مفادات ایک جیسے ہیں۔“ داور خان نے کہا۔ ”ہمیں مل کر کام کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“

”دونوں قیدی شام تک ہمارے پاس واپس آ جائیں گے۔“ داور خان نے بتایا۔

”یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟“

”بہت آسان ہے۔“ داور خان نے کہا۔ ”میرا ایک خاص آدمی ان تک پہنچ چکا ہے۔ وہ بہت دلیر اور ہوشیار آدمی ہے۔ وہ ان دونوں کو خاموشی سے نکال لائے گا۔“

”سچ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں۔“ داور خان نے کہا۔

”داور خان اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہمارے لیے کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔“ رابرٹ نے کہا۔ ”پھر ہم کھل کر اور پوری آزادی کے ساتھ کام کر سکیں گے۔“

یہ پلاننگ بھی سمندر خان ہی کی تھی۔

پوری پلاننگ یہ تھی کہ وہ مراد خان اور جولیا کو اس طرح واپس لے آئے گا جیسے اپنے باغیوں سے نکال کر لا رہا ہو۔

اس طرح رابرٹ کو یقین ہو جاتا کہ اب سب کچھ صحیح ہو گیا ہے۔ وہ لوگ اطمینان اور آزادی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہتے اور اس دوران میں جلال بابا اور اس کے ساتھی دریا کو کانوں تک پہنچانے کے کام میں مصروف ہو جاتے۔

داور خان، رابرٹ کو اطمینان دلا کر واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد رابرٹ کے ایک ساتھی نے کہا۔ ”رابرٹ ایسا لگتا ہے کہ ان قبائلیوں کو بھی سیاست آ گئی ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم۔“ رابرٹ نے اپنی گردن ہلا دی۔ ”یہ مجھے بچہ سمجھ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جولیا کو کس مقصد کے تحت چھوڑا جائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کا برین واش ہو چکا ہوگا۔ میں نے جلال بابا کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ وہ انسان آکٹوپس کی طرح جکڑ لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جولیا اب ہمارے کسی کام کی نہیں رہی ہو۔“

”رابرٹ میں تو تمہیں دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ تم اپنے مقصد کے لیے اپنی اولاد کی قربانی دے رہے ہو۔“

”کیسی اولاد۔“ رابرٹ ہنس پڑا۔ ”جولیا میری اولاد کہاں ہے۔ وہ میرے ایک جاننے والے کی بچی ہے۔ میں نے بچپن سے اس کی پرورش کی ہے اسی لیے وہ مجھے اپنا باپ سمجھتی ہے۔ میری اولاد ہوتی تو کیا میں اسے اپنے ساتھ ان وحشیوں کے پاس لے آتا۔“

سب کچھ پلان کے مطابق ہی ہو رہا تھا کہ اچانک ایک گڑبڑ ہو گئی۔

یہ بہت شدید گڑبڑ تھی۔ اس کا اندازہ بھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ سرنگ نکالنے میں دریا بپھر اٹھے گا۔

یہ ایک تکنیکی کام تھا۔ جلال بابا اور اس کے ساتھی اندھا دھند ... پر ٹوٹ پڑے تھے اور وہ مچل گیا تھا۔ پہلے اس نے کناروں کا رخ کیا پھر پرشور اور پرہول انداز میں پہاڑیوں اور آبادیوں کو اپنی لپیٹ میں لیتا چلا گیا۔

اس نے سب کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

یہ ایک ایسی افتاد تھی جس میں سبھی مبتلا ہو گئے تھے۔ فرنگی بھی اور قبائلی بھی۔ ہر طرف تباہی پھیل گئی تھی۔

فرنگیوں نے جتنی کانیں کھودی تھیں۔ ان سبھوں میں پانی داخل ہو گیا۔ ساری کانیں اس طرح برباد ہوئیں کہ ناکارہ ہو کر رہ گئیں۔

لیکن یہ تباہی صرف فرنگیوں کی نہیں تھی بلکہ اس تباہی و بربادی سے قبائلی بھی محفوظ نہیں رہے تھے۔ ان کے کچے مکانات پرشور دریا کے غضب ناک پانیوں نے بکھیر کر رکھ دیے۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کس پر کیا بیت رہی ہے۔

یہ تباہی رات کے وقت آئی تھی اس لیے اس کی ہولناکی اور بھیانک پن اور بھی شدید ہو رہا تھا۔ ہر طرف موت، چیخیں، ہر طرف چیخیں۔

صبح کی کرنوں نے وہاں ایک عجب منظر دیکھا۔

چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔

اس پانی میں بہتی ہوئی چیزیں۔ اسلحے، مشینیں جو سب ناکارہ ہو چکی تھیں اور ان کے درمیان بلبلاتے ہوئے لوگ۔ ایک دوسرے کو تلاش کرتے ہوئے رشتے دار...... کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ کتنے لوگ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور کتنے زندہ رہ گئے ہیں۔

مراد خان، شہباز خان اور جلال بابا ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔

یہ زندہ بچ گئے تھے۔ ایک طرف جولیا تھی اور ان سے کچھ فاصلے پر سمندر خان کی لاش پڑی تھی۔

سمندر خان کی لاش کے پاس سیاہ پوش کی لاش بھی تھی۔ لوگوں نے داور خان کی لاش بھی تلاش کر لی تھی وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔

”اس آدمی نے ہم سبھوں کو برباد کروا دیا۔“ مراد خان نے سمندر خان کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں بیٹے ایسا نہیں کہتے۔“ بابا جلال کی آواز گونجی۔ ”بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے قربانی تو دینی پڑتی ہے۔“ اس آدمی کی بدولت فرنگیوں کا پورا منصوبہ ناکام ہو گیا اور اب وہ یہاں سے واپس جا رہے ہیں۔“

”یہ بات تو ہے۔“ شہباز خان نے اپنی گردن ہلائی۔ ”ہماری زمین کو اس آدمی نے بچا لیا ہے بابا۔“

رابرٹ نڈھال قدموں سے چلتا ہوا جولیا کے پاس آیا۔ ”جولیا ہم واپس جا رہے ہیں کیونکہ اب ہمارے یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

”آپ جا سکتے ہیں ڈیڈ لیکن میں نہیں جاؤں گی۔“ جولیا نے کہا۔ ”کیونکہ میں اب جولیا نہیں بلکہ فاطمہ ہوں۔“

”کیا......؟“

”ہاں ڈیڈ، میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔“ جولیا نے بتایا۔ ”اور اب مجھے یہیں رہنا ہے۔“

رابرٹ کی آنکھوں میں نفرت کی چمک پیدا ہو گئی۔

دریا کا پانی اترنے لگا تھا ان پہاڑوں والی آبادی پر ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی ایسی صبح جس میں بیرونی سازشوں کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

زمین زادہ

ساحر جمیل سید

پسندیدگی اگر محبت میں ڈھل جائے تو فراق میں دل کا تڑپنا انسانی جبلّت کے عین مطابق ہے... محبت قربت گزیدہ ہو جائے تو پھر حالات کی چلمن پر جذبوں کا پڑا پردہ سُرور کے سرسراتے جھونکوں کے بجائے جھلسادینے والی گرم ہوا کے تھپیڑوں سے اڑنے لگتا ہے... رفتہ رفتہ نگاہیں زندگی کے تلخ و شیریں حقائق سے شناسائی کے مراحل طے کرنے لگتی ہیں... سچائی کی آگاہی جذبات کو کچل دیتی ہے اور قربتِ عشق سے تخریب کی راہیں نکل آتی ہیں... جس پر کوئی مسافر قدم رکھ دے تو پھر واپسی کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا... ایسی ہی منزل کی جانب گامزن ایک بدقسمت مسافر کی داستانِ حیات...

جذبات کے ہلکوروں سے حقیقت آشنائی تک کا سفر جنوں

عیدالاضحیٰ کا دن تھا۔ ماہا اور عاصم کو نہلا دھلا کر چینج کروانے کے بعد افشاں نے خود بھی نہا کر کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔

اس نے گلابی رنگ کا وہی سوٹ پہنا تھا جو طاہر کو بہت اچھا لگتا تھا۔ ویسے تو وہ جب بھی نہا دھو کر بال کھولتی تو طاہر عجیب محبت بھری نظروں سے مسکرا مسکرا کر اسے دیکھا کرتا مگر جب بھی وہ یہ گلابی سوٹ پہنتی تھی، تب تو جیسے وہ دنیا جہان سے بے خبر ہو جاتا تھا اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا لیتا تھا۔

''بس، یہاں میرے سامنے بیٹھ جائیں اور مجھ سے باتیں کریں۔''

یہ اس کی فرمائش ہوتی۔ پسندیدہ ترین مشغلہ اور جب افشاں اس کے سامنے بیٹھ جاتی تھی تو اور کسی بات کی جیسے اسے کوئی پروا... کوئی فکر ہی نہ رہتی تھی۔ بعض اوقات تو افشاں اس کے اس شوق سے بیزار بھی ہو جاتی تھی۔ اسے گھٹن محسوس ہونے لگتی۔

اس نے کچن میں جا کر گوشت ابلنے کے لیے چولہے پر رکھا اور اپنے کمرے میں آگئی۔ ماہا اور عاصم کھیلنے کے لیے باہر گراؤنڈ میں جا چکے تھے خود وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ سوٹ کے ساتھ میچ کرتی ہوئی پنک لپ اسٹک سے ہونٹ سجائے اور بالوں میں برش کرنے لگی۔ اس کا ارادہ تھا کہ بال سنوارنے کے بعد پہلے پلاؤ تیار کرے گی پھر تکے بناتی۔ تکّوں کا سوچتے ہوئے اسے پھر سے طاہر کا خیال آگیا۔ طاہر کو تکّے بہت پسند تھے۔ وہ جب بھی تکّے بناتی تھی، طاہر نہایت توجہ اور شوق سے ان کے ساتھ انصاف کرتا تھا۔ آج بھی وہ تکّے بنانے والی تھی مگر آج اس کے بنائے ہوئے تکّے کھانے کے لیے طاہر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ....وہ ٹھیک سے یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ کس حال اور حالت میں ہے۔ اس نے کچھ کھایا بھی ہو گا یا نہیں۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی تو وہ سر جھٹکتے ہوئے دوبارہ سے اپنے بالوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اندر کہیں ایک تلخی... ایک کڑواہٹ پھیل گئی تھی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تو وہ پیچھے دیکھے بغیر بولی۔

''سوہنیو! کپڑے گندے نہیں کرنا۔'' ماہا، عاصم کے علاوہ بھلا اور ہو ہی کون سکتا تھا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

''ماہا...'' وہ برش کرتے کرتے پلٹی۔ پھر دروازے میں کھڑی شخصیت پر نظر پڑتے ہی اس کی زبان کو از خود بریک لگ گئے۔ برش ہاتھ سے چھوٹ کر کارپٹ پر گر گیا... دل کو ایک دھچکا سا لگا تھا۔

دروازے میں ماہا یا عاصم نہیں بلکہ ان کے پاپا کھڑے تھے... طاہر علی آذر۔

افشاں نے اپنے اندر خوف کی لہر اترتی محسوس کی۔ طاہر دروازے کے پٹ سے کندھا ٹکائے اپنی سرد آنکھوں سے یک ٹک اسے ہی تک رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پسٹل تھا۔ افشاں کا ذہن فوراً ماہا اور عاصم کی طرف گیا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ آخر وہ بھیانک وقت آن پہنچا تھا جس کا ہر وقت اسے دھڑکا لگا رہتا تھا۔

''طاہر... آپ...'' وہ نہیں سمجھ سکی کہ کیا کہے۔ طاہر اسی طرح خاموش کھڑا اس کی صورت دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھے، شکوے تھے... دکھ تھا... غصہ اور خفگی تھی... اور اس کا چہرہ جیسے مٹی کی کسی بے جان دیوار کی کہانی سنا رہا تھا۔

''تمہیں اس حد تک نہیں جانا چاہیے تھا افشاں!'' طاہر کے پتھریلے ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور افشاں کی سماعت سے طاہر کی مخصوص بھاری آواز ٹکرائی۔

''ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا تمہیں... میرے مقابل ہی یقین دہانی کر لی تھی نا تم نے...''

''طاہر! مم... میری بات سنیں...'' افشاں ہکلائی۔

''سوری افشاں! میں مجبور ہوں... تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے... جو فیصلہ تم نے بزورِ بازو زبردستی مجھ پر مسلط کیا ہے، اس کے برقرار رہنے کی صرف ایک ہی صورت ہے... واحد یہی ایک صورت۔''

طاہر نے پسٹل والا ہاتھ سیدھا کیا۔ اگلے ہی پل کمرے میں ایک دھماکے کی آواز بلند ہوئی اور افشاں نے اپنے پیٹ میں ایک دہکتا ہوا انگارہ سا اترتا محسوس کیا۔ وہ اپنی آنکھوں میں کچھ خوف اور کچھ حیرت سمیٹے طاہر کو اور طاہر کے ہاتھ میں دبے پستول کی نال سے نکلتے دھوئیں کو دیکھتی ہوئی عقب میں گرتی چلی گئی۔

☆☆☆

اچانک آنکھ کھلتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اضطراری انداز میں اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ ماہا اور عاصم دونوں گہری نیند سو رہے تھے۔ بے اختیار اس نے ایک گہری سانس لی۔

پھر وہی منحوس خواب... گزشتہ دو ڈھائی ماہ سے تقریباً اسی نوعیت کے خوابوں نے اس کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ اپنی کوشش اور تدبیر سے افشاں نے اس نیم پاگل انسان سے چھٹکارا تو حاصل کر لیا تھا مگر اس کی دہشت جیسے افشاں کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

خون میں آج بھی شامل تھی۔

افشاں اپنی مرضی سے طاہر کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ پسند سے شادی کی تھی اس نے... طاہر سے اسے توجہ اور محبت بھی ملی تھی، عزت بھی ملی تھی اور بار بار اس کی عزتِ نفس کا قتل بھی ہوا تھا۔ طاہر سنجیدہ اور غصیلے مزاج کا تھا اور یہی ایک بات سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ وہ شروع دن سے اس کے غصے سے گھبراتی تھی اور شروع دن سے طاہر کا غصہ کم ہونے کے بجائے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی گیا۔ وہ اپنی سی احتیاط بھی کرتی تھی پھر بھی اس سے کچھ نہ کچھ ایسا سرزد ہو جاتا کہ طاہر کو غصہ آجاتا اور ابھی... ابھی دو ڈھائی ماہ پہلے جو سانحہ گزرا تھا وہ...

افشاں آگے کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سر جھٹکا اور ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

نصف شب گزر چکی تھی۔ میں راولپنڈی کے نواحی علاقے میں واقع ایک کمرشل عمارت کی تیسری منزل پر تنہا کھڑا اپنے وجود اور ہوش و حواس کی سلامتی کو ٹٹولنے، جانچنے کی لاشعوری سی کوشش میں مصروف تھا۔ میرے اندر میرے ہونے کا احساس شک اور بے یقینی کی زد میں تھا۔ میں ریزہ ریزہ بکھری ہوئی مٹی کا ڈھیر نہیں تھا۔ میرا دماغی توازن بھی بالکل درست تھا... حواس بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے اور میرے لیے یہ حیرت و بے یقینی کے ساتھ ساتھ دکھ کی بات بھی تھی۔

میں نے ایک آہ بھرتے ہوئے یونہی اطراف میں نظر دوڑائی۔ دور تک... فضا میں ایک پُرسکون خاموشی ہلکورے لے رہی تھی۔ عقبی طرف پہاڑی نشیب و فراز میں بکھرے ہوئے مکانوں کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔

کل سے وقتاً فوقتاً برستی رہنے والی بارش ایک بار پھر سے تھم چکی تھی اور میں اندرونی طور پر شدید گھٹن اور حبس کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے کچھ دیر پہلے ہی یہاں... اوپر چھت پر آیا تھا۔ ورکشاپ کا باقی عملہ نیچے کمرے میں بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔

ٹھنڈی اور نم ہوا کے جھونکے میرے کندھوں پر جھولتی سیاہ چادر سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر بلندیوں پر تنے آسمان کی سمت دیکھا۔ گدلے گدلے بادلوں کے پس منظر سے جھانکتی پورے چاند کی روشنی ماحول میں ایک سحر خیز سی اداسی بکھیر رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنے چہرے پر اترتی ہوئی نمی کو محسوس کیا۔

"طاہر! پتا نہیں وہ درد مشترک تھا یا پتا نہیں کیا تھا جو مجھے آپ کے انتہائی قریب لے آیا...." میرے اندر پھر سے افشاں کی سرگوشی گونجی... اس کے پہلے خط... پہلے محبت نامے کے الفاظ!

"میں اپنی روح کی تمام تر صداقتوں کے ساتھ آپ سے محبت کرتی ہوں... میری گزارش ہے کہ اس خط کو کم از کم تین بار ضرور پڑھیے گا... آپ کسی بھی فیصلے پر پہنچیں، مجھے مطلع ضرور کیجیے گا... اگر آپ ایک حساس انسان ہوئے تو مجھے پورا یقین ہے کہ میرا یہ خط ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں ہوگا اور اگر آپ صرف ایک رائٹر ہوئے تو یہ میری بدقسمتی ہوگی... اس سے بڑی بدنصیبی بھلا اور ہو بھی کیا سکتی ہے کہ جسے آپ اپنا سب کچھ تسلیم کر لیں، اسے آپ کی ضرورت ہی نہ ہو۔"

"چٹاخ۔" شاید ہوا نے میرے نم رخسار پر طمانچہ مارا تھا... میری بند آنکھیں فوراً کھل گئیں۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا افشاں! واقعی اس سے بڑی بدنصیبی اور کچھ نہیں ہو سکتی... مگر اب ہمارے درمیان یہ انصاف کون کرے گا کہ کس نے... کس کو... کیا تسلیم کیے رکھا۔" میں افشاں کی پرچھائیں سے ہم کلام تھا۔

"ہم ایک دوسرے کے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے ناگزیر تھے پھر بھی... پھر بھی تم میرے خلاف اس حد تک چلی گئیں۔ تیرہ سال کا تعلق اور بارہ سال کا رشتہ کیسی سفاکی سے ختم کر ڈالا... ہر رابطہ، ہر تعلق توڑ لیا... کیا... کیا واقعی میں اس قدر گھناؤنا اور مکروہ انسان ہوں کہ تم میرے خلاف پولیس سے مدد مانگنے پر مجبور ہو گئیں... گویا مجھے اپنا دشمن تسلیم کرتے ہوئے خود بھی علی الاعلان دشمنی پر اتر آئیں... اور... اور پھر میرے سر پر الزام بھی کیا دھرا کہ تمہیں مجھ سے جان کا خطرہ ہے... میں تمہیں... تمہیں اور بچوں کو قتل کر دینا چاہتا ہوں... قتل! اُف میرے خدا..."

میرے حواس ایک بار پھر سکتے کی سی کیفیت محسوس کرنے لگے۔ شدید حیرت... بے یقینی... میرے رخساروں میں پولیس والوں کے طمانچوں کی جلن بیدار ہو گئی۔ کانوں میں تحقیر آمیز جملے اور گالیاں گونجنے لگیں۔ پولیس اسٹیشن... زنجیریں... عدالت... جیل...

ذلت و رسوائی کے احساس کے باعث میرے دل و دماغ میں اذیت کے بھنور بیدار ہونے لگے۔ صدمے کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اب بھی رہ رہ کر میرے اعصاب شل پڑ جاتے اور حواس گویا سن ہو کر رہ جاتے... اور پھر اس جانکاہ صدمے کو گزرے ابھی وقت بھی کتنا گزرا تھا۔ صرف ڈھائی ماہ؟ ابھی ڈھائی ماہ پہلے تک تو ہم ایک ساتھ تھے اور کوئی دو چار دن سے نہیں بارہ سال سے ایک ساتھ تھے... ایک دوسرے کے شریکِ زندگی تھے۔ اس سے پہلے ایک سال تک ہمارے درمیان ایک باوقار، سنجیدہ اور افسانوی سی محبت کا رشتہ بھی رہا تھا۔

محبت... خدا کی رحمت... کسی درویش، فقیر کی انتہائی خوب صورت دعا... وہی دعا آج میرے لیے ایک بددعا بن چکی تھی... ایک مسلسل آزار۔

"طاہر! آپ میرے من کے دیوتا ہیں۔ میں اپنی ساری زندگی آپ کی داسی بن کر گزارنا چاہتی ہوں۔"

"چٹاخ۔" میرے گال پر ایک اور طمانچہ پڑا تھا۔

آج سے بارہ برس قبل جو ہستی اپنی دنیا کو ٹھوکر مارتے ہوئے میری محبت، میرے قرب و رفاقت کی سائل بن کر میری کٹھن زندگی میں شامل ہوئی تھی جسے میں نے دیوانوں کی طرح چاہا تھا، جو میری زندگی... میری دنیا... میری کل کائنات تھی اور جس کی محبت میں میں نے اپنا آپ تک فراموش کر دیا تھا... آج سے ڈھائی ماہ پہلے اسی نے میرے خلاف پولیس سے مدد طلب کرتے ہوئے مجھے حوالات سے جیل کی چار دیواری تک پہنچا دیا تھا۔ ہر اپنے پرائے کی نظر میں مجھے ایک وحشی، جنگلی... ایک جنونی پاگل ثابت کر دیا تھا۔ مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ اپنے اور میرے درمیان ایک ایسی سیاہ دیوار اٹھا دی تھی جس کا گر جانا کسی صورت ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میری پیشانی پر ایسی کالک تھوپ دی تھی جو شاید اب صرف خون ہی سے دھل سکتی تھی۔

مر تو میں ڈھائی ماہ پہلے اسی وقت گیا تھا جب افشاں نے پولیس اسٹیشن جا کر میرے خلاف بیان دیا تھا۔ پولیس نے اسکول کے گیٹ پر مجھے تشدد کا نشانہ بنایا۔ ایس ایچ او نے افشاں کے دستخط والی درخواست میرے منہ پر ماری تھی۔ یقیناً میں مر ہی چکا تھا۔ اب تو بس اس وجود نامی لاش کو کہیں ٹھکانے لگانا تھا اور اس لاش کے چہرے کی سیاہی دھونا تھی جس کا دھل پانا صرف خون ہی سے ممکن ہو سکتا تھا۔ اپنا یا کسی اور کا خون... بس یہی فیصلہ کرنا باقی تھا۔ ٹھنڈی اور نم ہوا کے جھونکے بدستور میری چادر اور کپڑوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ بادل پھر سے اکٹھے ہونے لگے تھے۔ میں ساکت چہرے اور پتھر آنکھوں سے دور... دور پہاڑوں کے موہوم ہیولوں کے اس پار یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ وہاں جہاں آسمان زمین پر سجدہ ریز دکھائی دیتا تھا۔ وہیں کہیں موجود گھر کے ایک کمرے میں افشاں سکون کی نیند سو رہی تھی۔ میرے اضطراب و کرب سے بے خبر... میری اذیتوں اور وحشتوں سے لاتعلق... ایک ناآشنا اور اجنبی کی طرح...

☆☆☆

بڑے ہی روکھے پھیکے، سادہ اور بے روح سے شب و روز کی اسیری کا دور تھا۔ صبح، خوشبو اور ذائقے سے خالی ہوتی تو شام رنگوں سے عاری... ہوا کا لمس بے جان اور بے تاثر تھا۔ میرا ماحول، میرے حالات ہی ایسے تھے کہ زندگی بس ایک مخصوص لگے بندھے اور جمود زدہ سے معمول میں گزر رہی تھی... صبح گھر سے ورکشاپ اور ورکشاپ سے سیدھا گھر... اپنے کمرے میں کتابوں اور کاغذوں کے درمیان۔

بس یہی ایک واحد دلچسپی اور شوق پالا تھا۔ کتاب اور مطالعے کی یہ محبت شروع ہی سے میری روح میں پلتی آئی تھی اور اس محبت نے خود مجھے بھی کچھ کچھ شاعر اور افسانہ نگار بنا دیا تھا۔ گزشتہ چند سالوں سے میری تحریریں متواتر مختلف رسائل و جرائد میں چھپتی آ رہی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں قارئین اور مداحوں کا اپنا ایک حلقہ بنا چکا تھا۔ مجھے خطوط موصول ہوتے تھے۔ وشنگ کارڈز موصول ہوتے تھے اور میں ہر خط، ہر کارڈ کا جواب خلوصِ دل سے تحریر کیا کرتا تھا۔ انہی دنوں مجھے افشاں کا پہلا خط موصول ہوا۔ پہلا خط... محبت کا اقرار نامہ!

قریباً ڈیڑھ ماہ پہلے ایک ڈائجسٹ میں میرا ایک تردیدی خط شائع ہوا تھا جس میں، میں نے اپنے حالات و واقعات اور جذبات کا بھی کچھ اظہار کیا تھا۔ اس خط کی اشاعت کے بعد مجھے کئی ایک آشنا، ناآشنا کرم فرماؤں اور مداحوں کے خلوص نامے موصول ہوئے تھے اور یہ سلسلہ جاری تھا مگر افشاں کا خط دیگر تمام خطوط سے یکسر الگ نوعیت کا تھا۔ غیر معمولی اور حیران کر دینے والا۔

پہلا ہی خط فل سائز دستے کے بارہ صفحات پر مشتمل تھا۔ گویا افشاں کے خاندانی پس منظر... گھر بار... گزشتہ اور موجودہ زندگی اور افشاں کے معمولات کا حال بیان کرتا ہوا ایک مختصر سا افسانہ!

اندازِ تحریر اور لفظوں کا چناؤ صاحبِ تحریر کے مزاج کی نفاست اور شائستگی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ میں خود ایک نثر نگار تھا سو لفظوں میں ڈھلے "احساس" اور جملوں میں بولتے جذبوں کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔

افشاں نے پہلے ہی خط میں برملا اظہار کر دیا تھا کہ وہ غائبانہ طور پر میری محبت میں پور پور دھنس چکی ہے اور مجھ سے "تجدیدِ محبت" کی خواہش مند ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے نہایت محتاط لفظوں میں اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا۔ جواب میں اس نے اپنے دوسرے خط میں مجھے اپنی تصویر ارسال کی اور مجھے پروپوز بھی کر دیا۔ شادی کا سارا منصوبہ بھی لکھ بھیجا کہ میں امی بابا کو رشتے کے لیے ان کے ہاں بھیجوں تو وہ کیا کہیں... کیا بتائیں کہ وہ یہاں تک کیسے اور کیوں پہنچے۔ نیز یہ کہ انہیں اس رشتے کا پتا کہاں سے چلا۔ افشاں شادی تک پلان کیے بیٹھی تھی اور میں اس کے خط کا جواب تک تحریر کرنے میں تذبذب کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔

افشاں کے خواب بہت عام، بہت سادہ، بہت معمولی تھے مگر قدرت کی ستم نوازی یہ تھی کہ میں ان خوابوں سے بھی زیادہ عام، سادہ اور معمولی بندہ تھا۔ میں اس کے ابتدائی دو تین خطوط ہی سے اس کے متعلق اتنا کچھ جان چکا تھا، گویا برسوں کی شناسائی ہو۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈائجسٹ میں چھپنے والا میرا تردیدی خط پڑھ کر افشاں نے خود سے میرے... اور میرے ماحول کے متعلق ایک خیالی نقشہ بنا لیا ہے اور اب اس ''تاج محل'' جیسے حسین اور رومانی تصور کو حقیقت کر لینا چاہتی ہے۔

میرے دل میں افشاں کے لطیف جذبات اور گداز احساسات ہمیشہ کے لیے اپنے نام محفوظ کر لینے کا لالچ ہمک آیا... مگر مجھے یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ یہ جذبات و احساسات میرے لیے نہیں ہیں... محبت کی یہ وارفتگیاں کسی اور کے لیے ہیں... میرے اور میرے حالات کے حوالے سے تو افشاں مکمل طور پر لاعلم تھی... اندھیرے میں تھی... اس کے خواب میں، میری تو کہیں کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

''چھوٹا سہی مگر گھر ذاتی ہو کیونکہ چھت کم از کم اپنی ہونی چاہیے۔''

میں کرائے کی چھت تلے سوتا تھا۔

''زندگی کا ساتھی ہائی کوالیفائڈ ہو۔''

میں خواب سے تھوڑا اور باہر سرک گیا۔

''ایک اچھی وائٹ کالر جاب ہو۔''

میں پوری طرح خواب سے باہر آن کھڑا ہوا کہ صبح سے شام تک لوہے سے لڑنا میرا معمول تھا۔

آخر میں ایک شدید کشمکش اور شش و پنج کے بعد میں نے افشاں کے خطوط امی بابا کے سامنے رکھ دیے۔ یوں میری ساری فیملی افشاں سے متعارف ہو گئی۔ ایک چھوٹی سی میٹنگ ہوئی اور امی بابا کی گفتگو سے حقائق کی تصویر کچھ اور واضح ہو گئی اور میرا تذبذب بھی جاتا رہا۔ امی نے کہا تھا۔

''کاش! یہ لڑکی میری بہو بن سکتی مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔''

بابا کے الفاظ تھے۔

''ہم الگ الگ دنیاؤں میں جینے والے لوگ ہیں۔ یہ بڑے گھر کی لڑکی ہے۔''

میں نے افشاں کو لکھ بھیجا۔

''آپ کی محبت پانا نصیب اور سعادت کی بات لگتی ہے... آپ سے محبت کرنا خوشی اور اعزاز کی بات معلوم ہوتی ہے مگر ہماری شادی ہونا... ہمارا ایک ہونا ممکن نہیں... یہ ایک انہونی ہے۔ میرے حالات، مجھے ایسا کوئی خواب دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے اور آپ میرے اور میرے حالات کے متعلق کچھ نہیں جانتیں لہٰذا میرا خیال اپنے دل سے نکال دیجیے۔''

اگر میرا انداز واشگاف نہیں تھا تو افشاں بھی جیسے کچھ جاننا سمجھنا چاہتی ہی نہیں تھی۔ اس نے مجھے لکھ بھیجا۔

''طاہر! جب ہم کسی کو دیکھ بھال کر، جانچ پرکھ کر محبت کرتے ہیں تو وہ محبت نہیں سودا ہوتا ہے... عموماً محبت آنکھ سے شروع ہو کر دل تک پہنچتی ہے۔ ہماری محبت دلوں سے شروع ہو کر آنکھوں تک پہنچے گی۔''

ہمارا یہ خطوط کے ذریعے رابطہ ایک سلسلے کی صورت اختیار کرتا گیا۔ میرے محتاط اور گریز پا رویے سے افشاں محبت کی جن شدتوں اور وارفتگیوں کے ساتھ مجھ پر منکشف ہوئی، وہ مجھے مسحور کر گئی تھیں... مجھ پر جیسے کوئی سحر اتر آیا تھا۔

ہم ان دنوں ملتان میں رہائش پذیر تھے اور افشاں کا تعلق واہ کینٹ سے تھا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ ایک ایسی لڑکی میری رفاقت، میری محبت کی تمنائی ہو بیٹھی جس کی آرزو میں کسی بھی حد تک چلے جانا بصد شوق پسند کیا جا سکتا تھا مگر میں اس تلخ حقیقت کو کیسے نظرانداز کر دیتا کہ میری اور اس کی حیثیت میں زمین آسمان جیسا فرق ہے۔ میں ایک خاک نشیں... زمیں زادہ تھا اور افشاں گویا مقدس بلندیوں پر بیٹھی ایک مہربان دیوی...

میں نے اپنے مزاج، عادات و اطوار اور اپنے حالات کے متعلق سب کچھ جزئیات کے ساتھ افشاں کو لکھ بھیجا... ایک ایک بات... اور سب کچھ جان لینے کے بعد بھی اس کے جذبوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ وہ اپنے فیصلے پر قائم رہی... امی بابا کے حوالے سے اس کا اصرار بھی برقرار رہا۔ اس حوالے سے ہمارے درمیان مہینوں بحث کے انداز میں گفتگو ہوتی رہی۔ میرے ہر تعرض کا جواب اس کے پاس تھا۔ جواز تھے، دلائل تھے۔ وہ مجھے قائل کرتی رہی اور میں

دامن بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ تذبذب میں مبتلا رہا۔ مجھے معلوم بھی نہ ہو سکا کہ جذباتی لحاظ سے تو میں خود نہ جانے کب کا گردن گردن محبت نامی اس دلدل میں دھنس چکا تھا۔

آٹھ نو ماہ بعد ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ میں ہی واہ کینٹ پہنچا تھا۔ اس پہلی ملاقات پر افشاں نے مجھے دو آڈیو کیسٹ گفٹ کیے تھے اور میں نے اسے پہلی بار تحفتاً ''قرآن مجید'' پیش کیا تھا۔

قریباً دو ماہ پہلے افشاں کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چھوٹی بہن کی شادی سر پر تھی اور افشاں نے جیسے خود کو اس کی ماں تصور کر لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں تمام زندگی شادی نہیں کروں گی۔ میں آپ کے نام پر بیٹھ کر گزار دوں گی۔ اس پہلی اور مختصر سی ملاقات میں، میں اسے سمجھاتا رہا۔

''زندگی اس طرح نہیں گزرا کرتی... وہ بھی عورت ذات کی... کوئی بھی اچھا پروپوزل آئے تو قبول کر لینا۔''

افشاں نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کے پاس زندگی گزارنے کے حل تھے۔ مسائل سے نمٹنے کا حوصلہ تھا۔

اس مختصر سی ملاقات کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے راستے پر ہو لیے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ پھر دوبارہ کبھی نہ ملنے کے لیے... یہی ہمارے درمیان طے پایا تھا۔

میں اپنے شہر، اپنے گھر واپس پہنچا تو گویا اپنی متاعِ کُل گنوا کر... زندگی ہار بیٹھنے والے کسی جواری کی طرح تھکا ہوا ٹوٹا ہوا اور بکھرا ہوا سا...

میں لوٹ آیا تھا مگر ادھورا... میرے اندر سے کچھ کھو گیا تھا۔ ''کچھ'' کم ہو گیا تھا۔ گھٹ گیا تھا کچھ... اور اس کا احساس اس مہیب خلا سے ابھر رہا تھا جو میرے اندر پیدا ہو گیا تھا۔

آنے والے دنوں میں افشاں سے میرا تعلق ختم ہونے والا تھا... رابطہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹنے والا تھا۔ یہ خیال نہایت جاں گسل تھا... اتنا کہ میرے قویٰ مضمحل رہنے لگے۔ اندر کا خلا مزید وسیع ہونے لگا اور گھٹن میں جیسے ہر ساعت کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ساری ساری رات میں افشاں کے خطوط اپنے اردگرد پھیلائے بیٹھا رہتا۔ کبھی ایک خط پڑھتا اور کبھی دوسرا... دن کو ورکشاپ میں ہوتا تو وہی باتیں، وہی جملے ہمہ وقت ذہن میں گردش کرتے رہتے جو افشاں مجھے لکھا کرتی تھی یا پھر اس کو جواب میں جو میں خود تحریر کیا کرتا تھا۔

افشاں کا خیال... اس کا تصور میرے اندر اس شدت سے واضح اور روشن ہو گیا تھا کہ اس کی تابناکیوں میں دیگر تمام سوچیں اور خیالات جیسے دھندلاتے دھندلاتے بالکل ہی معدوم ہو کر رہ گئے تھے۔ افشاں کی یاد... اس کے خیال کو نظرانداز کرنے کی کوشش کرتا تو گویا محبت کا دیوتا میرے رگ و پے میں اضطراب و کرب کا زہر پھونک دیتا۔ میرے اعصاب چٹخنے لگتے اور سانس لینا بھی محال ہو جاتا... گویا افشاں یا اس کے خیال سے پہلوتہی کرنا کوئی جرم، کوئی گناہ ہو۔

چند ہی روز میں میرا برائے نام گریز اور تمام حیل و حجت بھی دم توڑ گئی۔ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اسی روز میں نے افشاں کو اپنی اس کایاپلٹ اور بے قراریوں کے متعلق تفصیلاً لکھ بھیجا۔ یہ بات بھی برملا لکھ بھیجی کہ ''میں تمہارے بغیر جینے کا تصور نہیں رکھتا... مجھے تمہارا ساتھ چاہیے... تازندگی، تاعمر... چاہے اس کے لیے مجھے کسی بھی حد تک کیوں نہ جانا پڑے۔''

میں افشاں کی محبت کی جنوں خیزیوں کے سامنے دل و جان سے شکست تسلیم کر چکا تھا۔ اس کے جذبوں کی شدتوں کے سامنے ہار تسلیم کرتے ہوئے چاروں خانے چت پڑا تھا مگر افشاں نے معذرت کر لی۔

افشاں کی والدہ کے انتقال کے بعد امی بابا اتمامِ حجت کے لیے ایک بار واہ کینٹ جا کر افشاں کے دیگر گھر والوں سے مل آئے تھے۔ رشتے کی بات چیت بھی کر آئے تھے مگر توقع کے عین مطابق انتہائی احسن انداز سے میرے پروپوزل کو رد کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں خود بھی ممکنہ حد تک اصرار کر کے دیکھ چکا تھا مگر کوئی صورت بنتی نظر نہیں آتی تھی۔

شب و روز پوری طرح مایوسی کے اندھیروں میں گزر رہے تھے کہ ایک روز عجب انہونی ہو گزری... ایک کرشمہ تھا وہ...

افشاں... میری زندگی... میری آرزو اپنے گھر بار... اپنی پُرآسائش زندگی کو ٹھوکر مار کر ایک رات اچانک میری بے رنگ اور کرخت زندگی میں آ شامل ہوئی۔ گویا فلک بوس مقدس بلندیوں سے ایک دیوی میرے خستہ حال صحن میں اتر آئی تھی۔ مجھے محبت اور توجہ عطا کرنے... میری تنہائیاں اور اداسیاں بانٹنے۔

میں... طاہر علی آذر... ایک ادھورا شاعر... ایک معمولی افسانہ نگار، خاک نشیں، زمیں زادہ اس شبِ اقلیمِ محبت کا ایک خوش قسمت دیوتا تھا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

”اب آپ نے آگے کا کیا پلان کیا ہے؟“ ایک طویل خاموشی کے بعد رانا منیر مجھ سے مخاطب ہوا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور آنکھوں میں سوال تھا۔

”پلان... پلان کیا ہونا ہے۔ صبح فیصلہ کچھ اور کرتا ہوں، دوپہر کو ارادے کچھ اور ہو جاتے ہیں۔“ میں نے عقب میں موجود بڑے سے پتھر کے ساتھ کمر لگالی۔ ”رات کو سوچتا ہوں کہ اب بھلا جینے کی کیا ضرورت... کیوں نہ پیشانی پر لگا داغ اپنے ہی خون سے سب کو دھو دکھاؤں کہ جس نے مجھ پر یہ الزام اٹھایا ہے کہ مجھے اس شخص سے جان کا خطرہ ہے... میں اس کے لیے اپنی جان دے سکتا تھا، سو وار دی۔ دن میں خیال آٹھہرتا ہے کہ اگر مرنا ہی ٹھہرا تو کیوں نہ تمہاری بھابی کو اس کے کیے کی سزا بھی دیتا جاؤں... ایک کاری ضرب... عمر بھر کا کوئی ناسور... اس کے دو چار خیر خواہوں اور ہمدردوں کو تو مرتے مرتے بھی لے مروں گا میں۔“

منیر بے ساختہ ہنسا تو میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں اس وقت آبادی سے کافی دور ایک چٹان پر بیٹھے تھے۔ رانا منیر میرا پرانا اور بہت اچھا دوست تھا۔ ہمارے آپس میں گھریلو تعلقات رہے تھے۔ میری یہاں موجودگی کا جان کر وہ ملنے کی غرض سے دوڑا چلا آیا تھا اور مجھ سے مل کر میرا دگرگوں حلیہ دیکھتے ہی جیسے اسے شاک لگا تھا اور اب ساری تفصیل جان لینے کے بعد وہ میری بات پر ہنس رہا تھا۔

”طاہر بھائی! آپ دو چار کو ماریں گے۔“ وہ ابھی تک ہنس رہا تھا۔

”ہاں میں۔“

”بس رہنے دیں طاہر بھائی! میں جانتا ہوں آپ کو۔ آپ چڑیا کا بچہ بھی نہیں مار سکتے۔“

میں نے ایک لمحہ سوچا... اپنے اندر کو ٹٹولا... خاموشی تھی... ایک سخت پتھریلی خاموشی۔

”چڑیا کا بچہ تو میں واقعی نہیں مار سکتا منیر! لیکن تمہاری بھابی کو سزا دینے کے لیے میں کسی کو بھی مار سکتا ہوں۔ کسی کی بھی جان لے سکتا ہوں اب... میری زندگی میں اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ دنیا میں دلچسپی کا واحد بہانہ اس کی ذات تھی مگر اس نے بزورِ طاقت اپنا آپ مجھ وحشی سے چھین لیا۔ میں بھی اس کے عزیزوں، پیاروں کو ہمیشہ کے لیے اس سے الگ کر دوں گا۔ وہ بالکل تنہا ہو جائے گی تو پھر تنہائی اور اکیلے پن کے اس کربناک آزار سے آشنا ہو سکے گی جو میں ایک عرصے سے جھیلتا آیا ہوں۔ دل کرتا ہے کہ اس کی میڈم یا میڈم کے شوہر کو جا کر گولی ماردوں جس نے ہمارے آپسی جھگڑے میں خدائی فوجدار کا کردار ادا کرتے ہوئے پولیس کو بلالیا تھا۔ لیکن ان کو مارنے کے بعد میں خود پولیس کی گولی کا نشانہ بنوں یا پھانسی چڑھوں... تمہاری بھابی کی صحت پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا جبکہ اصل تکلیف تو اس نے پہنچائی ہے۔ اصل ظلم تو اس نے ڈھایا ہے... اب اسے نتیجہ تو ہر صورت بھگتنا ہی ہوگا۔ ہاں اس کی بہن کے گھر کو مکمل طور پر قبرستان میں تبدیل کر دوں تو پھر اسے کسی عزیز کی دوری کا حقیقی دکھ معلوم ہوگا اور...“ میں ایک لمحے کو خاموش ہوا۔ منیر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم کچھ بھی سوچو یا سمجھو مگر میرے اندر اتنا زہر بھر گیا ہے کہ تمہاری بھابی کو مزہ چکھانے کے لیے... اپنی اذیت، اپنے دکھ کی شدت کا تجربہ کرانے کے لیے میں ماہا اور عاصم تک کو قتل کر سکتا ہوں۔“

منیر چند لمحے پُرسوچ نظروں سے میری پتھریلی صورت تکتا رہا پھر سامنے گھاس چرتی بکریوں کی طرف دیکھنے لگا۔

”آپ جذبات میں ایسا بول رہے ہیں۔“

”میں کب جذباتی نہیں تھا؟“

”بہرحال، میں تو آپ کو ایسی کسی انتقامی کارروائی کا مشورہ ہرگز نہیں دوں گا۔“

”میں نے مشورہ مانگا بھی کب ہے؟“

”دیکھیں طاہر بھائی! میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کا انتقام نہ لیں... انتقام لیں مگر اندھا انتقام نہیں... آپ خود کو بنائیں... اسٹیبلش کریں... گھربار، گاڑی شاڑی اور کوئی بزنس وغیرہ سیٹ کریں۔ آپ کا اپنا پیروں پر جم کر کھڑے ہو جانا... ایک کامیاب انسان بن جانا ہی... سب سے بڑا انتقام ہوگا۔“

”یہ سب ممکن ہوتا تو آج میری زندگی ایسے تاریک موڑ پر نہ کھڑی ہوتی۔ شروع دن سے آج تک یہی تو ایک بنیادی مسئلہ رہا ہے۔ سارے خرابے کی اصل جڑ، ریڑھ کی ہڈی... میری غربت... میری مفلسی!“

میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”آؤ، چلتے ہیں۔“ رانا منیر نے میری تقلید کی۔

”اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ اپنی توجہ بس خود کو بنانے کی طرف کرلیں۔“

”میں ایسی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں منیر! میں

جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں اور کیا کر سکتا ہوں۔“ ہم ٹہلنے کے سے انداز میں واپس جارہے تھے۔ ورکشاپ کے اوپر ہی موجود رہائش گاہ پر جہاں سے دو گھنٹے پہلے ہم اس لیے اٹھ آئے تھے کہ تسلی اور اطمینان سے کچھ ذاتی گفتگو کر سکیں۔

”انسان کو یا تو بہت زیادہ پڑھا لکھا ہونا چاہیے یا پھر بالکل کورا... یہ جو درمیان والی کہانی ہے نا... یہ بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے... اور میں اس تکلیف کی تمام تر شدتوں سے بھی جان پہچان رکھتا ہوں۔ کوئی ڈھنگ کی اپنی مرضی کی یا اپنے مزاج کی جاب تو مجھے مل نہیں سکتی... ڈگری پرابلم... اور کسی عام، معمولی ملازمت یا پھر محنت و مشقت سے کون سے خواب خریدے جا سکتے ہیں، اس کا بھی میں ایک وسیع تجربہ رکھتا ہوں۔“

میرے لہجے میں خود بخود تلخی عود کر آئی۔ تقریباً جب سے ہوش سنبھالا تھا، محنت و مشقت ہی تو دیکھتا آیا تھا... ایک مزدور کا بیٹا تھا میں اور خود بھی مزدور پیشہ ہی تھا۔

”ملازمتوں اور مزدوریوں سے تو کچھ بنتا بھی نہیں ہے اور مجھے بھی اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ میری مراد تو بزنس سے تھی... کوئی بھی ذاتی کاروبار...“

”تم خود ان دنوں کیا کر رہے ہو؟“

”بتایا تو تھا آپ کو... گھر فارغ بیٹھا ہوں... وہ ایجنسی والے کام میں لاکھوں کا نقصان اٹھایا ہے۔“

ہم واپس پہنچ گئے تھے۔ چھوٹا شاگرد وقاص چائے بنا رہا تھا۔ سیٹھ... استاد رضوان چوزوں کو باجرہ ڈال رہا تھا اور یوسف خان اپنا موبائل کھولے بیٹھا تھا۔

”او یارا طاہر بھائی! تم لوگ کدھر چلا گیا تھا یار!“

ہمارے اوپر پہنچتے ہی یوسف خان مجھ سے مخاطب ہوا۔

”بس یہیں... ذرا پیچھے کا چکر لگانے گئے تھے۔“

”اچھا چلو ٹھیک اے، اب آگئے او تو ذرا امارا موبائل دیکھو۔ اس کو کوئی کوڑ لگ گیا ہے۔ ام کال ملا کر ایلو بولتا اے تو یہ سالا بند او جاتا اے۔“

”مجھے سمجھ نہیں آتی یوسف خان! کسی مکینک کو دکھاؤ۔“

میں اسے جواب دیتے ہوئے تیسری منزل پر جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ منیر میرے ساتھ تھا۔ یوسف خان خودکلامی والے انداز میں بڑبڑایا۔

”کمال اے یار! تم کو بھی اس خبیث کا سمجھ نہیں آتا... پھر تو تم بھی امارا بھائی اے۔“

مغرب کا وقت قریب تھا۔ موسم بھی مناسب ہی تھا۔ ہم دونوں چھت پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ”ہم دونوں مل کر بہت کچھ کر سکتے ہیں طاہر بھائی! اور آپ دیکھ لینا بہت جلد... بہت جلد حالات کچھ کے کچھ ہوں گے... آج جن لوگوں کو آپ کی پروا بھی نہیں رہی پھر آپ کے دائیں بائیں ہوں گے۔“

”بہت کچھ... مثلاً؟“

”بہت سے کاروبار ہیں... کوئی سا بھی شروع کر دیں گے۔“

”کاروبار اور بزنس کے لیے پیسا چاہیے اور میری حالت تمہارے سامنے ہے... پاؤں کے نیچے زمین تک نہیں۔“

”حالات تو میرے بھی ایسے ہی ہیں مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“

”بنیادی سوال پیسے ہی کا ہے منیر! کچھ بھی کیا جائے، کچھ بھی سوچا جائے... پہلے نمبر پر پیسے کی بات آتی ہے... پیسا کہاں سے آئے گا؟“

میرے سوال پر کچھ دیر کے لیے منیر کسی سوچ میں پڑ گیا پھر سنجیدہ انداز میں بولا۔

”اس کے لیے ہمیں کوئی ”گیم“ کرنا پڑے گا۔“

”گیم...؟“

”جی... میرے ہاتھ میں بہت سے گیمز ہیں۔ ایک گیم تو ایسا ہے کہ ہم دو چار روز میں ہی پچاس ساٹھ ہزار بنا سکتے ہیں۔ اس سے کم از کم ہم کچھ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔“

”گیم کیا ہے؟“

”بلیک میلنگ... ایک عورت ہے خاصی...“

”نہیں یار! یہ عورت والی بات مت کرو۔ میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔“ میں نے فوراً قطع کلامی کی۔

”لیکن ایسے تو کام نہیں چلے گا۔ میرے پاس ایک سے ایک ایزی اور کلیئر گیم موجود ہے۔ آپ اپنا ذہن بنائیں۔ یقین کریں کہ اگر ہم چاہیں تو ہمیں کوئی کام دھندا کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ چھوٹے چھوٹے گیمز کھیلتے رہیں گے اور موج کریں گے۔“

میں خاموشی سے اس کی صورت تکتا رہا۔

”طاہر بھائی! یہاں پنڈی اسلام آباد میں ایسی ایسی مچھلیاں اور ایسے ایسے مرغ ذبح ہونے کو تیار پڑے ہیں کہ میں آپ کو کیا بتاؤں۔“ منیر نے فوراً موبائل جیب سے نکال لیا۔

”آپ یہ ایک ”آنٹی“ کا نمبر نوٹ کریں اور اس سے رابطہ کریں... دوستی کریں۔“

”منیر! تم جانتے ہو کہ یہ میرا مزاج نہیں... دھوکا،

WWW.PAKSOCIETY.COM

فریب، دغابازی یہ سب میں نہیں کرسکتا۔"

"تو آج اپنا حال بھی دیکھ لیں پھر... خلوص، سچائی، ایمان داری وغیرہ وغیرہ... یہ سب ذہنی بیماریوں کے نام ہیں۔ اس دنیا میں ڈھنگ سے جینے کے لیے دھوکے، فریب سے کام لینا ہی پڑتا ہے... معاشرہ قبول بھی تو ایسے ہی لوگوں کو کرتا ہے۔ آپ کو بھی اب اپنے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا کرنا ہوں گی۔ وقت اور حالات کے مطابق... دنیا کو دنیا جیسا ہو کر ملیں گے تو یہ دنیا آپ کے قدموں میں ہوگی۔"

مجھے چپ لگ گئی۔ وہ اپنی دھن میں بولے جارہا تھا اور میں بس "ہوں، ہاں" میں جواب دیتا رہا۔ مغرب کے بعد وہ واپسی کے لیے رخصت ہوگیا۔ ڈھائی ماہ بعد اس رات پہلی بار ایسا ہوا کہ میں نے مرجانے یا ماردینے سے ہٹ کر بھی سوچا۔

رانا منیر راولپنڈی کا مقامی بندہ تھا۔ کافی عرصے وہ لینڈ مافیا کا بھی حصہ رہا تھا۔ شہر کے بہت سے بگڑے ہوئے اور ٹیڑھے لوگوں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا اور کچھ نہیں تو اس کے ذریعے میں اسلحہ تو بہ آسانی خرید ہی سکتا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ آنے والے وقتوں میں کیا ہوگا... وقت کے دامن سے میرے لیے کیا نکلے گا یا آنے والا کل مزید کیا ستم ڈھائے گا... ہاں اس وقت، ان لمحوں تک میری ذہنی وجذباتی حالت کچھ ایسی تھی کہ میں سہولت میسر آجانے کی صورت میں خود سے کسی بھی انتہائی قدم کی توقع کرسکتا تھا۔

☆☆☆

جیل کی بے رحم دیواریں تھیں۔ آہنی سلاخیں تھیں۔ رات کا آخری پہر تھا اور میں ایک کونے میں فرش پر بیٹھا اس سب کو قبول کرلینے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ میرے ساتھ یہاں آٹھ دس افراد اور بھی بند تھے جو اس وقت بے خبر پڑے سورہے تھے مگر میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔

میں گزرے ہوئے ان تمام واقعات کو یاد کرنے لگا جنہوں نے اس موجودہ صورت حال کو جنم دیا تھا اور مجھے اس پنجرے میں لا پھینکا تھا۔

ہفتے کی شام تھی۔ افشاں اپنی ایک کولیگ مس ساجدہ اور اسکول کے گیٹ کیپر کی والدہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ ماہا اور عاصم مجھ سے پوچھ کر باہر گراؤنڈ میں کھیلنے کے لیے چلے گئے تھے اور میں گھر میں اکیلا تھا۔

یہ چھوٹا سا گھر ہمیں اسکول ہی کی طرف سے مہیا کیا گیا تھا۔ قریباً آٹھ ایکڑ کے احاطے کے ایک حصے میں اسکول کی عمارت تھی۔ دوسرے میں شادی شدہ ٹیچرز کے لیے یہ کوارٹرز تھے اور انہی کوارٹرز کے مقابل احاطے کی دوسری دیوار کے ساتھ پیونز اور دیگر ملازمین کے کوارٹرز تھے۔

"میں تو اپنے مقام و مرتبے سے معزول ہوا بیٹھا ہوں... ایک شوہر والی... گھر کے سربراہ والی تمام ذمے داریاں آپ نے سنبھال رکھی ہیں۔ اس لحاظ سے میں آپ کا نہیں... بلکہ آپ میری مجازی خدا ہیں... ان دنوں اس مرتبے پر آپ فائز ہیں۔"

میرے دل و دماغ میں جو بات بھی ہوتی تھی، میں برملا وہ کہہ دیا کرتا تھا۔ اس کے سوا کسی سے میرا کوئی تعلق واسطہ بھی تو نہیں تھا... اور پھر وہ میری اپنی جو تھی... میری ہم راز ...... محرم... میری دوست اور شریکِ زندگی... میں شاید ٹھیک سے اندازہ ہی نہیں کرپایا تھا کہ میری ایسی باتیں اس کے مزاج اور اندازِ فکر کو کس رنگ میں رنگتی جارہی ہیں۔

ہفتے کے روز... شام کو عموماً میرا موڈ خوشگوار ہی ہوا کرتا تھا کہ ہر ہفتے، رات کے کھانے کے بعد ہم اکٹھے بیٹھ کر کوئی نہ کوئی مووی دیکھا کرتے تھے۔ اس شام بھی میرا موڈ اچھا ہی تھا لیکن جب مغرب کی اذان ہوگئی... باہر اندھیرا پھیل گیا اور افشاں کی واپسی نہ ہوئی تو مجھے ایک فکرمندی نے آلیا۔

میں نے موبائل پر ایک دوبار افشاں سے رابطہ کیا مگر اسے جیسے وقت اور حالات کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اس علاقے میں جہاں ہم رہائش پذیر تھے، انتہاپسندوں کا اچھا خاصا زور ہے اور وہ لوگ یوں گھومنے پھرنے والی عورتوں کو یا تو اغوا کرلیتے ہیں یا پھر گولی ماردیتے ہیں... یہ بات بھی اسے بخوبی معلوم تھی کہ بازار آنے جانے والی عورتوں کو یہاں کے لوگ بدکردار تصور کرتے ہیں اور یہ بھی اسے اچھی طرح علم تھا کہ مجھے اس کا بازار جانا قطعی پسند نہیں... اور یہ بات میں نے شروع دن ہی سے اسے اچھی طرح سمجھا دی تھی۔ اس کے باوجود شروع دن سے آج تک وہ اپنی روش پر قائم تھی۔

میرا موڈ بگڑتا چلا گیا۔ بچوں کو پکارا مگر وہ بھی ابھی تک کہیں باہر ہی تھے۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا تو دونوں ہی مجھے گراؤنڈ میں کہیں دکھائی نہیں دیے۔ میرا موڈ کچھ مزید خراب ہوگیا... بلکہ مجھے غصہ آنے لگا۔

آخر رات کو تقریباً نو ساڑھے نو بجے محترمہ واپس گھر پہنچیں تب تک میرا دماغ بُری طرح خراب ہوچکا تھا لہٰذا جیسے ہی وہ میرے کمرے میں آکر... میرے پاس بیٹھی، میں نے اسے جاکر سونے کا کہہ دیا۔ اندازہ تو خود اسے بھی تھا، سو وہ بھی خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں جاکر بچوں کے ساتھ سوگئی اور میں دیر تک یہ سوچ سوچ کر کڑھتا رہا کہ

آخر میری پسند ناپسند کا کوئی پاس کیوں نہیں رکھا جاتا؟ میرے کہے... میرے بتائے سمجھائے پر عمل کیوں نہیں ہوتا... کیوں میری کوئی بات تسلیم نہیں کی جاتی؟ باقی رات میں اپنے لکھنے لکھانے کے کام میں مصروف رہا کہ ان دنوں میں رائٹنگ میں اپنا کیریئر بنانے... اپنی اس صلاحیت کو پروفیشن بنالینے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا مگر افسوس اور دکھ کی بات یہ تھی کہ باوجود کوشش اور محنت کے مجھے اپنی توقع کے مطابق نتیجہ نہیں مل پارہا تھا۔

صبح قریب تھی جب میں مضمحل اعصاب کے ساتھ لیٹ کر سوگیا۔ دوپہر کو آنکھ کھلی تو افشاں میرے سامنے آبیٹھی۔

"میں آپ کے لیے ایک گہرے کلر کا سوٹ لائی ہوں۔ آپ نے کبھی گہرا رنگ نہیں پہنا... یہ بہت اچھا لگے گا آپ کے اوپر۔"

میں ہونٹ بھینچے خاموش بیٹھا رہا۔ البتہ دل ہی دل میں، میں بولا۔

"مجھے اس سب کی کبھی بھی کوئی حاجت یا شوق نہیں رہا... میں کیا چاہتا ہوں یہ آپ سمجھ لینے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں... کیوں..."

"میں نے تو کچھ نہیں خریدنا تھا وہ... ساجدہ نے کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ اکیلی جانے سے گھبرا رہی تھی تو اس نے مجھے ساتھ چلنے کا کہہ دیا۔"

"مجھے تکلیف بھی تو یہی ہے کہ آپ دوسروں کو اتنی ترجیح کیوں دیتی ہیں... میں آپ کے نزدیک تھرڈ پرسن کیوں ہوں؟" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ جھنجلاہٹ اور وحشت تھی کہ میری رگوں میں سنسنانے لگی۔

میں نے نیند کی گولیاں اٹھائیں اور دو گولیاں نگل لیں مگر چند منٹ گزرنے کے بعد بھی جب ان کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوا تو میں نے دو تین مزید حلق سے اتارلیں۔ ایک ذرا میں ہچکچایا بھی تھا کہ ڈیڑھ سال پہلے بھی انہی گولیوں کی وجہ سے آپسی جھگڑے کے دوران میں بہت زیادہ غصہ ہوگیا تھا اور ہم دونوں ہی کو شدید دکھ اور اذیت کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن اس وقت جھگڑے کی وجہ بھی بہت تکلیف دہ تھی اور گولیاں بھی میں نے کوئی بیس پچیس کھالی تھیں۔ لہٰذا ان چار پانچ گولیوں سے کسی بڑی بدمزگی کی قطعاً کوئی توقع نہیں تھی۔

"ہم دونوں اکیلی نہیں تھیں... خالہ بھی ساتھ گئی تھیں۔"

اس بار مجھ سے چپ نہیں رہا گیا۔

"میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں آپ کے تمام مخلص ہمدردوں سے پوچھوں کہ جو کام مجھے سرے سے پسند ہی نہیں... میرے اندر جس کے لیے قطعاً کوئی گنجائش ہی نہیں... جانتے بوجھتے ہوئے بھی آپ وہی کام کرتی ہیں تو کس لیے... اپنے اس رویّے، اس طریقہ کار سے آپ مجھے کیا سمجھانا یا باور کرانا چاہتی ہیں؟"

"ہم بازار نہیں، کسی کے گھر گئے تھے۔ وہیں سے کپڑے وغیرہ لیے ہیں۔"

"جہاں بھی گئے تھے، کوئی طریقہ ہوتا ہے آنے جانے کا... آپ تو جیسے جاکر واپسی کا راستہ ہی بھول گئی تھیں... جانتی بھی ہیں کہ یہ پنجاب نہیں ہے۔ یہاں کے لوگوں کے رہن سہن اور یہاں کے حالات کا بھی آپ کو سارا علم ہے... پھر بھی؟" ہمیشہ کی طرح افشاں کے پاس جواز تھے... توجیحات تھیں۔ میرا پارا چڑھتا گیا۔ گولیوں کا اثر بھی محسوس ہونے لگا تھا۔

"ویسے اگر دیکھا جائے تو اصولی طور پر مجھے کسی اعتراض کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ مجھے تو آپ کا شکر گزار رہنا چاہیے... چاہے آپ کچھ بھی کرتی پھریں۔ ہاتھ پاؤں ہونے کے باوجود میں ایک اپاہج اور معذور انسان ہوں۔ کھانا مجھے پکا پکایا اور وقت پر ملتا ہے... کپڑے استری شدہ ملتے ہیں... سگریٹ تک تو مجھے آپ مہیا کررہی ہیں... میں آپ کا محتاج ہوں، آپ تو میری محتاج نہیں ہیں پھر بھلا مجھے یا میری کسی بات کو کوئی اہمیت یا وقعت دینے کی ضرورت کیوں محسوس کریں گی آپ؟" میرے لہجے میں میری بے روزگاری... میری بے بسی کا آزار آ گھلا تھا۔

"لیکن کیا کروں کہ اپنی عادت سے مجبور ہوں... شکر گزار ہونے کے بجائے الٹا بک بک کرتا رہتا ہوں۔"

"میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا۔ یہ آپ کے خودساختہ خیالات ہیں۔"

"ہاں، پاگل اور جاہل انسان جو ٹھہرا... عقل تمیز سے عاری ہوں نا! سمجھ نہیں سکتا میں... اور آپ سوچیں یا نہ سوچیں... آپ کا رویّہ... آپ کا برتاؤ ثابت کرتا ہے کہ آپ کے نزدیک میری کیا حیثیت، کیا اہمیت ہے یہ..." میں نے کونے میں پڑے فریزر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ فریزر آپ نے خریدا ہے... مجھے تکلیف ہے اس کی... بے انتہا تکلیف! اس بات پر نہیں کہ یہ آپ نے کیوں خریدا ہے... ٹھیک ہے آپ کی رقم تھی، آپ نے جیسے مناسب سمجھا اسے استعمال کرلیا... مجھے دکھ، تکلیف اس بات کی ہے کہ کم از کم

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھ سے پوچھ تو لیتیں... چلو پوچھتی نہ، مشورہ کر لیتیں... یہ بھی نہ کرتیں کم از کم بتا ہی دیتیں کہ میں ایسا کرنے والی ہوں... مگر آپ نے تو مجھ سے ایسی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کی... گویا میں یہاں موجود ہی نہیں... میرا ہونا نہ ہونا آپ کے لیے برابر ہے... اور یہ تو صرف ایک تازہ مثال ہے... کیا اس کے بعد بھی یہ سوچنے سمجھنے کی گنجائش بچ جاتی ہے کہ یہ میرے خودساختہ خیالات ہیں یا وہ تلخ حقیقت جو میں کب سے جھیلتا آرہا ہوں؟'' میرے ذہنی خلفشار اور جھنجلاہٹ میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہورہا تھا۔ خون تھا کہ سلگنے لگا تھا... کیا کروں... کیسے سمجھاؤں... کیسے اپنے ہونے کا احساس دلاؤں... مجھے کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کچھ دیر مزید ہمارے درمیان اسی طرح بات چیت ہوتی رہی تو میں ضبط کھو بیٹھوں گا لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ کچھ دیر کے لیے باہر گراؤنڈ میں نکل جاؤں سو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ بھی دوسروں جیسی ہوتی جارہی ہیں... دنیا جیسی۔ مجھے کسی سے کوئی سروکار نہیں... نہ آپ سے، نہ دنیا سے۔'' میں بولتے ہوئے لاؤنج میں آگیا۔

''اگر یہی سب ہوتا ہے... اسی طرح ہوتے رہنا ہے تو میں سب کچھ جلا کر راکھ کر دوں گا... سب کچھ... یہ گھر بھی اور خود کو بھی۔'' میں نے جیب سے ماچس نکالی اور لاؤنج میں پڑے پلنگ پر بچھی چادر کو تیلی دکھادی۔ ایک تو میری نظر میں وہ تھی ہی بیکار چادر، دوسرا افشاں بھی قریب ہی کھڑی تھی اس لیے مجھے یقین تھا کہ میری یہ حرکت زیادہ نقصان کا باعث نہیں بنے گی... افشاں فوراً آگ بجھالے گی۔ میری توقع کے مطابق وہ فوراً پلنگ کی طرف جھپٹی اور میں گھر سے نکل کر گراؤنڈ کے وسط میں موجود اسٹیج پر جا کر لیٹ گیا۔ میرا دماغ ہولے ہولے گھوم رہا تھا اور یقینی طور پر ایسا نیند کی گولیوں کے سبب تھا۔

کچھ دیر بعد مس ساجدہ کا شوہر میرے پاس آبیٹھا، مجھے سمجھانے بجھانے کے لیے، میرا غصہ کم کرنے کے لیے۔ وہ گیا تو سامنے والے گھر میں رہنے والا اسکول کا ایک پیون میرے پاس آبیٹھا۔ کچھ ہی دیر مزید گزری تھی کہ اسکول کی پرنسپل کا شوہر وسیم گاڑی لے کر اسکول آن پہنچا۔

''اسے کس نے بلایا ہے؟'' میں نے قدرے تعجب سے پیون کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں جی! آؤ ملتے ہیں... بلا رہے ہیں وہ۔'' وسیم نے غالباً پیون کو اشارہ کر کے بلایا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ گیا۔

''کیا بات ہے؟ مجھے پتا چلا ہے کہ کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا ہے۔''

وہ مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں جی مگر یہ ہمارا میاں بیوی کا آپسی معاملہ ہے... ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔''

''آپ نے گھر میں کوئی آگ وغیرہ لگائی ہے؟'' وہ بات کرتے ہوئے ہمارے مکان میں داخل ہو گیا۔ پلنگ پر پڑی ادھ جلی چادر کو دیکھتے ہوئے وہ واپس پلٹا۔

''نہیں، یہ گھر کا معاملہ نہیں ہے... پولیس کو بلاؤ۔''

پتا نہیں وہ خبیث کس سے مخاطب تھا اور اسے کال کر کے بلایا کس ذلیل ہستی نے تھا۔ بہرحال، وہ باہر نکلا اور بیرونی کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ میں اندر حیران و پریشان کھڑا تھا کہ یہ سب کیا شروع ہو گیا ہے۔ بات کا بتنگڑ بنانے کی کوشش بھلا کیوں کی جارہی ہے؟

کچھ دیر بعد پولیس پہنچ گئی اور مجھے گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔ اگلے روز دوپہر تک مجھے بٹھائے رکھنے کے بعد ایس ایچ او کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ افشاں نے کپڑوں کا بیگ اور کچھ رقم بھجوائی تھی جو ایس ایچ او نے میرے حوالے کر دی۔

''یہ تمہارا بیگ اور پنجاب کا کرایہ... گاڑی پکڑو اور پنجاب کا رخ کرو۔ اس سے پہلے کہیں بریک نہ لگانا۔'' اس کا لہجہ کرخت اور تحکمانہ تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' لفظ جیسے خود بخود میرے ہونٹوں سے پھسلے تھے۔

''چل اوئے، اسے گاڑی پر بٹھا کر آ۔'' ایس ایچ او نے کسی سپاہی کو مخاطب کیا۔ میں نے پیسے جیب میں ڈالے، بیگ اٹھایا اور خاموشی سے پولیس اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل آیا مگر میرا پنجاب جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے رکشا پکڑا اور دوبارہ اسکول جا پہنچا۔ اسی وقت غالباً چھٹی ہوئی تھی۔ بچے اسکول کی اندرونی عمارت سے گیٹ کی طرف آرہے تھے۔ اسکول کے کوریڈور میں ایک دو ٹیچرز بھی غالباً موجود تھیں۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں میرے استقبال کے لیے باقاعدہ پولیس کی نفری موجود ہوگی۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی پولیس کے جوانوں نے مجھے چھاپ لیا۔ گالیاں... تھپڑ... گھونسے... وہ مجھ پر یوں ٹوٹ پڑے تھے جیسے میں کوئی دہشت گرد ہوں یا کوئی پیشہ ور مجرم... انتہائی مطلوب شخص... تشدد... تحقیر اور مغلظات اپنی جگہ،

برے دل و دماغ میں اس وقت یہ کربناک خیال تڑپ رہا تھا کہ میرا یہ تماشا... میری یہ درگت دیکھنے والی آنکھیں کس کس کی ہیں... کیا کوریڈور میں افشاں بھی میری ذلت و رسوائی کا یہ تماشا دیکھ رہی ہے... کیا میرے بچے بھی یہ نظر سوز نظارہ دیکھ رہے ہیں... دیکھ رہے ہیں تو ان کے دل و دماغ پر اس سارے منظر کا، اس واقعے کا کیا اثر پڑے گا... ان کے محسوسات کیا ہوں گے؟ مجھے ایک بار پھر ایس ایچ او کے سامنے لا کھڑا کیا گیا۔

''اوئے... تجھے میں نے کہا تھا کہ پنجاب سے پہلے بریک نہیں لگانا... پھر تو اسکول کیوں گیا؟''

''میرے بیوی بچے ہیں یہاں۔ میں ایسے کیسے جا سکتا ہوں؟'' پتا نہیں کیوں مگر میرا لہجہ بالکل بے خوف تھا۔

''تیری بیوی نے ہی تجھے یہاں پہنچایا ہے اور اسی نے تجھے یہاں سے دفعان کرنے کا کہا ہے۔''

''نہیں... یہ ناممکن ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔'' میں نے بے ساختہ اس کے کہے کی نفی کی۔ میرے لہجے میں جیسے پختہ یقین تھا۔ کچھ بھی سہی افشاں میرے خلاف اس حد تک بھی نہیں جا سکتی... کسی صورت بھی نہیں۔

ایس ایچ او چند لمحے میری صورت تکتا رہا پھر اس نے ایک بھاری بھرکم سی گالی بکتے ہوئے ایک کاغذ اٹھا کر میرے منہ پر کھینچ مارا۔

''لے... خود پڑھ لے اپنی بیوی کا محبت نامہ۔''

میں نے ایک سرسری سی نظر کاغذ پر ڈالی۔ وہ تحریر میری نظر آشنا نہیں تھی جبکہ افشاں کی تحریر تو میں کروڑوں تحریروں میں سے بھی بہ آسانی شناخت کر سکتا تھا۔

''یہ ہینڈ رائٹنگ اس کی نہیں ہے۔'' میرا لہجہ سپاٹ تھا۔

''ہینڈ رائٹنگ کے بچے! سائن دیکھ۔''

میں نے دوبارہ ہاتھ میں پکڑے کاغذ پر نظر ڈالی اور... اور... میں... ایک شاک تھا، ایک دھچکا تھا جو میری بنیادیں تک تہ و بالا کر گیا تھا۔ کاغذ میرے ہاتھ میں تھا اور میری نظریں جیسے اس پر جم کر رہ گئی تھیں۔ دماغ یکایک سن ہو گیا۔ سارا وجود پتھرا گیا تھا میرا...

سورج تو آج بھی مشرق ہی سے طلوع ہوا تھا۔ دنیا کا باقی نظام بھی جوں کا توں تھا۔ خود میرا وجود ثابت و سالم تھا، ریزہ ریزہ ہو کر بکھرا نہیں تھا۔ سانسیں چل رہی تھیں۔ حواس سلامت تھے۔ دل بھی برابر دھڑک رہا تھا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا پھر بھلا یہ انہونی کیسے ہو گزری تھی۔

ایک شور ر تخیر تھا جو میری نس نس میں چیخ اٹھا تھا۔ ایک قیامت کا سا شور... اور پھر... پھر وہ شور دم توڑتا گیا اور میرے اندر سناٹے پھیلتے چلے گئے... ایک گہری خاموشی تھی جو میری روح تک سرایت کرتی چلی گئی...

''ہاں... اب کیا ارادہ ہے... پنجاب جانا ہے یا نہیں؟''

''نہیں...'' میرے ہونٹوں کو جنبش تو ہوئی مگر اپنی آواز مجھے سنائی نہیں دی۔

''بند کرواوئے اس کتے کو۔''

ایس ایچ او کا حکم ملتے ہی سپاہی مجھے دھکے مارتے ہوئے حوالات تک لے گئے۔ اگلی صبح مجھے عدالت حاضر کیا گیا اور وہاں سے... یہاں جیل منتقل کر دیا گیا۔

☆☆☆

گزشتہ ایک ڈیڑھ ماہ سے رانا منیر برابر مجھ سے ملنے آ رہا تھا۔ دو چار راتیں وہ میرے پاس یہاں ٹھہرا بھی تھا۔ رانا منیر، یوسف خان اور میں... ہم تینوں ہی گھنٹوں ایک ساتھ گزارتے تھے۔ اکٹھے کھاتے پیتے تھے اور ایک ساتھ ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے لیے بھی نکل جایا کرتے تھے۔ یوسف خان کچھ ایسی بے تکلف طبیعت کا بندہ تھا کہ چند ہی روز میں رانا منیر اور یوسف بھی آپس میں گھل مل گئے تھے۔

اس ایک نکتے پر تو ہم تینوں ہی پوری طرح متفق تھے کہ جینے کا کوئی معیار ہونا چاہیے... زندگی کی کوئی مناسب اور بہتر صورت ہونی چاہیے... کھلا پیسا ہونا چاہیے... مگر کھلا پیسا کیسے اور کہاں سے آئے گا... یا کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے ہم متفق نہیں ہو پائے تھے۔

جمعے کا دن تھا۔ ورکشاپ کی چھٹی تھی۔ سیٹھ رضوان ترنول اپنے گھر گیا ہوا تھا اور چھوٹا وقاص ہری پور اپنے گھر... وہ ہری پور کے کسی گاؤں خان پور کا رہائشی تھا۔ میں، یوسف اور منیر حسب عادت تیسری منزل پر بیٹھے تھے۔ یوسف اور منیر پشاور روڈ پر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہے تھے۔

''اس ٹینکر میں چالیس ہزار لیٹر پیٹرول ہوتا ہے۔'' منیر نے ایک آئل ٹینکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چالیس لاکھ کا... لیکن چوری کا ہو تو دس پندرہ لاکھ سے زیادہ میں نہیں جاتا۔''

میری نگاہیں دور... پہاڑوں کے اس پار... ٹھیک وہاں ٹکی ہوئی تھیں جہاں آسمان زمیں پر سجدہ ریز دکھائی دیتا تھا۔ عظیم اور مقدس بلندیاں زمیں زادوں پر مہربان ہوتی معلوم ہورہی تھیں۔ وہیں کہیں افشاں تھی۔

''تو ٹھیک ہے تامنڑاں! ام تین بندہ اے... پانچ

WWW.PAKSOCIETY.COM

پانچ لاکھ حصے میں آئے گا نا۔"

مجھے تو ایک خوب صورت سا گھر چاہیے تھا... بنگلا ٹائپ... پانچ، پندرہ تو کچھ بھی نہیں تھے۔

"روڈ روبری کا کیس ہے یہ... بڑا رپھڑ والا کام ہے۔" منیر نے فوراً سر جھٹکا۔

"یار! تم بس ہاں کرو۔ماں قسم دن کا وقت روڈ سے ام نے اس کا گاڑی چھینا تھا اور عوام بس دور کھڑا دیکھتا رہا تھا۔"

"ایسے کاموں کے لیے اسلحہ بھی ناگزیر ہوتا ہے اور جب اسلحہ ہو تو مرنے مارنے کی ضرورت بھی آپڑتی ہے۔بندہ پھڑکانا مجبوری بھی بن جاتی ہے۔"

رانا اسے اس کام کی سنگینی کا احساس دلا رہا تھا اور سنگینی کے اس احساس سے یوسف خان کے خون میں جیسے سنسناہٹ بیدار ہو گئی تھی۔ اس نے جذباتی انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔

"تو ام کس مرض کا دوا اے... ام لائے گا اسلحہ۔ ادھر... پشاور میں امارے گھر دو پسٹل پڑا اے... ایک ٹرپل ٹو رکھا اے اور چار گرینیڈ بھی اے امارے پاس... ضرورت پڑنے پر بندہ بھی ام پھڑکائے گا... اور بولو تم؟"

میں نے بے اختیار گردن موڑ کر یوسف خان کی طرف دیکھا۔

"گرینیڈ..." میرا انداز سوالیہ تھا۔

"ہاں... گرینیڈ اور وہ بھی روسی والا... یہ چائنا والا نئیں جو دو ہزار میں مل جاتا اے... امارے پاس گھر میں چار روسی گرینیڈ رکھا ہے۔ام چاروں اٹھا لائے گا۔تم کوئی پکا بات تو کرو۔"

پسٹل یا رائفل کا یوسف کے پاس ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ مگر یہ گرینیڈ والی بات میرے لیے دلچسپی کا باعث تھی۔ کوئی ایک گھر مٹی کرنے کے لیے ایک دو گرینیڈز کی ضرورت پڑ تو سکتی تھی۔

"طاہر بھائی! یہ روڈ روبری والا معاملہ بڑا خطرناک ہوتا ہے... اس میں انسان بہت بُرا پھنستا ہے۔" مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر منیر نے فوراً جیسے اختلاف کیا۔

"جاؤ منڑاں!" یوسف فوراً تیز لہجے میں بولا۔ "خطرہ نئیں اٹھائے گا تو پیسا کدھر سے آئے گا؟ تم کو خطرہ محسوس ہو تو تم پیچھے رہنا... پہلی گولی ام کھائے گا اور ام ای کھلائے گا۔"

"نہیں یوسف خان!" میں نے فوراً دخل دیا۔ "یہ گولی کھانے کھلانے والی بات ٹھیک نہیں۔ پانچ دس لاکھ کے چکر میں کسی کو جان سے مار ڈالنا کچھ... ٹھیک نہیں لگتا۔"

"کیوں ٹھیک نہیں لگتا؟"

"انسانی جان کوئی اتنی معمولی یا سستی چیز تو نہیں ہے۔"

"کیوں نئیں یار طاہر بھائی... کیسا بات کرتا اے تم۔ انسانی جان... دس ہزار میں انسان مرتا اے۔"

میرے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آگئی۔

"جو بھی ہے، ہم اتنے... سستے میں تو کسی کی بھی جان نہیں لیں گے۔"

"اچھا... تمہاری نظر میں جان کا قیمت کیا اے...؟ اگر کسی کو قتل کرنا او تو اس کا کتنا قیمت ملنا چاہیے؟"

میں نے ایک سرسری سی نظر یوسف اور منیر کے سوالیہ چہروں پر ڈالی اور گردن موڑ کر ادھر دیکھا... پہاڑوں کے اس پار... دور...

"اگر بات مرنے مارنے تک پہنچ جائے اور سوال بھی صرف میری ذات کا ہو... تو..." میں نے رخ بدل کر یوسف خان کی آنکھوں میں جھانکا۔ "کم از کم بھی کہانی ایک کروڑ تیس لاکھ کی تو ہونی چاہیے۔"

چند لمحوں تک ہم بس خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے پھر منیر نے کچھ کہنا چاہا۔

"طاہر بھائی..."

"قیمت میں کمی کی تو گنجائش نہیں... مزید کچھ بھی کہو۔" میں نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹی۔

میرے سر پر بہت بوجھ تھا۔ بہت قرض تھا۔ اگر "ابھی جیتے رہنے" کے سوال پر میں ایک ذرا بھی توجہ دیتا تھا تو یہی احساس اندر سے کچوکے دیتا محسوس ہوتا کہ ہر اپنے، پرائے کا قرض چکائے بغیر جینا پڑے تو اس کی کوئی گنجائش نہیں... یہ تو اب میری غیرت کو گوارا ہی نہیں تھا اور جینے کی صورت میں نئی زندگی کی تشکیل و ترتیب اور سود سمیت یار و اغیار کا قرض چکانے کے معاملے میں یہ دس، بیس یا تیس لاکھ کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔

"طاہر بھائی! جتنا بڑا گیم ہو گا اتنا ہی زیادہ رسک ہو گا۔" منیر کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

"بات زندگی کی قیمت کے متعلق ہو رہی ہے... مجھے تو اب اس زندگی کی ویسے بھی کوئی ضرورت نہیں... کامیاب ہوا تو تسلی کے ساتھ سب کا حساب کتاب کروں گا... مارا گیا تو "شہید" کہ ایک بڑے مقصد کے لیے جدوجہد کرتا ہوا مروں گا۔" میں نے ایک نظر منیر کے چہرے پر ڈالی۔

"اور یہ تو میں صرف اپنے حوالے سے بات کر رہا

ہوں۔ اگر ہم تینوں ہوں تو "گیم" کم از کم بھی تین کروڑ توے لاکھ کا ہونا چاہیے۔"

وہ دونوں پُرسوچ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور فرش پر کہنی ٹکاتے ہوئے نیم دراز ہو گیا۔

"ہم لوگ جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، وہ اس معاشرتی مشینری میں ایندھن کی حیثیت رکھتا ہے اور ایندھن کی کیا زندگی ہوتی ہے... جلنا... سلگنا اور راکھ ہو جانا... تم دونوں سوچ لو... مجھے تو اب یکبارگی راکھ ہو جانا گوارا ہے مگر مزید جلنا سلگنا نہیں۔"

"ٹھیک اے طاہر بھائی! ام تمہارے ساتھ پورا پورا اتفاق کرتا اے... جب بولو، جدھر بولو اور جو بولو... ام کرے گا۔"

یوسف خان ذرا سیدھا ہو بیٹھا۔

"طاہر بھائی! ہم لوگ پیشہ ور نہیں ہیں... اتنا بڑا گیم ہینڈل کرنا کوئی آسان کام نہیں... اس کے لیے تو نیٹ ورک ہونا چاہیے، پروفیشنل لوگ ہونے چاہئیں۔" منیر شاید کچھ فکر مند تھا۔

"پیشہ ور نہیں ہیں اور ہو بھی نہیں سکتے۔ اس لیے آئے دن چھوٹے چھوٹے گیمز میں گندا ہونے کے بجائے ایک ہی بار کوئی بڑا گیم کھیل لیا جائے اور بس..." میں نے ایک لمحہ توقف کیا۔

"جان کے داؤ پر ایک بازی... یا تو گھر بار، گاڑی شاڑی اور کوئی چھوٹا موٹا سیٹ سا بزنس... یا پھر ان ساری مکروہ ضرورتوں اور ذلیل جھنجٹوں سے آزادی۔"

دولت کی بھوک ہر انسان کو ہوتی ہے۔ ہر انسان ساری زندگی روپیا پیسا کمانے اور جوڑنے کی تگ و دو میں ہانپتا رہتا ہے۔ مجھے بھی یہ بھوک بہت پہلے سے تھی مگر اسے ایک لگام تھی۔ بیوی بچوں کی صورت... افشاں کی صورت... محبت کی لگام! اور ان باتوں کے علاوہ خود میرا اپنا مزاج یہ نہ تھا لیکن جو ذلت و رسوائی میں اٹھا چکا تھا، اس نے شاید میرا مزاج تک مسخ کر ڈالا تھا۔ بے وقعتی اور کم مائیگی کے احساس کی جن شدتوں کو میں جی آیا تھا، انہوں نے اس بھوک کی آگ پر پیٹرول کا کام کیا تھا۔ میں اکثر افشاں سے کہا کرتا تھا۔

"پیسا زمین کا خدا ہے۔ جس کے پاس جتنا ہے وہ اتنا ہی باوسائل، صاحب اختیار اور طاقت والا ہے۔ اس کی اتنی ہی قدر و منزلت اتنی ہی وقعت ہوتی ہے۔"

ہم فرش پر بیٹھے تھے اور آسمان پر گھر بنانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ساری رات ہمارے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔ آج پہلی بار ہم تینوں ایک نکتے پر متفق ہوئے تھے۔ تین ذہنوں نے ایک ہی تناظر میں سوچنا شروع کیا تھا۔

رانا منیر مقامی بندہ تھا۔ چھوٹی سطح پر ہی سہی، وہ اس فیلڈ کے لوگوں سے تعلق واسطہ تو رکھتا تھا۔ معاملات کی اچھی جانکاری تھی اس کے پاس... اس کی اس جانکاری ہی سے ہم نے تین چار بڑے گیمز کا انتخاب کیا اور ایک طویل تبادلۂ خیال اور بحث و تمحیص کے بعد صبح تک ایک گیم فائنل کر لیا۔

شارٹ کٹ کے چکر میں اتنا بڑا رسک لینے پر وہ دونوں کیوں تیار ہو گئے تھے، وہ جانیں... مجھے اپنا پتا تھا کہ میرے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ میری نجات تو اب صرف موت سے ممکن تھی سو میں نے زندگی کو داؤ پر لگا کر جوا کھیلنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

گیم فائنل تھا۔ بس اب کھیلنے سے پہلے ہمیں اطمینان اور تسلی سے تیاری کرنی تھی۔ کچھ بنیادی انتظامات کرنے تھے۔ اسلحے کی ذمے داری یوسف خان کے سر تھی، سو وہ صبح ہی پشاور کے لیے روانہ ہو گیا۔ حالات، واقعات کو جنم دیتے ہیں اور حالات ایک مخصوص صورت اختیار کر گئے تھے... ایک سنگین صورت۔

مجھے ان لمحوں شدت سے ایک شعر یاد آ رہا تھا۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

☆☆☆

میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ میں ایک مجرم تھا۔ میرے بالکل سامنے افشاں کھڑی مجسٹریٹ سے مخاطب تھی۔

"مجھے طلاق نہیں چاہیے... لیکن میں ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی... یہ جاب لیس ہیں... ان کا غصہ بہت زیادہ ہے... بہت ہی زیادہ... یہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزاریں... میں اپنی مرضی سے گزاروں گی۔"

ہاں، بالکل یہی الفاظ تھے... یہی "بھالے" تھے جو مجھے اندر تک چھیدتے چلے گئے تھے۔ دماغ منجمد سا ہو کر رہ گیا تھا میرا... وہ مزید بھی کچھ کہہ رہی تھی۔

خرچے... جاب... میری وجہ سے درپیش مشکلات و مسائل۔

دوسری پیشی پر میں زنجیر بکف کھڑا تھا اور افشاں میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔

"مجھے یہ یقین دہانی چاہیے کہ میری یا میرے بچوں کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

جان کو کوئی خطرہ نہیں۔“

میری نگاہوں کے سامنے ”درخواست“ کے الفاظ جھلملائے۔

”یہ ڈرگز لیتے ہیں... بچوں پر تشدد کرتے ہیں... گھر جلانے کی کوشش کی... ہمیں قتل کرنا چاہتے ہیں۔“

”افشاں... افشاں۔“ میرے اندر کوئی بہ آوازِ بلند پکارا... چیختا تھا کوئی۔ ”افشاں... کیا تم افشاں ہی ہو... افشاں ہی ہو نا تم؟“ میرے اندر کوئی بلبلا رہا تھا، پھڑ پھڑا رہا تھا۔

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا

اس درجہ بدگمانی... اس درجہ بداعتمادی... میرے لیے یہ جاننا، سمجھنا محال تھا کہ افشاں میرے حوالے سے ایسا کیسے سوچ سکتی ہے۔ ایسے خیالات... ایسا یقین بھلا کیسے رکھ سکتی ہے؟ وہ تو مجھے اچھی طرح جانتی تھی بلکہ اب تک میرا تو ماننا یہی رہا تھا کہ ”بس ایک افشاں ہی ہے جو مجھے جانتی سمجھتی ہے۔ اب اسی کا بیان مجھے ایک مکروہ اور قابلِ نفرت انسان ثابت کر رہا تھا۔

یہ ڈرگز لیتے ہیں... یعنی خطرناک پاگل... بچوں پر تشدد کرتے ہیں... وحشی... گھر جلانے کی کوشش کی... جنونی... ہمیں قتل کرنا چاہتے ہیں... ایک سفاک درندہ... جاب لیس ہیں... ایک فضول ناکارہ بوجھ۔

”اوہ... میرے خدا! میں زندہ سلامت کیوں ہوں؟ میری دھڑکنیں کیوں چلے جارہی ہیں؟ میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر کیوں نہیں گیا۔“ میرے اندر کوئی دھاڑیں مار مار کر بین کرنے لگا اور میں خود اپنی جگہ پتھرایا کھڑا ایک ٹک افشاں کو تک رہا تھا لیکن اسے شاید میری گھناؤنی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں تھا۔ آئندہ کئی روز تک رہ رہ کر مجھ پر حیرت و بے یقینی کی شدت کے باعث سکتے کی سی کیفیت طاری ہوتی رہی۔

ٹھیک ہے کہ میں ڈرگز استعمال کرتا تھا۔ مزاج بھی سنجیدہ اور غصیلا رکھتا تھا۔ شدید غصے ہی کے باعث مرنے مارنے کی بات بھی کہہ گیا ہوں گا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ میں... میں... اُف... یا حیرت۔

غصے میں انسان بہت کچھ کہہ جاتا ہے لیکن وہ سب لمحاتی اور وقتی ہوتا ہے اور... اور میری زندگی میں تو اور کچھ تھا بھی نہیں... نہ کوئی تعلق نہ دوست... نہ کوئی رشتے دار یا عزیز... نہ کسی سے ملنا ملانا اور نہ کہیں آنا جانا۔ بس افشاں اور بچے... یہی میری کُل دنیا تھی، کُل کائنات... میری کُل متاع!

ہماری شادی کو بارہ سال گزر چکے تھے۔ بارہ سال ہم نے ایک ساتھ گزارے تھے اور آج بھی... آج بھی میں افشاں کے لیے وہی بے قراریاں رکھتا تھا۔ اس سے دوری کا ایک ایک لمحہ میرے لیے سوہانِ روح تھا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں آخری سانس تک اسے اپنی نگاہوں کے سامنے بٹھائے رکھوں۔ وہ کھانا بنایا کرتی تھی تو میں کچن کے دروازے میں کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ کسی اور کام میں مصروف ہوتی تو اکثر اس کے آس پاس ٹہلتا رہتا۔ باتیں کرتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوا کرتا کہ میں کام چھڑا کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا کرتا تھا۔

اگر میرے اختیار و قدرت میں ہوتا تو میں اسے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی خود سے دور نہ ہونے دیتا۔ ایک ثانیے کے لیے بھی نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔ میرے لیے وہ آکسیجن کی طرح تھی اور یہ بات بھلا اس سے بہتر اور کون سمجھ سکتا تھا۔

میں...... محبت کے روبرو زنجیر بکف کھڑا تھا۔ مجھے لعنت کا طوق بھی پہنا کر ابلیس قرار دیا جاچکا تھا، دھتکارا جاچکا تھا پھر بھی... پھر بھی میرا دل افشاں کے حق میں جواز تراشنے میں جتا ہوا تھا۔

”وہ ایسی نہیں ہے۔ اس بیان کے لیے اسے مجبور کیا گیا ہوگا۔“

”ہوسکتا ہے اس کے اسکول میں میڈم نے اسے ایسا کرنے پر زور دیا ہو۔ اس کے دماغ میں یہ خناس جو بھرا رہتا تھا کہ میں یہاں کی آل ان آل ہوں...“

”افشاں خود سے تو ایسا نہیں کرسکتی... وہ تو مجھے جانتی ہے کہ میں بس بظاہر پتھر کی طرح نظر آتا ہوں۔ اندر سے کیسا کمزور اور نرم دل کا بندہ ہوں...“

میں تو جانوروں تک کے لیے بے حد حساس تھا۔ ایک بلی کا بچہ بھی مر جاتا تو میری بھوک اڑ جاتی تھی۔ ہماری اپنی بھی ایک سفید بلی تھی۔ ”مانا“ ماہا کی ہم قافیہ جو میرے ساتھ کمبل میں گھس کر سویا کرتی تھی۔ وہ تو جانتی تھی مجھے... یوں، جیسے لباس وجود کو جانتا ہے۔ سانس سینے کے اندرونی راستوں کو جانتی ہے... آواز قصرِ سماعت کی تمام غلام گردشوں کو جانتی ہے اور جیسے آنکھ روشنی کو جانتی ہے۔ افشاں بھی تو مجھے اسی طرح جانتی تھی اور... اور وہ مجھے بتا رہی تھی کہ میں ایک سنگ دل، ظالم، سفاک اور ایسا مکروہ اور گھناؤنا انسان ہوں جو بچوں کو اور اس کو ذبح کر دینا چاہتا ہے... جان سے مار دینا چاہتا ہے۔

جیل سے اپنی ضمانت پر رہا ہوا تھا میں... پچاس ہزار کا مچلکہ بھرنے کے بعد۔ وہاں سے سیدھے تھانے جاکر اپنا ضبط شدہ سامان وصول کیا تھا۔ پولیس والوں کا اصرار تھا کہ مجھے یہاں رکنا نہیں بلکہ فوری طور پر پنجاب روانہ ہونا ہے... وہ دھمکیاں بھی دیتے رہے تھے مگر میرا دھیان جیسے کہیں اور تھا۔

سامان وصول کرنے کے بعد میں ایک ہوٹل میں آبیٹھا۔ بیگ میں سے ایک فائل نکلی جس میں ایک ناول کا ادھورا مسودہ تھا۔ اسی کے اوپر ایک ڈھائی انچ کی چٹ رکھی تھی۔ پندرہ، پندرہ... بیس بیس صفحات کے محبت نامے لکھنے والی کا آخری خط... ڈھائی انچ کی ایک چٹ اور گنتی کی چند سطریں۔

”جو بس میں تھا اس گھر کو بچانے کے لیے کیا ہے لیکن میری بدقسمتی نے ہر جگہ میرا پیچھا کیا۔ آپ کو مجھ سے نفرت ہے، یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آئندہ شاید عمر بھر ہمارا رابطہ ممکن نہ ہو۔“

میں کتنی ہی دیر ساکت اور سن بیٹھا رہا۔ اب تک افشاں کے دماغ میں نہ جانے کتنے جواز گھڑتا آیا تھا مگر اس چٹ کا آخری جملہ... ”آئندہ شاید عمر بھر ہمارا رابطہ ممکن نہ ہو...“ عمر بھر کے لیے قطع تعلق... رابطہ تک نہیں ہوگا۔

”ایسا تو تمہیں سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا افشاں! اور تم نے فیصلہ کرلیا... عمل بھی کر ڈالا؟“ میری حالت شاخ سے ٹوٹے پتے کے جیسی تھی۔ پولیس والے مجھے شہر میں برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ سامان وغیرہ میرے حوالے کرتے وقت انہوں نے مجھے تنبیہ کی تھی۔

”اگر کل صبح تک تم خود روانہ نہ ہوئے تو پھر ہم اپنے طریقے سے تمہاری روانگی کا انتظام کردیں گے۔“

شہر بھر میں میرا کوئی شناسا، کوئی ہمدرد نہ تھا۔ جو ”تھا“ وہ دشمنی پر اتر آیا تھا۔ پاؤں کے نیچے زمین نہ تھی۔ فردوسِ محبت سے دھتکارا جاچکا تھا سو میں پہلے ملتان پہنچا اور وہاں دوستوں کے نئے رویے دیکھ کر یہاں... پنڈی چلا آیا۔ یہیں ایک موٹر ورکشاپ میں ملازمت اختیار کرنے کے چند روز بعد میں نے افشاں کو ایک خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ جن دنوں ہماری ”خطوطی محبت“ اپنی شدتوں پر تھی، ان دنوں موبائل نہیں ہوا کرتے تھے۔ آج موبائل ہونے کے باوجود ہمارے درمیان بات ہونا ممکن نہ رہا تھا۔ افشاں نمبر تبدیل کر چکی تھی۔ اس کے بھی ہمدرد صرف اسی کے ہمدرد تھے اور میرا تو خود افشاں کے سوا کوئی تھا ہی نہیں... سو میرے پاس بس

اب یہی ایک راستہ بچا تھا، خط... بارہ سال بعد، محبت کی تکمیل اور محبت کے کرداروں کی بربادی کے بعد ایک رات پھر میں افشاں کو خط لکھنے بیٹھ گیا... ایک آخری خط۔

محترمہ افشاں طاہر صاحبہ!
السلام علیکم!

میری ڈھٹائی اور بے غیرتی دیکھیے کہ اتنی ذلت و رسوائی کے بعد بھی میں زندہ ہوں۔ نہ صرف زندہ ہوں بلکہ اپنے ہوش و حواس میں بھی ہوں۔

آج سے قریباً تیرہ سال قبل پہلا خط آپ نے مجھے لکھا تھا اور آج یہ آخری خط میں آپ کو تحریر کر رہا ہوں۔ آخری خط اور شاید میری آخری تحریر!

”اے رگِ جاں کے مکیں!“ بارہ سال پہلے... خطوط میں آپ مجھے یوں مخاطب کیا کرتی تھیں۔ موجودہ صورتِ حال میں اس سے آگے کے جملے میرا ذہن خود سے ترتیب دینے لگتا ہے۔ ”اے رگِ جاں کے مکیں! ابھی تو صرف تھپڑوں، گھونسوں اور گالیوں سے تمہاری طبیعت نکھاری ہے۔ آئندہ ادھر کا رخ کیا تو جوتوں سے مرمت کراؤں گی۔“

بے یقینی سی بے یقینی ہے۔ میں ابھی تک اس سب کو پوری طرح قبول نہیں کر پایا۔ دل کم بخت ماننے کو تیار ہی نہیں۔ آج بھی مجھے یہ سب ایک خواب لگتا ہے۔ ایک دل دوز اور جانکاہ خواب... میں شعوری طور پر خود کو سمجھاتا رہتا ہوں کہ احمق، جاہل انسان! خواب اتنا طویل نہیں ہوا کرتا... یہ سب سچ ہے... حقیقت ہے۔ آپ کو اور بچوں کو مجھ سے جان کا خطرہ ہے۔ میں آپ کو اور بچوں کو قتل کر دینا چاہتا ہوں۔ تھانے اور عدالت جاکر مجھ پر یہ الزام، یہ بہتان اٹھا کر گویا آپ نے مجھ پر یہ لازم کردیا ہے کہ میں ایسا کوئی انتہائی قدم اٹھا گزروں... یہ ثابت کردوں کہ عدالت یا تھانہ آپ کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ میرے مقابل کوئی دوسرا آپ لوگوں کا مخلص اور محافظ نہیں ہوسکتا۔

میں ڈرگز لیتا ہوں... جاب لیس ہوں... میرا غصہ بہت زیادہ ہے... جب ہم پنجاب میں تھے تو میری ڈرنکنگ یا اسموکنگ کی روٹین کیا تھی؟ میں کب اور کن مواقع یا حالات میں ایسا کرتا تھا شاید آپ کو یاد ہو۔ سرحد شفٹ ہونے کے بعد میں اس سب سے مکمل طور پر کنارہ کش ہوگیا تھا۔ رہنا بھی چاہتا تھا مگر ایسا ہو نہ سکا۔ میں نے ڈرگز کا استعمال شروع کیا اور پھر باقاعدہ طور پر میں نے اسے اپنے معمول کے طور پر اپنا لیا لیکن ایسا کیوں ہوا؟ یہ سوچنے کی شاید آپ کو کبھی توفیق ہی نہ ہوسکی... میرا غصہ بہت ہی زیادہ ہے... وقت کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساتھ ساتھ اس میں شدت ہی آتی گئی... مگر یہ جاننے سمجھنے کی بھی آپ کو کبھی فرصت میسر نہ آسکی کہ ایسا کیوں ہے؟

رہی بات جاب لیس ہونے کی تو اس کی وجوہات بھلا آپ سے بہتر اور کون سمجھ سکتا ہے؟ میری تو خواہش تھی کہ ہم پنجاب میں رہیں... میں محنت و مشقت سے کماؤں اور آپ گھر میں بیٹھی ہوں... دو سال پہلے آپ کی بہن اور بہنوئی کی عدالت میں بھی مجھ گناہ گار نے یہی کہا تھا۔ آپ سے بھی کتنی بار کہا مگر میرے ساتھ وہ کٹھن زندگی جینا آپ کے لیے ممکن نہ تھا جو کہ میری اپنی اصل تھی۔ میری اور میرے باپ دادا کی اوقات... جس کو بنیاد بنا کر میں آٹھ مہینے خطوط میں آپ کو سمجھاتا رہا تھا کہ میرے حالات بہت کٹھن ہیں۔ میرے اوقات انتہائی تلخ ہیں... اپنی زندگی کو جہنم بنانے کا ارادہ چھوڑ دیں... اپنا فیصلہ تبدیل کرلیں... آپ میرے ماحول میں نہیں گزار پائیں گی... مگر اس وقت آپ کو میرے گھر کی چٹنی بھی دیسی گھی میں بھنی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے یہ قطعہ بھی تحریر کیا تھا۔

تو میرے عشق کا دم بھرتی ہے لیکن تجھ کو
عشق مجھ سے نہیں، خود اپنے ہی جذبات سے ہے
مفلسی میری بدل دے گی اسے نفرت میں
یہ عقیدت جو تجھے آج میری ذات سے ہے

مگر آپ نہیں مانیں۔ آپ کی بہن کے ہاں سے واپسی کے موقع پر بھی آپ نے سرحد ہی کو ترجیح دی۔ ایک بہتر زندگی اور سہولیات کے پیش نظر جن کا میری محنت و مشقت میں دستیاب ہونا ممکن نہیں تھا۔ ساتھ میں بچوں کے مستقبل اور تعلیم کا بھی سوال تھا اور یہ ایک ایسا پہلو تھا جو مجھے خاموش ہوجانے پر مجبور کرتا تھا۔ تعلیم اور ڈگری نہ ہونے کی سزا سے میں خود خوب واقف تھا۔

آپ نے سرحد کو ترجیح دی کہ آپ کو ایک اچھے پیکیج کی آفر تھی۔ گفت و شنید کے بعد بچوں کی اچھی تعلیم کے سوال پر مجھے بے بسی سے خاموش ہوجانا پڑا۔ میں تو شروع سے آپ کی خوشی کو ترجیح دیتا آیا تھا۔ آپ کی خواہش اور جذبات کا خیال رکھتا آیا تھا۔ حالانکہ اس کوشش میں مجھے دکھ اور اذیت کے کئی پل صراط بھی عبور کرنا پڑے پھر بھی... پھر بھی میں نے آپ کی خوشی کا احترام ہی کیا۔ دو سال پہلے والے جھگڑے میں جب آپ ناراض ہوکر اپنی بہن کے ہاں چلی گئی تھیں تو آج ہی کی طرح میری کوئی بات سنے بغیر ان لوگوں نے پہلے مجھے قابل نفرین قرار دیا اور جب میں نے وہاں پہنچ کر سارا معاملہ واضح کیا تو انہوں نے برملا آپ کو قصور وار ٹھہرایا تھا۔ انہی کے نزدیک... "ایسی باتوں پر تو قتل ہوجایا کرتے ہیں۔" "ان دونوں نے آپ سے کہا تھا۔ "آئندہ زارا یا محمود سے رابطہ رکھا تو ہمارا تمہارا تعلق ہمیشہ کے لیے ختم۔" لیکن مجھے آپ کی خوشی عزیز تھی سو واپس پہنچتے ہی میں نے آپ کو رابطہ بحال کرلینے کی اجازت دے دی تھی۔ ہاں میرے اپنے اندر کی حالت کیا تھی، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اور... اور جب آپ سرور اللہ کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھیں۔ اس کے لیے جادو ٹونے اور سفلی اعمال تک کرنے لگی تھیں، میرا ہی کندھا تھا افشاں! جس پر تم سر رکھ کر رویا کرتی تھیں اور میں... میں تمہاری کمر تھپکا کرتا تھا۔ تمہارا حوصلہ بندھایا کرتا تھا۔ تمہاری ہی خواہش اور خوشی کے احترام میں، میں نے اس سے دوستی کی، گھر کھانے پر انوائٹ کیا اور تمہارے سامنے بٹھایا۔ اس کے بعد اسامہ کے لیے بھی آپ کے دل میں جذبات ابھرے... آپ اسے دیکھنے ملنے کے لیے شاپنگ کے بہانے پشاور جانا چاہتی تھیں۔ اس شاپنگ کی آپ مجھ سے اجازت بھی لے چکی تھیں۔ بعد میں آپ کئی بار پشاور بھی گئیں۔ کبھی شاپنگ... کبھی بچوں کی آؤٹنگ... ہزار اذیت اور کرب کے باوجود میرے ماتھے پر کبھی شکن تک نہ آئی۔ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن آپ میری محبتوں پر ایمان لے آئیں گی... آپ کو میرے خلوص، میری محبت کی شدتوں کا اندازہ ہو ہی جائے گا اور آپ اپنی روح کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ میری ہو کر رہ جائیں گی... لیکن میں غلطی پر تھا۔ یہ بات شاید میں سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا کہ آپ نے اپنے جس تصور سے محبت کا اظہار کیا تھا، وہ میں نہ تھا... میں آپ کے تاج محل جیسے حسین خواب کا حصہ نہ تو کبھی رہا تھا اور نہ ہی کبھی حصہ بن سکا۔ اسی لیے میری وفاؤں... میری محبتوں کے صلے میں آپ نے مجھے زنجیریں دیں... لعنت ملامت کا طوق... قید و بند کی صعوبتیں... پولیس کا تشدد اور ذلت و رسوائی۔

آپ شروع دن سے دوسروں کو ترجیح دیتی رہیں اور میں آپ کے لیے تھرڈ پرسن ہی رہا۔ میری ڈرگز کی عادت... میری جھنجلاہٹیں، میرا غصہ اور غصے میں آئے روز کی بے بسی اور وحشت کا اضافہ... اگر آپ کو میرے متعلق سوچنے کی بھی فرصت میسر آئی ہوتی تو آپ نہایت آسانی سے سمجھ جاتیں کہ ایسا کیوں ہے... مگر میں تو ایک ناکارہ وجود تھا، ایک اضافی بوجھ... گھر کے کسی ایک کمرے کے کونے میں پڑا ہوا بیکار فرنیچر... کوئی ٹوٹی ہوئی میز، کرسی...

عدالت میں کھڑے ہوکر آپ نے کہہ دیا کہ آپ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنا چاہتی ہیں۔ گویا میں نے جبر و ستم کی انتہا کر رکھی ہو... آپ پر پابندی اور پہرے بٹھا رکھے ہوں۔

ڈائجسٹ میں چھپنے والا میرا تردیدی خط پڑھنے کے بعد آپ کو اس جنوں نے آلیا تھا کہ آپ میری تنہائیاں، میرے دکھ بانٹیں گی... میری روح میں اترے خار اپنی پلکوں سے چن لیں گی۔ یہ خار چنے ہیں آپ نے؟ اس طرح تنہائیاں اور دکھ بانٹے جاتے ہیں جس طرح آپ میرے ساتھ سلوک کرتی رہیں... اور وہ محبت نامہ کس کی مرضی سے لکھا تھا؟

آٹھ ماہ آپ کو سمجھاتا رہا، منع کرتا رہا... کس کی مرضی باقی رہی؟ پھر جب میں نے پورے خلوصِ دل سے حامی بھری تو آپ نے مجبوری کا اظہار کر دیا تھا۔ میرے گھٹنے ٹیکنے اور بھیک تک مانگنے کے باوجود آپ مجبور و منکر ہی رہی تھیں۔

مجھے پوری طرح مایوس و بددل کر کے واپس ملتان بھیج دینے کے بعد ایک روز اچانک آپ میرے غربت کدے میں پہنچ آئیں تو وہ کس کی مرضی تھی؟

اپنا بازار گھومنے پھرنے کا شوق آپ آج تک پورا کر رہی ہیں... یہ کس کی مرضی کا معاملہ ہے؟

سرور کی محبت میں آپ نے سفلی اعمال تک کیے۔ کس نے آپ کی مرضی میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی؟

اسامہ کے لیے آپ کے دل میں جذبات ابھرے، نرم گوشہ پیدا ہوا۔ زخم میرے وجود پر ابھرے۔ آپ سے کچھ کہا؟

ملتان کے بجائے کہاں... سرحد میں شفٹ ہونا کس کی مرضی سے ہوا؟

زارا اور محمود سے تاحال رابطہ... یہ کس کی مرضی ہے؟

اور اب... اب آپ نے ہمیشہ کے لیے کوئی تعلق نہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا... کبھی رابطہ نہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

نہیں افشاں! نہیں... یہ تو کسی صورت ممکن ہی نہیں... کم از کم میرے جیتے جی تو ایسا نہیں ہو سکتا... ہاں دعا کرو... دعا کرو کہ موت مجھ پر مہربان ہو جائے... میں مارا جاؤں وگرنہ دوسری صورت میں آج تک فیصلے بھی آپ کرتی رہی ہیں اور اپنی من مرضی بھی لیکن اب آخری فیصلہ میں کروں گا... صرف اور صرف میں۔

آپ نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اپنا آپ اور بچے تک مجھ سے جبراً چھین لیے۔ یعنی جینے کا واحد بہانہ ہی چھین لیا۔ میں بھی ایسا ہی کروں گا۔ اگر مجھے موت نہ آئی تو بہت جلد میں آپ کے سبھی عزیزوں، پیاروں کو آپ سے چھین لوں گا... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے... آپ یقین دہانی لینا چاہیں... تحفظ درکار ہو تو پورے ملک کی عدالتوں اور تھانوں سے رجوع کر لیں... مگر یہ بھی سوچ لیجیے گا کہ آپ کس کس عزیز اور پیارے کی زندگی کا رسک لے سکتی ہیں؟

جس طرح آج میں دنیا میں یک و تنہا ہوں، آپ بھی اپنی ساری زندگی اسی طرح یک و تنہا گزاریں گی اور میں آپ سے کہوں گا:

ہاں جی! اپنی مرضی سے زندگی گزارنا چاہتی تھیں نا، اب گزاریے... اپنی مرضی اور مکمل آزادی کے ساتھ۔

ارادہ تو میرا خط لکھنے کا تھا... افشاں کے نام ایک آخری خط۔ لیکن جب لکھنے بیٹھا تو خط داستان کا رنگ اختیار کر گیا۔ صفحات کے صفحات کالے ہوتے چلے گئے لیکن سلسلۂ کلام ختم ہونے میں ہی نہ آیا۔ آخر میں نے صبح ان سطروں پر خط ادھورا چھوڑ دیا۔

ہمارے درمیان تلخی ہوئی، جھگڑا ہوا... میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ سارا قصور میرا رہا ہو گا۔ میری خطا، میری ہی غلطی ہو گی پھر بھی... کیا وہ غلطی اتنی سنگین، اتنی بڑی تھی جتنی ذلت آمیز سزا آپ نے میرا مقدر کر دی؟ مان لیتا ہوں کہ میں کوئی اچھا انسان نہیں مگر اتنا بُرا بھی تو نہ تھا جتنا کہ آپ نے میرے ساتھ سلوک کروایا ہے... اتنا تو میری طرف سے بارہ سال میں بھی نہیں ہوا، جتنا آپ نے ایک لمحے میں میرے ساتھ کر ڈالا۔

آپ مجھے ایک جذباتی غلطی کے طور پر برداشت کرتی رہیں اور میں آپ کے جنوں میں بار بار اپنی نفی کرتا رہا۔ خود اپنے وجود کو زخمی کرتا رہا... آپ کا دکھ تک میرے وجود پر ہمیشہ نقش و نگار کی صورت ظاہر ہوتا رہا لیکن پھر بھی میں ایک سیاہ بخت زمیں زادہ ہی رہا... آپ کے دل میں میری بھی کوئی گنجائش نہ بن سکی اور آخر کار دھتکار دیا گیا۔

بچے... ماہا اور عاصم... یہ جب آپ کے پاس نہیں رہیں گے تب آپ اس دکھ... اس اذیت سے کچھ تھوڑا سا آشنا ہو سکیں گی جس میں میری ہر سانس لتھڑی ہوئی ہے... عزیز ترین ہستی کی جدائی... کسی انتہائی اپنے کی دوری...

بہتر ہو گا کہ آپ راضی خوشی دونوں بچے میرے حوالے کرنے کے لیے خود کو آمادہ کر لیں، اگر وہ آپ کو عزیز ہیں تو... بصورتِ دیگر... بچے زندہ رہیں یا نہ رہیں... میں رہوں نہ رہوں... چاہے میرا نام و نشان تک باقی نہ رہے... بچے میں آپ کے پاس نہیں رہنے دوں گا... کسی صورت بھی نہیں... اس پر یقین کر لیں... یقین!

☆☆☆

سیاہ تاریک رات اپنی آخری سانسیں گن رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں صبح کی اذان ہونے والی تھی اور ہم تینوں اس وقت راولپنڈی کے ایک پوش علاقے کی ایک دو منزلہ کوٹھی کی عقبی دیوار کے ساتھ دبکے بیٹھے تھے۔ اردگرد مکمل خاموشی اور سکون تھا۔ کہیں کوئی آواز، کوئی آہٹ نہ تھی۔

”رانا بھائی! یہ تم سنبھالو...“ یوسف خان نے بیگ میں سے رائفل نکال کر رانا منیر کو تھما دی۔

”یہ ایک پسٹل ام رکھتا اے... یہ دوسرا آپ رکھو... میگزین بھرے ہوئے ہیں...“ یوسف خان نے بیگ میں سے دو پسٹل نکال کر ایک اپنے نیفے میں اڑسا اور دوسرا مجھے تھما دیا۔

یہاں تک ہم ایک ٹیکسی میں آئے تھے اور ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی ہم تینوں کوٹھی کے گرد گھومتے ہوئے یہاں آ کر دبک گئے تھے۔

یہاں تک پہنچنے سے پہلے ہم نے بہت بار سوچا تھا، بہت غور کیا تھا۔ اپنے منصوبے کا ہر پہلو سے جائزہ لیا تھا۔ اٹھارہ دن ہم اپنے مطلب کی معلومات جمع کرتے رہے تھے۔ خورشید اکبر پراچہ اور اس کی فیملی کے شب و روز کی مصروفیات کا جائزہ لیتے رہے تھے۔ رانا منیر کی بتائی ہوئی تقریباً ساری تفصیل ہی درست تھی۔ خورشید اکبر لوہے کا کاروبار کرتا تھا۔ سیکڑوں ٹن لوہے کی روز کی خرید و فروخت۔ فیملی کے نام پر اس کی ایک بیوی اور دو بچیاں ہی تھیں۔ چھوٹی بیٹی دسویں کلاس کی طالبہ تھی اور بڑی بی اے کے فائنل ایئر میں تھی۔ ملازمین کے طور پر دو نوعمر لڑکے تھے جن میں سے ایک صبح آتا تھا اور شام کو واپس چلا جاتا تھا جبکہ دوسرا شب و روز وہیں رہتا تھا اور رات کو انیکسی میں سوتا تھا۔

بلاشک و شبہ خورشید اکبر کا کاروبار اتنے بڑے پیمانے پر چل رہا تھا کہ گردن چھری تلے آنے کی صورت میں وہ دس کروڑ بھی دے سکتا تھا مگر ہم نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق صرف تین کروڑ نوے لاکھ سمیٹنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔

”گرینیڈز کدھر ہیں؟“ میں نے دھیمے لہجے میں پوچھتے ہوئے بیگ اپنی طرف کھینچا۔

”بیگ میں ہیں... فاضل راؤنڈز بھی اسی میں ہیں۔ ضرورت پڑنے پر نکال لیں گے...“

”ٹھیک ہے۔ سنبھالو پھر اسے۔“ میں نے بیگ دوبارہ یوسف خان کی طرف سرکا دیا۔

”ہمارا یہاں زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔“ رانا منیر نے سرگوشی میں کہا۔

”بیٹھنے کی ضرورت ہی کیا ہے... اٹھو۔“

میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو وہ دونوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی اس لیے ہمیں اندر پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں اٹھانا پڑی۔

اندرونی طرف دیوار ہی کے ساتھ ہم کچھ دیر دبکے بیٹھے رہے۔ کوٹھی میں چند لائٹیں روشن تھیں اور پوری کوٹھی میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یقیناً مکین بےفکری سے نیند کی راحتوں میں ڈوبے پڑے تھے۔

افشاں بھی تو ماہا اور عاصم کے ساتھ سکون سے سو رہی ہو گی۔ اس بات سے قطعی بےخبر کہ اس کی سرد مہری اور سنگ دلی مجھے کہاں سے کہاں پہنچا چکی ہے۔ میں نے سر جھٹک کر اس فضول خیال سے توجہ ہٹالی۔

”پہلے لڑکی لوگوں کو قابو کرتے ہیں... کیا خیال اے؟“ یوسف نے دوسری منزل کی ایک کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کھڑکی سے اندر بیڈ روم میں... نائٹ بلب کی مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

”بوتل دو۔“ میں نے یوسف کو کوئی جواب دینے کے بجائے رانا منیر کو مخاطب کیا تو اس نے قمیص کے نیچے سے بوتل نکال کر مجھے تھما دی۔ شراب کی بوتل... ورکشاپ سے روانہ ہوتے وقت بھی میں نے چار پانچ پیگ چڑھائے تھے مگر اب ٹھیک موقع پر پہنچ کر مجھے مزید کی طلب محسوس ہونے لگی تھی۔ کچھ تھوڑی سی بےچینی اور الجھن تھی جو اس تلخ سیال ہی سے ختم ہو سکتی تھی۔

رانا منیر سے میں نے بہت دن پہلے ہی حتمی انداز میں کہہ دیا تھا کہ جس دن گیم کرنا ہو اس دن ”بوتل“ کا انتظام لازمی کر لینا تاکہ میرے ارادوں میں کسی قسم کی لغزش نہ آنے پائے۔ نشے میں دھت ہوں گا تو اچھا بُرا جو بھی ہو گا، کر گزروں گا۔ البتہ ہوش و حواس میں رہتے ہوئے کوئی ایسا ویسا کام کرنا میرے لیے قطعی ممکن نہیں ہو گا...!

میں نے دو تین بڑے بڑے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے بوتل دوبارہ منیر کو تھما دی۔

”پہلے مسٹر اینڈ مسز پراچہ سے ملاقات کرتے ہیں... آجاؤ۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کر کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف چل پڑا۔

”طاہر بھائی...“ میرے یوں آگے بڑھنے پر شاید منیر کو کوئی اعتراض تھا مگر میں رکا نہیں۔ وہ دونوں بھی اٹھ کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرے پیچھے چلے آئے۔ بیگ یوسف کے بائیں کندھے سے جھول رہا تھا۔ ٹرپل ٹو رائفل رانا منیر کے ہاتھوں میں تھی جبکہ میں اور یوسف بھی پسٹل سنبھال چکے تھے۔

شمائلہ اور نائلہ دونوں بہنیں اوپری منزل پر ہوتی ہیں اور مسٹر اینڈ مسز پراچہ کا بیڈ روم نیچے ہے۔ یہ تو ہمیں معلوم تھا مگر کس طرف... کس جگہ، یہ ہمیں علم نہ تھا۔ یہ ہمیں اس روشنی سے معلوم ہوا جو ان کے بیڈ روم کے دروازے کی معمولی سی جھری سے باہر لاؤنج میں آرہی تھی۔

''طاہر بھائی! احتیاط بہت ضروری ہے۔'' منیر نے سرگوشی کی تو میں آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ بیڈ روم کا دروازہ ہم سے بمشکل تین چار قدم کے فاصلے پر ہوگا۔

''مجھے معلوم ہے کہ غلطی یا ناکامی کی صورت میں صرف موت بچتی ہے... لہٰذا کوئی مشورہ یا نصیحت نہیں۔''

میرے سرد لہجے پر وہ بس ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اسے تو میں نے کہہ دیا تھا مگر میرے اپنے ذہن میں ناکامی یا موت کے حوالے سے کوئی واہمہ تک نہیں تھا۔ یہ اعتماد، یہ یقین شراب کے مرہونِ منت رہا ہوگا۔

میرے ذہن میں تو ایک کروڑ تیس لاکھ بھرے ہوئے تھے... ایک منظر جگمگا رہا تھا... ایک خوب صورت سا مکان تھا جس کے پورچ میں ایک چمچماتی ہوئی کار کھڑی تھی... لان کی سرسبز تراشیدہ گھاس پر ماہا اور عاصم ''مانے'' (ہماری سفید بلی) کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ کھلکھلا رہے تھے اور میں اور افشاں ایک طرف گارڈن چیئرز پر برابر برابر بیٹھے کافی سے شغل کررہے تھے اور اپنے ''تینوں'' بچوں کو کھیلتا دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

میں نے آگے بڑھتے ہوئے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ بے آواز اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ اندر دائیں طرف ایک جہازی سائز کا بیڈ تھا جس پر وہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی طرف کرکے بے سدھ سو رہے تھے۔

اندر پہنچتے ہی منیر نے آہستہ سے دروازہ بند کردیا۔ ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کی اور بیڈ کی طرف بڑھ گئے۔

رانا منیر اور یوسف بیڈ کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے تو میں نے پائنتی کی طرف سے بیڈ کو ٹھوکر ماری۔ ہمارے ہاتھوں میں دبے ہتھیاروں کا رخ ان دونوں ہی کی طرف تھا۔ دوسری ٹھوکر پر پہلے تو مسز پراچہ کی نیند اکھڑی اور ساتھ ہی ہم پر نظر پڑتے ہی اس کی دہشت زدہ، گھٹی گھٹی آواز پر خورشید پراچہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ منیر نے فوراً پراچہ کی گردن سے رائفل کی نال لگادی۔

''آواز کیا سانس بھی نہ نکلے تیری۔''

یوسف خان نے مسز پراچہ کے کندھے پر ایک ہلکی سی لات رسید کی۔ ''او بی بی! اپنا منہ بند رکھو۔ ورنہ ام تمہارے منہ میں گولی مارے گا۔''

دونوں میاں بیوی سمٹ کر ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ گئے۔ رائفل کی نال کے دباؤ نے پراچہ کو سر اپنی مسز کی گود میں جھکانے پر مجبور کردیا تھا۔

''ٹھ... ٹھ... ٹھہرو... بات سنو... تت تم...'' پراچہ گھگیایا تو منیر نے برق رفتاری سے اس کے کان پر ایک گھونسا رسید کردیا۔

''چپ کر... چپ۔''

''اوکے، اوکے۔'' پراچہ نے فوراً دونوں ہاتھ یوں اوپر کو پھیلائے جیسے گرتی ہوئی چھت کو روک رہا ہو۔ مسز پراچہ کی حالت زیادہ پتلی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ تھی تو بھینس نما لیکن کسی ڈری سہمی ہرنی کی طرح وحشت زدہ سی نظریں گھما گھما کر ہم تینوں کو دیکھ رہی تھی۔ خوف کی شدت اس کے ہونٹوں کو لرزا رہی تھی۔

''پراچہ صاحب! ہم آپ سے صرف ایک معاملہ طے کرنے کی نیت سے حاضر ہوئے ہیں۔ اگر آپ آرام سکون سے بیٹھ کر سن سنا لیں تو نوازش ہوگی، دوسری صورت میں آپ کو تکلیف اٹھانا پڑے گی۔ جان بھی جاسکتی ہے۔ آپ کی مسز اور بچیاں بھی لقمۂ اجل بن سکتی ہیں۔''

میرا انداز نرم مگر دوٹوک تھا۔

''ج... جی! ضرور... آپ... آپ لوگ بیٹھیے نا... بب... بات کرتے ہیں۔'' پراچہ ہکلایا۔

کچھ دیر پہلے وہ دونوں ہر قسم کی فکر و پریشانی سے آزاد نیند کے گہرے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے کہ اچانک ہی بے چاروں پر ناگہانی افتاد نازل ہوگئی تھی۔ آنکھیں کھولتے ہی ان کی آنکھوں میں جیسے کوئی بھیانک خواب آچھپا تھا۔ تین تین موت کے فرشتے جیسے ان کی روحیں قبض کرنے کے ارادے سے انہیں گھیرے کھڑے تھے۔ دونوں ہی بری طرح گھبراہٹ اور سراسیمگی کا شکار دکھائی دینے لگے۔

چند لمحے ہم بھی اپنی اپنی جگہ خاموش کھڑے رہے۔ میں نے اور منیر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اطمینان کا اظہار کیا۔ دونوں میاں بیوی صورتِ حال کے ٹرانس میں آچکے تھے۔

میں بے تکلف سے انداز میں جوتوں سمیت ان کے

روبرو بیڈ پر پالتی مار کر بیٹھ گیا تو منیر نے رائفل کا دباؤ پراچہ کی گردن سے ہٹالیا۔ البتہ وہ پوری طرح چوکس کھڑا رہا۔

''جی... حکم کیجیے۔'' پراچہ نے دائیں ہاتھ سے گردن مسلتے ہوئے ایک سراسیمہ سی نظر منیر پر ڈالی اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی، آنکھوں میں اندیشے تھے اور چہرے پر ایک پریشانی کا تاریک سایہ...

میں نے منیر کو اشارہ کیا تو اس نے بوتل نکال کر مجھے تھما دی۔ پسٹل میرے سیدھے ہاتھ میں تھا جو میں نے گھٹنے پر دھرا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ سے میں نے ایک گھونٹ بھرا۔

''پراچہ صاحب! ہم آپ کو اس وقت اور اس طرح ڈسٹرب کرنے پر معذرت خواہ ہیں۔ تھوڑی سی شرمندگی بھی ہے ہمیں مگر... ہمارے پاس اور کوئی راستہ بچا نہیں تھا۔ مجبوراً ایسا کرنا پڑا ہے۔'' میں نے بوتل میں سے ایک اور گھونٹ لیا۔ اس تلخ اور آتشیں سیال کی تپش مجھے میرے چہرے اور آنکھوں کو دہکاتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

''ج... جی۔'' پراچہ فیصلہ نہیں کرپایا تھا کہ کیا کہے۔

''ہم پیاسے ہیں... ضرورت مند ہیں... ایک دو چھوٹے چھوٹے سے خواب خریدنا چاہتے ہیں... زندگی پر تھوڑا حق، تھوڑا اختیار حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ بس اسی سلسلے میں آپ کے حضور حاضر ہوئے ہیں۔''

میرے لہجے میں ایک گہری سنجیدگی اور ٹھہراؤ تھا۔ میری نظر منیر کے چہرے پر پڑی تو میں نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے اپنی طرف گھورتے پایا۔ شاید اسے میرے الفاظ نامناسب محسوس ہوئے تھے مگر میں جس سے مخاطب تھا، وہ میرا مدعا بخوبی سمجھ گیا تھا۔

''آ... آپ لوگوں کو... کیش چاہیے... میں... میں دینے کو تیار ہوں... کتنا...؟''

منیر فوراً رائفل کی نال سے اس کی کنپٹی پر ایک ٹھوکا مارتے ہوئے غرایا۔

''اپنی زندگی کی قیمت بول... اپنی فیملی کی جان کی قیمت لگا۔''

پراچہ نے فوراً کنپٹی پر ہاتھ رکھ لیا۔ چہرے پر تکلیف سمیٹے ایک نظر منیر پر ڈالی پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

''آپ لوگ بولیے... کتنا چاہیے آپ کو... مم... میں دوں گا۔''

''گھر میں اس وقت کتنا موجود ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''کوئی... ساٹھ ستر لاکھ کے لگ بھگ تو ہوگا۔''

''اور بینک میں؟''

''بب... بینک!'' اس نے ہچکچاتے ہوئے ہم تینوں کو باری باری دیکھا۔ ''جی بینک میں بھی ہے۔ آ... آپ بتایئے اپنی ڈیمانڈ۔''

''عقل مند اور معاملہ فہم آدمی معلوم ہوتے ہیں آپ... ہم نے اپنی زندگیوں کی قیمت لگائی ہے... فی کس ایک کروڑ تیس لاکھ... کُل ملا کر تین کروڑ نوے لاکھ۔''

''تت... تین کروڑ نوے لاکھ؟'' پراچہ کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں۔

''آپ دونوں اور آپ کی بچیوں کی جانیں یقیناً اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہوں گی۔'' میں نے پسٹل کی نال سے اپنی کنپٹی کھجائی۔

''ہم... مگر اتنی بڑی رقم تو گھر میں موجود نہیں ہے۔'' اس نے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے گویا اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''بینک میں تو موجود ہے نا؟'' اس دفعہ منیر نے اس کی گدی پر ضرب لگائی۔

خورشید پراچہ بے ساختہ کراہ اٹھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرے۔

''آ... آپ چیک لکھ کردے... دے دیں... وہ سب سیف والی رقم اور ز... زیور بھی دے دیں ان کو۔''

مسز پراچہ شوہر کی تکلیف پر جیسے تڑپ اٹھی اور اپنی دانست میں اس نے ایک معقول مشورہ بھی دیا تھا۔

''اے بھینس کا اولاد! تم اپنا زبان بند رکھو۔ مردوں کے درمیان بات چیت ہورہا ہے نا، خاموش رہو تم۔''

یوسف خان نے فوراً اسے جھڑکا۔

''پراچہ صاحب! میں نے پہلے عرض کیا ہے نا کہ ہم ضرورت مند ہیں، مجرم نہیں ہیں... مجرم ہوتے... چور ڈاکو ہوتے تو گھر میں موجود نقدی اور زیور لے کر ہی ٹل جاتے مگر ایسا ہے نہیں... ہم آج چند گھنٹوں کے لیے آپ کے مہمان ہیں۔ بینک کھلتے ہی آپ بینک جائیں گے، ہمارا ایک بندہ آپ کے ساتھ جائے گا جو فون پر مسلسل ہمارے ساتھ رابطے میں رہے گا... کال پر... ایک ذرا بھی اینس بیس ہوئی تو آپ کی مسز اور دونوں بچیاں یہاں اپنے بدترین انجام سے دوچار ہوجائیں گی۔ اور اگر آپ ہماری مطلوبہ رقم لے کر واپس آگئے تو ہم بھی آپ کو سلام کرتے ہوئے خاموشی سے واپس لوٹ جائیں گے... آپ اپنی جگہ خوش اور آباد اور ہم

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی جگہ... کیا کہتے ہیں آپ؟"

میں نے پہلے سے طے شدہ اپنا پروگرام اس کے گوش گزار کر دیا۔

"ٹھ... ٹھیک ہے... ہو جائے گا۔" خورشید پراچہ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔"

"نہیں... اگر آپ پسند کریں تو گڑبڑ کی کوشش کر لیجیے گا۔ بس اپنے بیوی بچوں کا پہلے سوچ لیجیے گا کہ ان کے ساتھ کیا ہوگا... ہم تو یہاں تک آئے ہی مرنے کی نیت کر کے ہیں۔" میں نے بے فکری سے کہتے ہوئے بوتل سے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔

"نہیں، نہیں... بالکل بھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ آپ لوگ اطمینان رکھیے پلیز۔" پراچہ نے جلدی سے کہا۔ آنکھ کھلتے ہی اسے جو اعصابی دھچکا برداشت کرنا پڑا تھا، اب وہ اس سے کافی حد تک سنبھلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"میں یہ رقم بہ آسانی دے سکتا ہوں آپ کو۔"

"چلیے پھر اسی بات پر ہاتھ ملائیے۔ ایسی صورت میں آپ لوگوں سے زیادہ محترم اور قابلِ تعظیم ہمارے نزدیک اور کوئی نہیں۔"

میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو پراچہ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"ڈیل از ڈن۔" میں نے گرم جوشی سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔

"ڈن!" پراچہ نے مری مری آواز میں کہا اور میں بیڈ سے نیچے اتر کھڑا ہوا۔

"چلیے پھر... ہمیں اپنی بچیوں سے بھی متعارف کروائیے۔"

"کک، کیوں... ان سے کیوں؟"

مسز پراچہ فوراً ہکلائی۔ بچیوں کے ذکر پر اس کا چہرہ اندیشوں اور واہموں کی آماجگاہ دکھائی دینے لگا۔

"ہم کوئی دشمن تو نہیں ہیں پراچہ صاحب! ہمارے درمیان ایک اچھی ڈیل ہوئی ہے۔ ہم چند گھنٹوں کے لیے آپ کے مہمان ہیں اور آپ لوگ ہمارے میزبان، سو... اپنے باقی فیملی ممبران سے بھی تعارف کرائیے نا ہمارا۔" میری بات مکمل ہوتے ہی یوسف اور منیر نے ایک ایک ہاتھ سے ان دونوں کا بازو تھام لیا۔

"چلو اٹھو، کھڑے ہو جاؤ۔"

"آگے لگو۔"

اس وقت قریب کی کسی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہوئی۔

یوسف اور منیر کی ذہنی و جذباتی حالت کا تو پتا نہیں، البتہ وہ ایک تناؤ کا شکار ضرور نظر آتے تھے۔ اور میں... میرے اندر وہی خاموشی تھی، گہری اور پُرہول خاموشی... ایک مہیب خلا۔ جو تھوڑی بہت بے چینی اور الجھن کا احساس تھا، اسے جیسے شراب نے حنوط کر ڈالا تھا۔ لہٰذا میں اعصابی تناؤ کا شکار نہیں تھا۔ کوئی بوجھ بھی نہیں تھا۔

دونوں میاں بیوی کو ہم گن پوائنٹ پر ٹھوکے دیتے ہوئے دوسری منزل پر شمائلہ اور نائلہ کے بیڈروم کے سامنے لے آئے۔

ابھی تک تو سب کچھ ہمارے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہی تھا اور آگے بھی پورا منصوبہ احسن طریقے سے مکمل ہونے کی توقع تھی۔

بیڈروم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی۔

"اپنے تھوبڑے درست کرو اور اچھے طریقے سے ہمارا تعارف کرانا۔" منیر نے سرد اور تحکمانہ انداز میں ان دونوں سے کہا تو وہ تھوک نگلتے ہوئے سر ہلا کر رہ گئے۔ یقیناً دونوں ہی کی اندرونی حالت نہایت دگرگوں رہی ہوگی اور وہ دل ہی دل میں نہ جانے خدا سے کیا کیا دعائیں مانگ رہے ہوں گے۔ اسلحہ ہم تینوں نے غیر محسوس انداز میں اپنے پیچھے چھپا لیا کہ کہیں پہلی ہی نظر پر وہ بدک کر حواس باختگی میں چیخنا چلانا نہ شروع کر دیں۔ ایسے میں صورتِ حال سنگین رخ بھی اختیار کر سکتی تھی اور سارا منصوبہ بھی ٹھپ ہو سکتا تھا۔ دروازہ کھولنے والی شاید شمائلہ تھی... خورشید پراچہ کی بڑی بیٹی۔ اس نے جماہی لیتے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔ چہرے پر کچھ بیزاری سی بھی تھی لیکن سامنے... اپنے ممی پاپا... اور ان کے عقب میں تین اجنبی صورتوں کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر حیران کن تیزی سے تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ جماہی درمیان ہی میں دم توڑ گئی۔ بیزاری کی جگہ حیرت نے لے لی اور آنکھوں سے نیند کا خمار جیسے فوراً اڑن چھو ہو گیا۔

"گڈ مارننگ۔"

"ہیلو۔"

"السلام علیکم۔"

ہم تینوں ہی مسکرائے تھے۔

"گڈ مارننگ بیٹا! یہ لوگ بہت خاص مہمان ہیں... اس لیے آپ کو اس وقت ڈسٹرب کیا۔"

خورشید پراچہ نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا اور اندر کی جانب بڑھا۔ لڑکی واپس پلٹ چکی تھی۔ ہم تینوں بھی ان دونوں میاں بیوی کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی بیڈ پر مضمحل سے انداز میں لیٹی ہوئی نائلہ بھی فوراً سیدھی ہو بیٹھی۔ اپنی بہن ہی کی طرح اس کے چہرے پر بھی شدید حیرت اور الجھن کے تاثرات ابھرے تھے۔

اتنی صبح ممی، پاپا کا یوں تین اجنبی لوگوں کے ساتھ ان کے بیڈروم تک آنا یقیناً کسی غیر معمولی معاملے کا حصہ ہے... اتنا اندازہ تو بہرحال انہیں ہونا ہی تھا۔ البتہ ممی پاپا کی موجودگی نے انہیں حواس باختہ نہیں ہونے دیا۔

"آگے ہو کر سنبھالیں ان کو... اگر کوئی چیخی تو وہ ماری جائے گی۔" میں نے پراچہ کے کان میں ایک زہریلی سرگوشی کی تو وہ چابی بھرے کھلونے کی طرح آگے بڑھ گیا۔ منیر نے عقب میں دروازہ بند کر دیا تھا۔ ہم تینوں اسلحہ چھپائے دروازے کے سامنے ہی کھڑے رہے۔

"مما! کون ہیں یہ لوگ؟" شمائلہ نے بیڈ سے اپنا دوپٹا اٹھا کر واپس پلٹتے ہوئے اپنی ماں سے سوال کیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت و پریشانی کے ساتھ ساتھ کچھ ہلکی سی ناگواری بھی تھی۔

"بیٹا! آپ بیٹھ جاؤ... بیٹھو۔" خورشید پراچہ نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"سب ٹھیک تو ہے نا پاپا؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"سب ٹھیک ہے... ٹھیک ہے سب۔ آپ یہاں بیٹھ جائیں اور توجہ سے میری بات سنیں۔" خورشید پراچہ نے اسے بیڈ پر بٹھا دیا جبکہ مسز پراچہ نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے نائلہ کو بانہوں میں بھر لیا تھا۔

"مما! کیا ہوا ہے... کون لوگ ہیں یہ؟"

ممی، پاپا کے ستے ہوئے چہروں پر طاری گھبراہٹ دونوں بہنوں کو ہی کسی بڑی گڑبڑ کا احساس دلا گئی تھی اور اب وہ دونوں سراسیمہ اور مشکوک نظروں سے ہماری صورتیں تک رہی تھیں۔

"دیکھو بیٹا! گھبرانے یا ڈرنے کی کوئی بات نہیں... یہ لوگ بس چند گھنٹے یہاں مہمانوں کی طرح رکیں گے پھر چلے جائیں گے... آپ دونوں بس یہاں خاموش بیٹھی رہیں۔"

خورشید پراچہ نے ٹھہر ٹھہر کر بات مکمل کی اور دونوں بیٹیوں کے گال تھپتھپائے۔ عقب میں موجود میرے ایک ہاتھ میں پسٹل تھا اور دوسرے میں شراب کی بوتل۔ میں نے بوتل سے ایک گھونٹ لیا اور ان سے مخاطب ہوا۔

"تمہارے پاپا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم بس ذرا رستہ بھٹک کر ادھر آ گئے ہیں۔" میں نے پسٹل والا ہاتھ بھی سامنے کر لیا۔ "اب کچھ دیر یہاں آرام کر کے چلے جائیں گے لیکن اگر تم بہنوں میں سے کسی نے کوئی شور شرابا مچانے کی کوشش کی تو ہم تمہارے ممی پاپا کو گولی مار دیں گے۔"

دونوں بہنوں کی آنکھیں ہی کانوں کی طرف رینگ گئیں اور چہروں پر زردی کھنڈ گئی۔

"تم لوگ اسے بھی انیکسی سے یہیں اٹھا لاؤ۔" میں نے منیر اور یوسف سے کہا تو وہ دونوں اپنے ہتھیار سنبھالتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں خود بیڈ کے سامنے پڑے صوفے پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں ان چاروں پر جمی ہوئی تھیں اور ذہن میں افشاں، ماہا اور عاصم کے چہرے جھلملا رہے تھے۔ ہم بھی چار ہی تھے... چار ہوا کرتے تھے... ابھی تو میں اکیلا تھا بالکل یک و تنہا۔

"تمہیں ایسا تو بہرحال نہیں کرنا چاہیے تھا افشاں!" میرے اندر کے خلا میں میری اپنی ہی بڑبڑاہٹ گونجی۔

"ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب تمہیں بھی یک و تنہا ہونا پڑے گا۔ جلد یا بدیر میں جب بھی لوٹا، بچے تمہارے پاس نہیں رہیں گے۔ اگر رہے تو پھر تمہارے بہن بہنوئی اور ان کے بچے زمین پر باقی نہیں رہیں گے۔"

میرے اندر پھر سے لاوا کھولنے لگا۔ میں نے سر جھٹکا اور بوتل منہ سے لگا لی۔ وہ چاروں میرے سامنے بیڈ پر سکڑے سمٹے سے بیٹھے تھے۔ کچھ ہی دیر مزید گزری ہوگی کہ یوسف اور منیر انیکسی سے ملازم لڑکے کو بھی پکڑ لائے۔ لڑکے کی عمر چودہ پندرہ سال رہی ہوگی۔ وہ بری طرح ہراساں اور سہما ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ منیر نے اسے بھی لا کر خورشید پراچہ کے قریب ہی بیڈ پر بٹھا دیا۔

"بس یہاں چپ چاپ بیٹھے رہو۔" منیر نے کرخت لہجے میں اس سے کہا اور میرے برابر ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ یوسف خان البتہ اپنی جگہ پر جم کر کھڑا تھا۔ اپنے منصوبے کا پہلا مرحلہ ہم بخوبی طے کر چکے تھے۔ گھر کے مکینوں پر ہم نے بہ آسانی قابو حاصل کر لیا تھا۔ وہ پانچوں ہمارے سامنے ستم رسیدہ صورتیں لیے انتہائی شرافت سے بیٹھے ہوئے تھے۔

دوسرا مرحلہ شروع ہونے میں ابھی کم از کم بھی تین ساڑھے تین گھنٹے باقی تھے۔ اس دوران مسز پراچہ اور شمائلہ نے مل کر ہمارے لیے ناشتا بھی تیار کیا۔ جب تک وہ دونوں کچن میں مصروف کار رہیں، منیر رائفل لیے کچن کے دروازے پر کھڑا رہا۔ ناشتے کے بعد ہمیں نہایت ادب و احترام سے چائے بھی پیش کی گئی۔ اتنی پیاری اور سمجھ دار فیملی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی پراچہ صاحب کی کہ جیسے ہماری آنکھوں کے اشارے تک سمجھ رہے تھے اور بلا کسی چون وچرا سر تسلیم خم کیے ہوئے تھے۔ قریباً سات بجے بیرونی گیٹ پر بیل ہوئی۔ پراچہ صاحب کا دوسرا ملازم لڑکا کچھ سامان اٹھائے باہر دروازے پر کھڑا تھا۔ اسے کھڑکی سے جھانک کر پہلے تو یوسف خان نے دیکھا پھر میں نے بھی سامنے کے رخ پر موجود کھڑکی سے جھانک کر تسلی کی۔ اس کے بعد منیر نیچے گیا اور نہایت طریقے سلیقے سے اسے بھی اوپر لے آیا۔

اوپر کی صورتِ حال اور ماحول کا حصہ بنتے ہی وہ بے چارہ بالکل ہی گم صم ہو کر رہ گیا۔ منیر نے اسے بھی دوسرے لڑکے کی طرف دھکیل دیا۔

"چل بیٹھ جا یہاں۔"

پھر جب بینک ٹائم ہو گیا تو میں نے موبائل پر وقت دیکھتے ہوئے پراچہ کو مخاطب کیا۔

"جی پراچہ صاحب! کیا ارادے ہیں پھر؟"

"میں تیار ہوں۔"

"دماغ میں کوئی فتور وغیرہ؟"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے... مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ اپنے کہے پر پورا اتریں گے اور میری فیملی کو آگے بھی کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ رقم آپ چاہیں تو میں زیادہ بھی دے سکتا ہوں۔"

"رقم اتنی ہی کافی ہو گی۔ ہاں، آپ ایک بار اپنے بیوی بچوں کے چہرے بغور دیکھ لیں۔ یہ اسی حالت میں دوبارہ دیکھنا چاہیں تو اپنے دماغ میں کسی کیڑے کو مت کلبلانے دیجیے گا اور ذرا اپنا سیل نمبر بھی بتا دیجیے۔" اسے تنبیہ کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔ اس نے نمبر بتایا جو میں نے اپنے موبائل میں سیو کر لیا۔ اس کے بعد میں نے منیر کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ پہلے ہی ہینڈ فری لگائے بیٹھا تھا۔ دوسری بیل پر اس نے کال ریسیو کر لی۔ پراچہ، اس کی بیوی اور دونوں بچیاں چپ چاپ بیٹھی سب کچھ دیکھ سن رہی تھیں۔

"چلو پھر روانہ ہو لو۔ ہمارا یہ بندہ تمہارے ساتھ جائے گا۔" میں نے منیر کی طرف اشارہ کیا اور وہ دونوں ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کی بیوی اور بچیوں کو تھوڑی بے چینی ہوئی تو پراچہ نے خود ہی انہیں سمجھا دیا اور تسلی دی۔ پھر مسز پراچہ کی نشاندہی پر منیر نچلی منزل سے ایک بڑے سائز کا بیگ اٹھا لایا تو وہ اور پراچہ دونوں بینک کے لیے روانہ ہو گئے۔

رائفل منیر میرے حوالے کر گیا تھا اور میرے والا پسٹل وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

میں نے ہینڈ فری کانوں میں لگائی اور صوفے پر ایزی ہو کر بیٹھ گیا۔ ہمارے منصوبے کا دوسرا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ اہم ترین اور خطرناک ترین مرحلہ... میری نظریں اب سامنے موجود پانچ افراد پر جمی ہوئی تھیں اور کان منیر کے ساتھ سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ یوسف خان بائیں ہاتھ پر موجود صوفے کے بازو پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ اس کے پستول کا رخ مسز پراچہ کی طرف تھا۔ خورشید پراچہ اور منیر گاڑی لے کر کوٹھی سے نکل چکے تھے۔

ہمارے لیے زندگی کی بدمزاجی میں اب کچھ ہی وقت کا مسئلہ تھا۔ محض ایک دو گھنٹوں میں کاغذ کے ان ٹکڑوں کا ڈھیر آنے والا تھا جن پر ہم زمینی باشندوں کی زندگی انحصار کرتی ہے۔ ہم تینوں کروڑپتی ہونے والے تھے۔ زندگی کا معاندانہ رویہ اب دم توڑنے والا تھا۔ ہماری اب "اس سے" خوب جمنے والی تھی۔

میرے ذہن میں افشاں کا خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔

"طاہر! آپ ضرورت سے زیادہ حساس انسان ہیں اور ایسا شخص اپنے لیے بھی مسلسل اذیت کا باعث ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔"

شمائلہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تو میری توجہ اس کی طرف ہو گئی۔

"کیا ہوا؟"

"مجھے واش روم جانا ہے۔" اس نے کونے میں موجود دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے ایک ذرا سوچا اور یوسف کو مخاطب کیا۔

"ذرا چیک کرو۔" میں نے واش روم کی طرف اشارہ کیا۔ یوسف اٹھ کر کونے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ چاروں طرف نظر گھما کر دیکھا اور مطمئن سے انداز میں واپس پلٹ آیا۔

"ٹھیک ہے، جاؤ۔" میری اجازت پاتے ہی وہ واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے سے ایک قدم پیچھے تھی کہ یوسف خان نے اچانک اسے پکارا۔

"اے... رکو ذرا۔" شمائلہ وہیں ٹھٹک کر رک گئی اور یوسف خان جلدی سے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"تمہارے پاس مبائل شبائل تو نہیں اے؟"

"ن... نہیں تو۔" وہ گھبرائی۔

یوسف خان نے بغور اس کی صورت دیکھی مگر اس کی آنکھوں میں شک موجود رہا۔ خود میرے ذہن میں یہ اندیشہ

بیدار ہو گیا کہ ہو سکتا ہے اس نے موبائل اپنے کپڑوں میں چھپا رکھا ہو اور واش روم میں سے کسی کو میسج وغیرہ کر کے ہمارے لیے کسی مصیبت کا بندوبست کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ یوسف کے ذہن میں بھی یقیناً یہی بات تھی۔ اس نے شمائلہ کو اوپر سے پیروں تک ٹٹولتی ہوئی مشکوک نظروں سے دیکھا۔ شمائلہ جیسے کھڑے کھڑے اپنے آپ میں سمٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سامنے ہی بیڈ پر بیٹھی اس کی چھوٹی بہن اور ماں بھی اپنی جگہ بے چینی سے کسمسانے لگیں۔ چند لمحے بعد یوسف نے جیسے رائے طلب نظروں سے میری طرف دیکھا کہ تلاشی لوں یا نہیں۔

منیر بھی کال پر تھا اور گاڑی جدھر جدھر سے گزر رہی تھی، وہ برابر مجھے بتا رہا تھا۔

"بس... پہنچ گئے بینک۔" منیر کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"پراچہ کو ابھی نیچے مت اترنے دینا۔"

میں نے پہلے منیر کو جواب دیا پھر شمائلہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"ادھر... واپس آ کر بیٹھ جاؤ۔"

"مگر..."

"تلاشی دے سکتی ہو... چلو، ادھر آؤ۔" اس بار میرا لہجہ ذرا کرخت تھا۔ وہ چاروناچار واپس پلٹی تو میں پوری طرح منیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں منیر! میں پراچہ صاحب کو بھی کانفرنس میں لے رہا ہوں۔"

میں نے پراچہ کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

"جی پراچہ صاحب! پہنچ گئے بینک؟"

"ہاں، پہنچ گئے۔"

"بس پھر ایسا کیجیے کہ والیم زیرو کر کے اپنا موبائل اسی طرح اپنے سامنے کی جیب میں رکھ لیجیے۔ ہم تینوں کانفرنس میں رہیں گے اور آپ... جلد سے جلد کام نمٹا کر واپس آ جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔" پراچہ نے مختصراً کہا اور سیل غالباً جیب میں رکھ لیا۔ یہ ہم پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ منیر بینک کے باہر موجود رہے گا تاکہ اگر کوئی گڑبڑ ہو تو فرار کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوں اور دوسرا بینک کے کیمروں کی آنکھ سے محفوظ رہنا بھی پیشِ نظر تھا۔

"بیگ لے کر اندر چلا گیا۔" منیر نے کہا۔

"تم گاڑی سے اتر کر آس پاس کسی ایسی جگہ کھڑے ہو جاؤ جہاں سے بینک کے دروازے اور گاڑی دونوں پر نظر رکھ سکو۔"

"اوکے۔" گاڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

یوسف میرے برابر صوفے پر آ بیٹھا۔ مجھے پھر سے کچھ بے چینی محسوس ہونے لگی مگر بے چینی کی دوا ختم ہو چکی تھی... بوتل خالی پڑی تھی۔

سب سے زیادہ سنسنی خیز لمحات بھی شروع ہو چکے تھے۔ پراچہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اب بس ہم اس کے موبائل سے کچھ مدھم مدھم آوازیں ہی سن سکتے تھے۔

"منیر! کان پوری طرح کھلے رکھو اور اپنے اطراف سے بھی چوکنے رہنا۔"

فکرمندی تو بہرحال ہونی ہی تھی۔ سوال زندگی اور موت کا تھا۔ یہ رقم اگر نہ مل پاتی تو میری موت تو پھر اٹل تھی۔ پیشانی پر ذلت کا کراہت آمیز داغ لیے... بے وقعتی اور کم مائیگی کے جانکاہ آزار کے ساتھ گھٹن زدہ ماحول میں نبھاہ کرتے چلے جانا بھلا ممکن ہی کیسے ہو سکتا ہے۔

باقی رہنے کے لیے ازالہ ناگزیر ہو چکا تھا۔ ایک جنگ... اور فتح... لازم تھی۔ بے وقعتی اور کم مائیگی کی موت... عزتِ نفس کی بحالی کے لیے ضروری تھی۔ میرے سر پر قرض تھا اور اس قرض کی ادائیگی کیے بغیر مجھے جینا ہرگز بھی گوارا نہیں تھا۔ یہی احساسات اور شوریدہ سر خیالات تو تھے جو مجھے آج اس حد تک لے آئے تھے... ایسا انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر چکے تھے۔

"یہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزاریں، میں اپنی مرضی سے گزاروں گی۔"

افشاں بول رہی تھی۔ میرے ہاتھوں میں زنجیریں تھیں۔

"تم انفرادی سطح پر یہ فیصلہ کیسے کر سکتی ہو؟ یہ تو ہمارا مشترکہ فیصلہ تھا۔ ہمارا آپس کا فیصلہ تھا۔ کسی کی مشاورت اس میں شامل نہ تھی۔ پھر آج اس میں تھانہ اور عدالت کیسے آ گئے... کوئی تیسرا کون ہوتا ہے ہمارے درمیان فیصلہ کرنے والا... تمہاری برداشت پر بات آئی تو تم تھانے اور عدالت تک جا پہنچیں... اگر تم برداشت کرتی آئی تھیں تو ضبط کی انتہاؤں کو تو میں بھی جیتا آیا تھا افشاں۔" میرے دماغ میں پھر وہی اذیت پکنے لگی جو گزشتہ تین ماہ سے مجھے مسلسل نڈھال کیے ہوئے تھی۔

"یہ نہیں کرنا چاہیے تھا تمہیں... ایسا نہیں کرنا چاہیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔‘‘ میں بڑبڑایا۔

’’منیجر کے کمرے میں بیٹھا ہے۔‘‘

میرے کانوں میں منیر کی آواز نے سمع خراشی کی۔

خورشید پراچہ بینک منیجر کے آفس میں بیٹھا چائے یا کافی پی رہا تھا اور ہمارے لیے جیسے وقت ایک جگہ ٹھہر کر رہ گیا تھا۔ یوسف میرے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں تو سامنے بیٹھے افراد پر تھیں البتہ کان میری طرف متوجہ تھے۔ پراچہ کی بیوی اور بچیاں بھی سارے معاملے اور صورتِ حال کو سمجھ رہی تھیں۔ دس منٹ... پندرہ منٹ... بیس... تیس... جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا، میرے اندر ایک اضطراب جاگنے لگا تھا۔

آخر میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

’’منیر! لگتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔‘‘

’’معلوم نہیں... ایسی کوئی آواز یا سرگوشی سنائی تو نہیں دی۔‘‘

منیر کے اپنے لہجے میں فکرمندی تھی۔ ٹھیک اسی وقت منیر کی کال ڈراپ ہوگئی۔ میں نے فوراً ہی نمبر ڈائل کرتے ہوئے اسے دوبارہ رابطے میں لے لیا۔

’’ہاں۔‘‘

’’تم پوری طرح ہوشیار رہو۔‘‘

میں ٹہلتے ہوئے سامنے کے رخ والی کھڑکی تک آیا۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر ایک روشن اور چمکتا ہوا دن پھیلا ہوا تھا۔ فضا بالکل پُرسکون اور خاموش تھی۔ دس منٹ مزید گزرے ہوں گے کہ منیر کی سرسراتی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

’’پراچہ باہر آرہا ہے۔ اوہ... اس کے پیچھے ایک سیکیورٹی گارڈ بھی ہے۔ بیگ اٹھا رکھا ہے اس نے۔‘‘

’’اپنے اردگرد کا بھی دھیان رکھو۔‘‘

’’سب نارمل ہے۔ گارڈ بیگ گاڑی کی عقبی سیٹوں پر ڈال رہا ہے اور پراچہ غالباً میری تلاش میں نظریں اِدھر اُدھر دوڑا رہا ہے... گارڈ واپس جارہا ہے۔‘‘

’’کیا خیال ہے پھر...‘‘ میں نے استفسار کیا۔

’’مجھے لگتا ہے کہ کوئی گڑبڑ نہیں... پراچہ کے سیل سے بھی ایسا کچھ سنائی تو نہیں دیا۔‘‘ منیر کے لہجے میں خفیف سا تذبذب بھی تھا۔

’’چلو پھر ہمت کرو... مگر پوری طرح چوکنا رہنا۔‘‘

’’او کے۔‘‘ منیر غالباً پراچہ کی طرف چل پڑا۔

میں ایک بار پھر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

’’طاہر بھائی! سب ٹھیک تو اے نا؟‘‘ یوسف مجھ سے مخاطب ہوا تو پہلے میں نے ایک نظر غلط انداز اس کے تھوبڑے پر برسائی پھر بیڈ کی طرف دیکھا۔ شمائلہ اور نائلہ اپنی ماں سے چپٹی بیٹھی تھیں۔ دونوں لڑکے بھی اپنی جگہ جمے بیٹھے تھے اور ان پانچوں کی ڈری سہمی نظریں میری ہی جانب نگراں تھیں۔

منیر، پراچہ کے قریب پہنچ چکا تھا اور اب وہ لوگ گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔

’’پراچہ کا موبائل لے لو... راستے میں کہیں تلف کر دینا۔‘‘

’’ٹھیک ہے... باقی سب کچھ او کے ہے۔ بیگ میں ہماری مطلوبہ رقم موجود ہے اور ہم واپسی کے لیے نکل رہے ہیں۔‘‘

’’پوری طرح محتاط رہنا اور اپنے تعاقب کا بھی خیال رکھنا۔‘‘

’’سنیے...‘‘ مسز پراچہ کی آواز پر میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ’’بچی نے واش روم جانا ہے۔‘‘ اس کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

’’تھوڑی دیر مزید انتظار کیجیے... وہ لوگ واپسی کے لیے روانہ ہوچکے ہیں۔ جیسے ہی وہ واپس پہنچے، ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس کے بعد بے شک آپ لوگ اپنے بستر بھی واش روم ہی میں ایڈجسٹ کر لیجیے گا۔‘‘ میرے خشک انداز پر وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ پھر ایک خیال آجانے پر میں نے یوسف کو مخاطب کیا۔

’’ذرا ان کے موبائل دیکھو کدھر ہیں۔‘‘

مجھے اس بات پر تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی کہ یہاں آتے ہی پراچہ اور مسز پراچہ کے موبائلز تو ہم نے اپنے قبضے میں کر لیے تھے مگر اوپر آنے کے بعد دونوں بہنوں کے موبائلز کی طرف ہماری توجہ کیوں نہیں گئی۔ حتیٰ کہ کچھ دیر پہلے جب شمائلہ کو واش روم کے دروازے سے میں نے واپس اپنی جگہ پر آبیٹھنے کا کہا تھا، اس وقت بھی یہ خیال میرے ذہن میں نہیں آیا کہ ان کے موبائلز دیکھ لیے جائیں اور اپنے قبضے میں لے لیے جائیں۔ شاید اس کی وجہ شراب کا خمار ہو جس نے میرے حواس سن کر رکھے تھے اور پھر... ہم تھے بھی کون سا کوئی پیشہ ور مجرم جو اس طرح کی تمام احتیاطی تدابیر ذہن میں رہتیں۔

بہرحال یوسف خان کی کوشش سے دونوں کے موبائلز بیڈ سائڈ درازوں سے برآمد ہوگئے جو یوسف نے اپنی جیب

میں رکھ لیے۔ میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد شمائلہ کو واش روم جانے کی اجازت دے دی اور وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر واش روم میں جا گھسی۔

یوسف خان اب صوفے پر میری جگہ بیٹھا تھا اور میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ منیر سے بھی میری بات چیت ہورہی تھی۔ وہ لوگ جیسے جیسے کوٹھی کے قریب آتے جارہے تھے، میری بے چینی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ امید و بیم کی کیفیت شدید ہوتی جارہی تھی۔ حالات و واقعات بتا رہے تھے کہ ہم نہایت سہولت سے اپنے مقصد میں تقریباً کامیاب ہوچکے ہیں اور یہ بات مجھے ہضم نہیں ہورہی تھی۔ میرے لیے اس پر یقین کرنا تھوڑا مشکل تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے اپنے نصیبوں کا خوب پتا تھا۔ پھر مزید کچھ ہی دیر گزری تھی کہ منیر کی آواز میرے کانوں میں اتری۔

’’لیجیے... پہنچ گئے ہم لوگ۔‘‘

میں فوراً لپک کر کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ گاڑی گیٹ کے سامنے آکر رک رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر خورشید پراچہ موجود تھا اور عقبی دروازے سے منیر نیچے اتر رہا تھا۔ ٹھیک وہی لمحے تھے جب سامنے والی کوٹھی کی اوٹ سے دو آدمی نکل کر اس طرف کو آتے دکھائی دیے۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھے مگر ان کی چال ڈھال، ان کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرا ماتھا ٹھنکا... ان کی نظریں بھی منیر پر جمی ہوئی تھیں اور رخ بھی اسی کی طرف تھا۔ یکا یک ہی میری چھٹی حس کسی شدید گڑبڑ کے احساس سے چیخ اٹھی۔ منیر کوٹھی کے دروازے کی طرف آرہا تھا... یقیناً گیٹ کھولنے کے لیے۔

’’منیر! کچھ گڑبڑ ہوچکی ہے... یہاں پیچھے دو مشکوک افراد تمہاری طرف آرہے ہیں... ہوشیار!‘‘ میں نے تیز لہجے میں کہا تو منیر ٹھٹک کر رک گیا۔ اگلے ہی پل اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے اس طرح پلٹ کر دیکھنے پر ایک ذرا تو وہ دونوں کچھ ہچکچائے پھر ان میں سے ایک نے باقاعدہ منیر کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا اور کچھ کہا بھی۔ دوسرا شخص غیر محسوس سے انداز میں اپنا ہاتھ قمیص کے نیچے لے جاچکا تھا جہاں یقینی طور پر پسٹل موجود تھا۔ میں نے فوراً ہی رائفل سنبھال لی۔ منیر نے بھی پلک جھپکنے کی دیر میں اپنا پسٹل نکال لیا تھا۔ بس پھر جو ہوا آناً فاناً ہوگزرا۔

منیر کو پسٹل نکالتا دیکھ کر اس دوسرے شخص نے بھی برق رفتاری سے پسٹل نکالا اور منیر پر فائر کر دیا... اوپر کھڑکی سے میں نے ان دونوں کے پاؤں کے قریب سڑک کا نشانہ لیتے ہوئے دو تین سنگل شاٹ فائر کیے۔ منیر نے بھی دو جوابی فائر کیے اور بھاگ کر کوٹھی کے گیٹ کے اندر گھس آیا۔

خدا معلوم منیر کی فائرنگ کا نتیجہ تھا یا میری کہ ان میں سے ایک لڑکھڑا کر گر پڑا۔ گولی غالباً اس کی پسلیوں میں لگی تھی۔ دوسرے نے فوراً ہی اپنا پسٹل نکالتے ہوئے میری طرف جوابی فائرنگ کی۔ ایک گولی باہر دیوار سے ٹکرائی اور دوسری کھڑکی کے کھلے پٹ کا شیشہ کرچی کرچی کر گئی۔

مسز پراچہ اور اس کی دونوں بچیاں بے اختیار چیخ اٹھیں۔ یوسف کے چہرے پر بھی بوکھلاہٹ کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

’’کک... کیا ہوا... کیا ہوا طاہر بھائی؟‘‘

یوسف گھبرائے ہوئے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں کھڑکی کے ساتھ دیوار سے پشت لگائے، ہونٹ بھینچے کھڑا تھا۔ میری سیاہ بختی آج بھی میرے ہمراہ تھی۔ چند لمحوں میں ساری کہانی بگڑ کر رہ گئی تھی۔ زندگی نوٹوں کے ڈھیر کی صورت، نیچے... کوٹھی کے گیٹ کے سامنے گاڑی میں پڑی تھی اور موت جیسے ہمارے گرد گھیرا ڈال چکی تھی۔ مجھے شدت سے ایک شعر یاد آیا۔

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

’’معاملہ بگڑ چکا ہے یوسف خان! مجھے یقین ہے کہ بات کسی طرح پولیس کے نوٹس میں آچکی ہے اور ہم لوگ گھیرے جاچکے ہیں۔‘‘

میں نے بوجھل آواز میں کہا تو یوسف کے چہرے کی رنگت بالکل ہی متغیر ہوگئی۔ پراچہ کی فیملی دہشت زدہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ یقیناً انہیں اب اس بات کا ڈر تھا کہ وہ ہمارے جنون کا نشانہ بننے والے ہیں۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور منیر کی گھبراہٹ زدہ صورت نظر آئی۔

’’ہم لوگ بُری طرح پھنس چکے ہیں طاہر بھائی۔‘‘ منیر نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا اور دروازہ بند کرتے ہوئے اس کی چٹخنی چڑھا دی۔

اس کا گریبان اور کندھے سے قمیص سرخ ہورہی تھی۔

’’ان دو بندوں میں سے ایک الیاس گورائیہ تھا۔ تھانہ گنج منڈی میں اے ایس آئی لگا ہوا ہے اور میں اسے بڑی اچھی طرح پہچانتا ہوں۔‘‘

’’یہ خون...‘‘ میں جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

’’گولی کا کمال ہے مگر بچت ہوگئی۔ بس کندھے کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اوپری کھال کو ذرا چھو کر گزری ہے۔“

”قمیص اتارو تم۔“ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”پولیس کو پتا کیسے چلا؟“ یوسف سخت پریشان تھا۔

”قمیص کو چھوڑیں طاہر بھائی! ہمارے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ کیا کرنا ہے اب؟“ وہ سخت مضطرب تھا۔

میرے ہونٹوں پر ایک مضمحل سی مسکراہٹ ابھری۔ میں نے ایک نظر یوسف اور منیر کی وحشت زدہ صورتوں پر ڈالی اور منیر سے مخاطب ہوا۔

”خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ میری نجات کی صورت تو بن آئی... تم لوگ اگر گرفتاری دینا چاہو تو وہ تمہاری مرضی ہے۔“

منیر میری بات کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ وہ چند لمحے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے طاہر بھائی! اگر یہی انجام ہونا ہے تو پھر یہی سہی... یونہی سہی۔“

”اس... پراچہ نے امارے... ساتھ دھوکا کیا ہے۔“ یوسف خان دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔ ”ہو سکتا ہے کال ٹریس ہوئی ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ پراچہ نے بینک کے اندر سے کوئی گیم کیا ہے۔“

”اس بات پر اب مغز کھپانے سے کیا حاصل... آگے کا سوچو اب۔“

پھر میں اور منیر... ہم دونوں ہی کھڑکیوں کی طرف بڑھ گئے۔ ایک کھڑکی تو سامنے کے رخ پر تھی جبکہ دوسری بغلی طرف تھی۔ ہم دیوار کی آڑ لیتے ہوئے باہر کا جائزہ لینے لگے۔ یقین تو پہلے ہی تھا، صورتِ حال واضح تھی... کھڑکیوں میں سے جھانک کر دیکھنے پر ہمیں صورتِ حال کی سنگینی کا صحیح معنوں میں اندازہ ہو گیا۔

اس کوٹھی کے چاروں طرف ہی پولیس کی نقل و حرکت جاری تھی۔ باوردی پولیس والے بھی دکھائی دے رہے تھے اور بغلی طرف والی کھڑکی سے ایک طرف کھڑی پولیس کی موبائل بھی دکھائی دی تھی۔ اچھی خاصی نفری تھی پولیس کی اور ہم تین ایسے احمق تھے جنہیں ایسے معاملات کا قطعاً کوئی تجربہ نہیں تھا اور ہمارے پاس اسلحہ بھی کوئی خاص نہ تھا۔

”آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ نجات کے سوا اب اور کوئی راستہ ہمارے پاس ہے بھی نہیں۔“ منیر کھڑکی کے قریب ہی دیوار کے ساتھ کمر ٹکا کر بیٹھ گیا۔

”اگر ام لوگ گرفتاری دے دیں... ہتھیار ڈال دیں تو؟“ یوسف خان کی آواز میں خفیف سی لرزش تھی۔

”ان کے ایک بندے کو گولی لگی ہے۔ پتا نہیں بچتا ہے یا نہیں... ہم لوگوں نے ہتھیار ڈال بھی دیے تو وہ ہمیں گرفتار کرنے کے بجائے ”پار“ کرنا ہی پسند کریں گے۔“

منیر نے بددلی سے کہا۔ میں بھی منیر ہی کی طرح دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا تھا۔

”تو... تو پھر اب کیا ہوگا... کیا کرنا چاہیے اب ہمیں؟“

یوسف کی رنگت زرد پڑی ہوئی تھی اور وہ بُری طرح گھبرایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اور منیر نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

یوسف ہماری توقع کے برخلاف کچھ زیادہ ہی حواس باختہ اور دہشت زدہ نظر آرہا تھا۔ اس کی حالت خاصی دگرگوں ہو رہی تھی۔

”بیٹھ جاؤ یوسف! ایک طرف سکون سے بیٹھ جاؤ اور انتظار کرو۔“

میں نے دھیمے لہجے میں کہا تو وہ فوراً صوفے کے قریب پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔

”لو بیٹھ گیا... مگر... مگر اب انتظار کس بات کا کرنا اے؟“

”کچھ دیر خاموش رہو یار۔“ منیر کے لہجے میں ہلکی سی بیزاری تھی۔

میں نے ایک نظر بیڈ کی طرف دیکھا۔ دونوں ملازم لڑکے ایک کونے پر سمٹے بیٹھے تھے اور مسز پراچہ اپنی دونوں بیٹیوں کو یوں بغلوں میں دبائے بیٹھی تھی جیسے خطرے کے وقت مرغی چوزوں کو پروں میں چھپا لیتی ہے۔

”ابھی کچھ دیر میں ہمیں وارننگ دی جائے گی... پھر ہم پر دھاوا بول دیا جائے گا۔ ہمارے پاس گولیاں بھی بس گنتی ہی کی ہیں۔“ منیر کی بات سنتے سنتے اچانک ہی یوسف خان ایک طرف پڑے اپنے بیگ کی طرف کھسک گیا۔

”ہم لوگ زیادہ دیر مزاحمت نہیں کر سکیں گے... مختصراً یہ کہ ہمارے پاس بس اب گنتی کے چند گھنٹے ہیں... زیادہ سے زیادہ۔“

منیر گمبھیر لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا اور میں مسز پراچہ کی شکل دیکھ رہا تھا جس پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آنکھوں میں اَن گنت وسوسے اور اندیشے تھے اور لرزیدہ ہونٹوں پر یقیناً اپنی بچیوں کی عزت و آبرو اور سلامتی کے حوالے سے دعائیں۔

”مجھے بس یہ یقین دہانی چاہیے کہ میری اور میرے بچوں کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔“ افشاں مجسٹریٹ سے مخاطب تھی۔

”یعنی موت یقینی ہے؟“ میرا انداز خود کلامی والا تھا۔

”جی... تقریباً۔“ منیر نے مختصراً کہا۔

چند لمحے ایک بوجھل خاموشی میں گزرے۔ مجھے یک ٹک اپنی طرف دیکھتے پا کر مسز پراچہ نے دونوں لڑکیوں کو تھوڑا اور دبوچ لیا۔

”جو اصل قصوروار ہے وہ تو زندہ سلامت رہے گا... ان کا تو کوئی قصور بھی نہیں... کیا بنے گا ان کا؟“

”ان کی موت حادثاتی قرار دی جائے گی یا پھر ہمارے سر ڈال دی جائے گی۔ بے شک یہ پولیس کی اندھی فائرنگ کا نشانہ بنیں۔“

”نہیں منیر! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے بے ساختہ نفی میں سر کو حرکت دی۔ پتا نہیں کیوں مگر میری آنکھوں سے دو آنسو بھی بہہ نکلے تھے۔

”تو... پھر...؟“

منیر نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ ٹھیک اسی لمحے یکے بعد دیگرے تین گولیوں کی آواز بلند ہوئی۔ بغلی کھڑکی کے شیشے کی کرچیاں اندر کارپٹ پر آ بکھریں۔ پلاسٹر آف پیرس کی چھت کا کچھ حصہ ٹوٹ کر کمرے کے وسط میں گرا تھا۔ مسز پراچہ اور اس کی بیٹیاں بے ساختہ چیخ اٹھیں۔ دونوں ملازم لڑکے بھی رونے لگے۔ ان کے چہرے یوں زرد ہو رہے تھے کہ کاٹو تو لہو نہیں۔

”ہم... مرے گا... مرے گا ام لوگ۔“ یوسف گھٹنوں کے بل بیگ کے قریب بیٹھے بیٹھے بڑبڑایا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پسٹل تھا اور بائیں میں گرینیڈ۔

”ہاں، مرے گا تو سہی مگر ابھی کچھ وقت لگے گا... یہ فائرنگ صرف ہمارے پاس موجود اسلحے کی نوعیت جاننے کی غرض سے کی گئی ہے۔“

”تو ام جواب میں گرینیڈ پھینکتا اے پھر۔“ یوسف ایک دم کھڑا ہوا۔

”بیٹھ جاؤ ورنہ سر میں گولی لگے گی۔“

منیر کے تیز لہجے پر یوسف جس تیزی سے کھڑا ہوا تھا، اس سے دگنی تیزی کے ساتھ واپس بیٹھ گیا۔

”آپ لوگ یہاں سے نکل جائیں۔“ میں نے مسز پراچہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر اسے جیسے میری بات کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ وہ دہشت زدہ سی بیٹھی ہماری صورتیں تکتی رہی۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں، اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

"جان پیاری ہے تو فوراً کھڑی ہو جاؤ۔ اپنا نہیں تو بچوں کا خیال کرو۔" اس بار وہ یوں ہچکچاتے ہوئے آہستہ سے کھڑی ہوئی جیسے اس کے کھڑے ہوتے ہی ہم اسے گولی مار دیں گے۔ اس کے چہرے پر حیرت اور آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

"ان کو کدھر بھیجتا اے؟" یوسف نے اچنبھے سے پوچھا جبکہ منیر اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔

میں کھڑکی کے قریب سے جھکے جھکے انداز میں گزر کر دروازے کے قریب پہنچا اور چٹخنی نیچے گراتے ہوئے مسز پراچہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"چلو... نکلو سب جلدی۔"

میرے دروازہ کھولتے ہی وہ پانچوں فوراً آگے بڑھے تھے کہ یوسف ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اے بھینس کا اولاد! کدھر منہ اٹھا کے جاتا اے؟ بیٹھو... بیٹھو ادھر۔" یوسف کا لہجہ انتہائی کرخت تھا۔ وہ پانچوں ٹھٹک کر رک گئے اور میری طرف دیکھنے لگے۔

"یوسف! جانے دو ان کو... آئیں آپ لوگ۔"

میں نے یوسف کو ٹوکتے ہوئے پھر سے انہیں مخاطب کیا۔

"کیسا بات کرتا اے یار تم! یہ لوگ تو امارا بچت کا واحد ذریعہ اے... تم انہیں کدھر بھیجتا اے؟"

"یوسف خان! ہماری بچت اب کسی... ذریعے سے ممکن نہیں... تم اس حقیقت کو قبول کرلو تو بہتر ہوگا۔"

میں نے یوسف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"او منڑاں! یہ ذریعہ اے نا! اور اگر نہیں اے تو بھی ام ان کو کیسے کہیں جانے دے... اس خنزیر کے بچے پراچہ نے امارے ساتھ دھوکا کیا اے... یہ اس کا بیوی بچہ اے۔ ام ان کو کدھر نہیں جانے دے گا۔ اگر ام مرے گا تو یہ بھی امارے ساتھ ہی ادھر مرے گا۔" یوسف خان کی جیسے سوئی اٹک چکی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف آمیز دہشت کے سائے لہرا رہے تھے۔

"یوسف خان! پاگل مت بنو... پراچہ نے اگر دھوکا کیا ہے تو اس میں ان کا کیا قصور؟"

منیر اٹھ کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"قصور اے یا نہیں... یہ لوگ ادھر سے نہیں جائے گا بس..." یوسف نے گویا اپنا آخری فیصلہ سنایا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے اور کچھ نہیں۔"

منیر نے ناگواری سے کہا اور مسز پراچہ سے مخاطب ہوتے ہوئے یوسف کی طرف بڑھا۔

"تم لوگ جاؤ... کوئی نہیں روکے گا۔"

"ایک قدم بھی اٹھایا تو ماں قسم ام گولی مار دے گا۔" یوسف نے اچانک ہی مسز پراچہ کی طرف پسٹل سیدھا کرلیا۔ اس کے اعصاب تن گئے تھے اور آنکھوں میں ایک مجنونانہ چمک اتر آئی تھی۔

"یوسف! تھوڑا ہوش سے کام لو۔" میرا لہجہ خشک تھا۔

"ہوش ہی سے کام لے رہا اے ام۔"

"پسٹل نیچے کرو۔" منیر کے تیور بگڑ چکے تھے۔

"منیر بھائی! آگے مت بڑھو ورنہ ام گولی چلا دے گا۔"

یوسف ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گرینیڈ تھا اور پسٹل والا ہاتھ اب اس نے منیر کی طرف سیدھا کرلیا تھا۔ حالات کی سنگینی نے اسے اس قدر وحشت زدہ کر دیا تھا کہ وہ جیسے ٹھیک سے سوچنے سمجھنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ اس وحشت میں واقعی ہم میں سے کسی پر بھی گولی چلا سکتا ہے۔

"رک جاؤ منیر!"

میں نے منیر کو روکنا چاہا مگر خود منیر کا اپنا دماغ بھی گرم ہو چکا تھا۔

"اچھا چلاؤ گولی... الو کے پٹھے۔"

منیر، یوسف کی طرف لپکا۔ میں نے یوسف کے چہرے کے عضلات مرتعش ہوتے دیکھے۔ میری دھڑکنیں یک دم اپنی رفتار بھول بیٹھیں۔ میں چیخ کر ان دونوں کو روکنا چاہتا تھا مگر میرے حلق سے آواز نکلنے سے پہلے ہی یوسف نے ٹریگر دبا دیا۔ ایک بار... دو بار... کمرے کی فضا دو دھماکوں اور مسز پراچہ اور اس کی بچیوں کی دہشت زدہ آوازوں سے لرز اٹھی۔ میں نے منیر کو لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا۔ وہ دو قدم لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور دھڑام سے نیچے آرہا۔

ایک گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی اور دوسری سینے میں۔ گرتے گرتے منیر نے بھی فائر کیا تھا مگر اس کا نشانہ خطا گیا۔

کمرے میں موجود ہم سبھی افراد ایک ذرا تو جیسے پتھر کے بے جان سنگی مجسموں میں تبدیل ہو کر رہ گئے تھے۔ گویا ہمارے سانس تک رک چکے تھے۔ ہم سب ہی پھٹی پھٹی نظروں سے منیر کے خون میں لت پت وجود کو دیکھ رہے تھے۔ خود یوسف بھی پتھرائی ہوئی نظروں سے منیر ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یوسف اپنے حواس کھو چکا تھا۔ وہ اندھا دھند اب

کسی پر بھی فائر کھول سکتا تھا۔ مسز پراچہ، اس کی بچیاں... ملازم لڑکے اور خود میں بھی اس کے اس جنون کا نشانہ بن سکتے تھے۔

میں نے منیر کے پھڑ کتے ہوئے وجود سے نظر ہٹا کر یوسف کی طرف دیکھا۔ ٹھیک اسی لمحے یوسف نے بھی میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں موجود جنون میں اب خوف اور ایک گہرا اندیشہ بھی ابھر آیا تھا۔

ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور دونوں کے ذہن میں شاید ایک ہی خیال کا ناگ پھنکار اٹھا کہ ہم دونوں کا سکتہ ٹوٹا اور ہم دونوں نے بیک وقت حرکت کی۔ یوسف نے میری طرف پسٹل سیدھا کیا تھا اور میں نے اس کی طرف رائفل۔ پھر ہم دونوں نے ایک ساتھ ٹریگر دبائے۔ ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے۔ یہ تو میں اندازہ نہیں کر پایا کہ میری چلائی ہوئی گولی یوسف کو کہاں لگی تھی۔ میں نے بس اسے تڑپ کر صوفے سے ٹکرا کر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہاں، یوسف کی چلائی ہوئی گولی میری ہنسلی کی ہڈی سے ٹکرائی تھی اور یقینی طور پر ہڈی کو توڑتی ہوئی کندھے کے اندر کہیں اترتی چلی گئی تھی۔ شدید تکلیف اور جلن نے میرے قدم ڈگمگا دیے اور میں کھلے ہوئے دروازے سے ٹکراتا ہوا گر پڑا۔ میری ٹانگیں کمرے کے اندر تھیں اور باقی دھڑ باہر کوریڈور میں... کوئی دہکتا جلتا انگارہ تھا جو میرے کندھے کے اندر پھڑ پھڑا رہا تھا۔

شدید ترین تکلیف کے باوجود میں نے دوسرے ہاتھ سے رائفل سنبھالتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی کیونکہ ابھی یوسف کے انجام کی مجھے تسلی نہیں تھی اور کمرے میں پانچ افراد ایسے موجود تھے جن کو یوسف ہر صورت مار ڈالنے کی کوشش کر سکتا تھا اور... اور ان میں ایک ماں بھی تھی اور... اس کے دو بچے بھی... میں بہ دقت تمام اٹھا... سامنے ہی صوفے کے قریب پڑا یوسف ہاتھ میں موجود گرینیڈ کی "پن" کھینچ رہا تھا۔ میں نے فوراً رائفل اس کی طرف سیدھی کرنی چاہی مگر رائفل کا وزن جیسے کئی من زیادہ ہو چکا تھا۔ میں باوجود اپنی تمام تر کوشش کے رائفل اس کی طرف سیدھی نہیں کر پایا اور اس نے گرینیڈ کی پن کھینچتے ہوئے گرینیڈ مسز پراچہ کی طرف لڑھکا دیا۔

"بھاگو... بھاگو۔" میں اپنی پوری قوت مجتمع کرتے ہوئے چیخا لیکن میری آواز ایک گھٹی گھٹی سی سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔

"بھاگ... او... بھاگ..." ایک کان پھاڑ دینے والا ہولناک دھماکا ہوا۔ کچھ گھٹی گھٹی چیخیں میری سماعت کے قریب آکر معدوم ہو گئیں۔ فرش کپکپایا تھا۔ میرے ذہن میں افشاں کا مسکراتا ہوا روشن چہرہ طلوع ہوا اور جھپٹ اپنی آنکھوں کی طرف آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وجود کو ایک قیامت کا دھچکا لگا۔ بوجھ... بھاری بوجھ تھا جو میرے وجود پر آکر ٹکرایا تھا۔ درد و کرب کا ایک طوفان بلاخیز میرے پورے وجود میں پھیلتا چلا گیا۔ میرا رُواں رُواں جھنجھنا اٹھا تھا۔

اس کربناک جھنجھناہٹ کی شدتیں اس قدر زیادہ تھیں کہ میرے محسوسات اب تک کی زندگی میں اس سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ سو میرے حواس... میرے محسوسات جیسے لمحہ بھر میں تحلیل ہوتے ہوئے کہیں غائب ہو گئے۔ درد و کرب کا احساس یکا یک جاتا رہا۔ مجھے ان لمحوں میں ایک ایسے الوہی سکون سے آشنائی ہوئی جو اپنے ہونے کی حالت میں میں نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ میں خود بھی جیسے پوری طرح تحلیل ہو چکا تھا اور میری جگہ میں ایک "خلا" باقی تھا یا... یا شاید میں خود ایک خلا کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ایک بے کراں خلا کی۔

اور اس خلا میں ایک آواز گونج رہی تھی۔

"مجھے بس یہ یقین دہانی چاہیے کہ میری یا میرے بچوں کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"یہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزاریں... میں اپنی مرضی سے گزاروں گی۔"

"اب شاید عمر بھر ہمارا رابطہ ممکن نہ ہو۔"

"طاہر! یہ اپنے لاڈلے کو دیکھ لیں... "ماتے" کی دم کے ساتھ تکیہ باندھ رہا ہے۔"

"میں چائے اور چپس لے کر آرہی ہوں۔"

"طاہر! باہر بہت گہرے سیاہ بادل آئے ہوئے ہیں۔ آئیں گراؤنڈ میں چل کر گھومتے ہیں۔"

پھر وہ گونج معدوم ہوتی چلی گئی۔ خاموشی... سکون... مکمل خالی پن... کچھ باقی نہ رہا تھا... کچھ بھی...

☆☆☆

نیرنگی ہستی میں جینے والے گروہ کے علاوہ دو انسانی گروہ اور بھی ہوتے ہیں۔ ان دو گروہوں میں سے ایک تو وہ ہوتا ہے جن کی تمام زندگی... آسائش و عشرت میں گزرتی ہے۔ دوسرا گروہ ان ادھوری روحوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی لوحِ ہستی پر روزِ ازل ہی جلی حروف میں دکھ لکھ دیا گیا تھا... صرف دکھ۔ اپنی زندگی، اپنے ہونے کا دکھ... اپنی محرومیوں اور اپنی غربت کا دکھ... اور... اور محبت کا دکھ، ایک کربِ مسلسل... آزارِ جاں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اب اسے قنوطیت کہا جائے، ناشکری یا میرا منفی اندازِ فکر کہ میں اپنا شمار اسی آخری الذکر گروہ میں کرتا ہوں۔

دکھ کے مختلف ذائقوں کو مسلسل چکھتے ہوئے... اس کی خون آشام پوشاکیں پہنتے پہنتے جب کوئی عاجز آجاتا ہے، تھک جاتا ہے اور اپنی لوحِ ہستی پر لکھے ہوئے سے انحراف کرتے ہوئے دکھ کے اس تاریک دائرے سے نکلنے کے لیے بغاوت کرتا ہے تو عموماً وہ خود ہی دکھ کا ''مجسم اظہاریہ'' بن جاتا ہے۔

ہم تینوں بھی ایسے ہی باغی تھے، بس ہمارے دکھوں کی نوعیت الگ الگ تھی۔

میرے دونوں ساتھی اس حوالے سے خوش قسمت رہے کہ وہ دکھ کے شکنجے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہوگئے تھے۔

اور میں... طاہر علی آزر... ایک ادھورا شاعر... معمولی افسانہ نگار... ہستی کا مجرم، زندگی کا قیدی... ایک بار پھر سے دکھ کا نیا چولا پہننے کے لیے زندہ بچ رہا تھا۔

دوبارہ جب میرے حواس لوٹے، میں نے خود کو اسپتال میں پایا تھا۔ گولی لگی تھی۔ گرینیڈ پھٹنے سے گرنے والا چھت کا ملبا میری قبر بنا تھا۔ مجھے وہاں سے نکال کر اسپتال لایا گیا اور میری ڈھٹائی اور بے غیرتی دیکھیے کہ میں پھر بھی زندہ بچ گیا۔ سوائے ایک ٹانگ کٹنے کے میرا باقی سارا وجود زندہ اور سلامت تھا۔ البتہ میرے علاوہ وہاں موجود بھی لاشوں میں بدل گئے تھے۔ منیر... یوسف... مسز پراچہ اور اس کی بچیاں... دونوں ملازم لڑکے... کوئی ایک بھی جانبر نہ ہوسکا تھا سوائے مجھ ملعون کے۔ میں ہی زندگی کے طوق سے نجات پانے کے لیے مضطرب تھا اور مجھے ہی زندگی نے دبوچ لیا تھا۔

پراچہ فیملی سمیت اپنے ساتھیوں کا قاتل بھی مجھے ہی ٹھہرایا گیا تھا۔ پوری فیملی کو یرغمال برائے تاوان اور خطرناک ناجائز اسلحے کی ذمے داری بھی میرے ہی سر تھی۔ مجسٹریٹ صاحب نے نہایت سہولت اور سکون سے مجھے پچیس سال کی قید سنادی۔ مجھے پہرے اور پنجرے میں بٹھا کر زندہ رہنے پر مجبور کردیا گیا۔

آج کل زنداں کی تنگ دیواریں ہیں۔ آہنی سلاخیں ہیں اور میں ہوں۔ میرے وجود میں ہنوز ایک گہری خاموشی ہے، ویران سا سناٹا اور دماغ میں ہمہ وقت ایک شورِ زنجیر... وہی شور میں نے ان کاغذوں پر اگل دیا ہے۔

یہ تحریر طاہر علی آذر کی آخری تحریر ہے۔ اس کے لیے... جس نے مجھ سے سارے رابطے توڑ لیے ہیں۔ برسوں کی رفاقت کے بعد اجنبی بن گیا ہے۔ ہاں افشاں! یہ سب تمہارے لیے ہے۔ میرے پاس اور کوئی راستہ، کوئی ذریعہ نہ تھا تم تک اپنی بات پہنچانے کا سو میں نے یہ راستہ اپنایا ہے۔ میں زندگی حاصل کرنے نکلا تھا۔ تمہارے اور تمہارے بچوں کے معیار کی زندگی... مگر یہ تو کہیں لکھا ہی نہ تھا، بھلا میں تمہاری محبت کسی بھی طرح کیسے حاصل کرسکتا تھا جبکہ یہ میری لوحِ ہستی پر کبھی لکھی ہی نہ گئی تھی۔

اور یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ میں ایک اپاہج وجود کے ساتھ زنداں نشیں ہو کر رہ گیا، بصورتِ دیگر جو میری واپسی ہوتی تو تمہاری نارسائی کا کرب اور ذلت و رسوائی کی وہ آگ یقیناً مجھے حساب کتاب چکانے پر مجبور کردیتی اور نتیجتاً تم خسارے میں جا پڑتیں۔ تازندگی تنہا جیتیں... بالکل یک و تنہا۔

مجھ زمیں زادے کی سیاہ بختی کہ یہ خسارہ ہمیشہ ہی سے میرا نصیب رہا اور خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ تم اس جاں گسل آزار سے محفوظ رہیں۔

اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے بھرپور انداز میں جینا افشاں! خدا تعالیٰ تم پر ہمیشہ مہربان رہے۔ آمین۔

آخر میں یہ دو شعر... تمہارے لیے کہے تھے... تمہاری امانت ہیں، تمہاری نذر۔

تیرے سرد رویّے کی وہ خنکی جاں تک اتری تو
میرے من کے دریا کی سب لہریں جم کر برف ہوئیں
سفر میں ہم پر جیون کے جو گزری وہ بس اتنی ہے
جینا ہم کو آیا نہ اور ساری سانسیں صرف ہوئیں

آج بھی... تمہارا... پاگل، وحشی۔

طاہر علی آذر۔

افشاں نے ڈائجسٹ بند کر کے ایک طرف ڈالتے ہوئے ماہا اور عاصم کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔

دو آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر رخساروں پر بہہ نکلے جنہیں اس نے فوراً ہی ہتھیلی سے رگڑ کر پونچھ ڈالا اور لائٹ آف کرتے ہوئے اپنے بستر پر دراز ہوگئی۔ وہ نہیں سمجھ پائی تھی کہ یہ دو آنسو طاہر کے لیے بے اختیار نکلے تھے یا کہ اس کے اپنے ہی اندر کی کسی اذیت کا نتیجہ تھے۔ البتہ یہ اطمینان اسے ضرور حاصل ہوا تھا کہ آج سے کوئی ڈر، خوف یا گھبراہٹ محسوس نہیں ہوگی۔ ڈرانے، دہلانے والا کوئی خواب نیندیں نہیں اجاڑے گا اور وہ سکون کی نیند سو سکے گی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM